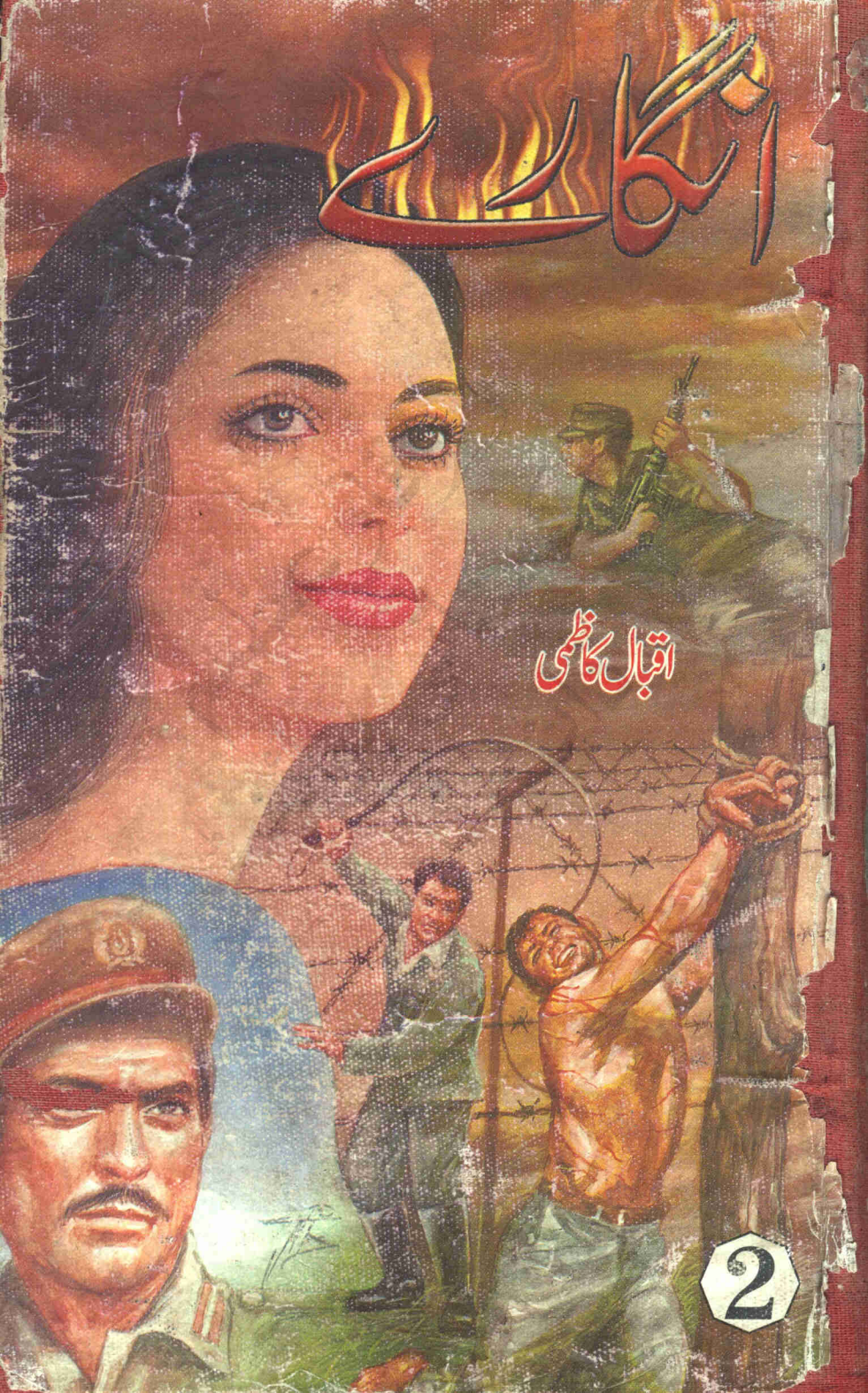

انگارے
اقبال کاظمی
2

ہنومان گڑھ درمیانے درجے کا شہر تھا۔ یہاں چند اچھے اور درمیانے درجے کے ہوٹل تھے لیکن سیتا نے شہر کے نواحی علاقے میں واقع ایک گیسٹ ہاؤس کو ترجیح دی۔

گیسٹ ہاؤس کے چاروں طرف وسیع باغ تھا جس پر بڑی محنت کی گئی تھی۔ وسیع و عریض لان تھا۔ دبیز گھاس کے قطعات کے کناروں پر خوبصورت پھولوں کے پودوں کی کیاریاں تھیں۔ لان میں ایک دوسرے سے فاصلے پر میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر رنگ برنگی خوبصورت چھتریاں بھی تنی ہوئی تھیں۔

جس ٹرین پر ہم بٹھنڈہ سے آئے تھے اُس نے ہمیں سہ پہر چار بجے کے قریب ہنومان گڑھ پہنچایا تھا۔ سٹیشن سے نکلنے اور آٹو رکشہ پر یہاں تک آنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ ریلوے سٹیشن سے نکل کر سیتا نے رکشے والے کو جس طرح گیسٹ ہاؤس کا پتہ بتایا تھا اُس سے مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ یہ شہر اُس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔

اس وقت اگرچہ پانچ بج چکے تھے مگر فضا میں ہلکی سی تپش اب بھی موجود تھی۔ اس شہر کے چاروں طرف دُور دُور تک ریگستان تھا اور ریگستان کی گرمی شہر کو بھی اثر انداز کرتی تھی۔

آٹو رکشہ جیسے ہی گیسٹ ہاؤس کے گیٹ کے سامنے رُکا ایک ادھیڑ عمر ملازم دوڑتا ہوا باہر آ گیا۔ اُس نے پہلے ہاتھ جوڑ کر ہمیں پرنام کیا پھر وہ بیگ اُٹھا لیا جو ہم دونوں کا کل اثاثہ تھا۔ میں سیتا کے ساتھ بجری والی روش پر چلتے ہوئے لان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تمام میزیں خالی تھیں۔ لان کے دوسری طرف درختوں کے نیچے بار بی کیو اسٹینڈ تھا۔ مگر وہاں بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

گیسٹ ہاؤس کی عمارت ایک بہت بڑے ڈبل سٹوری بنگلے پر مشتمل تھی۔ برآمدہ بہت وسیع و عریض تھا۔ فرش سفید ماربل کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے بنا ہوا تھا۔ ایک کافی ٹیبل اور چند کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ برآمدے کے کناروں کے ساتھ ساتھ پودوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ ہم ملازم کے پیچھے چلتے ہوئے برآمدے والے دروازے میں داخل ہو گئے۔ آگے ایک کشادہ راہداری تھی جس کے ایک طرف استقبالیہ کاؤنٹر بنا ہوا تھا اور سامنے اُوپر جانے کے لئے زینہ تھا جس پر گرے رنگ کا ایکرالک قالین بچھا ہوا تھا۔ کاؤنٹر اور زینے کے بیچ میں بھی اتنی کشادہ جگہ تھی کہ تین چار آدمی پہلو بہ پہلو آسانی سے گزر سکتے تھے۔ اس سے آگے ایک وسیع ہال نظر آ رہا تھا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے اور کئی صوفہ نما سیٹیں ایک دوسرے کے سامنے مناسب فاصلوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہر دو سیٹوں کے بیچ شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل بھی نظر آ

رہی تھی۔ اس ہال کے دوسری طرف ایک مختصر سی راہداری اور اس سے آگے غالباً کچن تھا۔

ملازم کاؤنٹر کے سامنے رُک گیا۔ اُس نے ہمارا بیگ نیچے رکھ دیا تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ جوانی میں قیامت رہی ہوگی۔ اُس کے چہرے پر ہلکا سا میک اپ تھا اور وہ تازہ دم لگ رہی تھی۔ اُس نے گولڈن بارڈر والی گہرے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی جس کا پلو نیچے لٹکا ہوا تھا۔ اسی رنگت کا بلاؤز اس قدر مختصر تھا کہ میں اُس کی طرف نظریں اُٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

اُس نے ہونٹوں پر پیشہ وارانہ مسکراہٹ لاتے ہوئے ہمارا استقبال کیا اور سامنے رکھا ہوا ایک رجسٹر کھول کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس سے پہلے کہ میں ہاتھ بڑھاتا سیتا نے وہ رجسٹر سرکا کر اپنے سامنے کر لیا اور بال پین اُٹھا کر خانہ پُری کرنے لگی۔ میں خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اور پھر یہ جان کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اُس نے رجسٹر میں میرا نام پریم کمار اور اپنا کنیا کماری لکھا تھا۔ اور اس سے آگے والے خانے میں پتی پتنی لکھا تھا۔

ہم پٹھان کوٹ میں اور اس کے بعد سفر میں بھی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے آئے تھے لیکن یہاں آ کر یکایک ہندوانہ ناموں کی تبدیلی میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔

''کتنے دن قیام کا ارادہ ہے مسز پریم کمار؟'' کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت نے رسٹر اپنی طرف سرکا کر نام پڑھتے ہوئے پوچھا۔

''صرف آج کی رات..... کل صبح کی ٹرین سے ہم بیکانیر روانہ ہو جائیں گے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اُس عورت نے کچھ کہا، سیتا نے پرس میں سے چند نوٹ نکال کر اُس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔

''مہمانوں کو رُوم نمبر اٹھارہ میں پہنچا دو۔'' اُس عورت نے نوٹ سمیٹ کر قریب کھڑے ہوئے ملازم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آیئے دیوی جی!'' ملازم نے بیگ اُٹھا لیا۔ اُس نے بھی سیتا ہی کو مخاطب کیا تھا۔ غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ جو کچھ ہے یہ دیوی جی ہی ہے۔ میں تو بس ایویں ہی ہوں۔

رُوم نمبر اٹھرہ (اٹھارہ) اُوپر تھا۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میں نے ہال کی طرف دیکھا کہ لوگ مختلف سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور کافی یا چائے پیتے ہوئے مدھم لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ رُوم نمبر اٹھرہ (اٹھارہ) اوپر کی منزل پر کارنر میں اور سامنے کے رُخ پر تھا۔ ڈبل بیڈ کا یہ کمرہ بہت شاندار طریقے سے آراستہ تھا۔ بیڈ کے ایک طرف سفید فارمیکا کی الماری اور اس کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ صوفہ بچھا ہوا تھا جس کے سامنے شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل بھی تھی۔ داخلی دروازے کے ساتھ ہی باتھ رُوم کا دروازہ تھا۔ ایک اور دروازہ صوفے سے ذرا آگے تھا۔ ملازم نے ہمارا بیگ بیڈ پر رکھ کر وہ پردہ بھی ہٹا دیا۔ اس

دروازے کے دوسری طرف کشادہ سی گیلری تھی جس کے اطراف میں پائپ کی گرل لگی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ گملے رکھے ہوئے تھے۔ بانس کی کھپچیوں والی دو کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ اس گیلری سے سامنے والے لان کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ گیٹ کے سامنے سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت جاری تھی۔

''کوئی جل پان دیوی جی؟'' ملازم نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی نہیں..... تم جاؤ!'' سیتا نے کہا۔ ''ضرورت ہوگی تو بلا لیں گے۔'' ملازم شاید ٹپ ملنے کی اُمید پر اب تک کھڑا تھا۔ سیتا کا رُوکھا سا جواب سن کر منہ لٹکائے چلا گیا۔ سیتا نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا اور بیڈ پر گر گئی۔

''تھک گئی.....!'' وہ میری طرف کروٹ لیتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا کیا حال ہے پریم کمار جی؟'' اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

''یہ یکایک نام بدلنے کی کیا تک تھی؟''

''پٹھان کوٹ سے بھٹنڈہ تک مسلمانوں کی اکثریت ہے.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''مسلم دھرم کے حوالے سے کوئی بات ہوتی تو تم سنبھال لیتے۔ اب یہاں سے آگے زیادہ آبادی ہندوؤں کی ہے۔ یہاں ہندو دھرم کے حوالے سے کوئی بات ہوگی تو میں سنبھال لوں گی۔''

''تم نے اپنا نام کیوں بدلا؟ تم رجسٹر پر سیتا بھی لکھ سکتی تھیں۔ اور پھر یہ پتی پتنی؟''

''یہ رشتہ تمہیں پسند نہیں آیا کیا؟'' سیتا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''سیدھی سی بات ہے رجسٹر میں کچھ تو لکھنا تھا۔ اگر میں درست لکھتی تو بلاوجہ ہمیں شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ اور پھر تم سے بھی الگ خانہ پُری کرائی جاتی۔ میں نے پتی پتنی لکھ کر سارے جھگڑے ہی مُکا دیئے۔''

''اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ابھی تو ہم آئے ہیں..... دم تو لینے دو! پروگرام بھی بنا لیں گے۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ گئی اور بیگ کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔ ''میں نہانے جا رہی ہوں۔ بعد میں تم بھی نہا لینا۔ پھر ہم چائے پئیں گے۔'' وہ اپنے کپڑے اور تولیہ لے کر باتھ رُوم میں گھس گئی۔ اُس نے دروازہ آدھا کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں صوفے سے اُٹھ کر گیلری میں آ گیا اور سامنے سڑک پر ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ اس وقت ایک ٹیکسی گیٹ کے سامنے رُکی۔ گیسٹ ہاؤس کا وہی ملازم بھی برآمدے سے نکل کر دوڑتا ہوا گیٹ پر پہنچ گیا۔ ٹیکسی کی چھت پر دو سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔ ٹیکسی سے اُترنے والے مسافروں میں تقریباً چالیس سال کی عمر کا ایک آدمی، ایک عورت جس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی اور دو بچے شامل تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا، لڑکی کی عمر بارہ تیرہ سال اور لڑکا سات آٹھ سال کا ہوگا۔ وہ لوگ ٹیکسی سے اُتر کر اندر آ گئے تو میں بھی گیلری سے ہٹ کر کمرے میں آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس وقت میری نظر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کی طرف اُٹھ گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

ڈریسنگ ٹیبل اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ آئینے میں باتھ رُوم کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دروازہ نیم وا تھا اور اندر تک کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ منظر بڑا ہوشربا تھا..... مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ سیتا شاور کے نیچے کھڑی تھی۔ ہلکی پھوار کے ساتھ برستا ہوا پانی اُس کے بدن پر دھاروں کی صورت میں پھسل رہا تھا..... اور کہیں کہیں کندنی بدن پر پانی کے قطرے آبدار موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

میری کنپٹیاں سلگنے لگیں..... میں ڈریسنگ ٹیبل کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا لیکن میری نظریں بار بار آئینے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔

میں اُٹھ کر دوبارہ بالکونی میں آ گیا اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اسی دوران ایک اور ٹیکسی گیٹ کے سامنے آ کر رُکی۔ ایک نوجوان لڑکی اور ایک مرد ٹیکسی سے اُترے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی بات پر ہنستے ہوئے بجری والی روش پر چلتے ہوئے برآمدے میں غائب ہو گئے۔ اور اسی وقت سیتا کی آواز سن کر میں نے مُڑ کر اندر کی طرف دیکھا۔ سیتا باتھ رُوم کے دروازے سے سر باہر کو نکالے کھڑی تھی۔

''یہ دروازہ بند کر دو! اور کھڑکی کا پردہ بھی برابر کر دو۔'' اُس نے کہا۔

میں نے اندر آ کر دروازہ بھیڑ دیا اور کھڑکی کا پردہ بھی کھینچ کر برابر کر دیا۔ سیتا جسم پر تولیہ لپیٹے باتھ رُوم سے باہر آ گئی۔ تولیہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ اُس کے جسم کو پوری طرح ڈھک سکتا۔ اُس کے بدن پر پانی کے قطرے اب بھی موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

میں نے جھک کر بیگ میں سے کپڑے نکالے اور اُس کی طرف دیکھے بغیر باتھ رُوم میں گھس گیا۔ میں تقریباً آدھا گھنٹہ شاور کے نیچے کھڑا رہا۔ ٹھنڈے پانی سے دماغ کی تپش کسی حد تک کم ہو گئی۔ باتھ رُوم کے دروازے پر دھب دھب کی آواز سن کر میں چونک گیا اور آڑ میں ہو کر تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو سیتا سامنے کھڑی تھی۔

''میرے کپڑے اندر کھونٹی پر ٹنگے ہوئے ہیں..... وہ دے دو مجھے۔'' اُس نے کہا۔ میں نے کپڑے اُتار کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیئے اور دروازہ بند کر دیا۔ باتھ رُوم میں بھی ایک صاف ستھرا تولیہ ٹنگا ہوا تھا۔ میں نے اپنا جسم خشک کیا اور کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔ سیتا لباس پہن چکی تھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔ میں اُس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ سے کنگھا لیا اور اپنے بال سنوارنے کے بعد کنگھا اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ آئینے میں مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ میرے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے اُسے نہیں بتایا کہ اس آئینے میں کیسا ہوشربا منظر دیکھ چکا ہوں۔

''ویٹر کو بلا کر چائے کے لئے کہہ دو! اب طلب ہو رہی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ میں نے ویٹر کو بلانے کے لئے کال بیل کا بٹن دبا دیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ چند منٹ بعد ویٹر دروازے میں نمودار ہوا۔ میں نے اُسے چائے لانے کے لئے کہہ دیا اور ہم دونوں اُٹھ کر

بالکونی میں بیٹھ گئے۔

باہر لان میں اب کچھ رونق نظر آ رہی تھی۔ کئی میزوں پر لوگ بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ سب جوڑے ہی تھے۔ کوئی مرد اکیلا یا کوئی عورت اکیلی نہیں تھی۔ لان کے دوسری طرف بار بی کیو سٹینڈ کے چولہوں میں بھی کوئلے دہکنے لگے تھے اور تین آدمی کام میں مصروف تھے۔ تینوں نے میرون رنگ کے ایپرن باندھ رکھے تھے۔ دو کے سروں پر بٹلرز والی اُونچی سفید ٹوپیاں تھیں۔

کچھ دیر بعد ویٹر چائے لے آیا۔ اُس کیجانے کے بعد میں نے دوسرا دروازہ بند کر دیا۔ اس دوران سیتا نے کمرے سے چھوٹی ٹیبل اُٹھا کر گیلری میں رکھ لی اور چائے پیالیوں میں اُنڈیلنے لگی۔

شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ موسم بھی خوشگوار ہوتا جا رہا تھا۔ صحرائی علاقوں کی یہی ایک انفرادیت تو ہوتی ہے۔ دن کے وقت جھلسا دینے والی گرمی اور شام ڈھلتے ہی ٹھنڈ کا احساس ہونے لگتا ہے۔

ہم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سامنے دیکھتے رہے۔ رونق بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ باہر سے آنے والے کچھ لوگ لان کا رُخ کرنے کی بجائے اندر ہال کی طرف جا رہے تھے۔

سورج غروب ہوتے ہی لان میں برقی قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ فضا چکن تکوں اور کوئلوں پر تیار ہونے والے دیگر فاسٹ فوڈز کی اشتہا آمیز خوشبو سے مہک اُٹھی۔

لان میں اتنے گاہکوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ یہاں قیام پذیر لوگ تو کم تھے زیادہ تعداد باہر سے آنے والوں کی تھی۔ شاید یہ گیسٹ ہاؤس کسی خاص وجہ سے شہر میں شہرت رکھتا تھا۔

نو بجے کے قریب تو کسی میز پر کوئی خالی سیٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم دونوں بالکونی میں جا بیٹھے اور اس رونق کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے رہے۔ اور پھر دس بجے کے قریب ہم بھی کمرے سے نکل کر نیچے آ گئے۔ نیچے والا ہال بھی گاہکوں سے بھرا ہوا تھا اور ایک دلچسپ انکشاف یہ ہوا کہ گیسٹ ہاؤس کے عقبی لان میں گھاس پھوس کے گول جھونپڑوں کی طرح کیبن بنے ہوئے تھے جو صرف کپلز کے لئے مخصوص تھے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو اس طرف بھی آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ انکشاف تو بعد میں ہوا کہ وہ جھونپڑا نما کیبن گاہکوں کی عیاشی کے لئے بنائے گئے تھے۔ یوں تو بھارت میں شراب عام تھی۔ ہر جگہ پی جا سکتی تھی مگر بعض ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز نے کچھ اصول بنا رکھے تھے۔ مثلاً اس گیسٹ ہاؤس کے ہال اور لان میں شراب نوشی ممنوع تھی۔ مگر پیچھے کی طرف جھونپڑا نما کیبنوں میں شراب سرو کی جا رہی تھی۔

ہال میں ایک دو سیٹیں اگرچہ خالی تھیں مگر سیتا کا رُخ باہر کی طرف تھا۔ میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور برآمدے سے نکل کر ہم لان کے کنارے پر رُک گئے اور تجسّس بھری نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ لان میں تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ لیکن تقریباً اُس وقت

کونے کی میز سے ایک عورت اور دو آدمی اُٹھتے ہوئے نظر آئے۔ سیتا مجھے اشارہ کرتی ہوئی اُس طرف بڑھ گئی اور اس سے پہلے کہ کوئی اور اس طرف آتا ہم نے اُس میز پر قبضہ کرلیا۔

تھوڑی دیر بعد ویٹر مینو کارڈ لے کر آ گیا اور تب مجھے پتہ چلا کہ ہرن کے کباب اس گیسٹ ہاؤس کی اسپیشل ڈش تھی۔ ہرن راجستھان میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ لیکن بیشتر علاقوں میں اس کے شکار پر پابندی ہے اس کے باوجود غیر قانونی طور پر اس کا شکار ہوتا ہے۔ ہنومان گڑھ میں دو تین ریسٹورنٹ ایسے تھے جہاں ہرن کا گوشت پکتا تھا۔ لیکن ان ریستورانوں پر بھی آئے دن چھاپے پڑتے رہتے تھے اور بھاری جرمانے کئے جاتے تھے۔

اس گیسٹ ہاؤس کی مالکہ الکا ہوتری بیوہ عورت تھی۔ اُس کا شوہر نٹور سنگھ جب زندہ تھا تو اُس نے خوب ہاتھ پیر پھیلائے تھے۔ الکا ہوتری بھی اُن دنوں جوان تھی۔ وہ اپنی جوانی میں یقیناً قیامت رہی ہوگی۔ نٹور سنگھ نے بیوی کے حسن و شباب سے خوب فائدہ اُٹھایا تھا۔ یہ شاندار گیسٹ ہاؤس اور اس کے اطراف میں لمبی چوڑی زمین جوانی میں بڑے لوگوں سے تعلقات ہی کی مرہون منت تھی۔

نٹور سنگھ کو مرے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ الکا ہوتری نے کبھی ہندو عورتوں کی طرح سفید ساڑھی نہیں پہنی تھی۔ وہ بیوگی کا لباس پہن کر زندگی کی خوشیوں اور نعمتوں سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اُس نے اپنے اور مرحوم شوہر کے دوستوں سے تعلقات جاری رکھے۔ آج اگرچہ اُس کی عمر ڈھل رہی تھی لیکن اب بھی اُس میں بڑا دم خم تھا۔ اور یہ اُس کے تعلقات ہی کا نتیجہ تھا کہ اُس کے گیسٹ ہاؤس میں دھڑلے سے ہرن کے گوشت سے لذیذ کباب تیار ہوتے تھے اور اُسے کبھی کسی پوچھ تاچھ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہرن کے گوشت ہی کی وجہ سے یہاں گاہکوں کا رش رہتا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ یہاں ہرن ہی نہیں پچھلے جھونپڑا نما کیبنوں میں نسوانی گوشت کی بھی تجارت ہوتی تھی۔ یہ گیسٹ ہاؤس عیاشی کا اڈہ تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ بہت سے مرد سیتا کو گھور رہے تھے۔ بعض آدمیوں کا انداز تو ایسا تھا جیسے وہ اُسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائیں گے۔

اسی دوران ویٹر نے قریب آ کر سیتا کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ چونک سی گئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ویٹر چلا گیا۔ سیتا کی آنکھوں میں اور چہرے پر تشویش کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ کھانا ختم کر کے وہ اُٹھ گئی۔

''تم بیٹھو! میں ابھی آتی ہوں۔''

''کوئی خاص بات؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا لیکن وہ جواب دیئے بغیر اُٹھ کر ایک طرف چلی گئی۔

میں اکیلا بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ویٹر برتن اُٹھا کر لے گیا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ایک عورت کسی میز سے اُٹھ کر میری طرف آ گئی اور بے تکلفی سے سیتا والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ہیلو!'' اُس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''وہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئی..... یہ کال گرلز ہوتی ہی ایسی ہیں۔ بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ میرے ساتھ چلو! خوش کر دُوں گی۔ اور تمہاری جیب پر زیادہ بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔''

''تم یہاں سے اپنی مرضی سے اُٹھ جاؤ گی یا مجھے کچھ کرنا پڑے گا؟'' میں نے کھا جانے والی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

وہ گڑبڑا سی گئی۔ اُسے شاید مجھ سے ایسے ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔ لیکن بہرحال اُس نے وہاں سے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

سیتا کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر اب بھی تشویش نمایاں تھی۔

''کہاں غائب ہوگئی تھیں؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ایک پرانا جاننے والا مل گیا تھا..... اُس طرف کھڑی اُس سے باتیں کر رہی تھی۔'' اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔

''یہاں تمہارا جاننے والا؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں جے پور کی رہنے والی ہوں جو یہاں سے صرف چار سو کلومیٹر ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ راجستھان ہے اور اس خطے کا ہر شہر ایک تاریخی مقام رکھتا ہے۔ کالج کے زمانے میں، میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتی رہتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کئی سال پہلے جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آئی تھی تو مان سنگھ کے گھر پر ہی قیام کیا تھا۔ اب اُس نے مجھے دیکھ لیا اور ویٹر کو پیغام بھیج کر مجھے بلا لیا۔''

''وہ یہاں کیوں نہیں آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہاری وجہ سے۔'' اُس نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ سمجھا تھا کہ تم میرے پتی ہو۔ ہوسکتا ہے ناراض ہو جاؤ۔ اس لئے وہ یہاں نہیں آیا۔''

میں نے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہوسکتا ہے وہی بات ہو جو وہ کہہ رہی تھی۔ اس کے بعد ہم زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھے۔ سیتا نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں آتے ہی سیتا بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ میں بالکونی میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور لان کی رونق کو دیکھتا رہا۔

بارہ بجے کے قریب میں اندر آ گیا۔ سیتا لیٹی ہوئی سامنے دیوار کو گھور رہی تھی۔ میں خاموش بیٹھا اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ باہر جانے سے پہلے تو وہ بہت چہک رہی تھی لیکن اُس اجنبی سے ملاقات کے بعد وہ ایک دم خاموش سی ہوگئی تھی۔ میں نے سیتا سے پوچھنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ٹال گئی اور موضوع بدل کر بات کرنے لگی۔

ایک بج رہا تھا۔ باہر سے آنے والی آوازیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔ مجھے نیند آنے لگی۔ میں نے

بالکونی والا دروازہ بند کر دیا اور تیز روشنی والا بلب بجھا کر نائٹ بلب جلا دیا اور صوفے پر لیٹ گیا۔ سیتا بھی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگی اور پھر میری بھی آنکھ لگ گئی۔

کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی..... میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سیتا بیڈ پر نہیں تھی۔ میں نے باتھ رُوم کی طرف دیکھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا مگر اندر کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ گیلری والا دروازہ بھی بند تھا۔ میں نے ہولے سے سیتا کا نام لے کر پکارا اور اُٹھ کر باتھ رُوم میں بھی جھانک لیا۔ میں نے باہر والے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اُسے کھولنا چاہا تو دروازہ نہیں کھلا۔ باہر سے کنڈا لگا ہوا تھا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی..... ذہن میں طرح طرح کے وسوسے سر اُبھارنے لگے۔ میں صوفے پر آ کر بیٹھ گیا اور سیتا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کہاں چلی گئی تھی؟ میرے ذہن میں بار بار اُس پراسرار اجنبی کا خیال اُبھر رہا تھا۔ اُس سے ملاقات کے بعد ہی وہ کچھ پریشان سی دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ پراسرار ملاقاتی کون تھا؟ میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ کیا سیتا مجھے دھوکے میں رکھ کر اُسی سے ملنے گئی تھی؟

شہر کی کسی عمارت پر لگے ہوئے گھڑیال نے تین بجے کا اعلان کیا۔ میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ ذہن میں ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ سیتا مجھے کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش تو نہیں کر رہی؟ لیکن میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر مجھے پھنسانا ہوتا تو وہ بہت پہلے ایسا کوئی قدم اُٹھا چکی ہوتی۔

ہلکا سا کھٹکا سن کر میں ایک بار پھر چونک گیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ باہر سے کوئی بہت احتیاط سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جلدی سے صوفے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دروازہ کھلنے اور پھر آہستگی سے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک آنکھ میں بہت معمولی سی جھری پیدا کر کے دیکھا وہ سیتا تھی جو دروازہ بند کر کے دبے قدموں آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس کی نظریں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔ قریب پہنچی تو میں نے وہ آنکھ بھی پوری طرح بند کر لی۔ سیتا ایک لمحے کو میرے قریب رُکی اور پھر بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں نے ایک بار پھر آنکھ میں جھری پیدا کر کے دیکھا۔ وہ دوسری طرف کروٹ لئے لیٹی تھی۔

سیتا تو شاید تھوڑی دیر بعد سو گئی تھی لیکن مجھے دیر تک نیند نہیں آ سکی۔ میرا ذہن بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ میں یہی سوچتا رہا کہ سیتا رات کے آخری پہر چوری چھپے کہاں گئی تھی؟ اور پھر یہی سوچتے ہوئے میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ سیتا اُس وقت بھی کمرے میں نہیں تھی۔ وہ باتھ رُوم میں بھی نہیں تھی۔ میں نے اُٹھ کر باہر والے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو اس مرتبہ وہ آسانی سے کھل گیا۔ میں نے باہر جھانکا تو راہداری کے اختتام پر زینے کے قریب کچھ لوگ کھڑے

تھے۔ اُن میں سیتا بھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے اس طرف آ گئی اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

''اس وقت آٹھ بج رہے ہیں اور رات کو تم نے کہا تھا کہ ہمیں دس بجے والی ٹرین سے جانا ہے۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب شاید ہم دس بجے والی ٹرین سے نہ جا سکیں۔ دو بجے والی ٹرین پکڑنی ہو گی۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''کیوں.....؟ پروگرام میں یہ تبدیلی کیوں؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''گیسٹ ہاؤس میں ایک قتل ہو گیا ہے۔'' سیتا نے بتایا۔ ''نیچے پولیس آئی ہوئی ہے۔ اُنہوں نے گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر تمام مہمانوں کو روک لیا ہے۔ کوئی اجازت کے بغیر باہر نہیں جا سکتا۔''

''اوہ.....!'' میں اُچھل پڑا۔ ''کون قتل ہوا ہے..... کیسے؟ میرا مطلب ہے کچھ معلوم ہوا؟''

''گیسٹ ہاؤس کے پچھلی طرف ایک جھونپڑا نما کیبن میں ایک آدمی کی لاش ملی ہے۔ اُسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔'' سیتا نے بتایا۔ ''لاش کا انکشاف صبح ساڑھے چھ بجے اُس وقت ہوا جب گیسٹ ہاؤس کا صفائی کرنے والا ملازم کیبنوں کی صفائی کر رہا تھا۔ اُس کیبن میں اُس شخص کو پڑے دیکھ کر پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ شاید کوئی گاہک نشے میں دھت پڑا ہوا ہے۔ لیکن جب اُسے ہلایا جلایا گیا تو پتہ چلا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ فوری طور پر پولیس کو اطلاع دی گئی اور پولیس نے یہ انکشاف کیا کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اُس کے گلے پر ایسے نشان صاف نظر آ رہے تھے جیسے رسّی لپیٹی گئی ہو۔ پولیس نے پوچھ گچھ کے لئے تمام مہمانوں کو روک لیا ہے۔ اس لئے ہم دس بجے والی ٹرین سے نہیں جا سکتے۔''

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور میں گہری نظروں سے سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ سیتا رات کے پچھلے پہر چوری چھپے کمرے سے باہر گئی تھی۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے سوال اُبھر رہے تھے۔ کیا سیتا اس پراسرار اجنبی سے ملنے گئی تھی؟ کیا وہ لاش اُس اجنبی کی تھی اور کیا سیتا نے اُسے قتل کیا تھا؟

''میری طرف اس طرح گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟'' سیتا مجھے اس طرح گھورتے پا کر گڑبڑا سی گئی۔

''اوہ..... کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لگتا ہے یہاں ہمارے لئے کچھ اُلجھن پیدا ہو گئی ہے۔''

''کچھ نہیں ہو گا۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''پولیس بھی جانتی ہے کہ قاتل گیسٹ ہاؤس کے مہمانوں میں سے نہیں ہو سکتا۔ وہ محض خانہ پری کے لئے معمول کے مطابق کچھ سوالات کریں

گے اور بس.....''

اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ ناشتہ ہم نے کمرے ہی میں منگوالیا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم بالکونی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ساڑھے نو بجے کے قریب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ سیتا نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

ایک سب انسپکٹر تھا اور اُس کے ساتھ گیسٹ ہاؤس کی مالکہ الکا ہوتری جو خاصی پریشان لگ رہی تھی۔

سب انسپکٹر پندرہ بیس منٹ تک ہم سے مختلف سوالات پوچھتا رہا جن کے جواب زیادہ تر سیتا ہی نے دیئے تھے۔ اُس نے مجھے بہت کم بولنے کا موقع دیا تھا۔

''ٹھیک ہے مسز پریم کمار!'' سب انسپکٹر نے سیتا ہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگوں کو جو زحمت ہوئی اس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں۔ آپ لوگ چاہیں تو گیسٹ ہاؤس سے جا سکتے ہیں۔''

''ہمیں تو دس بجے کی ٹرین سے بیکانیر جانا تھا۔ مگر اس ٹرین کا وقت تو نکل گیا۔ اب دو بجے والی گاڑی ہی پکڑیں گے۔'' سیتا نے کہا۔

سب انسپکٹر نے ایک بار پھر معذرت کی اور الکا ہوتری کو اشارہ کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

دن کا باقی حصہ ہم نے کمرے ہی میں گزارا۔ گیارہ بجے کے قریب پولیس چلی گئی تھی۔ ایک بجے ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا اور سیتا نے کاؤنٹر پر جا کر حساب چکایا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم گیسٹ ہاؤس سے رخصت ہو گئے۔

بہت سست رفتار ٹرین تھی۔ شام سے ذرا پہلے ہم بیکانیر پہنچ گئے۔ یہ ہنومان گڑھ سے بڑا اور زیادہ قدیم شہر تھا۔ یہاں بھی ہم نے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر رجسٹر کی خانہ پری سیتا ہی نے کی۔ یہاں بھی اُس نے میرا نام پریم کمار اور اپنے آپ کو مسز پریم کمار لکھا تھا۔

ریگستان میں ٹرین پر چند گھنٹوں کے اس سفر نے مجھے زیادہ تھکا دیا تھا۔ سیتا کے چہرے پر بھی تھکن کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ ہنومان گڑھ میں تو ہم رات کو کمرے سے نکل کر لان میں آ گئے تھے لیکن یہاں ہم کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ رات کا کھانا بھی کمرے ہی میں منگوا کر کھایا تھا۔

صبح سات بجے ناشتہ کر کے ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ ایک بار پھر ٹرین کا سفر درپیش ہو گا۔ لیکن سیتا نے بتایا کہ بیکانیر سے جیسلمیر کی طرف ریلوے لائن نہیں تھی۔ البتہ پوکھران سے ٹرین مل سکتی تھی۔ بیکانیر سے پوکھران تک کا سفر بس میں کرنا پڑے گا۔

بس کا یہ سفر بے حد اذیت ناک ثابت ہوا تھا۔ ایک تو بس کھٹارہ ٹائپ کی تھی اس پر مسافر بھیڑ بکریوں کی طرح بھر لئے گئے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ چاروں طرف تپتا ہوا ریگستان۔

گرمی کی شدت سے دم گھٹا جا رہا تھا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنے آپ کو سبزے ہی میں گھرے ہوئے پایا تھا۔ کشمیر کی وادی تو واقعی جنت کا ٹکڑا تھی۔ اور مجھے لگتا تھا جیسے میں اُس جنت سے نکل کر جہنم میں آ گیا ہوں۔ اوپر آگ برساتا ہوا آسمان اور نیچے چاروں طرف تپتا ہوا صحرا۔ راستے میں کہیں کہیں پانی دستیاب تھا۔ وہاں آبادی بھی تھی اور تھوڑا بہت سبزہ بھی۔ ایسی جگہوں پر ناریل کے درخت دُور ہی سے نظر آ جاتے تھے۔

بس گنج نیر، کولیات، پالوری اور رام ڈیوڑھا سے ہوتی ہوئی بالآخر دوپہر کے قریب پوکھران پہنچ گئی۔ بڑی شدت کی گرمی تھی۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی اور دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ آگے تقریباً ایک سو پندرہ کلومیٹر کا سفر باقی تھا۔ یہاں سے شام کے وقت ٹرین بھی مل سکتی تھی لیکن شاید سیتا میں بھی سفر جاری رکھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس لئے ہم ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ کر ایک ہوٹل میں پہنچ گئے۔ یہاں ہمیں ایئر کنڈیشنڈ کمرہ مل گیا۔

ہم دن بھر کمرے میں بند رہے۔ باہر گرمی اس شدت کی تھی کہ کمرے سے نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ رات کا کھانا بھی سیتا نے کمرے ہی میں منگوالیا تھا۔ وہ باہر نکلنے سے گریز کر رہی تھی۔ اُس کے بارے میں میرے ذہن میں جنم لینے والے شبہات بڑھتے جا رہے تھے۔ ہنومان گڑھ میں اُس پراسرار اجنبی سے ملاقات اور اُسی رات اُس کے قتل کے بعد سیتا کو چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ مسلسل کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ پوچھنا چاہا تھا کہ وہ گیسٹ ہاؤس میں رات کے آخری پہر چوری چھپے کمرے سے نکل کر کہاں گئی تھی لیکن کوشش کے باوجود میں دل کی بات زبان پر نہیں لا سکا تھا۔

صبح ہم دیر تک سوتے رہے۔ ناشتے کے بعد سیتا مجھے کمرے ہی میں چھوڑ کر چلی گئی۔ اُس کی واپسی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔

''بس اسٹینڈ تک گئی تھی۔'' اُس نے خود ہی بتایا۔ ''آگے تقریباً سوا سو کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ریل میں ایئر کنڈیشنڈ پارلر میں یہاں سے سیٹ ملنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ چار بجے والی ایئر کنڈیشنڈ میں سیٹیں مل گئی ہیں۔ ہم سات بجے تک جیسلمیر پہنچ جائیں گے۔ اس وقت وہاں کا موسم بھی کسی قدر خوشگوار ہو گا۔''

''ہم موسم کی شدت سے بچنے کے لئے زندگی بھر تو ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں نہیں دبکے رہیں گے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''جیسلمیر۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر تم نے تو بتایا تھا کہ تم جے پور کی رہنے والی ہو۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم جیسلمیر کہاں ہے اور جے پور کہاں ہے۔ لیکن.....''

''جے پور، جیسلمیر سے تقریباً ساڑھے چھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔'' اُس نے میری

بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پہلے جیسلمیر۔ وہاں پہنچ کر میں بتا دُوں گی کہ تمہیں یہاں کیوں لائی ہوں۔''

''تم اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی ہو۔ میں کل رات سے پریشان ہوں۔ ذہن بری طرح اُلجھا ہوا ہے۔'' میں نے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں..... کیا بات ہے؟'' اُس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''رات کے پچھلے پہر تم چوری چھپے کمرے سے نکل کر کہاں گئی تھیں؟'' یہ سوال غیر ارادی طور پر میری زبان سے نکل گیا۔

وہ اس طرح اُچھل پڑی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اُس کا چہرہ بھی ایک دم دُھواں ہو گیا لیکن اُس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

''تمہیں مجھ پر کوئی شبہ ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''رات کے کھانے کے بعد تم سے ملاقات کرنے والا وہ اجنبی کون تھا اور اُس آدمی کی موت سے تمہارا کیا تعلق ہے جس کی لاش گیسٹ ہاؤس کے پیچھے ہٹ میں پائی گئی تھی؟'' میں نے کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''اوہ.....'' سیتا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ''تو تم اس وقت جاگ رہے تھے جب میں کمرے سے باہر گئی تھی اور تمہیں شبہ ہے کہ اُس آدمی کو میں نے قتل کیا ہے؟''

''تم اس کی وضاحت کر دو تو شاید میری اُلجھن رفع ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے..... میں اس کی وضاحت کر دُوں گی لیکن ابھی نہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''لیکن بہتر ہو گا کہ میرے بارے میں اپنے ذہن سے شبہات نکال دو۔ اور میں تمہیں یہاں کیوں لائی ہوں اس کے بارے میں بھی بتا دُوں گی۔ لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم سوچ رہے ہو کہ میں تمہیں تمہارے محاذ سے بہت دُور لے آئی ہوں۔ مگر ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''تم یہاں رہ کر اپنی قوم کی وہ خدمت کر سکو گے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس وقت تم اس کے بارے میں کچھ مت پوچھنا۔ وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتا دُوں گی۔''

اس کے بعد میں نے واقعی کوئی سوال نہیں کی۔ سیتا نے اُس وقت وہی ساڑھی پہن رکھی تھی جو گزشتہ شام کو ہنومان گڑھ آنے کے بعد پہنی تھی۔ اُس نے پہلے ساڑھی کا پلو گرایا پھر خالی کھول کر ساڑھی اپنے جسم سے الگ کر کے ایک کرسی پر ڈال دی اور بیڈ پر پشت کے بل لیٹ گئی۔ اُس کے جسم پر مختصر سا بلاؤز اور پیٹی کوٹ تھا۔ اُس کا سینہ کھڑی کمان کا منظر پیش کر رہا تھا۔

''آؤ..... تم بھی تھوڑی دیر آرام کر لو!'' سیتا نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور سرک کر ایک طرف ہو گئی۔ لیکن میں صوفے پر بیٹھا رہا۔ سیتا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو

گئی۔ وہ کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی اور پھر سو گئی۔ اور میں کرسی پر بیٹھا اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ نجانے کیا بات تھی کہ میرا شبہ قوی تر ہوتا جا رہا تھا کہ ہنومان گڑھ والے گیسٹ ہاؤس کے پیچھے ہٹ میں ہونے والے قتل میں سیتا ہی کا ہاتھ تھا اور مقتول اجنبی تھا جس نے ویٹر کے ذریعہ پیغام بھیج کر سیتا کو الگ بلوایا تھا۔ میں جیسے جیسے سوچتا گیا میرا ذہن اُلجھتا گیا۔ اور پھر میں بھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔

○

وہ شاندار ایئر کنڈیشنڈ بس محکمہ سیاحت کی تھی جو ٹھیک چار بجے روانہ ہو گئی۔ سیٹیں دو دو مسافروں کے لئے اور کافی کشادہ تھیں۔ مجھے اور سیتا کو جو سیٹ ملی وہ آگے سے دوسرے نمبر پر تھی۔ اس طرح ہم نہ صرف شفاف ونڈ سکرین سے سامنے بلکہ دائیں بائیں کھڑکیوں کے براؤن شیشوں سے بھی باہر دیکھ سکتے تھے۔

بس میں سفر کرنے والے سب ہی لوگ سیاح تھے۔ اُن میں ہندوستانی بھی تھے اور دس بارہ یورپین بھی۔ جن میں آدھی عورتیں اور آدھے مرد تھے۔ بس میں محکمہ سیاحت کی ایک گائیڈ بھی تھی۔ اُس جوان اور خوبصورت لڑکی نے گلابی ساڑھی پہن رکھی تھی جس پر محکمہ سیاحت کا بیج لگا ہوا تھا۔ بس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ گائیڈ مسافروں کو راستے میں آنے والے مختلف مقامات کے بارے میں بتاتی جا رہی تھی۔

ساڑھے پانچ بجے کے قریب بس چندن نامی ایک قصبے میں رُک گئی۔ بس جس جگہ رُکی تھی وہاں سامنے ہی ایک بہت بڑا جین مندر نظر آ رہا تھا اور گائیڈ بس میں بیٹھے بیٹھے ہی مسافروں کو اُس مندر کے بارے میں بتا رہی تھی۔ شاید مندر کی سیر کا پروگرام اس ٹور میں شامل نہیں تھا۔ اس دوران مسافروں کی ٹھنڈے مشروبات سے تواضع بھی کی جا رہی تھی۔

پندرہ منٹ رُکنے کے بعد بس آگے روانہ ہو گئی۔ اب جیسلمیر صرف پینتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ لیکن بس کی رفتار مقررہ حد سے زیادہ نہیں بڑھائی گئی۔ راستے میں دو اور چھوٹی بستیوں میں بھی بس کو چند منٹ کے لئے روکا گیا تھا۔ اس طرح تقریباً سوا گھنٹے بعد بس جیسلمیر کے نواح میں پہنچ گئی۔

اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ میں سامنے پہاڑی پر ایک بہت بڑے حصے کو سونے کی طرح چمکتے دیکھ کر چونک گیا۔ لگتا تھا جیسے پہاڑی کا وہ حصہ پتھروں کا نہیں سونے کا ہو۔ میں سیتا سے اُس کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ خوبصورت گائیڈ کی سریلی آواز سنائی دی۔ وہ مسافروں کو رخصت ہوتی روپہلی دُھوپ میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے اس پہاڑ کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''ہم تاریخی شہر جیسلمیر کے نواح میں پہنچ رہے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے دُھوپ میں سونے کی طرح دمکتی ہوئی کوئی چٹان نہیں بلکہ جیسلمیر کا پیلے پتھروں سے بنا ہوا قلعہ ہے۔ دو سو پچاس

فٹ اُونچی تکونی پہاڑی پر اس قلعے کی بنیاد راجہ راول جیسل نے رکھی تھی۔ اس کی تعمیر میں پیلا پتھر استعمال کیا گیا اور یہ سات سال کی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔''

وہ خوبصورت گائیڈز کے بغیر رٹے رٹائے الفاظ بڑی روانی سے بولے جا رہی تھی۔

''اس قلعے کے نناوے برج ہیں اور جنگی اعتبار سے اسے اُس زمانے میں بہت مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دوہری فصیلیں تقریباً تیس فٹ بلند ہیں۔ قلعہ کے چار دروازے ہیں۔ راجہ جیسل اس قلعہ کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اگرچہ صرف چار سال ہی زندہ رہا لیکن بعد میں آنے والے راجے اس قلعہ کی شان و شوکت میں اضافہ کرتے رہے۔ قلعے کے اندر آٹھ جین مندر ہیں جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ان مندروں کی تعمیر تقریباً سو سال میں مکمل ہوئی اور ان کی تعمیر میں بھی پیلا پتھر استعمال کیا گیا۔ ان کے اندر پتھروں سے تراشی ہوئی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اس قلعے کے اندر ہندوؤں کے بھی کئی مندر ہیں جن میں لکشمی ناتھ مندر سب سے بڑا ہے۔ مہاراجہ راول جیسل کے بعد آنے والے راجے اس قلعے میں اپنے خوبصورت محلات بھی تعمیر کرواتے رہے۔ یوں تو ہر عمارت قابل دید ہے مگر موتی محل، رنگ محل اور گنج ویلاز سب سے زیادہ خوبصورت ہیں.....''

گائیڈ اس قلعے کے بارے میں بتاتی رہی۔ بس اب شہری حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ میں سڑک کے دونوں طرف خوبصورت اور تاریخی عمارتوں کو دیکھنے لگا۔ اور اب سیتا میری طرف جھکی اس شہر کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''اس شہر کی بنیاد تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال پہلے راجہ راول جیسل نے رکھی تھی اور یہ شہر اُس کے نام سے منسوب ہو گیا۔ راجہ جیسل کے خاندان نے آٹھ سو سال تک یہاں حکومت کی۔ 1947ء میں ہندوستان کے بٹوارے کے بعد ہندوستان کی تمام ریاستوں کے ساتھ ریاست جیسلمیر کی سرکاری حیثیت بھی ختم کر دی گئی..... گنجان آبادی والے اس شہر کو گولڈن سٹی بھی کہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شہر کے چاروں طرف سنہری ریت کے ٹیلے ہیں جو تیز ہوا کی وجہ سے اپنی جگہ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

جیسلمیر کی اپنی تاریخی اہمیت تھی۔ یہ ایسی گزرگاہ پر واقع تھی جہاں سے قدیم وسط ہند، گجرات، مہاراشٹر اور سندھ کی طرف جانے والے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ ان تجارتی قافلوں سے دیگر محصولات اور چنگی کی مد میں یہاں کے حکمرانوں کو بڑی آمدنی ہوتی تھی جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ بھی خوشحال تھے۔ نہ صرف ہر راجہ نے قلعہ بند شہر کے اندر خوبصورت محلات تعمیر کروائے بلکہ بڑے بڑے تاجروں نے بھی سنہری پتھروں سے خوبصورت حویلیاں تعمیر کروائیں۔ مگر بمبئی کی بندرگاہ تعمیر ہونے کے بعد تجارتی قافلوں نے اپنا رُخ بدل لیا جس سے نہ صرف ریاست کی آمدنی بلکہ اس کی اہمیت بھی کم ہو گئی۔ یہاں تمہیں ہر قدیم عمارت میں سنگ تراشی کا بڑا نفیس اور خوبصورت کام نظر آئے گا۔ لیکن بمبئی کی بندرگاہ تعمیر ہونے کے بعد وہاں

روزگار کا سلسلہ پیدا ہوا تو سنگتراشی کے ماہر کاریگر سلاوٹ یہاں سے ہجرت کر کے سندھ کا رُخ کرنے لگے۔ لیکن آج بھی یہاں سنگتراشی کے کام کو شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔''

''ایک کام کرو!'' میں اُس کے خاموش ہونے پر جلدی سے بول پڑا۔ ''اس گائیڈ کو میرے پاس بھیج دو اور تم اُس کی جگہ کھڑی ہو کر بس کے مسافروں کو اس تاریخی شہر کے بارے میں بتاتی رہو۔ تمہیں تو محکمہ سیاحت میں گائیڈ ہونا چاہئے تھا۔''

''میں ان گائیڈز سے زیادہ جانتی ہوں۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''راجستھان قدیم تاریخی قلعوں، محلات اور حویلیوں کی سرزمین ہے۔ میں تمہیں اس خطے کی تاریخ کے علاوہ ایک ایک عمارت کے بارے میں بتا سکتی ہوں کہ وہ کب اور کس نے بنوائی تھیں۔ مثلاً جیسلمیر میں بڑا باغ، قلعہ، گدیسر ٹینک، جین مندر، پتوؤں کی حویلی، رام ڈیوڑھا، ویاس چھتریاں، سالم سنگلا کی حویلی، مندر محل، جواہر نواس جن پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روپہلی کرنیں پڑتی ہیں تو یہ سونے کی طرح چمک اُٹھتے ہیں اور.....''

''بس بس.....'' میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''کچھ بعد میں بتانے کے لئے بھی رہنے دو۔''

سیتا مسکرا کر رہ گئی۔

بس شہر کے مختلف بارونق علاقوں سے گزرتی ہوئی پیلس ہوٹل کے سامنے رُک گئی۔ اُس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کا اندھیرا پر پھیلانے لگا تھا۔ مگر شہر کی بتیاں بھی جگمگا اُٹھی تھیں جن کی روشنیاں پھیلتے ہوئے اندھیرے سے دست و گریباں ہو رہی تھیں۔

بس سے اُترتے ہی سیتا نے ایک آٹو رکشہ روک لیا اور اندر بیٹھنے کے بعد ڈرائیور کو علاقے کا جو نام بتایا وہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔

رکشہ شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑتا ہوا مشرق میں نواحی علاقے کی طرف نکل آیا۔ یہاں آبادی چھدری تھی۔ حویلی نما عمارتیں ایک دوسرے سے فاصلے پر تھیں۔ سیتا نے ایک عمارت کے سامنے رکشہ رُکوا لیا اور نیچے اُتر کر ڈرائیور کو کرایہ ادا کرنے لگی۔ میں بھی بیگ سنبھال کر اُتر گیا۔ میرا خیال تھا کہ سیتا یہاں بھی کسی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس ہی میں قیام کرے گی۔ لیکن اس حویلی کو دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ گیٹ پر کال بیل کا بٹن دبانے کے دو تین منٹ بعد گیٹ کا ذیلی دروازہ کھل گیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

وہ ادھیڑ عمر آدمی راجستھانی لباس میں تھا۔ سر پر مخصوص انداز میں بندھی ہوئی میرون رنگ کی پگڑی بھی اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ اُس کا تعلق کسی راجپوت خاندان سے ہے۔

اندر اندھیرا تھا جس کی وجہ سے نہ تو ہم اُس کی شکل اچھی طرح دیکھ سکے تھے اور نہ ہی وہ ہمیں ٹھیک سے دیکھ پایا تھا۔ البتہ ہمیں دیوانہ وار اندر گھستے دیکھ کر وہ کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔

''کون ہو بھایا..... ایسے اندر کیوں گھسے آوت ہو؟''

''میں ہوں چتون سنگھ! سیتا۔'' سیتا نے کہا۔ ''یہاں اور کون ہے؟'' سیتا نے پوچھا۔

''اوہ سیتا دیوی.....؟'' چتون سنگھ نامی وہ آدمی چونک سا گیا۔ ''یہاں کوئی نا ہیں ہے۔ آؤ..... ادھر کو آ جاؤ..... آؤ آؤ!'' اُس نے میرے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔

برآمدہ بھی تاریک تھا۔ ہم چتون سنگھ کے پیچھے اندر داخل ہوئے تو صرف ایک کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ چتون سنگھ نے وسطی کمرے میں رُک کر بتی جلا دی اور بیگ ایک طرف رکھ کر کندھے پر پڑا ہوا اجرک نما کپڑا اُتار کر فرنیچر جھاڑنے لگا۔ حالانکہ فرنیچر صاف ہی تھا۔

''بیٹھو..... بیٹھو سیتا دیوی!..... آپ بھی بیٹھو!'' اُس نے ہم دونوں کو اشارہ کیا۔

چتون سنگھ کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبا قد، گھٹا ہوا جسم اور بڑی بڑی گچھے دار مونچھیں۔ راجستھانی لباس میں وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔

''کوئی جل پان سیتا دیوی؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے سیتا کی طرف دیکھا۔

''ہاں چتون سنگھ! ہم چائے پئیں گے۔ اور اس کے بعد بھوجن بھی کریں گے۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم چائے بنا دو..... کھانا بازار سے لے آنا۔''

''جی سیتا دیوی۔'' چتون سنگھ کہتے ہوئے ایک طرف غائب ہوگیا۔

''یہ کس کی حویلی ہے؟'' چتون سنگھ کے جانے کے بعد میں نے سیتا سے پوچھا۔

''ہماری ہے.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''راجپوتانہ کے مہاراجوں کو آبادی اور بربادی کا بہت شوق تھا۔ وہ آپس میں بڑی بڑی جنگیں لڑتے اور جو وقت بچتا وہ قلعوں، محلات اور حویلیوں کی تعمیر پر صرف کر دیتے۔ جتنی دولت ان راجوں نے عمارتوں کی تعمیر پر خرچ کی ہے وہ اگر فلاح و بہبود پر خرچ کی جاتی تو آج راجستھان میں کوئی ریگستان دکھائی نہ دیتا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہوتا۔ لیکن اس طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ پہلے یہ لوگ انسانوں کی جنگیں لڑا کرتے تھے۔ آج کل کتے لڑایا کرتے ہیں۔ یہی ان کا شوق رہ گیا ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میرے پتا جی کا تعلق بھی ایک ایسے ہی خاندان سے ہے جس نے راجستھان کی ایک ریاست پر صدیوں حکمرانی کی ہے۔ اس خاندان کو بھی عمارتیں سنوانے کا شوق تھا۔ جے پور، اودھے پور، جیسلمیر اور راجستھان کے بڑے بڑے شہروں میں کئی حویلیاں ہیں جن میں سے بیشتر ویران ہوتی جا رہی ہیں۔ یہاں ہمارے کنبے کے کچھ لوگ کبھی کبھار آتے رہتے ہیں اس لئے حویلی کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہتی ہے۔ ایک بہت بڑی حویلی شہر کے اندرونی حصے میں بھی ہے لیکن اُسے تاریخی ورثہ قرار دے کر سرکار نے قبضے میں لے رکھا ہے۔''

اسی دوران چتون سنگھ چائے بنا کر لے آیا۔

''آپ کشمیر سے کب لوٹیں سیتا دیوی؟'' اُس نے ہمارے سامنے کافی ٹیبل پر چائے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کئی روز ہو گئے.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''یہاں کی کیا صورتحال ہے؟''

''حالت بہت کھراب ہے سیتا دیوی!'' چتون سنگھ نے کہتے ہوئے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ کو ادھر آوت نا ہیں چاہئے تھا۔ لوگار کو پتہ چل گیا تو.....'' وہ ایک بار پھر میری طرف دیکھتے ہوئے خاموش ہوگیا۔

''ہاں ہاں کہو..... یہ اپنا ہی بندہ ہے۔'' سیتا بولی۔

''خبراں بہت گرم ہیں سیتا دیوی!'' چتون سنگھ بولا۔ ''ہمارتو یہ سنن ہے کہ سیتا دیوی نے پہلے کشمیر میں دو سینکوں کی ہتھیا کر ڈالی اور ایک اُگر وادی کے ساتھ بھاگ گئی۔ بعد ماں اُس مسلمان اُگر وادی نے جموں میں سینک افسران پر گولے چلائے تو سیتا بھی اُس کے ساتھ ہووے تھی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''جے پور میں سینا کے افسران نے بڑے ٹھاکر جی کو پکڑ لیا پر اُسی روز چھوڑ دیا۔ آپ نے یہاں آ کر بہت گلتی کرت ہو سیتا دیوی! کیپٹن صاب بھی اِدھر آوت رہت ہے۔''

''اوہ..... آخری مرتبہ وہ کب آیا تھا؟'' سیتا نے پوچھا۔

''دو روج پہلے.....'' چتون سنگھ نے جواب دیا۔ ''اُس کے ساتھ رانا بھی تھا اور.....'' وہ خاموش ہوگیا۔

''عورتیں بھی۔'' سیتا نے اُس کی بات پوری کر دی۔

''ہاں سیتا دیوی.....'' چتون سنگھ نے گردن ہلا دی۔

''اچھا ٹھیک ہے.....'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ میں یہاں آئی ہوں..... کسی کو نہیں۔ سمجھ گئے؟''

''سمجھ گیا سیتا دیوی.....!'' چتون سنگھ نے گردن ہلا دی۔ ''اب میں جاؤں؟ کچھ بھوجن کا بندوبست.....''

''ہاں..... تم جاؤ!'' سیتا نے پرس میں سے کچھ نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیئے۔ ''یہ رکھ لو! اور جو سمجھ میں آئے لے آنا۔''

چتون سنگھ نے نوٹ لے کر جیب میں رکھ لئے اور خالی کپ اُٹھا کر لے گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ حویلی سے چلا گیا۔ حویلی کا گیٹ اُس نے باہر سے بند کر دیا تھا۔

چتون سنگھ کی باتوں سے میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ سیتا کے بارے میں خبریں بہت پہلے یہاں تک پہنچ چکی تھیں۔ اس صورتحال سے بھارتی فوجیوں کی گندی ذہنیت کا اندازہ بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ اپنے آدمیوں کو بچانے اور اپنے جرائم چھپانے کے لئے اُنہوں نے اپنوں کو بھی معاف نہیں کیا تھا۔ پہلے چاچا قربان علی کو گولیوں سے چھلنی کیا پھر اُس کی بیٹی کو تشدد کا نشانہ بنا کر ہلاک کر ڈالا۔ اور احتجاج کرنے والوں کو بھی بھون ڈالا۔ یہ اطلاع تو ہمیں جموں ہی میں مل گئی تھی کہ فوجیوں نے سیتا کے بارے میں پوچھنے کے لئے اُس کے ماما کو بھی اذیتیں دے کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ اور میرا اندازہ بالکل درست نکلا تھا کہ راجستھان میں بھی سیتا کے بارے

میں پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ اور میرے خیال میں سیتا نے یہاں آکر واقعی غلطی کی تھی۔

چتون سنگھ نے جس کیپٹن کا تذکرہ کیا تھا وہ سیتا کا وہی کزن تھا جو عرصہ پہلے سیتا کو اپنی ہوس کا شکار بنا چکا تھا اور اُس کے ایک مسلمان دوست پر جھوٹا الزام عائد کر کے اُسے پولیس کے ہاتھوں مروا دیا تھا۔

سیتا نے مجھے راستے ہی میں بتایا تھا کہ جیسلمیر شہر پاکستان کی سرحد سے ساٹھ ستر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور یہاں ایک بہت بڑی چھاؤنی ہے۔ اور اُس کا کزن کیپٹن گوپال بھی یہیں پر ہے۔ پہلے وہ لیفٹیننٹ تھا اور بعد میں کیپٹن ہو گیا تھا۔ چتون سنگھ کے کہنے کے مطابق کیپٹن گوپال اس حویلی میں آتا رہتا تھا۔ دو دن پہلے بھی وہ رانا نامی کسی دوست کے ساتھ آوارہ عورتوں کو لے کر آیا تھا اور وہ کسی بھی وقت یہاں آ سکتا تھا۔

چتون سنگھ بازار سے کھانا لے کر آ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد سیتا نے کپڑے بدل لئے۔ اُس کے جسم پر یہ لباس دیکھ کر میں چونک سا گیا۔ اس لباس میں اُس کے جسم کا زیادہ حصہ برہنہ ہو رہا تھا۔

''یہ...... کپڑے تم نے کہاں سے لئے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیڈ رُوم کی الماری میں بہت سے کپڑے موجود ہیں۔ تمہارا کام بھی چل سکتا ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر چتون سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

''چتون سنگھ! تم بلبیر سنگھ کے پاس چلے جاؤ۔ دو چار دن وہیں رہ لو۔ جب میں یہاں سے جانے لگوں گی تو تمہیں فون کر کے بلوا لوں گی۔''

''جی سیتا دیوی!'' چتون سنگھ نے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں اُلجھن سی اُبھر آئی تھی۔ ''پر آپ کی سیوا......''

''اپنی سیوا ہم خود ہی کر لیں گے۔'' سیتا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''اور تم اپنی زبان بند رکھو گے۔ کسی کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔ اب تم جاؤ!''

''جی سیتا دیوی۔'' چتون سنگھ نے کہا اور ایک کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک چھوٹی سی پوٹلی، جس میں اُس کے دو جوڑے کپڑے تھے، لے کر رُخصت ہو گیا۔

میں سیتا کے ساتھ ایک کمرے میں آ گیا۔ یہ بہت وسیع و عریض بیڈ رُوم تھا اور شاندار طریقے سے آراستہ تھا۔ بیڈ کے عین سامنے والی دیوار پر دو عورتوں کی ایسی تصویریں آراستہ تھیں جنہیں دیکھ کر ہی شرم آتی تھی۔ سیتا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر میک اَپ کرنے لگی۔ یہاں ہر چیز موجود تھی۔ یوں تو سیتا ویسے ہی بے حد حسین تھی مگر ہلکے سے میک اَپ سے اُس کا حسن کچھ اور نکھر آتا تھا۔ اور اس وقت تو وہ بہت اہتمام سے میک اَپ کر رہی تھی۔

''کیسی لگ رہی ہوں......؟'' اُس نے اُٹھ کر میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''تمہیں دیکھ کر تو سو سالہ بوڑھا بھی اپنے اندر ہلچل سی محسوس کرنے لگے گا۔ مگر تم کر کیا رہی ہو...... کہیں جانے کا پروگرام ہے کیا؟'' میں نے اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اُسے دیکھ کر میرے دل میں بھی کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔

''میں ایک شکار کی تلاش میں جا رہی ہوں۔ واپسی میں دو تین گھنٹے لگ سکتے ہیں...... تم پریشان مت ہونا۔'' اُس نے جواب دیا۔

''اگر تمہارے بعد کوئی آ گیا تو؟'' میں نے کہا۔

''کوئی نہیں آئے گا......'' سیتا نے جواب دیا اور اچانک ہی مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

میں گڑبڑا سا گیا۔ اس سے پہلے کہ سنبھل سکتا اُس نے اپنے ہونٹ میرے بائیں گال پر ثبت کر دیئے اور پھر پیچھے ہٹ کر میری طرف دیکھتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا اور مجھے پکڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف گھما دیا۔ میرے گال پر اُس کے ہونٹوں کا سرخ نشان بن گیا تھا جسے میں اپنے ہاتھ کی پشت سے صاف کرنے لگا۔

سیتا نے اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک درست کی اور مجھے اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ چند منٹ بعد وہ حویلی سے رخصت ہو گئی۔ حویلی کے گیٹ کا چھوٹا دروازہ اُس نے باہر سے بند کیا تھا۔ برآمدے والا دروازہ میں نے ویسے ہی بھیڑ دیا۔ سیتا کی ہدایت کے مطابق میں نے اُس دروازے کی چٹخنی بھی نہیں لگائی تھی۔

میں کچھ دیر تک کمرے کے ہال کے وسط میں کھڑا رہا اور گھوم پھر کر حویلی دیکھنے لگا۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ کئی راہداریاں اور لاتعداد کمرے تھے۔ میں نے راجے مہاراجوں کے شاہی محلات، قلعوں اور اس قسم کی حویلیوں کے بارے میں سنا تھا کہ ان میں سرنگیں، تہہ خانے اور خفیہ راستے ہوتے ہیں۔ کئی کمرے اُوپر بھی تھے۔ اُوپر جانے کے لئے ہال کمرے کے اندر سے بھی زینہ تھا اور باہر سے سیڑھیاں بھی تھیں۔

میں تقریباً ایک گھنٹے تک حویلی میں گھومتا رہا اور پھر دوبارہ ہال نما کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر وہاں رُکا اور پھر اُسی بیڈ رُوم میں آ گیا۔ میں نے کمرے کی بتی بجھا دی اور بستر پر لیٹ گیا۔ راہداری میں جلنے والے بلب کی مدھم سی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔

بستر اس قدر آرام دہ تھا کہ لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں...... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر سویا؟ اور پھر کسی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس کے ساتھ ہی ''چٹ'' کی ہلکی سی آواز سے کمرہ روشنی سے بھر گیا...... میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور جب آنکھیں تیز روشنی سے مانوس ہوئیں تو سامنے سیتا اور اُس کے ساتھ ایک آدمی کو دیکھ کر مے ا ر وادگ ہے جس کی مجھے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دو لی ئیں ڈال دیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

سے روشناس کرا دیا کہ یہ میرا خیال

''کیپٹن گوپال! یہ ہے کشمیر کا وہ سب سے بڑا اُگر وادی..... مجاہدین کا بہت بڑا سرغنہ شمروز..... جس نے بھارتی سینا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ جموں کے قریب مانسر جھیل کے کنارے سینا کے اعلیٰ افسروں کی ہلاکت کا منصوبہ بھی اسی نے بنایا تھا۔ تمہاری سینا، انٹیلی جنس یا کوئی اور ایجنسی اس کا سراغ نہیں لگا سکی لیکن دیکھو میں کس طرح آسانی سے اسے یہاں لے آئی ہوں.....''

میں اُچھل پڑا..... میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ میں نے خونخوار نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ اپنی جگہ سے کوئی حرکت کرتا کیپٹن گوپال نے بڑی پھرتی سے جیب سے پستول نکال لیا۔

میں بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا..... مجھے اپنی رگوں میں خون منجمد ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شدید سردی کی ایک لہر مجھے اپنی لپیٹ میں لیتی چلی گئی.....!!

○○○

میری رگوں میں خون جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا..... شدید سردی کی لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا کبھی کیپٹن گوپال اور کبھی سیتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیتا کے ہونٹوں پر اب بھی بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ لیکن اس وقت مجھے اُس کی مسکراہٹ بڑی مکروہ لگ رہی تھی۔ کیپٹن گوپال کے پستول کا رُخ اب بھی میری طرف تھا۔

''ویل ڈن سیتا!'' کیپٹن گوپال کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ ''تم نے واقعی وہ کام کر دکھایا ہے جو ہمارے بڑے بڑے سورما بھی نہیں کر سکے۔ اس نے واقعی ہماری سرکار اور ہماری سینا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی زندہ یا مُردہ گرفتاری پر سرکار کی طرف سے کروڑوں روپے کے انعامات مقرر ہیں۔ یہ انعامات تمہیں ملیں گے۔ اور تم بلاشبہ ہندوستان کی سب سے دولت مند عورت بن جاؤ گی۔'' وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے نفرت اور انتقام کی چنگاریاں برس رہی تھیں۔ اُس کے پستول کا رُخ اب بھی میری طرف تھا۔ وہ ایک بار پھر سیتا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم اس تک کیسے پہنچ گئیں؟ اور اسے آسانی سے کس طرح قابو کر لیا؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں یہاں سے یہ عہد کر کے نکلی تھی کہ یا تو اسے اور انگوری کو پکڑ کر لاؤں گی یا اپنی جان دے دُوں گی۔ انگوری میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ماری جا چکی تھی۔ میں ڈوڈا کے قریب اپنے ماما کی بستی میں تھی۔ اس دوران میں نے جموں اور ڈوڈا میں مجاہدین سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ میں مجاہدین کے توسط سے اس تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''اور پھر یہ اتفاق سے مجھے بستی کے قریب پہاڑیوں میں بے ہوش پڑا ہوا مل گیا۔ یہ زخمی تھا۔ میں اسے اُٹھا کر غار میں لے گئی۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کے ذریعے شمروز تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ میں نے اسے غار میں چھپائے رکھا۔ بستی کے ایک بوڑھے مسلمان کے ذریعے اس کا علاج کروایا اور اس کے کھانے پینے کا خیال رکھا۔

میں یہ سمجھتی رہی تھی کہ یہ کوئی عام کشمیری مجاہد ہے جو زخمی ہو کر اس طرف آن نکلا تھا۔ لیکن یہ انکشاف میرے لئے خاصا سنسنی خیز ثابت ہوا کہ یہی وہ خطرناک اُگر وادی ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ بھگوان نے اسے پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں ڈال دیا تھا۔ میں اس کی سیوا کرتی رہی۔ میں نے اسے زندگی کی ایک ایسی لذت سے روشناس کرا دیا کہ یہ میرا خیال

اپنے ذہن سے نہ نکال سکے۔ میں اسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئی کہ ہندو ہوتے ہوئے بھی مجھے ہندوؤں سے شدید نفرت ہے۔ کشمیر کے حوالے سے اپنی سرکار کی پالیسیوں سے بھی اختلاف ہے۔ میں آزادی کو کشمیری مسلمانوں کا حق سمجھتی تھی۔ میں نے اسے باور کرادیا کہ میں کشمیری مسلمانوں کو حق بجانب سمجھتی ہوں اور ہندو سامراج کے خلاف ان کے شانہ بشانہ لڑنا چاہتی ہوں۔ اس نے میری باتوں کا یقین کرلیا۔ یہ اب تندرست ہو چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی اگلا قدم اُٹھاتی غار کے قریب چشمے پر مجھے دو ہندو سینکوں نے گھیر لیا۔ وہ مجھے اکیلے پا کر میرے ساتھ بلادکار کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے مجھے بچایا اور وہ دونوں فوجی ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ اور پھر یہیں سے حالات میرے ہاتھ سے نکلنے لگے۔ یہ شمروز اپنے محاذ پر واپس جانا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قابو میں رکھا اور وہاں سے نکال لائی۔ میرے ماما کی بستی میں جو کچھ ہوا اس میں نہ اس کا ہاتھ تھا اور نہ میرا۔ بستی میں ہندو فوجیوں نے جو کچھ بھی کیا اس نے میرے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ تو بھر دیا لیکن میرے لئے مشکلات پیدا ہوگئیں۔ میں اسے کسی نہ کسی طرح جموں تک لے آنے میں کامیاب ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے کسی نہ کسی طرح وہاں سے بھی نکال لاؤں گی۔ لیکن وہاں مجاہدین کی ایک اور پارٹی سرگرم تھی۔ اُنہوں نے بھرتی فوجی افسروں کے قتل کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ میں اسے دُور رکھنا چاہتی تھی مگر یہ ان مجاہدین سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور پھر میں بھی اس گروہ میں شامل ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ میں وقت سے پہلے بھارتی فوجیوں کو اس سازش سے آگاہ کردُوں گی لیکن مجھے موقع نہیں مل سکا۔ اور پھر مانسر جھیل پر جس طرح قتل عام ہوا وہ خوفناک منظر میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گی..... یہ ایک بار پھر کشمیر کی طرف واپس جانا چاہتا تھا مگر ایک میری کوشش اور پھر حالات نے اسے اس طرف جانے سے باز رکھا اور ہم کسی نہ کسی طرح جموں سے نکل کر پٹھان کوٹ پہنچ گئے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی اور پھر پٹھان کوٹ سے یہاں تک کے حالات بتانے لگی۔

تم واقعی بہادر لڑکی ہو بھارتیہ ناری.....'' کیپٹن گوپال نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''اس کی گرفتاری پر نقد انعامات کے علاوہ تم مہاویر چکر کی بھی حق دار ہو۔''

''شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ مہاویر چکر کسی زندہ انسان کو نہیں دیا جاتا۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ درست ہے..... لیکن اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہیں اس سے بھی بڑا ایوارڈ دیتا۔'' کیپٹن گوپال نے کہا۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بھی طیش آ رہا تھا کہ کس قدر آسانی سے بیوقوف بن گیا تھا۔ سیتا نے اپنے آپ کو کشمیری مسلمانوں کا ہمدرد ظاہر کر کے مجھے اپنے حسن و شباب کے جال میں جکڑ لیا تھا اور بڑی خوبصورتی سے مجھے وہاں

سے نکال لائی تھی۔ عورت..... خوبصورت عورت واقعی اپنے اندر بڑی طاقت رکھتی ہے۔ جو کام بڑے سے بڑے سورما نہیں کر سکتے وہ ایک خوبصورت عورت بڑی آسانی سے کر ڈالتی ہے۔ اور مرد..... خواہ کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو عورت کے حسن کے جال میں پھنس کر بیوقوف بن جاتا ہے۔ یہی سب کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں کتنی آسانی سے بیوقوف بن گیا تھا۔ لیکن مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ میں اس کی باتوں میں کیوں آ گیا تھا۔

وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور میں موقع کی تلاش میں تھا۔ اور بالآخر مجھے موقع مل گیا..... کیپٹن گوپال کی توجہ ایک لمحہ کو میری طرف سے ہٹی تھی اور میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کیپٹن پر چھلانگ لگا دی۔

میرے پیر کی ٹھوکر پوری قوت سے اُس کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا میں اُڑتا ہوا صوفوں کے پیچھے کہیں جا گرا۔ اس سے پہلے کہ کیپٹن گوپال اس جھٹکے سے سنبھل سکتا میں نے اُس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا اور اُسے ساتھ لیتا ہوا درمیان میں رکھی ہوئی شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل پر گرا۔

ایک زوردار چھناکے کی آواز اُبھری..... شیشے کے ساتھ میز بھی ہم دونوں کے بوجھ سے ٹوٹ گئی۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کا ایک ٹکڑا میرے بائیں بازو پر کہنی سے ذرا اُوپر لگا کھال کٹ گئی اور خون رِسنے لگا۔

میز ٹوٹنے سے ہم اس طرح گرے تھے کہ کیپٹن گوپال میرے اُوپر آ گیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے سے اُس کے بازو پر بھی کٹ لگا تھا جس سے خون بہنے لگا تھا۔ لیکن میری طرح اُس نے بھی تکلیف کی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ میرے گلے پر گرفت جمانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے رگید رہا تھا۔

میں نے پوری قوت سے اُسے ایک طرف اُلٹ دیا اور بڑی پھرتی سے اُٹھ کر اُس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ اُس نے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر گرا اور اس سے پہلے کہ سنبھل سکتا گوپال نے میرے اُوپر چھلانگ لگا دی اور مجھے رگیدتا ہوا دُور تک لے گیا۔

کیپٹن گوپال ایک بار پھر میرے اُوپر تھا۔ اور میرے گلے پر گرفت جمانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس مرتبہ بھی میں نے اُس کی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی اور اُسے دونوں پیروں پر اُٹھا کر اُچھال دیا۔ وہ اُلٹی قلابازی کھاتا ہوا پچھلی طرف صوفے پر گرا۔ میں نے بھی اُٹھ کر چھلانگ لگا دی..... صوفہ ہم دونوں کے بوجھ سے اُلٹ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے دیوار کے قریب پہنچ گئے۔

سیتا خاموش تماشائی کی طرح ایک طرف کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اپنے ساتھی کیپٹن گوپال کی مدد کیوں نہیں کر رہی تھی؟

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ کیپٹن گوپال میں سانڈ جیسی طاقت بھری ہوئی تھی۔ طاقت کے حوالے سے میرا اور اُس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ لیکن یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا میری کمزوری میری شکست کا باعث بن سکتی تھی اور اس شکست کا انجام بھی میں اچھی طرح جانتا تھا۔ میں اپنے آپ کو گوپال کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر میں نے اُس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

کیپٹن گوپال کو موقع مل گیا اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب ہم ایک دوسرے پر لاتیں اور گھونسے برسا رہے تھے۔ ایک مرتبہ موقع پا کر گوپال مجھ سے لپٹ گیا اور مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ گوپال میرا سر دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔ ہر ٹکر پر میرے منہ سے کراہ نکل جاتی تھی۔ اُس نے میرے بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ میں نے اُس کی بغل میں ایک دو گھونسے لگائے تھے مگر ان گھونسوں میں شاید اتنی طاقت نہیں تھی کہ گوپال پر اس کا کوئی اثر ہو۔

میں نے گوپال کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے ضرب لگائی..... وہ کراہ اُٹھا اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ کیپٹن گوپال نے ایک بار پھر مجھے دبوچ لیا۔ گوپال پر گویا جنون طاری ہو چکا تھا..... وہ مجھ پر لاتیں اور گھونسے برساتا رہا۔ میں صرف اپنا دفاع کر رہا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے میں ایک کرسی سے ٹکرا کر پشت کے بل گرا اور گوپال نے میرے اُوپر چھلانگ لگا دی۔

اس مرتبہ میرا گلا اُس کی گرفت میں آ گیا..... اُس کے دونوں انگوٹھے میرے نرخرے پر تھے اور دباؤ بڑھتا جا رہا تھا..... میں گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اُس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی..... مجھے سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا..... آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی میری آخری کوشش بھی ناکام ہو چکی تھی۔ کیپٹن گوپال پر واقعی جنون طاری تھا۔ وہ مجھے گلا گھونٹ کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اسی وقت سیتا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ یہ آواز مجھے میلوں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''گوپال..... چھوڑ دو اسے..... میں کہتی ہوں چھوڑ دو.....!''

مگر کیپٹن گوپال پاگل ہو گیا۔ میرے گلے پر اُس کی گرفت کچھ اور بڑھ گئی۔ سیتا کی چیختی ہوئی آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور پھر کیپٹن گوپال کے منہ سے ایک کراہ خارج ہوئی۔ میرے گلے پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی..... میں نے دُھندلائی ہوئی نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں کافی ٹیبل کا ٹوٹا ہوا پایا تھا جس سے اُس نے گوپال کے سر پر ضرب لگائی تھی۔

سیتا کا ہاتھ اُوپر کو اُٹھا ہوا تھا۔ اُس نے دوسری ضرب لگائی لیکن اس مرتبہ وار سر کی بجائے اُس کے کندھے پر پڑا۔ گوپال کے ہاتھ میرے گلے سے ہٹ گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے چھائی ہوئی دُھند چھٹنے لگی۔ میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''شمروز! اُٹھو.....'' سیتا کی چیختی ہوئی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ''مارو اسے..... مار ڈالو اسے.....''

میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ کیپٹن گوپال اب بھی میرے سینے پر سوار تھا۔ میں نے اُسے ایک طرف گرا دیا اور اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ گوپال نے میرے منہ پر گھونسہ رسید کر دیا۔ گھونسہ اس قدر زوردار تھا کہ میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا.....

سیتا نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کافی ٹیبل کے پائے سے کیپٹن گوپال کے کندھوں پر دو تین ضربیں لگائیں۔ کیپٹن گوپال کے منہ سے گندی گالیاں نکلنے لگیں۔ اور پھر یہ گالیاں خرخراہٹوں میں تبدیل ہو گئیں..... وہ مجھے چھوڑ کر سیتا کی طرف لپکا اور اُس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ سیتا کی چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیئے..... میرے حواس بحال ہونے لگے۔ اور پھر میں نے کیپٹن گوپال پر چھلانگ لگا دی اور اُسے رگیدتا ہوا دُور تک لے گیا۔ لیکن کیپٹن گوپال کو ایک بار پھر موقع مل گیا اور وہ مجھے نیچے گرا کر میرے جسم پر ٹھوکریں برسانے لگا۔

''بس گوپال.....'' سیتا کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اسے چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں گولی مار دُوں گی۔''

''ہٹ جاؤ سیتا! میں اس اگر وادی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' کیپٹن گوپال مجھے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا۔

کمرہ فائر کی آواز سے گونج اُٹھا..... اس کے ساتھ ہی سیتا کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اب اگر تم پیچھے نہ ہٹے تو دوسری گولی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔''

کیپٹن گوپال مجھے گھونسہ مارنے جا رہا تھا لیکن اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم؟'' وہ سیتا کی طرف دیکھ کر غرایا۔ ''تم ایک آتنک وادی کو بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''یہ نہ تو آتنک وادی ہے اور نہ اگر وادی۔'' سیتا نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔ ''آتنک وادی اور اگر وادی، دہشت گرد اور باغی کو کہتے ہیں۔ یہ نہ تو دہشت گرد ہے اور نہ ہی باغی..... یہ تو اپنی مادر گیتی کو غاصبوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ اپنے وطن کی تحریک آزادی کا ایک دلیر اور بے باک مجاہد ہے۔ ایک ایسا مجاہد جس پر اس کی قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ تمہارے سینکوں پر تو اس کے نام کی دہشت ہے۔ اس کا مظاہرہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ اس کا نام سن کر تمہاری سینا کے بڑے بڑے جرنیلوں کے پیشاب خطا ہو جاتے ہیں۔ میں نے تمہیں اس پر ہاتھ اُٹھانے کا موقع دیا جس کا مجھے افسوس ہے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو سیتا؟'' کیپٹن گوپال چیخا۔ اُس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا

تھا۔ ''تم ایک آتنک وادی کی حمایت کر رہی ہو..... ایک اُگر وادی کی حمایت میں تم ہندوستانی فوج کے ایک آفیسر پر پستول اُٹھایا ہے جس کا انجام تم جانتی ہو۔''

''بہت اچھی طرح.....'' سیتا مسکرادی۔ ''میں یہاں سے کشمیر کی طرف گئی تو اسی مقصد تھی کہ شمروز کو گرفتار کر کے لاؤں۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگئی ہوں۔ لیکن وہاں نے جو کچھ بھی دیکھا ہے اس سے میرے دل میں بھارتی فوج کے لئے شدید نفرت پیدا ہو ہے۔ اتنے مظالم تو ہٹلر نے بھی یہودیوں پر نہیں توڑے ہوں گے جتنے بھارتی فوج کشمیر نہتے اور مظلوم مسلمانوں پر ڈھا رہی ہے۔ ہتھیاروں کی تلاش کے بہانے ان کے گھروں کو لو رہا ہے۔ مجاہدین کو پناہ دینے کے الزام میں ان کی بستیوں کو جلا کر راکھ کیا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ لوگوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہے۔ عورتوں اور کم عمر لڑکیوں اجتماعی آبروریزی کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ بھارتی فوجیوں نے کشمیر کو ایک شکارگاہ بنا رکھا ہے۔ انسان نہیں بھیڑیئے اور درندے ہیں جن کے منہ کو انسانی خون لگ گیا ہے۔''

''سیتا.....!'' کیپٹن گوپال ایک بار پھر چیخا۔ ''تم بہک رہی ہو۔''

''ہاں..... میں بہک رہی ہوں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''مجھے بھارتی فوج سے نفرت تو اُ روز ہوگئی تھی جب تم نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا اور جب میں نے کشمیر میں یہ سب ہوتے دیکھا تو مجھے ان بھارتی فوجیوں سے اور بھی شدید نفرت ہوگئی۔''

''تم غلطی کر رہی ہو سیتا!'' کیپٹن گوپال نے کہا۔ ''تم جموں اور کشمیر کی صورتحال سے واقف نہیں ہو۔ جو اِن لوگوں نے ہمارے ہندوؤں کے ساتھ کیا ہے وہ تم نہیں جانتیں۔ انہوں ہماری سیناؤں کو جو نقصان پہنچایا ہے تم اس سے بھی واقف نہیں ہو۔ یہ مظلوم نہیں ہیں..... انہیں کسی ہمدردی کا مستحق مت سمجھو..... یہ لوگ کشمیر کو بھارت سے الگ کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں پاکستان کی آشیر باد حاصل ہے۔ لیکن کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ اسے کسی صورت الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ باغی ہیں اور ان لوگوں کو سزا ملنی چاہئے۔ تم نے ایک باغی کے حق ایک ہندوستانی فوجی آفیسر پر پستول اُٹھا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھے یہ پستول میرے حوالے کر دو! تم نے جو کچھ بھی کیا ہے اور کہا ہے میں اسے بھول جاؤں گا۔ اس کی گرفتاری پر تم اب بھی انعام کی حق دار ہو۔ تمہیں بے حساب.....''

''حساب پر یاد آیا۔'' سیتا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے تو ابھی تم سے بھی حساب کتاب کرنا ہے۔ تم جانتے ہو تم نے مجھے کس طرح ہوس کا نشانہ بنایا تھا..... اپنا دوش ایک بے گنا مسلمان کے کندھوں پر ڈال کر اُسے پولیس کے ذریعے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ میں سب کچھ نہیں بھولی ہوں۔ اب حساب کتاب کا وقت آ گیا ہے۔ اپنے کپڑے اُتار دو!''

''کیا.....؟'' کیپٹن گوپال اُچھل پڑا۔ ''کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''میرا مطلب وہی ہے جو کچھ میں نے کہا۔'' سیتا بولی۔ ''اپنے کپڑے اُتارو.....!''

کیپٹن گوپال کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ میں بھی اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا سیتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت نہیں تھی کہ سیتا نے گوپال کو کپڑے اُتارنے کو کیوں کہا تھا اور وہ اُس کے ساتھ کیا کرنا چاہتی تھی۔ حیرت تو اُس کے طرزِ عمل پر تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اُس نے مجھے پلیٹ میں سجا کر کیپٹن گوپال کے سامنے پیش کر دیا تھا کہ یہ ہے وہ خطرناک ترین کشمیری اُگر وادی جس نے کشمیر میں بھارتی فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ اور اس وقت یہ بات بھی واضح ہوگئی تھی کہ وہ محض مجھے پھانسنے کے لئے یہاں سے کشمیر گئی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگئی تھی۔ وہ مجھے یہاں تک لے آئی تھی اور اُس نے مجھے کیپٹن گوپال کے سامنے پیش بھی کر دیا تھا۔ اور جب کیپٹن گوپال گلا گھونٹ کر مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا تو اُس نے نہ صرف مجھے بچا لیا بلکہ کیپٹن گوپال پر گولی بھی چلا دی تھی اور ایک بار پھر میری اور کشمیری مسلمانوں کی ہمدرد بن گئی تھی۔ کیا یہ بھی اُس کی کوئی چال تھی؟ کیپٹن گوپال نے بتایا تھا کہ میری گرفتاری پر اُسے کروڑوں روپے انعام ملیں گے۔ اور ہو سکتا ہے سیتا کے ذہن میں یہ خیال آیا ہو کہ کیپٹن گوپال مجھے کہیں خود تو حکام کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہتا تھا تاکہ انعام کی رقم خود حاصل کر سکے۔ ہو سکتا ہے یہی سب کچھ سوچ کر اُس نے پینترا بدلا ہو اور ایک بار پھر میری ہمدرد بن گئی۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ وہ کیپٹن گوپال کے کپڑے کیوں اُتروانا چاہتی تھی۔

''سنا نہیں تم نے کیپٹن گوپال.....؟'' سیتا ایک بار پھر چیخی۔ ''میں نے تمہیں کہا تھا کہ کپڑے اُتارو اور تم نے ابھی تک میرے حکم کی تعمیل نہیں کی۔''

''تم پاگل ہوگئی ہو.....'' کیپٹن گوپال بولا۔ وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سیتا نے فائر کھول دیا۔ گولی کیپٹن گوپال کے پیروں پر لگی۔ وہ اُچھل پڑا۔

○

کیپٹن گوپال چیختا ہوا قالین پر لوٹنے لگا۔ اُس کی ٹانگوں سے خون کا فوارہ اُبل پڑا تھا اور خون قالین کو گندا کر رہا تھا۔ سیتا کے ہاتھ بھی خون آلود تھے۔ اُس نے ایک بار پھر نفرت بھری نظروں سے کیپٹن گوپال کی طرف دیکھا اور ہاتھ دھونے کے لئے باتھ رُوم کی طرف چلی گئی۔

کیپٹن گوپال تقریباً پندرہ منٹ تک مچلتا رہا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح نیکر پہن لی اور دو منٹ کے اندر اندر نیکر بھی خون سے تر ہوگئی۔ سیتا ابھی تک کمرے ہی میں تھی۔ میں نے ایک نظر کیپٹن گوپال کی طرف دیکھا اور صوفے پر پڑا ہوا پستول اُٹھا کر اُسی کمرے میں آ گیا جہاں سیتا تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ باتھ رُوم میں ہوگی مگر وہ بیڈ پر پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

''تم نے اُس کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''زیادتی.....!'' سیتا کے لہجے میں بے پناہ سرد مہری تھی۔ ''میرا تو دل چاہتا ہے اُس کے ٹکڑے کر کے گوشت کتوں کو کھلا دُوں۔ لیکن یہ سزا ایسی ہے کہ وہ زندگی کے آخری لمحوں تک

اسے بھول نہیں سکے گا۔''

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر سے آہٹ سن کر چونک گئے..... آواز ایسی تھی جیسے برآمدے کا جالی والا دروازہ دھڑ سے بند ہوا ہو۔ سیتا اُچھل کر بیڈ سے اُتر گئی۔ میں بھی اُس کے ساتھ باہر کی طرف لپکا۔ کیپٹن گوپال سنگھ ہال والے کمرے میں نہیں تھا جہاں ہم اُسے چھوڑ کر گئے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ سیتا نے میرے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا اور باہر کی طرف دوڑی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی لپکا۔

کیپٹن گوپال جھک کر لڑکھڑاتا ہوا باہر والے گیٹ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ سیتا نے پورچ میں چھلانگ لگا دی اور پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پے در پے ٹرائیگر دباتی چلی گئی.....

تین گولیاں چلی تھیں اور تینوں کی تینوں کیپٹن گوپال کی پشت میں پیوست ہو گئیں..... وہ لٹو کی طرح گھوم کر گرا اور تڑپنے لگا۔ اُس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ گولیوں اور گوپال کی چیخوں کی آواز رات کے سناٹے میں دُور تک پھیل گئی تھی۔

میں نے بھی سیتا کے پیچھے گیٹ کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اُس جگہ برآمدے کے بلب کی مدھم سی روشنی پہنچ رہی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ دو گولیاں اُس کی پشت پر لگی تھیں اور ایک گردن میں۔ وہ بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ سیتا نے اُس پر تھوک دیا اور اُس کو ایک ٹھوکر مار کر پیچھے ہٹ گئی۔

''مجھے یقین ہے کہ کشمیر میں بھی بھارتی سینکوں کو پیٹھ پر ہی گولیاں لگتی ہوں گی۔'' وہ بڑبڑائی۔

''زیادہ تر.....!'' میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''رات کے سناٹے میں گولیوں کی آواز دُور تک گونجی ہو گی۔ اگر کوئی پتہ کرنے اس طرف آ گیا تو.....؟''

''یہ مہاراج پرتاب سنگھ کی حویلی ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''یہاں کچھ بھی ہو جائے کوئی اس طرف آ کر دروازے پر دستک نہیں دے گا۔''

''اب اس لاش کا کیا، کیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''حویلی کے پیچھے بہت جگہ ہے، کہیں بھی گڑھا کھود کر ڈال دیں گے۔'' اُس نے جواب دیا۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم لاش کو گھسیٹ کر حویلی کے پچھلی طرف لے گئے۔ یہاں وسیع و عریض کمپاؤنڈ تھا۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ قطار در قطار ناریل کے اونچے درخت تھے جو تیز ہوا سے ایک طرف جھکے جا رہے تھے۔ سیتا مجھے وہیں رُکنے کو کہہ کر پچھلے دروازے سے حویلی میں چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک گینتی اور بیلچہ لے آئی۔ ہم نے دیوار کے قریب جگہ کا انتخاب کیا اور میں نے گینتی سے کھدائی شروع کر دی۔

زمین نرم تھی۔ چھ فٹ لمبا اور تین فٹ گہرا گڑھا کھودنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ کیپٹن گوپال کی لاش اُس گڑھے میں ڈال کر زمین برابر کر دی گئی۔

''تازہ کھدی ہوئی زمین دیکھ کر کسی کو شبہ تو نہیں ہو گا؟'' میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''راجوں مہاراجوں کی حویلیاں اور محلات اپنے اندر پتہ نہیں کیسے کیسے راز چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ تو ایک لاش ہے جسے زمین نے نگل لیا۔ اب اس کے بارے میں کون جان سکے گا۔'' سیتا نے جواب دیا۔ اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''میں اسے جان سے نہیں مارنا چاہتی تھی۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کر کے خود ہی اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ اگر یہ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو ہمارے لئے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے۔''

''ابھی تم نے کہا ہے کہ میں اسے جان سے نہیں مارنا چاہتی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم اسے زندہ چھوڑ دیتیں؟ کیا اس صورت میں یہ ہمارے لئے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے نہیں کر سکتا تھا؟''

''میں اسے اس طرح یہاں سے جانے کی اجازت دیتی کہ یہ زندگی بھر اپنی زبان بند رکھتا۔ آؤ! اندر چلتے ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

ہم حویلی کے پچھلے دروازے سے اندر آ گئے۔ سیتا نے مجھ سے بیلچہ اور گینتی لے کر سٹور روم میں ڈال دیئے۔ ہال کمرے کا سارا سامان اُلٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ سینٹر ٹیبل ٹوٹ جانے سے شیشے کی کرچیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں اور قالین پر چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا۔

''ہمیں تھوڑی سی محنت کرنی پڑے گی۔'' سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد ہم آرام سے بیٹھ کر چائے پئیں گے اور گپ شپ کریں گے۔''

ہم نے فرنیچر وغیرہ الگ ہٹا کر قالین کو رول کر دیا۔ اس سے پہلے ٹوٹی ہوئی کافی ٹیبل اور شیشے کے بڑے بڑے ٹکڑے اُٹھا کر ایک طرف ڈال دیئے تھے۔ قالین خاصا وزنی تھا۔ اُسے گھسیٹ کر چھت تک لے جانے میں ہم دونوں پسینے میں نہا گئے۔ واپس آ کر ہم نے فرنیچر سیٹ کیا۔ سیتا ایک صوفے پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ کیپٹن گوپال سے ہاتھا پائی میں اُس کا بلاؤز سامنے سے پھٹ گیا تھا اور اُس کے سینے کا زیر و بم بہت خطرناک صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ میں اُس سے نظریں چرانے کی کوشش کرتا رہا۔

''میں نہا کر کپڑے بدل لوں، پھر چائے بناتی ہوں۔'' سیتا کہتے ہوئے اُٹھ گئی۔

میں بھی فوراً ہی اُٹھ گیا اور اس سے پہلے ہی کمرے میں گھس کر بیگ میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس دوران میں بھی دوسرے کمرے کے باتھ روم میں جا کر نہا لوں گا۔''

میں ابھی بیگ میں سے کپڑے نکال ہی رہا تھا کہ کھٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دی..... میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ سیتا اندر آ کر دروازہ بند کر چکی تھی اور اوپر والی چٹخنی لگا رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی قاتلانہ مسکراہٹ تھی۔

ہم دونوں اُس بیڈ رُوم میں بیٹھے ہوئے تھے جسے ہم نے رات گزارنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں حویلی میں داخل ہونے کے بعد ہم سب سے پہلے آئے تھے۔ اس

کمرے میں دیوار پر عورتوں کی رنگین شرمناک تصویریں آویزاں تھیں۔ میں نے بیٹھنے سے پہلے ان تصویروں والے فریم اُلٹ دیئے۔

''میں تمہیں اب تک نہیں سمجھ سکا سیتا!'' میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ سیتا نے چائے بڑی خوش ذائقہ بنائی تھی۔ ''ڈوڈا سے جموں تک تم ایک بزدل لڑکی ثابت ہوئی تھیں۔ جموں میں مانسر جھیل پر تم نے رائفل چلانے کی حد تک کچھ بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد تم پھر پہلے جیسی لڑکی نظر آنے لگیں۔ ڈری ڈری اور سہمی سہمی سی۔ لیکن یہاں میں نے تمہارا ایک مختلف رُوپ دیکھا ہے۔ تم نے جس بیدردی سے پہلے کیپٹن گوپال کو اُس کی مردانگی سے محروم کیا اور بعد میں جس طرح اُس کے شریر میں گولیاں پیوست کیں وہ سب میرے لئے بہت ہی حیران کن ہے۔ اور سب سے اہم بات.....'' میں نے کہتے ہوئے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''تم نے کیپٹن گوپال سے کہا تھا کہ مجھے پکڑنے کے لئے ہی کشمیر گئی تھیں اور بڑی خوبصورتی سے مجھے گھیر کر یہاں لے آئیں۔ مجھے اب تم پر شبہ ہونے لگا ہے۔ تم کون ہو سیتا.....؟ وہ تو ہرگز نہیں ہو جو اب تک اپنے آپ کو ظاہر کرتی رہی ہو۔ میں تمہاری اصلیت جاننا چاہتا ہوں۔''

''میری اصلیت.....'' سیتا نے کہتے ہوئے دونوں پیر سامنے کو پھیلا لئے۔ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اُس کے جسم پر شب خوابی کا باریک لباس تھا جس سے کہیں کہیں سے اُس کا جسم جھلک رہا تھا۔ ''میری اصلیت جاننا چاہتے ہو تو سنو!'' اُس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ''میں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کی ایجنٹ ہوں۔''

''کیا.....؟'' میں اُچھل پڑا۔

''یہ سچ ہے.....'' سیتا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''یہ کالج کے زمانے کی بات ہے۔ ایک روز کالج ہی میں شیتاب نامی عورت سے میرا سامنا ہو گیا۔ وہ آنند نامی کسی لڑکے کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ آنند میری ہی کلاس میں پڑھتا تھا لیکن اُس روز وہ کالج نہیں آیا تھا۔ نجانے کیوں مجھے اُس عورت پر شبہ سا ہوا اور میں نے اُس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ میں دو دن تک اُس کی نگرانی کرتی رہی۔ اس دوران آنند نے بھی کم از کم تین مرتبہ اُس سے ملاقات کی تھی اور یہ ملاقاتیں نہایت پراسرار انداز میں جے پور سے باہر امبر کے پرانے محلات میں ہوئی تھیں۔ نجانے کیوں اُس عورت پر میرا شبہ بڑھتا گیا۔ میں نے سرسری سے انداز میں آنند سے اُس عورت کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی عورت کو نہیں جانتا۔ بقول اُس کے پچھلے کئی روز سے کسی عورت سے اُس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

میرا شبہ بڑھتا گیا۔ وہ عورت تین دن بعد غائب ہو گئی۔

ایک مہینے بعد وہ عورت مجھے دوبارہ نظر آ گئی۔ میں نے پھر اُس کی نگرانی شروع کر دی۔ اس مرتبہ وہ آنند سے ملنے کالج نہیں آئی۔ لیکن اگلے ہی روز میں نے آنند کو اُس کے ساتھ دیکھ لیا۔

وہ ایک غیر معروف سے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آنند کی عمر بائیس کے لگ بھگ تھی جبکہ وہ عورت چالیس کے قریب تھی۔ مجھے اُن دونوں کے اس طرح چھپ چھپ کر ملنے پر حیرت تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ چالیس کی ہونے کے باوجود وہ عورت بے حد حسین تھی لیکن حیرت تو مجھے آنند پر تھی۔ وہ تو جوان اور خوبصورت لڑکیوں کا دلدادہ تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کے چکر میں کس طرح پھنس گیا تھا؟

مجھے کچھ گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے اُن کی نگرانی جاری رکھی اور تیسرے روز اُن دونوں کا پیچھا کرتی ہوئی نردانی مارگ کے علاقے میں واقع ایک بنگلے تک پہنچ گئی۔ اُن کے آنے سے پہلے وہ بنگلہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن پھر روشنی نظر آنے لگی۔

میں کسی نہ کسی طرح دیوار پھاند کر اندر پہنچ گئی۔ میں دبے قدموں بنگلے کی عمارت کے ساتھ گھومتی ہوئی اُس کھڑکی کے سامنے پہنچ گئی جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ بیڈ روم تھا۔ اُس کمرے میں آتی ہی شیتاب نامی اُس عورت نے ساڑھی اُتار دی تھی۔ اُس کے جسم پر صرف مختصر سا بلاؤز اور پیٹی کوٹ تھا۔ آنند اُس کے سامنے کھڑا بھوکی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس عورت نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ آنند والہانہ انداز میں اُس سے لپٹ گیا اور وہ دونوں بیڈ پر گر گئے..... اور پھر وہاں جو کچھ ہوا میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ شیطانی کھیل تھا جو بڑی گرمجوشی سے کھیلا جا رہا تھا۔ میں اگرچہ اُس وقت کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی تھی لیکن اپنے آپ میں عجیب سی سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ میرے سینے میں انگارے بھر گئے تھے اور دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

پتہ نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی اور پھر باتوں کی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آ گئی۔ میں نے اُٹھ کر دوبارہ کھڑکی سے جھانکا تو اس مرتبہ ایک اور سنسنی خیز منظر دیکھنے کو ملا۔ وہ دونوں بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے بیچ سگریٹ کے پیکٹ کے برابر ایک ڈبیہ رکھی ہوئی تھی جس میں کئی بٹن لگے ہوئے تھے اور انٹینا کی طرح ایک تار باہر نکلی ہوئی تھی۔ شیتاب نامی وہ عورت آنند کو اُس ڈبیہ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی اور آنند بار بار اس طرح سر ہلا رہا تھا جیسے وہ اُس کی بات سمجھ رہا ہو۔ پھر شیتاب اُٹھ کر الماری کے قریب چلی گئی۔ الماری کھول کر اُس نے ویلویٹ کے کور والی ڈبیہ نکال لی جو حجم میں پہلی ڈبیہ کے برابر تھی۔

''اور یہ ایک خوبصورت ٹائی پن ہے تمہارے پتا جی کے لئے۔'' شیتاب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''تین دن بعد تمہارے پتا جی کی سالگرہ ہے اور تم جانتے ہو وہ اپنی سالگرہ ہمیشہ گھر والوں کے ساتھ مناتے ہیں۔ اس بار بھی وہ ایک دو دن کی چھٹی لے کر جیسلمیر سے یہاں ضرور آئیں گے۔ تم یہ ٹائی پن انہیں سالگرہ کے تحفے کے طور پر دو گے۔'' شیتاب نے ڈبیہ کھول کر وہ ٹائی پن آنند کو دکھائی اور اُسے ڈبیہ میں رکھ کر ڈبیہ آنند کے حوالے کر دی۔

اس کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شیتاب نے آنند کو ایک بار پھر دوسری ڈبیہ کے

بارے میں سمجھایا جس میں انٹینا اور بٹن لگے ہوئے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی قسم کا ٹرانسمیٹر تھا۔

اور اس کے بعد پھر وہی شیطانی کھیل شروع ہو گیا جسے دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں تھی.....

میں وہاں سے ہٹ گئی اور دبے قدموں چلتے ہوئے دیوار پھاند کر بنگلے سے باہر آ گئی۔ میرے دماغ میں اس وقت سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ شیتاب نے آنند کو وہ ٹرانسمیٹر کیوں دیا تھا؟ اور اُس کے پتا جی کے لئے ٹائی پن کیوں دی تھی؟

دفعتہً میرے دماغ میں دھماکہ سا ہوا۔ آنند کے پتا جی فوج میں کرنل تھے اور جیسلمیر چھاؤنی میں ڈیوٹی دے رہے تھے۔ میں نے کچھ جاسوسی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں اور بعض فلموں میں بھی ایسی چیزیں دیکھی تھیں اور اب مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر یقین ہو گیا کہ یہ بھی کوئی جاسوسی ہی کا چکر ہے۔ وہ شیتاب نامی عورت دشمن کی ایجنٹ تھی اور اُس نے آنند کو بھی اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ آنند کے پتا جی فوج میں کرنل تھے اور جیسلمیر چھاؤنی میں تعینات تھے جہاں سے پاکستان کی سرحد پچاس ساٹھ میل سے زیادہ نہیں۔

میں وہ رات سو نہیں سکی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ اگر میں یہ بات پولیس کو بتاتی تو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ پولیس کا کام کرنے کا طریقہ کار کچھ ایسا ہے کہ وہ کام کم اور شور شرابا زیادہ کرتے ہیں۔ وہ شیتاب کو پکڑ تو لیتے لیکن گھوس لے کر چھوڑ دیتے۔ دوسرے دن شیتاب پھر غائب ہو گئی۔ اُس بنگلے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اگلے روز آنند کالج نہیں آیا۔

سالگرہ والے دن اُس کے پتا جی بھی جے پور پہنچ گئے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں گوپال کا خیال اُبھرا۔ وہ نیا نیا فوج میں گیا تھا اور ان دنوں اکیڈمی میں تھا۔ اُس سے رابطہ کرنا مشکل تھا۔ مجھے اپنے ایک اور رشتے دار کا خیال آ گیا وہ بھی فوج میں آفیسر تھا۔ میں نے فون پر اُس سے بات کی تو وہ اُسی روز جیسلمیر سے جے پور پہنچ گیا۔

اُسی روز بڑی رازداری سے آنند کو حراست میں لے لیا گیا اور اُس کے پتا جی کو تحفے میں دی جانے والی ٹائی پن بھی قبضے میں کر لی گئی۔ اس ٹائی پن کے اندر ایک بہت ننھا سا اور بہت طاقتور ٹرانسمیٹر پوشیدہ تھا۔ اُس ٹرانسمیٹر کے ذریعے دشمن ہمارے فوجی آفیسروں کی باتیں سنتے رہتے اور سرحد پر انڈین فوج کی سرگرمیوں سے آگاہ رہتے۔

آنند کو اس رازداری سے حراست میں لیا گیا تھا کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چل سکا۔ اُس کے قبضے سے وہ ٹرانسمیٹر بھی برآمد کر لیا گیا جو شیتاب نے اُسے دیا تھا۔ پوچھ گچھ کے دوران آنند نے بتایا کہ شیتاب سے اُس کی ملاقات چند مہینے پہلے ہی ہوئی تھی۔ اُس نے اُسے اپنے حسن کے جال میں پھنسا لیا اور پیسوں کا لالچ بھی دیا تھا۔ یہ ٹرانسمیٹر اُسے اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ اپنے پتا جی سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں اُسے آگاہ کرتا رہے۔ آنند نے شیتاب کے بارے میں بتایا کہ وہ دہلی کی رہنے والی ہے۔ اُس کے بتائے ہوئے پتے پر دہلی میں چھاپہ

مارا گیا لیکن شیتاب کو شاید آنند کی گرفتاری کی خبر مل چکی تھی۔ وہ روپوش ہو گئی اور اُس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔'' سیتا خاموش ہو گئی۔ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر بولی۔

''اس واقعہ کے چند روز بعد دو آدمیوں نے مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کے آفیسر تھے۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گئے جہاں دو اور بڑے آفیسروں سے میری ملاقات کرائی گئی۔ اُن میں ایک عورت بھی تھی۔ ''را'' کو پتہ چل گیا تھا کہ میری وجہ سے انڈین فوج کے خلاف ایک بڑی سازش ناکام ہو گئی تھی۔ اُن کے خیال میں میرے اندر وہ تمام تر صلاحیتیں موجود تھیں جو ''را'' کے ایک ایجنٹ میں ہونی چاہئے تھیں۔ انہوں نے مجھے ایجنسی کے لئے کام کی پیشکش کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ میری تعلیم کا حرج نہیں ہو گا۔ جب تک میں تعلیم سے فارغ نہیں ہو جاتی میری تربیت کا سیشن جاری رہے گا۔ اور تعلیم سے فارغ ہونے تک میں مکمل طور پر تربیت حاصل کر چکی ہوں گی۔

''را'' کے بارے میں، میں بہت کچھ سن چکی تھی۔ ان کے ایجنٹ نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے یہ پیشکش قبول کر لی اور پھر رفتہ رفتہ مجھ پر بہت سے انکشافات ہوتے چلے گئے۔ اسرائیلی ''موساد'' کو دنیا کی بہترین انٹیلی جنس سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ''را'' اُس کے بھی کان کاٹنے لگی ہے۔ پاکستان اور کشمیر کے حوالے سے ''را'' کی پالیسی بہت مختلف ہے۔ اسرائیلی ''موساد'' اس سلسلے میں ''را'' سے بھرپور تعاون کر رہی ہے۔ نہ صرف ''را'' کے ایجنٹوں کو اسرائیل میں تربیت دی جاتی ہے بلکہ ''موساد'' کے ایجنٹ یہاں بھی ''را'' کے ایجنٹوں کو تربیت دیتے ہیں۔ پاکستان میں تخریب کاری اور دہشت گردی کے لئے راجستھان میں کئی ایسے کیمپ قائم ہیں جہاں دہشت گردوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ پاکستان سے ان نوجوانوں کو یہاں لایا جاتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنے لوگوں اور اپنی حکومت سے ناراض ہیں۔ ایسے لوگ بڑی آسانی سے لالچ میں آ کر ''را'' کے ایجنٹوں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ یہاں ان کی برین واشنگ کر کے ان کے دل و دماغ میں پاکستان کے خلاف شدید نفرت بھر دی جاتی ہے اور ''موساد'' اور ''را'' کے ایجنٹ انہیں تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دیتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں پاکستان بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ بیدردی سے اپنے ہی لوگوں پر موت برساتے ہیں۔ بموں کے دھماکے کرتے ہیں اور تباہی و بربادی پھیلاتے ہیں۔ بہرحال...''

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اُس نے اپنی ایک ٹانگ سمیٹ کر گھٹنا اُوپر اُٹھا لیا تھا۔ اس طرح اُس کی ٹانگ پر سے کپڑا ہٹ گیا اور میں نے جلدی سے اپنا رُخ بدل لیا۔

''تعلیم ختم ہونے کے بعد مجھے ''را'' کی طرف سے باقاعدہ اسائنمنٹ دیئے جانے لگے۔ میں سرحد پار کر کے دو مرتبہ کراچی بھی جا چکی ہوں۔ ادھر میرے گھر والوں کو بالکل پتہ نہیں تھا کہ میں کن سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ میں نے تو انہیں یہ بھی خبر نہیں ہونے دی تھی کہ میں ''را'' کے لئے کام کر رہی ہوں۔ اسی دوران گوپال سنگھ میرا کزن سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے

فوج میں اپنی ڈیوٹی سنبھال چکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے کشمیر بھیج دیا گیا جہاں وہ لیفٹیننٹ بن گیا۔ میں نے اُن دنوں ایجوکیشن کا ایک اسپیشل کورس شروع کر دیا تھا۔ میرا ایک مسلمان دوست سلیم اس سلسلے میں میری مدد کر رہا تھا۔ گوپال کشمیر سے واپس آ چکا تھا۔ ایک روز وہ ہمارے گھر آیا تو میں اکیلی تھی۔ اُس کے دل میں ہوس جاگ اُٹھی اور اُس نے مجھے دبوچ لیا۔ اُس نے مجھے روند ڈالا اور پھر سلیم بھی آ گیا۔ گوپال کو اُس نے برا بھلا کہا تو گوپال نے اُلٹا اُسی کو پھنسا دیا۔ پہلے خود اُسے مارا پیٹا پھر پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس نے سلیم پر اتنا تشدد کیا کہ وہ ختم ہو گیا۔

میں اگر چاہتی تو اپنے ''را'' کے تعلقات بروئے کار لا کر گوپال کو نہ صرف فوج سے نکلوا دیتی بلکہ اُسے سڑنے کے لئے زندگی بھر کے لئے جیل میں بھی ڈلوا دیتی لیکن میں خود اُس سے انتقام لینا چاہتی تھی اور موقع کی تلاش میں رہنے لگی۔ انہی دنوں کشمیر کے حوالے سے تمہارا اور انگوری کا بڑا شہرہ تھا۔ تم دونوں کشمیر میں بھارتی فوج کو پے در پے ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے تھے اور تم لوگوں کی زندہ یا مُردہ گرفتاری کے لئے فوج اور ہند سرکار کی طرف سے کروڑوں روپے کے انعامات مقرر کئے گئے۔

بالآخر تم دونوں کی گرفتاری کے لئے ایک نئی پالیسی اختیار کی گئی۔ مجھے کشمیر اور تمہارے بارے میں بریفنگ دے کر کشمیر بھیج دیا گیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ میں مجاہدہ کے روپ میں کسی نہ کسی طرح تم تک رسائی حاصل کروں اور تمہیں کسی چکر میں پھنسا کر وہاں سے نکال لاؤں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ کشمیری مسلمان کشمیر میں آباد ہندوؤں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہے ہیں۔ وہ ہندوؤں کو وادی سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ اُن کی بستیوں کو آگ لگائی جا رہی ہے، اُن کی املاک پر قبضہ کیا جا رہا ہے اور اُن کا قتل عام ہو رہا ہے۔ ہندو اپنا سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

پولیس ہندوؤں کی جان و مال کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو گئی تو اُن کی رکھشا کے لئے فوج بھیجی گئی۔ کشمیری مسلمان کھلی بغاوت پر اُتر آئے۔ اُنہوں نے فوجی کیمپوں اور قافلوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اس سلسلے میں اُنہیں پاکستان کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ پاکستان اُنہیں دھڑا دھڑ اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔

○○○

گوپال سنگھ نے جے پور میں میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس سے مجھے اُس سے نفرت ہو گئی تھی اور پھر وہ مزے لے لے کر بتاتا رہا تھا کہ وہ کشمیر میں کس طرح مسلمان عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا رہا ہے۔ اور جب میں نے کشمیر میں اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا تو بھارتی فوجیوں سے میری نفرت دو چند ہو گئی۔ لیکن..... میں ایک مشن پر نکلی ہوئی تھی۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ تم تک ضرور پہنچوں گی۔

میں ڈوڈا میں اپنے ماما کے گاؤں میں تھی تو انگوری کی ہلاکت کی خبر ملی اور یہ بھی پتہ چلا کہ تم زخمی ہو کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ اس سے صرف ایک روز پہلے میں نے چاچا قربان علی کے ساتھ ڈوڈا میں ایک مسلمان مجاہد سے ملاقات کر کے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں اس کی تحریک میں شامل ہونا چاہتی ہوں لیکن اُسے پتہ چل گیا تھا کہ میں ہندو ہوں۔ میں نے بھی اپنا دھرم نہیں چھپایا تھا۔ اُس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ کوئی ہندو کشمیری مسلمانوں اور اُن کی تحریک کا کتنا ہی ہمدرد کیوں نہ ہو اُسے تحریک میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

اور پھر اگلے روز تم مجھے بے ہوشی کی حالت میں مل گئے۔ تم شدید زخمی تھے۔ میں تمہیں غار میں لے گئی۔ میرے دل میں ایک اُمید پیدا ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں تمہارا علاج کراؤں گی، تمہاری سیوا کروں گی اور اس طرح شاید میں تمہارے توسط سے تمہاری پارٹی اور پھر شمروز تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ تم ہی شمروز ہو تو مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنے ماما کی مدد سے تمہیں وہاں سے نکال لاؤں گی لیکن..... نجانے کیا بات تھی کہ تمہارے خلاف کوئی قدم اُٹھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چند روز بعد ہی میرے اندر یہ احساس جاگ اُٹھا کہ میں تو تم سے پریم کرنے لگی ہوں۔ پریم کی طاقت کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت تسلیم کیا گیا ہے۔ اسے کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ یہ پریم ایسا جذبہ ہے جو نہ تو دین دھرم کو دیکھتا ہے نہ ہی دوست اور دشمن میں تفریق کرتا ہے۔

اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں وہاں سے نکالوں گی تو ضرور لیکن اس طرح نہیں جس طرح منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اور پھر اُس روز جب چشمے کے قریب مجھے دو ہندو فوجیوں نے گھیر لیا، ہندو فوجیوں سے مجھے اور بھی نفرت ہو گئی۔ اور جس طرح تم نے اپنی جان پر کھیل کر اُن دو بھیڑیوں سے میری عزت اور جان بچائی اس سے میرے من میں تمہاری عزت بڑھ گئی۔ قدرت بھی میرا ساتھ دیتی رہی۔ ایسے حالات پیدا ہوتے رہے کہ ہم دونوں وہاں سے دُور ہٹتے

چلے گئے اور بالآخر میں تمہیں یہاں تک لانے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن میرا ارادہ ہرگز یہ نہیں تھا اور نہ ہے کہ تمہیں سرکار کے حوالے کروں گی۔''

''لیکن.....'' میں نے سیتا کے خاموش ہونے پر اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم تو کیپٹن گوپال کو یہاں لے کر آئی تھیں اور بڑے فخر سے اُسے بتایا تھا کہ کشمیر کے سب سے خطرناک اُگروادی کو پکڑ کر لے آئی ہو۔''

''ایسا کرنا میری مجبوری تھی۔'' سیتا مسکرائی۔ ''کیپٹن گوپال کو کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ میں ''را'' کے لئے کام کر رہی ہوں اور کسی اہم مشن پر کشمیر گئی ہوئی ہوں۔ اور پھر میں نے اُس سے اپنا انتقام بھی لینا تھا۔ میں اپنی اس توہین کو بھولی نہیں تھی۔ میرا سینہ اب بھی انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اُسے کوئی چارا ڈالنا ضروری تھا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیپٹن گوپال اُس وقت آفیسرز میس میں تھا۔ میں نے اُسے پیغام بھیج کر الگ بلوالیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک گیا۔ کئی مہینوں بعد ہمارا سامنا ہوا تھا۔ اُس کے سینے میں ایک بار پھر ہوس جاگ اُٹھی تھی۔ ہم آفیسرز میس کے ایک الگ کمرے میں بیٹھے رہے۔ وہ میرے ساتھ اپنی شام رنگین بنانا چاہتا تھا۔ وہ جلد سے جلد میرے کپڑے اُتارنا چاہتا تھا اور جب میں نے اُسے تمہارے بارے میں بتایا تو وہ اُچھل پڑا۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ میں اس مشن پر کشمیر گئی ہوئی تھی۔ اگر میں شمروز کو خاموشی سے ''را'' کے حوالے کر دُوں تو کچھ مزہ نہیں آئے گا۔ میں نے اُسے لالچ دیا کہ اگر شمروز کو اُس کے توسط سے سرکار کے حوالے کیا جائے تو اُسے پرموشن بھی مل سکتی ہے۔ اس طرح وہ آسانی سے میری چال میں آ گیا اور یہاں آ کر جو کچھ بھی ہوا وہ سب تم نے دیکھ لیا۔''

''یہ ناٹک رچانے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے اُس کی طرف دیکھا۔

''ناٹک تو یہ خود بخود بن گیا۔ میں تو اسے صرف پھانس کر یہاں لانا چاہتی تھی۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ایک بات اور.....'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''ہنومان گڑھ میں وہ آدمی کون تھا جس کی لاش.....''

''اوہ.....'' سیتا نے میری بات کاٹ دی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''تم ابھی تک اُس واقعہ کو بھولے نہیں ہو؟''

''میرے ذہن میں ایک خلش ہے.....'' میں نے کہا۔ ''وہ آدمی کون تھا اور تم اُس رات کمرے سے نکل کر کہاں گئی تھیں؟''

''اوہ.....'' اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تو تمہیں معلوم تھا کہ میں رات کو کمرے سے باہر گئی تھی۔''

''میری آنکھ کھل گئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم کمرے میں نہیں تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تم کتنی دیر پہلے باہر گئی تھیں؟ لیکن میرے جاگ جانے کے دس بارہ منٹ بعد نہایت خاموشی سے واپس آئی تھیں۔ اور پھر صبح یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ گیسٹ ہاؤس میں ایک قتل ہوگیا ہے اور مقتول کا گیسٹ ہاؤس سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''وہ کون تھا اور تم نے اُسے قتل کیوں کیا تھا؟''

''تو گویا تمہیں اب بھی شبہ ہے کہ اس آدمی کو میں نے قتل کیا تھا؟'' سیتا بولی۔ اُس کے ہونٹوں پر بدستور مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''شبہ نہیں یقین ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''صبح میں نے کمرے کے قالین پر سرخ مٹی دیکھی تھی جو تمہاری چپلوں کے ساتھ اندر آئی تھی۔ ہم کھانے کے لئے جب سامنے والے لان میں گئے تھے تو تم نے جوگرز پہنے ہوئے تھے۔ اور پھر اس طرف کہیں مٹی نہیں تھی۔ گیسٹ ہاؤس کے پچھلی طرف کچی زمین ہے اور مٹی سرخ ہے۔ اور کمرے میں وہ سرخ مٹی تمہاری چپلوں کے ساتھ آئی تھی۔''

''اوہ..... بہت گہرا مشاہدہ ہے تمہارا۔'' سیتا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''ہاں..... یہی کہہ لو!'' میں نے کہا۔ ''وہ کون تھا اور تم نے اُسے قتل کیوں کیا تھا؟''

''وہ ''را'' کا ایجنٹ گوتم تھا۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتا تھا اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں کس مشن پر کشمیر گئی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اُسے شبہ تھا کہ میرے ساتھ شمروز کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ اُس نے ویٹر کے ذریعے پیغام بھیج کر مجھے الگ بلا لیا۔ اُس وقت میں بھی اُلجھن کا شکار تھی کہ وہ کون ہے جس نے مجھے اس قدر رازداری سے الگ بلایا ہے۔ لیکن جب میں پودوں کے دوسری طرف پہنچی تو گوتم کو دیکھ کر پریشان سی ہوگئی۔ وہ بڑا احمق آدمی تھا۔ اُس کے ذریعے ہماری آمد کی اطلاع ہم سے پہلے جیسلمیر اور جے پور پہنچ سکتی تھی اور ممکن تھا کہ ہمیں راستے ہی میں گھیر لیا جاتا یا ہماری نگرانی شروع ہو جاتی۔ اُسے شبہ تھا کہ میرے ساتھ شمروز ہے۔ لیکن میں نے اُسے بتایا کہ شمروز کو ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا ہے۔ گوتم مجھ سے کچھ طلب کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اُس کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ رات ہی رات میں شمروز کو تلاش کر کے موت کے گھاٹ اُتار دے گا اور میری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ میں نے اُسے رات تین بجے گیسٹ ہاؤس کے پیچھے ایک ہٹ میں بلا لیا اور گلا گھونٹ کر اُسے ہلاک کر دیا۔ اگر وہ بچ کر نکل جاتا تو ہمارے لئے بہت سی پریشانیاں ہوسکتی تھیں۔ اور میں نہیں چاہتی کہ فی الحال تمہارے لئے مزید پریشانیاں پیدا ہوں۔''

''تم یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہو؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے لئے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ پریم میں

بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اور میں اس پریم شکتی پر وشواش رکھتی ہوں۔''

وہ چند لمحے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بیڈ سے اُتر کر وہ میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئی۔ اُس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور چہرہ اُٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''تم بھی..... ایک بار..... صرف ایک بار کہہ دو کہ مجھ سے پریم کرتے ہو۔ بس ایک بار کہہ دو.....''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا حویلی کا پھاٹک زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا.....

پھاٹک بدستور دھڑ دھڑایا جا رہا تھا اور رات کے سناٹے میں یہ آواز دُور تک پھیل رہی تھی۔

''کون ہو سکتا ہے؟'' سیتا نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے وحشت سی جھلکنے لگی تھی۔

''تم جانو.....'' میں نے کندھے اُچکا دیئے۔ ''میرا تو یہاں کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ تمہارا کوئی چاہنے والا ہو تو.....''

''یہ مذاق کا وقت نہیں ہے.....'' سیتا نے میری بات کاٹ دی۔ ''رات کو اس سمے کون ہو سکتا ہے؟''

''پولیس بھی ہو سکتی ہے۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ میں اس قدر پُرسکون کیوں تھا؟ حالانکہ اس قسم کی صورتحال میں تو مجھے بدحواس ہو جانا چاہئے تھا۔ ''دو گولیاں تم نے اس حویلی کے ہال کمرے میں چلائی تھیں۔ کیپٹن گوپال یہاں ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلاتا بھی رہا تھا۔ ممکن ہے ان گولیوں اور کیپٹن گوپال کی چیخوں کی آواز اس حویلی سے باہر نہ گئی ہو۔ لیکن بھاگتے ہوئے کیپٹن گوپال پر گیٹ کے قریب تم نے تین گولیاں چلائی تھیں۔ اُن کی آواز سناٹے میں دُور تک گونجی تھی۔ ہو سکتا ہے پولیس اسٹیشن قریب ہی ہو اور آواز تھانے تک پہنچی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گولیوں اور کیپٹن گوپال کی چیخوں کی آواز قریب کی کسی حویلی میں سن لی گئی ہو اور اُنہوں نے پولیس اسٹیشن فون کر دیا ہو۔''

''یہ ممکن نہیں۔'' سیتا بولی۔ ''گولیوں کی آواز بازگشت پیدا کرتی ہوئی فضا میں پھیلی تھی۔ اس طرح یہ اندازہ لگانا دُشوار ہوتا ہے کہ گولی کس جگہ سے چلائی گئی تھی۔''

''اگر پولیس نہیں تو کیپٹن گوپال کے دوست ہوں گے۔'' میں نے کہا۔ ''تم آفیسرز میس سے گوپال کو بلا کر لائی تھیں۔ وہاں تمہیں کسی اور نے بھی دیکھا ہوگا۔ کیپٹن گوپال کے واپس نہ پہنچنے پر اُنہیں تشویش ہوئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ اُس کے بارے میں پوچھنے کے لئے آئے ہوں۔''

''میں وہاں صرف ایک اردلی کے سامنے آئی تھی جسے پیغام دے کر میں نے کیپٹن گوپال کو الگ بلا لیا تھا۔ کسی اور کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ بہرحال.....'' وہ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''صورتحال مخدوش بھی ہو سکتی ہے۔ پر تمہیں چنتا کرنے کی

ضرورت نہیں۔ پرنتو احتیاط پھر بھی ضروری ہے۔ میں باہر جا رہی ہوں۔ تم ایسی جگہ کھڑے رہنا جہاں سے کسی ہنگامی صورتحال پر قابو پایا جا سکے۔''

ہم دونوں بیڈ رُوم سے باہر آ گئے۔ میں نے کیپٹن گوپال والا وہ پستول اُٹھا لیا جو سیتا نے صاف کر کے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اس میں سے پانچ گولیاں وہ چلا چکی تھی۔ دو تین گولیاں ہی بچی ہوں گی۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ خالی پستول بھی کسی پر دہشت طاری کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

بیڈ رُوم میں جانے سے پہلے سیتا نے بڑے ہال کی بتی بجھا دی تھی۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ سیتا میرا ہاتھ پکڑے محتاط انداز میں چلتی رہی۔ مجھے بھی اندازہ تھا کہ ہال میں کون سی چیز کہاں رکھی ہے لیکن اس کے باوجود میں ایک کرسی سے ٹکرا گیا۔ گھٹنے پر چوٹ لگی اور میں بے اختیار کراہ اُٹھا۔

''خیال سے.....'' سیتا نے میرا ہاتھ دبایا۔ ''بتی جلا دُوں؟''

''نہیں..... رہنے دو!'' میں نے گھٹنا سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اسی دوران گیٹ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا۔ انداز اب بھی وہی جارحانہ تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی عجلت میں ہو۔ ہم دونوں ایک بار پھر آگے چل پڑے۔ برآمدے والے دروازے کے قریب میں نے سیتا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور چند گز دُور کھڑکی کے قریب پہنچ گیا جس کے سامنے گہرے نیلے رنگ کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔

میں نے پردے کا ایک کونا سرکا کر باہر جھانکا۔ برآمدے میں غالباً ساٹھ واٹ کا بلب جل رہا تھا۔ برآمدے کے اندر اور اس کے آس پاس تو اس بلب کی روشنی معقولیت کی حد تک ٹھیک تھی لیکن اس سے آگے یہ روشنی بتدریج کمزور پڑتی چلی جا رہی تھی۔ تاہم گیٹ نظر آ رہا تھا۔

سیتا نے بولٹ گرا کر دروازہ کھول دیا اور باہر نکل گئی۔ وہ صرف ایک سیکنڈ کو برآمدے میں رُکی تھی۔ پھر سیڑھیاں اُتر کر تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی گیٹ کی طرف چلنے لگی کیونکہ اس دوران گیٹ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا تھا۔

گیٹ کے قریب پہنچ کر سیتا رُک گئی۔ اُس نے پہلے جھری میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ چند لمحے شاید تذبذب کا شکار رہی، پھر اُس نے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول دیا۔

میں پستول ہاتھ میں لئے کھڑکی سے لگا کھڑا تھا اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو کوئی عملی قدم اُٹھانے میں ایک لمحہ کی تاخیر نہیں کروں گا۔ لیکن اگلے ہی لمحہ ایک لڑکی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میری آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔ سیتا نے ایک لمحہ اُس سے کوئی بات کی، پھر دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھایا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی برآمدے کی طرف آنے لگی۔ برآمدے میں بلب کی روشنی میں اُس لڑکی کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ لیکن میں زیادہ دیر تک اُس کا جائزہ نہیں لے سکا تھا کیونکہ سیتا اُسے لے کر دروازے میں داخل ہو چکی تھی۔ اُس نے دروازہ بھی بڑی آہستگی سے بند کر کے بولٹ چڑھا دیا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اندھیرے میں اُس لڑکی کی تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اُس کی سانسوں کی آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا جیسے بہت دُور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو اور شاید کسی بات پر خوفزدہ بھی ہو۔

''مہابیر!'' اندھیرے میں سیتا کی آواز اُبھری۔ ''میرے ساتھ ایک مہمان ہے۔ میں اُسے لے کر بیڈ رُوم میں جا رہی ہوں۔ تم بھی وہیں آ جاؤ۔''

ظاہر ہے سیتا نے یہ بات مجھ سے ہی مخاطب ہو کر کہی تھی۔ وہ اُس لڑکی کے سامنے میرا اصل نام نہیں لینا چاہتی تھی اس لئے اُس نے مجھے مہابیر کے فرضی نام سے مخاطب کیا تھا۔

وہ دونوں غالباً دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی راہداری میں مُڑ گئی تھیں۔

اور جب میں نے بیڈ رُوم کے دروازے میں قدم رکھا تو وہ لڑکی عین میرے سامنے تھی۔ مجھے اور میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اُس لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی..... خوف سے اُس کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئی تھیں۔

''اوہ!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''ڈرو نہیں..... مجھے اس طرح پستول ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل نہیں ہونا چاہئے تھا۔'' میں نے آگے بڑھ کر پستول ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا اور مُڑ کر اُس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اور اب میری آنکھوں میں وحشت نمودار ہونے لگی تھی۔

وہ لڑکی اُس ہرنی کی طرح خوفزدہ تھی جو شکاریوں کے نرغے سے اپنی جان بچا کر بھاگی ہو۔ اُس کی عمر بمشکل سترہ سال رہی ہو گی۔ سرو قد، دُبلا پتلا بدن، چہرے کے نقوش نہایت جاذب، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تو واقعی کسی ہرنی سے مشابہ تھیں۔ اُس کی رنگت اگرچہ کسی قدر سانولی تھی لیکن اس میں بے پناہ کشش تھی۔ اُس کے بدن پر گھٹنوں سے اُوپر تک کا پیٹی کوٹ اور بلاؤز تھا۔ بلاؤز سامنے سے اور ایک کندھے سے پھٹا ہوا تھا۔ اُس کے نیم عریاں سینے پر اور دائیں بازو پر کھرونچوں کے نشان تھے۔ سر کے بال بھی اُلجھے ہوئے تھے۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ شاید وہ غنڈوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی اور کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگ نکلی تھی۔

مجھے دیکھ کر اُس نے دونوں ہاتھ سینے سے لپیٹ لئے۔ شاید وہ اپنی برہنگی چھپانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔ اُس کا یہ پھٹا ہوا اور مختصر لباس دیکھ کر یہ بھی اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی جو دھینگا مشتی کے دوران اُتر گئی تھی۔ بلاؤز بھی بہت مختصر تھا۔ پیٹ تو ناف تک برہنہ تھا ہی، بالائی جسم کی برہنگی چھپانے کی کوشش میں سینے کے اُبھار اُوپر کی طرف کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے۔

وہ لڑکی وحشت زدہ سی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی سیتا کو دیکھ رہی تھی۔ سیتا نے پلنگ پر پڑی ہوئی چادر اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی جسے اُس نے جلدی سے اپنے جسم پر لپیٹ لیا۔

''بیٹھ جاؤ!'' سیتا نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے بچا لو دیدی.....!'' لڑکی کی آواز خوف سے کپکپا رہی تھی۔ ''وہ لوگن میرے کو مار دیویں گے۔ میرے شریر کے ٹکڑے کر دیویں گے۔''

''ڈرو نہیں.....!'' سیتا نے کہا۔ ''یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ کوئی ہماری اجازت کے بغیر اس حویلی میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ!''

وہ لڑکی جھجکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چادر کے اندر اُس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ خوف سے اُس کے ہونٹ بھی سفید پڑ گئے تھے۔ وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ سیتا اُٹھ کر بیڈ کے دوسری طرف چلی گئی جہاں سائیڈ ٹیبل پر پانی سے لبریز جگ اور اس کے قریب ہی ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ اُس نے گلاس میں پانی انڈیلا اور لڑکی کے قریب آ گئی۔

''لو..... جل پی لو! تمہیں پیاس لگ رہی ہو گی۔''

لڑکی نے ایک ہاتھ چادر میں سے نکال کر گلاس کی طرف بڑھایا۔ لیکن اُس کا ہاتھ راستے ہی میں رُک گیا اور وہ بے بسی کی سی نظروں سے سیتا کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا.....؟'' سیتا نے پوچھا۔

''مم..... میں..... میں بچ جاتی کی..... ہوں دیدی.....'' وہ ہکلائی۔

''اوہ.....!'' سیتا بولی۔ ''تو اس لئے تم گلاس نہیں پکڑ رہیں۔ لیکن تم تو ہماری کرسی پر بیٹھی ہو۔ ہماری چادر بھی تم نے اوڑھ رکھی ہے۔''

لڑکی ایک جھٹکے سے کرسی سے اُتر گئی۔ اُس نے چادر جسم سے ہٹانا چاہی مگر رُک گئی۔ اُس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے اُبھر آئے تھے۔

''ڈرو نہیں.....!'' سیتا نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں جاتوں کی چھوٹائی بڑھائی کو نہیں مانتی۔ آرام سے بیٹھ جاؤ اور جل پیو۔ پیاس سے تمہارا حلق خشک ہو رہا ہے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ لیکن تم اس لئے یہ جل نہیں پی رہی ہو کہ تمہارے چھونے سے یہ گلاس نشٹ ہو جائے گا۔ لو! جل پیو اور بچ جاتی کا خیال دل سے نکال دو۔''

لڑکی نے عجیب سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی اور چادر میں سے ہاتھ نکال کر گلاس لے لیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق میں اُنڈیل لیا۔

سیتا نے اُس کے ہاتھ سے گلاس لے کر اُس میں کچھ اور پانی اُنڈیلا اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ واقعی ذات پات پر یقین نہیں رکھتی، اُس نے پانی پی لیا اور گلاس میز پر رکھ کر دوبارہ لڑکی کے قریب آ گئی۔ لڑکی اب بھی عجیب سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' سیتا نے اُس کے سامنے بیڈ پر پیر لٹکا کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کلپنا..... مارو نام کلپنا ہے دیدی!'' لڑکی نے جواب دیا۔

سیتا کچھ اور کہنا ہی چاہتی تھی کہ باہر کا گیٹ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا جانے لگا..... لڑکی اُچھل

کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کا چہرہ ایک بار پھر خوف سے دُھواں ہوگیا۔ اس خوف سے چادر کا ایک کو
اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ تیز سانس لینے سے اُس کا گداز سینہ غبارے کی طرح پھول پچک
رہا تھا۔

''ڈرو نہیں... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' سیتا اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''وہ جو کوئی بھی ہیں
اگر بری نیت سے اس حویلی کے دروازے پر آئے ہیں تو اپنے پیروں پر واپس نہیں جائیں گے
تم آرام سے یہاں بیٹھی رہو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ پرنتو باہر آنے کی کوشش مت کرنا۔''

سیتا نے مجھے اشارہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے
پستول نکالا اور سیتا کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گیا۔ اس مرتبہ سیتا نے ہال کی ایک بتی جلا لی تھی
اور برآمدے والا دروازہ کھول رہی تھی۔ حویلی کا گیٹ اب بھی دھڑ دھڑایا جا رہا تھا اور اس مرتبہ
اس کے ساتھ ہی کال بیل کی آواز بھی پوری شدت سے گونج اُٹھی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ
لگا لیا کہ وہ کم از کم دو آدمی تھے جن میں سے ایک گیٹ کو پیٹ رہا تھا اور دوسرے نے کال بیل
کے بٹن پر اُنگلی رکھ دی تھی۔

''کون ہے.....؟'' سیتا گیٹ کے قریب پہنچ کر چیخی۔ میں سائیڈ میں ہوگیا اور سیتا نے بے
دھڑک ذیلی دروازہ کھول دیا۔ ''کون ہو تم لوگ..... کیا پاگل ہوگئے ہو جو اس طرح آدھی رات
کو گیٹ پیٹ رہے ہو؟''

''معاف کرنا دیوی جی!'' باہر سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''ہماری چھوکری گھر سے
بھاگ گئی ہے۔ ہم اُسے تلاش کر رہے ہیں۔ یہاں کوئی ناری تو نہیں آئی تھوڑی دیر پہلے؟''

''چھوکری گھر سے بھاگ گئی ہے تو جا کر پولیس میں رپورٹ کرو۔ اس طرح لوگوں کو
پریشان کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے تمہیں۔'' سیتا نے غصے سے کہا۔

''اے..... اے.....'' ایک اور غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''جوبان کو قابو میں رکھ..... تم
جانت ناہیں ہو کس سے بات کرت ہو۔ ہمار پرشن کا جواب دیو! یہاں کوئی چھوکری تو ناہیں
آوت رہی ہے؟''

''میرا جوبان قابو میں ہے..... یہاں کوئی چھوکری نہیں آئی۔ جاؤ یہاں سے۔'' سیتا نے
جواب دیا اور دروازہ بند کرنا چاہا تو باہر سے کسی نے دروازے میں پیر پھنسا دیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا
جوگر پہنے ہوئے تھا۔

''ہمیں تمہار جوبان پر وشواس ناہی ہوت ہے۔ ہم تلاسی لیواں گے۔'' اُس شخص نے ایک
مرتبہ پھر غراتے ہوئے کہا اور دروازے کو دھکا دینے لگا۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ آدمی اندر گھس آیا۔
برآمدے سے آنے والی مدھم سی روشنی میں اُس کا جائزہ بخوبی لیا جا سکتا تھا۔ اُس کی صورت دیکھ
کر اُسے بلا تکلف ایک چھٹا ہوا بدمعاش کہا جا سکتا تھا۔ اور وہ تھا بھی چھٹا ہوا بدمعاش۔ وہ

درمیانے قد اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ اُس نے جینز اور بنیان پہن رکھی تھی۔ بازوؤں کے
اُبھرے ہوئے مسلز صاف نظر آ رہے تھے۔ دو تین دن کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ سر کے بال لمبے تھے
جنہیں چٹیا کی طرح باندھا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اُس نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا
تھا۔ میں نے پشت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ تیزی سے میری طرف مُڑا۔

''کیا بات ہے مہاشے؟ بڑے تپے ہوئے لگتے ہو۔ چھوکری بھاگ گئی ہے اس لئے؟'' میں نے
اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ اُچھل پڑا۔ ''اے.....!'' وہ غرایا۔ ''جانت نہ ہو کس سے بات کرت ہو؟ گنگو کہت ہیں
میرے کو..... گنگو دادا۔''

''گنگو دادا.....'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''یہاں سے جانے کا کیا لو گے؟'' میں نے
پستول والا ہاتھ سامنے کر دیا۔

''او بھایا.....'' وہ بدحواس سا ہوگیا۔ ''اس بندوکڑی کو اپنے بوجھ میں رکھ! ہم لڑت واسطے
ناہیں آیا ہوں۔ چھوکری کو ڈھونڈھت ہوں بھایا۔''

''کوئی چھوکری یہاں نہیں آئی..... چل بھاگ!'' میں نے پستول سے اشارہ کیا۔

''ناراج مت ہو بھایا!'' گنگو دادا دونوں ہاتھ سامنے جوڑتے ہوئے بولا۔ ''وہ چھوکری ہمارا
سب کچھ لے گیوت رے..... ہم تو اُس کو ڈھونڈھت ہوں۔ تو ناراج نہ ہو بھایا! ہم جاتا ہوں۔
ترت جاتا ہوں۔''

اور وہ واقعی ترت یعنی فوراً ہی باہر نکل گیا۔ مجھے اُس بدمعاش سے اس شرافت کی توقع نہیں
تھی۔ سیتا نے گیٹ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا اور ہم دونوں واپس آ گئے۔ سیتا نے برآمدے والا
دروازہ بند کر کے لاک کیا اور اُوپر کا بولٹ بھی چڑھا دیا۔ میں نے خود باقی دروازے بھی چیک
کئے اور ہم بیڈ رُوم میں آ گئے۔ وہ لڑکی کلپنا کمرے میں موجود نہیں تھی..... میرا دماغ بھک سے
اُڑ گیا۔ سیتا بھی پریشان ہوگئی۔

''اوئے! کہاں گئی وہ..... تلاش کرو اُسے کہیں باہر نکل گئی تو ان بدمعاشوں کے ہاتھوں
ماری جائے گی۔''

میرا خیال تھا کہ شاید موقع پا کر کلپنا برآمدے والے دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔ شاید
درختوں میں کہیں چھپی ہوئی ہو۔ میں کمرے سے نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آواز سن کر ہم
دونوں اُچھل پڑے۔

''میں یہاں ہوں دیدی..... کھاٹ کے نیچے۔''

یہ آواز بیڈ کے نیچے سے آئی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھا تو بے اختیار مسکرا دیا۔ کلپنا پلنگ
کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔

''وہ لوگ چلے گئے..... باہر آ جاؤ! اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ کہنیوں کے بل رینگتی ہوئی پلنگ کے نیچے سے نکل آئی۔ ایسا کرتے ہوئے چادر اُس کے جسم سے الگ ہوگئی تھی۔ پلنگ کے نیچے سے نکل کر اُس نے اپنے آپ کو ذرا سا اُوپر اُٹھایا تو میری نظریں اُس کے پھٹے ہوئے بلاؤز کے اندر رینگ گئیں۔ میرا سانس بے ربط ہونے لگا۔ خاکستری گھاٹیاں بڑا خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔

وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اُس نے اپنی برہنگی چھپانے کے لئے دونوں بازو ایک بار پھر سینے پر لپیٹ لئے۔ میں نے پلنگ کے نیچے پڑی ہوئی چادر اُٹھا کر اُس کی طرف اُچھال دی۔ اُس نے جلدی سے چادر اوڑھ لی۔

''وہ لوگ چلے گئے..... اب تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' سیتا نے کہا۔ ''تمہیں اس وقت کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جس سے تمہارے حواس قابو میں آسکیں۔ چائے پیوگی؟''

لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم یہاں بیٹھو..... میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' سیتا نے کہا۔ ''اور ہاں..... میں تمہیں دوسرے کپڑے دے دیتی ہوں، پہن لینا۔'' اُس نے وارڈ روب سے ہینگر پر ٹنگی ہوئی ایک ساڑھی نکال کر پلنگ پر ڈال دی۔ ساڑھی کے ساتھ بلاؤز اور پیٹی کوٹ بھی تھا۔

سیتا کمرے سے نکلی تو میں بھی اُس کے ساتھ ہی آ گیا۔ ظاہر ہے میرے وہاں کھڑے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔

کچن میں آ کر سیتا چائے بنانے لگی اور میں اُس کے قریب کھڑا اُسے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سیتا نے چائے صرف کلپنا کے لئے نہیں سب کے لئے بنائی تھی۔ میں تو اس وقت واقعی چائے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ اُس لڑکی کے آنے سے پہلے جب ہم باتیں کر رہے تھے تو اُس وقت مجھے نیند کے جھونکے آنے لگے تھے۔ اُس خستہ حال لڑکی کو دیکھ کر میری نیند غائب ہو گئی تھی اور گیٹ پر اُس بدمعاش سے نہایت مختصر سی ملاقات کے بعد تو نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اس وقت میں واقعی چائے جیسی چیز کی طلب محسوس کر رہا تھا۔

سیتا نے تینوں کپ ٹرے میں رکھے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اُٹھائی اور ہم کمرے کی طرف آ گئے۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اُسے گھمایا تو دروازہ نہیں کھلا۔ میں نے ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کلپنا نے کچھ کہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور پھر ایک منٹ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ کلپنا کپڑے بدل چکی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی اُس کے سانولے بدن پر خوب جچ رہی تھی۔ وہ دُبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ بلاؤز اُسے ڈھیلا تھا جس سے اُس کے سینے کا گداز جھلک رہا تھا۔

کلپنا نے اپنے اُتارے ہوئے کپڑے پلنگ کے نیچے ڈال دیئے تھے۔ سیتا نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور کلپنا کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ ''کتنی پیاری لگ رہی ہو۔'' وہ بولی۔

کلپنا شرما گئی۔ اب اُس کے چہرے پر خوف نہیں تھا۔ اُسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے اور یہاں اُسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی تو سیتا نے چائے کا ایک کپ اُس کی طرف بڑھا دیا اور خود بھی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں بھی سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے سے پہلے میں نے اپنا چائے کا کپ اُٹھا لیا تھا۔

میں اور سیتا چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کلپنا کی طرف دیکھتے رہے جو کپ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھی۔

''ہاں..... اب بتاؤ! یہ سب کیا ہے؟'' بالآخر سیتا نے اصل موضوع چھیڑ دیا۔ ''تم کون ہو؟ یہ دشٹ (بدمعاش) کون تھے اور تمہیں کیوں پکڑنا چاہتے تھے؟''

''میں پوکھران کی رہنے والی ہوں دیدی!'' کلپنا نے جواب دیا۔ ''میرے پتا جی دھوبی تھے۔ میں اور ماتا جی بھی دن رات اُن کے ساتھ کام کرتیں۔ لوگوں کے کپڑوں کی میل اُتار کر اُنہیں اُجلا کرنا ہمارا کام تھا۔ ہم کپڑے تو اُجلے کر دیتے لیکن لوگوں کے دلوں کا میل صاف کرنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ کبھی گھاٹ پر کپڑے دھوتی اور کبھی دُھلے ہوئے کپڑے لوگوں کے گھروں پر بھی پہنچاتی۔ میں چھوٹی عمر سے ہی یہ کام کر رہی تھی۔ پہلے پتا جی کے ساتھ جایا کرتی تھی، پھر اکیلی بھی جانے لگی۔

اُس روز میں ٹھاکر ہوش سنگھ کی حویلی پر کپڑے لے کر گئی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس سمے میری بدبختی کا زمانہ بھی شروع ہونے والا ہے۔ میں حویلی کے ڈیوڑھے میں بیٹھی ٹھاکرانی کے ساتھ کپڑوں کا حساب کر رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ٹھاکرانی کا بھائی ٹھاکر بلبیر سنگھ ایک طرف کھڑا مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے ایک دو مرتبہ اُس کی طرف دیکھا بھی تھا مگر خیال نہیں کیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ستر سالہ ٹھاکر کی نیت میں کھوٹ ہے۔

اس کے بعد میں نے ٹھاکر بلبیر سنگھ کو دھوبی گھاٹ کے چکر لگاتے ہوئے دیکھا۔ وہ دیر تک میرے پتا جی کے پاس کھڑا باتیں کرتا رہتا۔ باتیں تو وہ پتا جی سے کرتا لیکن اُس کی نظریں میری طرف لگی ہوتیں۔ تم جانو دھوبی گھاٹ پر کپڑے پٹختے ہوئے ہمارا حلیہ کیا ہوتا ہوگا۔ ساڑھی کا پلو تو بدن پر ٹکتا ہی نہیں۔ کبھی میں بوڑھے ٹھاکر کی نظریں اپنے بدن پر چبھتی ہوئی محسوس کرتی۔ وہ کمبخت کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتا رہتا تھا۔

پھر یکایک ٹھاکر بلبیر سنگھ حویلی سے غائب ہو گیا۔ پتہ پڑا کہ وہ جیسلمیر سے آیا ہوا تھا۔ یہاں چند روز رہ کر واپس چلا گیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اُس بڈھے کی میلی نظروں سے نجات مل گئی تھی۔ مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ چند روز بعد وہ واپس آ گیا۔ اور پھر اُس کا آنا جانا لگا رہا۔ وہ اگر شام کو جیسلمیر واپس جاتا تو صبح پھر پوکھران آ جاتا۔ اُس کے پاس موٹر تھی اور ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ کیا معنی رکھتا تھا۔ اور پھر میرے پتا جی کا دیہانت ہو گیا۔ اُنہیں گردن توڑ تاپ (بخار) چڑھا تھا۔ اُن کا بہت علاج کروایا مگر ایک ہفتے کے اندر اندر اُن کے جیون کا انت ہو گیا۔

اُس روز میں کپڑے لے کر حویلی گئی تو اُس بڈھے ٹھاکر نے پہلی مرتبہ مجھ سے بات کی، میرے پتا جی کے گزر جانے کا افسوس کیا اور مجھے سو روپے بھی دیئے۔ اُس وقت ٹھاکرانی موجود نہیں تھی۔ میں نے روپے لے لئے۔ میرے من میں کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ دھن وان ہم جیسے کمی کاروں کو بخشش دیتے ہی رہتے تھے۔

اس کے چند روز بعد میرا چاچا رام چند دھوبی ہمارے گھر آیا۔ رام چند دھوبی میرا سگا چاچا نہیں ہے۔ وہ دیر تک ماتا جی سے کھسر پھسر کرتا رہا اور بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی باتوں کے جواب میں میری ماتا جی بار بار انکار میں سر ہلاتی رہیں۔

رام چند دھوبی کا کئی روز ہمارے گھر آنا جانا لگا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری ماتا جی اور اُس میں کیا کھسر پھسر ہوتی تھی؟ پرنتو مجھے لگتا تھا جیسے وہ میری ماتا جی کو کسی بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور شاید ماتا جی نے ہار مان لی۔ رام چند دھوبی کھل اُٹھا۔ اُس نے میری ماتا جی کو کچھ نوٹ بھی دیئے۔ ماتا جی نے نوٹ چولی کے گریبان میں چھپاتے ہوئے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا بھی تھا مگر میں کچھ نہیں سمجھ سکی تھی..... یہ ایک ہفتے پہلے کی بات ہے۔'' کلپنا نے گہرا سانس لیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''اس سے اگلے روز ماتا جی مجھے لے کر جیسلمیر آ گئیں۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم ایک پرانے مندر کی یاترا کے لئے جا رہے ہیں۔ جب ہم جیسلمیر کے لاری اڈے پر بس سے اُترے تو یہاں رام چند دھوبی ہمارے استقبال کو موجود تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ وہ ہمیں ایک موٹر میں بٹھا کر ایک حویلی میں لے گیا۔ پہاڑی کے قریب یہ حویلی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ وہ ٹھاکروں کا علاقہ تھا۔ آس پاس اور بھی بہت سی اور بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔

اور پھر اُسی شام حویلی میں بڈھے ٹھاکر بلبیر سنگھ کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے ماتا جی سے کچھ پوچھنا چاہا تو اُس نے ہنس کر ٹال دیا۔ میرے دل میں کھد بدی ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ کسی پرانے مندر کی یاترا کے بہانے مجھے دھوکے سے یہاں لایا گیا ہے۔ دوسرے دن میں ماتا جی کے پیچھے پڑ گئی۔ میں اصل بات جاننا چاہتی تھی۔ اور پھر ماتا جی نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ ماتا جی اُس بڈھے ٹھاکر سے میری شادی کرنے والی ہیں جو عمر میں شاید میرے دادا سے بھی بڑا تھا۔ میں چیخ اُٹھی۔ ماتا جی نے مجھے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ وہ رام چند دھوبی کے ذریعے ٹھاکر سے دو ہزار روپے لے چکی تھی اور اُسے تین ہزار روپے اور ملنے والے تھے۔ گویا پانچ ہزار میں مجھے بیچ دیا گیا تھا..... میں بہت روئی پیٹی، چیخی چلائی مگر ماتا جی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ رام چند دھوبی بھی پہلے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں زندگی بھر عیش کروں گی۔ ٹھاکرانی بن کر راج کروں گی لیکن میں نے ضد نہیں چھوڑی تو وہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگا۔ ایک مرتبہ میرے منہ پر طمانچہ بھی مار دیا۔ اور پھر ایک روز ماتا جی پر بھی یہ سنسنی خیز انکشاف ہو گیا کہ ہمارے ساتھ واقعی دھوکہ ہو رہا ہے۔ اُس روز ماتا جی نے رام چند دھوبی کو ایک اور آدمی کے

ساتھ باتیں کرتے ہوئے سن لیا تھا۔

یہ ٹھاکر برہمن اور اُونچی جاتی کے لوگ ہم جیسے نیچ جاتی والوں کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ ہمیں ملیچھ کہا جاتا ہے۔ ہمارے کپڑوں کو چھو کر گزرنے والی ہوا اُن کے کپڑوں کو بھی چھو کر گزر جائے تو وہ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ پرنتو کسی حسین ناری کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے، اُس کے بدن کو اپنے بدن سے مسلتے ہوئے، اپنا پوتر خون اُس ناری کے خون میں شامل کرتے ہوئے انہیں احساس نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس وقت نہ وہ ناری ملیچھ ہوتی ہے اور نہ وہ دیوتا۔

''وہ بڈھا ٹھاکر بھی مجھے دیکھ کر میری خوبصورتی اور میری جوانی پر ریجھ گیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ اُونچی جاتی کا ٹھاکر ہے اور میں نیچی جاتی کی ہوں۔ اُس کے من میں کھوٹ تھا، ہوس تھی۔ وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

رام چند دھوبی نے میری ماتا جی سے کہا تھا کہ ٹھاکر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اپنی پتنی بنا کر عالیشان حویلی میں رکھے گا۔ مجھے ٹھاکرانی بنائے گا۔ میں راج کروں گی۔ مگر اُس رات ماتا جی نے رام چند دھوبی کی دوسرے آدمی سے باتیں سنیں تو وہ کانپ اُٹھی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ بڈھا ٹھاکر میرے خوبصورت شریر سے اپنی ہوس کی آگ بجھانا چاہتا تھا جس کے لئے اُس نے میری ماتا جی کو پانچ ہزار روپے دے دیئے تھے۔ ایسے دھن وانوں کے لئے پانچ ہزار روپے کیا معنی رکھتے تھے۔

ماتا جی کو رام چند دھوبی اور اُس آدمی کی باتوں سے پتہ چل گیا کہ ہمیں دھوکے سے یہاں لایا گیا ہے۔ وہ بڈھا ٹھاکر چند روز مجھے برتتا، میرے خوبصورت شریر سے اپنی ہوس کی آگ بجھاتا پھر مجھے اپنے کارندوں کے حوالے کر دیتا جو جیون بھر میری بوٹیاں نوچتے رہتے۔

پرسوں رات ماتا جی نے مجھے ساتھ لے کر حویلی سے بھاگنے کی کوشش کی مگر ہمیں پکڑ لیا گیا۔ حویلی میں رام چند دھوبی اور ماتا جی میں خوب لڑائی ہوئی۔ ماتا جی نے غصے میں رام چند دھوبی کے کپڑے پھاڑ دیئے اور رام چند دھوبی نے طیش میں آ کر ماتا جی کے سر پر لوہے کی سلاخ سے زوردار ضرب لگائی..... ماتا جی کا سر پھٹ گیا۔ بھیجہ بہہ نکلا اور ماتا جی نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی.....

مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور حویلی پر دو خطرناک دشٹوں کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ میں بند کمرے میں بیٹھی روتی اور تڑپتی رہی مگر کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ آج شام دو عورتیں حویلی میں آ گئیں۔ مجھے اُس کمرے سے نکالا گیا۔ اُن دونوں عورتوں نے مجھے نہلایا دھلایا، اچھے کپڑے پہنائے اور مجھے خوب بنایا سنوارا گیا۔ وہ دونوں عورتیں صورتوں ہی سے بڑی حرافہ لگتی تھیں۔ ایک موقع پر میں نے مزاحمت کی تو ایک عورت نے میری پٹائی کر دی۔

آدھی رات کے سمے مجھے ایک اور کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ہمیں حویلی میں رہتے ہوئے کئی

روز ہو گئے تھے مگر یہ کمرہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ بہت شاندار کمرہ تھا۔ اُسے اُس بڈھے ٹھاکر کی عشرت گاہ کہنا ٹھیک ہوگا۔ دیواروں پر عورتوں کی ایسی بڑی بڑی رنگین تصویریں لگی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر شرم آتی تھی۔ ایک عورت تو بالکل ننگی بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ دونوں عورتیں اُس وقت تک کمرے میں بیٹھی رہیں جب تک وہ بڈھا ٹھاکر نہیں آ گیا۔ عورتیں کمرے سے چلی گئیں تو بڈھے ٹھاکر نے دروجہ بند کر کے کنڈا لگا دیا۔ اُس نے دارو پی رکھی تھی۔ کمرے میں آ کر بھی اُس نے دارو پینا شروع کر دی۔ کئی گلاس پی کر وہ میری طرف آیا۔ میں اُس کی بنتی کرنے لگی..... اُس کے آگے ہاتھ جوڑے، اُس کے چرنوں پر گر گئی کہ میرا جیون نشٹ نہ کرے۔ پر اُس نے میری ایک نہیں سنی۔ اُس کے سینے میں تو ہوس کی آگ جل رہی تھی۔ اُس نے میرے شریر کو پانے کے لئے میری ماتا کو پانچ ہزار روپے دیئے تھے وہ مجھے کیسے چھوڑ دیتا۔

اُس نے میری ساڑھی کھینچ کر اُتار دی۔ اور پھر میرا بلاؤز اُتارنے لگا..... میں نے بنتی چھوڑ دی اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں چیخ رہی تھی مگر میری فریاد سننے والا کون تھا؟ میری مدد کو کون آتا؟ حویلی میں موجود دوسرے لوگ تو میری چیخیں سن کر خوش ہو رہے ہوں گے کہ ان کی محنت سپھل ہوئی اور بڈھا ٹھاکر میرے شریر کو روند رہا ہے۔

میرا بلاؤز پھٹ گیا..... اُس کمبخت ٹھاکر کی بانہوں میں بڑی شکتی تھی۔ اُس نے مجھے شکنجے کی طرح دبوچ رکھا تھا۔ پرنتو مجھے اپنے آپ کو چھڑانے کا ایک موقع مل گیا۔ میں اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آ گئی جہاں پیتل کا ایک گلدان بھی رکھا ہوا تھا جس میں پھول سجے ہوئے تھے۔ بڈھا ٹھاکر میری طرف لپکا تو میں نے پیتل کا گلدان اُٹھا کر اُس کے سر پر دے مارا۔ اُس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا..... وہ چیختا ہوا قالین پر گر گیا۔ میں دوڑ کر دروجے کے قریب آ گئی۔ پھر یہ سوچ کر رُک گئی کہ یہاں سے باہر نکلوں گی تو رام چند دھوبی اور اُس کے ساتھی مجھے پکڑ لیں گے۔ میں دوڑ کر کھڑکی کے قریب آ گئی اور کھڑکی کھول کر باہر کود گئی۔ یہ حویلی کا پچھلا حصہ تھا۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ پچھلی دیوار کے ساتھ اُوپر جانے کے لئے تنگ سی سیڑھیاں تھیں جہاں ایک چھوٹا سا کمرہ بھی بنا ہوا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر دیوار پر آ گئی اور باہر چھلانگ لگا دی۔

حویلی کے اندر شور مچ گیا تھا..... بڈھے ٹھاکر نے چیخ چیخ کر رام چند دھوبی اور اُن دشٹوں کو بتا دیا تھا کہ میں اُسے زخمی کر کے پچھلی طرف سے بھاگ گئی ہوں۔ وہ لوگ بھی دیوار پھاند کر حویلی سے باہر آ گئے اور مجھے پکڑنے کے لئے دوڑ پڑے۔ میں اپنی جان بچانے کے لئے بھاگتی رہی۔ ایک موقع پر رام چند دھوبی نے مجھے پکڑ لیا۔ میں نے اُس کے بازو پر دانت گاڑھ دیئے، وہ درد سے چیخ اُٹھا۔ میں اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑا کر بھاگ نکلی۔ میں بری طرح بدحواس تھی۔ موت کا خوف دماغ پر سوار تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر ان دشٹوں کے ہاتھ لگ گئی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میری بدھی نے کام چھوڑ دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں

جاؤں..... اور پھر میں اس حویلی کے پھاٹک کے سامنے رُک گئی۔ اندر برآمدے میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے وشواش تھا کہ یہاں مجھے پناہ مل جائے گی۔ اور دیدی..... کلپنا خاموش ہو گئی۔ اُس نے اُٹھ کر سیتا کے چرن چھو لئے، پھر میری طرف رُخ کر کے دونوں ہاتھ جوڑے۔

''اگر آپ دونوں مجھے پناہ نہ دیتے تو وہ لوگ مجھے خونخوار بھیڑیوں کی طرح چیر پھاڑ دیتے۔''

''اب تمہیں تسلی ہو گئی نا کہ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔'' سیتا نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''اُن کا خوف ذہن سے نکال دو! یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔'' سیتا اُس سے کچھ اور باتیں پوچھتی رہی، پھر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''اس پریشانی سے چھٹکارا پانے کے لئے تمہیں آرام اور گہری نیند کی ضرورت ہے۔ آؤ میں تمہیں دوسرے کمرے میں بھیج دُوں۔ بے فکر ہو کر آرام سے سو جاؤ..... باقی باتیں صبح ہوں گی۔'' سیتا اُسے لے کر کمرے سے نکل گئی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ سیتا پانچ منٹ بعد واپس آ گئی۔

''دیکھا تم نے....'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہے ہمارا دھرم جو کئی ذاتوں میں بٹا ہوا ہے۔ اُونچی ذات کے لوگ اپنے آپ کو بہت پوتر اور دیوتا سمجھتے ہیں۔ نیچی ذات والے اُن کی نظروں میں ملیچھ ہیں۔ وہ اُن کو چھو کر آنے والی ہوا سے بھی بچتے ہیں۔ لیکن ہوس کی آگ جب سینے میں بھڑکتی ہے تو وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اُنہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ پوتر اور دیوتا ہیں اور جس ناری کو وہ اپنے وجود تلے روندرہے ہوتے ہیں وہ کم ذات اور ملیچھ ہے۔''

میں گہرا سانس لے کر رہ گیا اور جواب دینے کی بجائے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ ساڑھے تین سے اُوپر کا وقت ہو رہا تھا۔ اُس وقت میرا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ سیتا نے دروازہ بھیڑ دیا اور پھر وہ بھی میرے ساتھ بیڈ پر لیٹ گئی۔ چند لمحوں بعد ہی اُس کی سنجیدگی رُخصت ہو گئی اور وہ ایک بار پھر شرارتوں پر اُتر آئی.....!!

○

وہ نسوانی چیخ کی آواز تھی.....

اُس وقت میرے دماغ پر غنودگی سی طاری تھی مگر چیخ کی آواز سن کر میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا اور اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ عقبی سمت والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے سامنے پڑا ہوا پردہ ہولے ہولے ہل کھا رہا تھا۔

چیخ کی وہ آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ میں اُسے اپنا واہمہ سمجھ کر لیٹ گیا۔ لیکن اُسی لمحے چیخنے کی آواز دوبارہ سنائی دی..... اس مرتبہ یوں لگا تھا جیسے کسی جوان لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے چیخنے سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہو..... جوان لڑکی کا خیال آتے ہی میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ سیتا بھی اس مرتبہ چیخنے کی آواز سن کر جاگ گئی تھی۔

''کیا ہوا..... کون چیخا تھا؟'' وہ بدحواس سی ہو رہی تھی۔ اُس کے ذہن پر بھی نیند کا غلبہ تھا۔

میں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بڑی آہستگی سے بیڈ سے اُتر کر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے پستول نکالا اور ننگے پیر دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اُسے آہستگی سے گھمانے کی کوشش کی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ وہ لاک بھی نہیں تھا اور اُوپر کی چٹخنی بھی نہیں لگی ہوئی تھی۔ میں نے گھوم کر سیتا کی طرف دیکھا وہ بھی اپنا شب خوابی کا لباس درست کرتی ہوئی پلنگ سے اُتر آئی۔

''کیا ہوا؟'' اُس نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کوئی کلپنا کے کمرے میں موجود ہے اور اس دروازے کو باہر سے کنڈا لگا دیا گیا ہے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

میرے ذہن میں بدترین خدشے جنم لے رہے تھے اور نجانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ کوئی حویلی میں گھس آیا ہے اور کلپنا کو زبردستی یہاں سے لے جانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میں عقبی دروازے کی طرف لپکا مگر سیتا نے میرا بازو پکڑ لیا اور ایک اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دروازہ ملحق کمرے میں کھلتا تھا۔ سامنے پردہ لٹکا ہوا تھا۔ سیتا نے پردہ ہٹا کر بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا اور ہم دوسرے کمرے میں آگئے۔ اُس کمرے کا راہداری میں کھلنے والا دروازہ محض بھڑا ہوا تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ پہلے احتیاط سے باہر جھانکا اور پھر سیتا کو وہیں رُکنے کا اشارہ کر کے باہر آگیا۔

راہداری میں قالین بچھا ہوا تھا۔ میں ننگے پیر تھا اور قدموں کی آواز بالکل نہیں اُبھر رہی تھی۔ میں تاریک ہال میں آگیا۔ ہال کے دوسری طرف والی راہداری کے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے میں جلنے والے نائٹ بلب کی مدھم سی نیلگوں روشنی باہر بھی آرہی تھی اور اُس کمرے سے دھینگا مشتی اور خرخراہٹ کی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ہال میں پڑے ہوئے فرنیچر سے بچتا ہوا ہر ممکن تیزی سے آگے بڑھا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور اندر دو آدمی کلپنا کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور کلپنا پوری شدت سے مزاحمت کر رہی تھی۔ ان دو بدمعاشوں میں سے ایک تو وہی گنگو تھا جو تین گھنٹے پہلے میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر دُم دبا کر بھاگ گیا تھا۔

میں غنڈوں اور بدمعاشوں کی فطرت سے واقف نہیں تھا۔ مجھے اُن کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ اس وقت میں نے گنگو اور اُس کے ساتھی کو جانے دیا تھا اور مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ تاک میں رہیں گے اور موقع پاتے ہی واپس آجائیں گے۔

گنگو نے ایک ہاتھ کلپنا کے منہ پر جما رکھا تھا اور دوسرا بازو اُس کے سینے پر لپیٹ کر اُسے گرفت میں لے رکھا تھا۔ جبکہ اُس کا دوسرا ساتھی کلپنا کی دونوں ٹانگوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور کلپنا اپنے آپ کو بچانے کے لئے بری طرح ٹانگیں چلا رہی تھی۔

میں نے مُڑ کر دیکھا، سیتا بھی مجھ سے دو قدم پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اُسے ایک بار پھر

خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے کے عین سامنے آگیا۔

''حیرت ہے....'' میں نے اُونچی آواز میں کہا۔ ''دو آدمی ایک چھوکری کو قابو نہیں کر سکتے۔''

وہ دونوں بری طرح اُچھل پڑے۔ اور اس بدحواسی میں کلپنا اُن کی گرفت سے نکل گئی۔ کلپنا آزاد ہوتے ہی میری طرف دوڑی لیکن اُس کا پیر اپنی ساڑھی میں اُلجھا اور وہ چیختی ہوئی منہ کے بل میرے سامنے گری۔

میں نے کلپنا کی طرف دیکھا اور اس ایک لمحہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے گنگو کے ساتھی نے میری طرف چھلانگ لگا دی..... وہ گنگو کے مقابلے میں قدرے دراز قامت تھا اور اُس کا جسم بھی خاصا مضبوط تھا۔ اُن دونوں میں ایک فرق بہت نمایاں تھا۔ گنگو کے بال لمبے تھے جنہیں اُس نے چوٹی کی صورت میں باندھ رکھا تھا اور یہ دوسرا بدمعاش گنجا تھا۔

اُس کے پیر کی ٹھوکر میرے پستول والے ہاتھ پر پڑی..... پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر چمگادڑ کی طرح ہوا میں اُڑتا ہوا دیوار کے ساتھ ایستادہ الماری کے اُوپر جا گرا۔

میں اس صورتحال سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ گنجے کی دوسری ٹھوکر میرے گھٹنے پر لگی..... میں کراہتا ہوا ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔ اُس کا ہتھوڑے کی طرح وزنی گھونسہ میرے پیٹ پر پڑا۔ میں دوہرا ہو گیا۔ اگلا گھونسہ میری ٹھوڑی پر لگا۔ میرے منہ سے ایک اور کراہ نکلی..... میں سیدھا ہو کر لڑکھڑا گیا۔

میری زندگی لڑتے ہوئے گزری تھی لیکن بدترین دشمن کے خلاف وہ لڑائی کسی اور نوعیت کی تھی۔ رائفلوں کی لڑائی، مشین گنوں کی اور گولہ بارود کی لڑائی..... ہند و فوجیوں سے دو بدو لڑائی کا موقع بہت کم ملا تھا۔ میں اگرچہ ہر لڑائی میں سرخرو رہا تھا لیکن غنڈوں کے ساتھ اس لڑائی نے مجھے وقتی طور پر بدحواس کر دیا تھا۔

گنجا بدمعاش مجھ پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا اور گنگو نے ایک بار پھر کلپنا کو دبوچ لیا تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ لیکن اس بار ایک فرق تھا کہ اُس کی چیخیں آزاد تھیں۔ مگر اُس کے چیخنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک تو رات کا آخری پہر تھا۔ اس علاقے میں بڑی بڑی حویلیاں اور محل نما عمارتیں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھیں اور ویسے بھی ٹھاکروں اور مہاراجوں کی حویلیوں سے راتوں میں ناریوں کی چیخیں گونجتی ہی رہتی تھیں۔ کسی کو ان چیخوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

گنجے بدمعاش نے ایک اور مُکا مارا۔ اس مرتبہ اُس نے میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں تیزی سے ایک طرف جھکا تو گھونسہ وزنی ہتھوڑے کی طرح میرے کندھے پر پڑا اور میں کراہتا ہوا نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بھی پہلی مرتبہ داؤ آزمانے کا موقع مل گیا۔

میں نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے گنجے کے دونوں پیروں کو ٹخنوں سے ذرا اُوپر سے زور سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گر گیا۔ میں بڑی تیزی سے اُٹھ کر

کھڑا ہو گیا اور گنجے کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اُسے اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

گنجا دیر تک پٹتا رہا۔ پھر اُس نے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا...... میں بری طرح لڑکھڑا گیا لیکن اپنے آپ کو گرنے سے بچا لیا۔ اس دوران گنجا بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ گنجے نے ایک دم چھلانگ لگا کر مجھ سے لپٹنے کی کوشش کی مگر میں تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا اور وہ اپنی ہی جھونک میں آگے جا کر الماری سے ٹکرا گیا۔ ابھی وہ سنبھلنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے پیچھے سے ایک لات رسید کر دی...... وہ کراہتا ہوا دوبارہ الماری سے ٹکرایا۔ اس مرتبہ اُس کے منہ سے بڑی خوفناک چیخ نکلی تھی۔ الماری کے تالے میں چابی لگی ہوئی تھی اور اُس گنجے کا سر اُس چابی سے ٹکرایا تھا۔ چابی اُس کی گنجی کھوپڑی میں پیوست ہو گئی اور جب ایک جھٹکے سے وہ پیچھے ہٹا تو زخم سے بہنے والا خون اُس کی پیشانی اور چہرے کو تر کر رہا تھا۔ اُس کا چہرہ بڑا بھیانک ہو گیا تھا۔

سیتا بھی کمرے میں گھس آئی۔ اُس نے آتے ہی گنگو پر حملہ کر دیا اور کلپنا کو اُس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ گنگو نے کلپنا کو چھوڑ دیا اور سیتا کو پکڑ کر پوری قوت سے پیچھے دھکیل دیا۔ سیتا لڑکھڑاتی ہوئی پلنگ پر گری...... اس کے ساتھ ہی اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ یہ چیخ کسی خوف کی وجہ سے نہیں نکلی تھی۔ اُس کا باریک شب خوابی کا لباس سامنے سے پھٹ گیا تھا۔ اُس نے کوئی زیر جامہ بھی نہیں پہنا ہوا تھا...... وہ بالکل برہنہ ہو گئی......

گنگو کی آنکھوں میں وحشیانہ سی چمک اُتر آئی۔ وہ سیتا کی طرف لپکا لیکن قالین پر پڑی ہوئی کلپنا اُچھل کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"دیدی...... بھاگ جاؤ!" کلپنا چیخی۔

گنگو جھٹکے دے کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران سیتا کو موقع مل گیا۔ وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ گنگو نے کلپنا پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ کلپنا چیختی رہی لیکن گنگو کی ٹانگیں نہیں چھوڑیں۔ گنگو نے اُس کی کھوپڑی پر زوردار گھونسہ مارا۔ اس مرتبہ کلپنا کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اور گنگو کی ٹانگیں اُس کی گرفت سے آزاد ہو گئیں......

میں نے گنجے بدمعاش کو پشت کی طرف سے اس طرح گرفت میں لے رکھا تھا کہ اُس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر دونوں بازو پیچھے کی طرف موڑ رکھے تھے اور وہ پیر کی ایڑھی سے میری پنڈلی پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اُس کے سر سے بہنے والا خون اب اُس کے لباس کو بھی تر کر رہا تھا۔

کلپنا سے نجات مل جانے کے بعد گنگو کو اب اس طرف توجہ دینے کا موقع مل گیا تھا۔ اُس نے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا اور میری پشت پر وار کرنے کے لئے بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا میری طرف لپکا۔

میں گنجے بدمعاش کو اس طرح گرفت میں لئے ہوئے تیزی سے گھوم گیا کہ گنجا میری ڈھال بن گیا۔ اُس کا سینہ سامنے تھا اور دوسرے ہی لمحہ کمرہ اُس کی بھیانک چیخ سے گونج اُٹھا...... گنگو کا خنجر دستے تک اُس کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا۔ گنگو کا ہاتھ ابھی تک خنجر کے دستے پر تھا۔ پھر

وہ اس طرح پیچھے ہٹا جیسے بجلی کا زبردست کرنٹ لگا ہو...... عجیب سے خوف کی شدت سے اُس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ آنکھیں دہشت کے مارے حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔

گنجا شیطان میری گرفت میں پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا...... اسی لمحے سیتا دوبارہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ بڑی عجلت میں لباس تبدیل کر کے آئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں لوہے کی تین فٹ لمبی سلاخ تھی۔ لیکن کمرے کا منظر دیکھ کر وہ اس طرح رُک گئی جیسے زمین نے اُس کے پیر پکڑ لئے ہوں۔ سیتا شاید ابھی تک اس صورتحال کو سمجھ نہیں پائی تھی کہ گنگو چیختا ہوا اپنی جگہ سے اُچھلا...... اُس کا رُخ سیتا کی طرف تھا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ سیتا پر حملہ آور ہوا ہے۔ سیتا نے بھی سنبھلنے کی کوشش کی مگر میرا اور سیتا کا اندازہ بھی غلط نکلا۔ گنگو نے سیتا پر حملہ نہیں کیا تھا۔ وہ سیتا سے ٹکرایا اور اُسے پوری قوت سے ایک طرف دھکیل کر دروازے کے باہر راہداری میں گرا۔ سیتا بھی دروازے سے ٹکرا کر چیختی ہوئی نیچے گری تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا گنگو نے اُٹھ کر راہداری میں ایک طرف چھلانگ لگا دی۔

گنجا بدمعاش ابھی تک میری گرفت میں تڑپ رہا تھا۔ اُس کے زخم سے بہنے والا خون لباس کو تر کرتا ہوا پیروں کے قریب قالین پر گر رہا تھا۔ اُس کے تڑپنے سے خون کے چھینٹے اِدھر اُدھر بھی اُڑ رہے تھے۔ میں نے تڑپتے ہوئے گنجے بدمعاش کو قالین پر ڈال دیا اور دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ راہداری میں پہنچتے ہی میں مُڑ کر ہال کی طرف دوڑا۔

گنگو حویلی کے عقبی طرف گیا تھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز اُس طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے بھی اُس طرف چھلانگ لگا دی۔ ایک صوفے سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا، پھر سنبھل کر دوڑ لگا دی۔ اس طرف بھی ایک کشادہ اور مختصر سی راہداری تھی۔ دائیں بائیں ایک ایک کمرہ تھا اور سامنے وہ اُونچا دروازہ تھا جو عقبی سمت میں کھلتا تھا۔ گنگو اُسی دروازے سے نکلا تھا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میں بھی دوڑتا ہوا باہر آ گیا اور اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کسی طرف سے قدموں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ گنگو درختوں میں کہیں چھپ گیا ہے۔ میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر ایک عجیب سی آواز سن کر چونک گیا...... وہ آواز ایسی تھی جیسے بلی درخت کے تنے کو پنجوں سے نوچ رہی ہو۔

میں نے آواز کی سمت دیکھا اور پھر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ایک انسانی ہیولہ ناریل کے درخت پر چڑھتا ہوا دکھائی دیا...... وہ گنگو کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ بندر کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھا تھا۔ ناریل کا وہ درخت حویلی کی بیرونی دیوار سے صرف تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔ بلندی پر پہنچ کر گنگو دیوار پر چلا گیا۔ اُس نے غالباً پیچھے مُڑ کر دیکھا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس نے باہر چھلانگ لگا دی۔

میرے منہ سے ایک بار پھر گہرا سانس نکل گیا۔ اُس کے پیچھے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں واپس مُڑا، راہداری میں داخل ہوا، دیوار ٹٹول کر بتی جلائی اور دروازہ بند کرتے ہوئے اُس

کا جائزہ لینے لگا۔ گنگو اور اُس کا گنجا ساتھی اسی دروازے سے اندر آئے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ اُنہوں نے دروازہ کس طرح کھولا ہوگا حالانکہ کلپنا کے آنے کے بعد سیتا نے خود تمام دروازے چیک کیے تھے۔ اور پھر بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس دروازے میں اوپر یا نیچے کوئی بولٹ نہیں تھا۔ صرف ہضمی قفل تھا۔ سیتا نے یقیناً ناب دبا کر دروازہ لاک کیا ہوگا۔ لیکن کسی تار وغیرہ کی مدد سے باہر سے بھی تالا کھولنا ناممکن نہیں تھا۔ گنگو وغیرہ اسی طرح یہ دروازہ کھول کر اندر آئے تھے۔

کلپنا کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا۔ آنکھیں دہشت سے جیسے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اُس کے بدن پر ہلکی سی کپکپاہٹ بھی طاری تھی۔ گنجا ختم ہو چکا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف اس طرح خون بکھرا ہوا تھا جیسے کسی بکرے کے گلے پر چھری پھیر کر چھوڑ دیا گیا ہو۔

''ڈرو نہیں کلپنا!'' میں گھٹنوں کے بل اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''اسے ہم نے نہیں مارا۔ گنگو نے خنجر کا وار مجھ پر کیا تھا مگر یہ زد میں آ گیا۔''

''میں بھی اسے یہی سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ دشٹ اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔'' سیتا نے کہا پھر کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لاش کے سینے میں پیوست اس خنجر کو دیکھو..... پہچانو اسے۔ اب تم اُس بڈھے ٹھاکر کی حویلی میں تھیں تو یہی دونوں بدمعاش تمہاری نگرانی کر رہے تھے۔ تم نے گنگو کے پاس یہ خنجر ضرور دیکھا ہوگا۔ یہ اُس کا خنجر ہے اور یہ گنجا اُس کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ تمہاری چیخوں کی آواز سن کر جب مہابیر اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو خالی ہاتھ تھا۔''

''مجھے وشواش ہے دیدی! کہ اس غنڈے کو تم میں سے کسی نے نہیں مارا۔'' کلپنا لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے تو خوشی ہے کہ یہ مارا گیا اور اذیت کی موت مارا گیا۔ میں نے اسے آخری لمحوں تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ کتنی بے رحم موت مرا ہے یہ راکھشس..... اسے تو اس سے بھی زیادہ اذیت ناک موت مرنا چاہئے تھا۔ پرنتو مجھے اس کی بھیانک شکل دیکھ کر ڈر لگ رہا ہے۔''

میں نے بے اختیار لاش کی طرف دیکھا۔ پھٹی پھٹی سی آنکھیں اور خون سے آلودہ چہرہ واقعی بہت بھیانک ہو گیا تھا..... اُسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔

''تم تو ایک بہادر لڑکی ہو۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بڑے کشٹ اُٹھائے ہیں۔ جولڑکی بوڑھے ٹھاکر اور رام چند دھوبی اور گنگو جیسے بدمعاشوں کے چنگل سے نکل آئے اُسے بھلا اور کس بات کا خوف ہو سکتا ہے..... یہ بے جان لاش کسی کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟''

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ ''اسے اپنے کمرے میں لے چلو! اس کا زیادہ دیر یہاں رُکنا ٹھیک نہیں۔''

''تم بھی چلو..... تم یہاں رُک کر کیا کرو گے.....؟'' سیتا نے کلپنا کو سہارا دے کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

اُس نے ٹھیک کہا تھا۔ میرے وہاں رُکنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے الماری پر پڑا ہوا پستول اُٹھا لیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے یکایک مجھے احساس ہوا کہ اُس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور سیتا اُسے بمشکل سہارا دیئے ہوئے تھی۔ مجھے کلپنا کی حالت پر ترس آنے لگا۔ ایک ہی رات میں وہ زندگی کے سنگین ترین تجربات سے دوچار ہوئی تھی۔ اُس کی ماں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا، اُس کی عزت نیلامی کی سولی پر چڑھ گئی تھی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی عزت بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ گنگو اور گنجے جیسے شہر کے خطرناک ترین غنڈے مرتیوں (موت) کے فرشتوں کی طرح اُس کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔ ہم نے اُسے اپنی حویلی میں پناہ دی تھی۔ وہ ہم سے مطمئن ہو گئی تھی۔ اُس کا خوف دُور ہو گیا تھا۔ لیکن موت کے فرشتے بھی کسی طرح حویلی میں گھس آئے تھے اور یہاں جو کچھ بھی ہوا تھا اُسے دیکھ کر وہ دہل گئی تھی۔ اُس پر اتنا خوف طاری ہوا تھا کہ اُس سے اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔

دوسری طرف سے میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے چلانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کلپنا سے اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول سیتا کو تھما دیا اور جھک کر کلپنا کو گود میں اُٹھا لیا۔ وہ مچلنے لگی۔

''نہیں نہیں..... مجھے اُتار دو جیجا جی! میں چل لوں گی۔'' وہ بولی۔

میں سیتا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اُس کے لبوں پر بھی مسکان آ گئی۔ کلپنا ہمیں پتی پتنی ہی سمجھی تھی۔

''شانت ہو شریر لڑکی!'' میں نے کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے اس وقت تم اپنے قدموں پر نہیں چل سکتیں۔''

کلپنا نے میری طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ اُس نے شرم کے مارے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ سیتا میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

گنجے بدمعاش اور گنگو سے دھینگا مشتی کرتے ہوئے کلپنا کا یہ بلاؤز بھی پھٹ گیا تھا اور اُس کا سانولا سینہ عریاں ہو رہا تھا۔ میری نظریں اُس کے سینے کے گداز زیر و بم کے ساتھ متحرک ہو رہی تھیں۔ میں بار بار نگاہوں کا زاویہ بدلنے کی کوشش کرتا مگر نظریں پھر وہیں ٹک جاتیں۔

کمرے میں آ کر میں نے اُسے پلنگ پر ڈال دیا۔ کلپنا نے اب بھی چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا رکھا تھا۔ سیتا نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی نظروں میں شوخی تھی۔ وہ وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی اور کپڑوں کا ایک جوڑا نکال لیا جو لہنگے اور چولی پر مشتمل تھا۔

''کلپنا!'' اُس نے کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اُٹھو اور باتھ رُوم میں جا کر کپڑے بدل لو!''

کلپنا ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور سیتا کے ہاتھ سے کپڑے لے کر باتھ رُوم میں گھس گئی۔ چند منٹ بعد وہ کپڑے بدل کر باہر آ گئی۔ اُسے اس لباس میں دیکھ کر میرے منہ سے ایک بار پھر گہرا سانس نکل گیا۔ گھاگھرا منی اسکرٹ کی طرح گھٹنوں سے اُوپر تھا اور چولی بھی اس قدر اُونچی تھی کہ پورا پیٹ برہنہ ہو رہا تھا۔ گریبان بھی فراخ تھا۔ اس لباس میں تو اُس کے بدن سے کچھ اور بھی سیکس پھوٹنے لگی تھی۔

''اب میں الگ کمرے میں نہیں سوؤں گی دیدی..... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' کلپنا نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب تمہیں الگ کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں..... بلکہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر سیتا کی طرف دیکھا۔

''گنگو بھاگ گیا ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''اُس کا اپنا ہی ساتھی اُس کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس سے یہ توقع نہیں کہ وہ ہمارے خلاف پولیس کو اطلاع دے گا۔ اس طرح وہ خود بھی پھنس جائے گا۔ البتہ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس بڈھے ٹھاکر بلبیر سنگھ کو بتا دے کہ کلپنا کو ہم نے چھپا رکھا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ ہماری حویلی پر چڑھ دوڑے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ لاش کو غائب کر کے فرنیچر اور قالین سے خون کے دھبے صاف کر سکیں۔ ہم خود بھی پولیس کے پاس نہیں جا سکتے اس طرح میں نظروں میں آ جاؤں گی اور تم بھی محفوظ نہیں رہ سکو گے۔ اگر ٹھاکر بلبیر سنگھ ہماری حویلی کا رُخ کرتا ہے تو گنجے کی لاش کی موجودگی ہمارے لئے مصیبت کا باعث بن سکتی ہے۔''

''پھر..... کیا ارادہ ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''صبح ہوتے ہی ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔'' سیتا نے جواب دیا اور الماری کے اُوپر سے وہ بیگ اُتار لیا جو ہم نے پٹھان کوٹ سے خریدا تھا اور جس میں ہمارے کپڑے وغیرہ تھے۔ یہاں آنے کے بعد یہ بیگ کھولنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

بیگ کی سائیڈ زِپ کھول کر اُسے بڑا کیا جا سکتا تھا اور سیتا نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح بیگ میں اتنی گنجائش نکل آئی کہ اس میں کپڑوں کے کئی جوڑے اور بھی رکھے جا سکتے تھے۔ وہ وارڈ روب کھول کر اُس میں سے کپڑے نکالنے لگی۔ زنانہ جوڑوں کے علاوہ اُس نے تین چار مردانہ جوڑے بھی نکالے تھے۔

''اگر گنگو پکڑا گیا تو تمہارا راز چھپا نہیں رہ سکے گا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ پولیس کو بتا دے گا کہ یہاں تم سے سامنا ہوا تھا۔ اس طرح پولیس سمجھ جائے گی کہ.....''

''گنگو تو مجھے نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔'' سیتا نے میری بات کاٹ دی۔ ''وہ صرف یہی بتائے گا نا کہ اُس نے اس حویلی میں ایک عورت اور ایک مرد کو دیکھا تھا۔ وہ حلیہ بھی بتائے تو

پولیس مجھے شناخت نہیں کر سکے گی۔ میں کوئی ایسی ہستی تو نہیں ہوں کہ مجھے شہر کا ہر شخص پہچانتا ہو۔ اور تمہیں کون جانتا ہے مہابیر؟'' سیتا نے آخر میں میرے نام پر خاص زور دیا تھا۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''صرف چتون سنگھ ایک ایسا شخص ہے جو جیسلمیر میں میری موجودگی سے واقف ہے۔ لیکن وہ ہمارا وفادار ملازم ہے۔ ذات کا راجپوت ہے۔ اُس نے ہمارا نمک کھایا ہے وہ میرے بارے میں کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ البتہ یہاں سے جاتے ہی پہلی فرصت میں اُسے صورتحال سے آگاہ کرنا ہوگا۔''

''اس کا کیا کرو گی؟'' میں نے کلپنا کی طرف اشارہ کیا۔

''ظاہر ہے ہم اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گی.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''حالات کچھ بہتر صورت اختیار کریں گے تو اسے کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے گا جہاں یہ راکھشس اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔'' باتیں کرتے ہوئے وہ بیگ میں کپڑے بھی رکھتی جا رہی تھی۔

''یہاں سے نکل کر کہاں جائیں گے..... کوئی محفوظ جگہ؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یوں تو ہمارے لئے جیسلمیر میں بہت سی پناہ گاہیں ہیں لیکن فوری طور پر سلاوٹ پاڑے والا مکان ہمارے لئے زیادہ محفوظ رہے گا۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''سلاوٹ پاڑہ؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''شہر کے ایک محلے کا نام ہے..... اس کے بارے میں تفصیل بعد میں بتاؤں گی۔'' سیتا نے کہا اور اپنے کام میں مصروف رہی۔

کلپنا کو بھی پتہ چل گیا کہ ہم یہاں سے جانے والے ہیں۔ وہ بھی ذہنی طور پر ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔

ہماری تیاری مکمل ہوگئی۔ ہم دن کی روشنی طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ منہ اندھیرے نکلنا مناسب نہیں تھا۔ کسی کی نظروں میں آئے تو ہم پر کسی قسم کا شبہ کیا جا سکتا تھا۔

میں پستول ہاتھ میں لئے ہال کمرے میں برآمدے والے دروازے کے عین سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ گنگو کے فرار کے بعد میرے خیال میں کسی بھی لمحہ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور میں غیر محتاط نہیں رہنا چاہتا تھا۔

○○○

دن کی روشنی پھیلنے لگی۔

حویلی کے سامنے سڑک پر اِکا دُکا گاڑیوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ گھروں
دودھ سپلائی کرنے والوں کی سائیکلوں پر لگے ہوئے دودھ کے ڈبوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز
بھی سنائی دینے لگیں۔ پینتیس لاکھ کی آبادی کا شہر، گولڈن سٹی جیسلمیر اپنی تاریخ کی ایک نئی
کا آغاز کر رہا تھا۔

میرے ذہن میں جنم لینے والے خدشات کم از کم اس وقت تک بے بنیاد ثابت ہوئے تھے
گنگو نے نہ تو پولیس کو اطلاع دی تھی اور شاید نہ ہی ٹھاکر بلبیر سنگھ سے رابطہ کیا تھا۔ اُس کے ا
ہاتھوں ایک قتل ہو چکا تھا اور شاید وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے کسی پناہ گاہ میں چھپ گیا تھا۔

صورتحال اگرچہ ابھی تک پُرسکون اور ہمارے حق میں تھی لیکن میں غیر محتاط نہیں رہنا چا
تھا۔ باہر سے آنے والی ہر آواز پر میں ہوشیار ہو جاتا۔ معاملہ صرف گنگو کا ہی نہیں تھا۔ بھا
فوج کا ایک ذمہ دار آفیسر کیپٹن گوپال سنگھ بھی اس حویلی کی زمین میں دفن تھا۔ گزشتہ رات
اُسے آفیسرز میس سے بلا کر لائی تھی اور پھر اُسے واپس جانا نصیب نہیں ہوا تھا۔

کیپٹن گوپال اکثر و بیشتر آوارہ عورتوں کے ساتھ داد عیش دینے کے لئے اس حویلی میں
رہتا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے دوست بھی ہوتے تھے اور ظاہر ہے وہ بھی فوجی آفیسر ہی تھے
گزشتہ رات کیپٹن گوپال کی غیر حاضری سے شاید وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ گوپال کسی عورت
لے کر حویلی میں آیا ہوا ہے۔ آج صبح اُس کی واپسی کا انتظار ہو گا اور جب وہ اپنی ڈیوٹی پر نہ
پہنچے گا تو اُس کے افسروں کو تشویش ہو گی۔ اُس کے دوستوں سے پوچھا جائے گا اور پھر اُس
بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے اس حویلی کا رُخ کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی فو
آفیسر ہماری موجودگی میں یہاں تک پہنچ گیا تو ہمارے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی
میں نے سیتا کے سامنے بھی اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تھا۔

''تمہاری سوچ غلط نہیں ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا خیال ہے وہ لوگ گوپا
کے بارے میں پہلے چھاؤنی ہی میں پتہ لگانے کی کوشش کریں گے۔ چھاؤنی میں بعض فو
افسروں کے بنگلے بھی عیاشی کے اڈے بنے ہوئے ہیں۔ پہلے وہ اس طرف پتہ لگائیں گے۔
اگر کسی کو حویلی کا خیال آ بھی گیا تو دوپہر سے پہلے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اور ظاہر ہے ہم اُ
وقت تک یہاں نہیں ہوں گے۔''

یہ بیس پچیس منٹ پہلے کی بات تھی۔ سیتا کچھ دیر میرے پاس بیٹھی کھڑکی سے بیرونی گیٹ کو دیکھتی رہی پھر اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا باہر دیکھتے ہوئے یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ پھر میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ کلپنا ایک صوفے پر آڑھی ترچھی پڑی اونگھ رہی تھی اور سیتا کچن میں تھی۔ میں ایک بار پھر گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ مزید پندرہ منٹ بعد میں سیتا کی آواز سن کر پیچھے مُڑا۔ وہ سینٹر ٹیبل پر ناشتہ لگا رہی تھی۔ اُس نے کلپنا کو آواز دی تو وہ بھی ہڑبڑا کر اُٹھ گئی۔

یہ اُس حویلی میں ہمارا آخری ناشتہ تھا۔ ذہن منتشر ہونے کے باوجود میں نے سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ البتہ چائے کی طلب باقی رہی۔ سیتا نے چائے کہیں اور پینے کا پروگرام بنایا تھا۔ اُس وقت آٹھ بج رہے تھے۔ شہر میں کاروبارِ حیات کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے اور سیتا کے خیال میں اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔ اُس نے اشارہ کیا اور ہم روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔

سیتا نے تمام کمروں کی بتیاں بجھا دیں۔ میں بیگ اُٹھا کر برآمدے میں آ گیا۔ اُس ایک بیگ میں ہم تینوں کے کپڑے تھے۔ سیتا نے برآمدے والا دروازہ بھی بند کر دیا اور ہم برآمدے سے نکل کر گیٹ کی طرف چلنے لگے۔

سیتا نے پہلے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر ہمیں اشارہ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ پہلے کلپنا اور پھر میں گیٹ سے باہر آیا۔ سامنے کشادہ سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت جاری تھی۔ لیکن رہائشی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔

ہم حویلی سے نکل کر دائیں طرف چلنے لگے۔ سیتا اور کلپنا آگے تھیں۔ میں بیگ کندھے پر لادے کسی مزدور کی طرح اُن سے چند قدم پیچھے چل رہا تھا۔ سیتا اور کلپنا نے ایک ہی جیسے لباس پہن رکھے تھے۔ گھٹنوں سے اُوپر منی اسکرٹ کی طرح اونچے گھاگھرے اور اُوپر مختصر سی چولیاں۔ یہ بڑا عجیب سا لباس تھا۔ کپڑا چولی کے صرف سامنے والے حصے پر تھا جس سے سینے کا کچھ حصہ ڈھکا ہوا تھا جبکہ پشت پر باریک ڈوریوں کی بندشیں تھیں۔ دونوں کی پشت بالکل برہنہ تھی۔ لیکن حویلی سے باہر نکلنے سے پہلے اُن دونوں نے چنریاں اوڑھ لی تھیں۔ ان سے نہ صرف پشت ڈھک گئی بلکہ اُن دونوں نے سامنے اس طرح گھونگھٹ نکال لئے کہ چہرے بھی چھپ گئے۔

میری نظریں بار بار اُن دونوں کی پنڈلیوں کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ کلپنا اگرچہ دُبلی پتلی سی تھی لیکن اُس کی پنڈلیاں گداز اور بھری بھری سی تھیں۔ سیتا کی پنڈلیاں تو اُس سے بھی زیادہ غضب ناک تھیں۔

ہمارے قریب سے اگرچہ ایک دو خالی ٹیکسیاں اور آٹو رکشے بھی گزرے تھے لیکن سیتا نے کسی کو نہیں روکا۔ صبح کے وقت چونکہ لوگ اپنے کام دھندوں پر جاتے تھے اس لئے رکشے اور ٹیکسیوں والے بھی سواریاں مل جانے کی اُمید پر ایسے علاقوں میں گھومتے رہتے تھے۔ تقریباً پچاس گز آگے جا کر ہم بائیں طرف ایک اور سڑک پر مُڑ گئے۔ اُس طرف تقریباً پچاس گز مزید

آگے ایک چھوٹی مارکیٹ تھی۔ اس طرف سامنے سے آتے ہوئے ایک رکشے کی رفتار ہمارے قریب پہنچ کر سست ہوگئی۔ سیتا نے اشارہ کیا تو رکشہ رُک گیا۔

ہم تینوں آسانی سے آٹو رکشہ میں بیٹھ گئے۔ بیگ بھی پیروں کے قریب رکھ لیا گیا۔ سیتا نے ڈرائیور کو ریلوے سٹیشن چلنے کو کہا تو رکشہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔

ریلوے سٹیشن کے سامنے اُس وقت خاصا رش تھا۔ جے پور سے آنے والی ٹرین اُس وقت وہاں پہنچی تھی اور پندرہ بیس منٹ بعد بیکانیر کی طرف ایک ٹرین روانہ ہونے والی تھی۔

رکشہ چھوڑ کر ہم ریلوے سٹیشن کی طرف چلنے لگے۔ لیکن ظاہر ہے ہمیں ٹرین پر سفر نہیں کرنا تھا اس لئے سٹیشن میں داخل ہونے کی بجائے ایک جگہ پر رُک گئے۔ یہاں جے پور سے آنے والی ٹرین سے اُترنے والے بہت سے مسافر جمع تھے۔ سامان بھی بکھرا ہوا تھا۔ رکشہ ٹیکسیوں کے ڈرائیور اور بگھیوں کے کوچوان بھی اُنہیں پریشان کر رہے تھے۔ صرف دو منٹ رُکنے کے بعد ہم ایک آٹو رکشہ پر سوار ہوگئے۔ سیتا نے اس مرتبہ ڈرائیور کو سلاوٹ پاڑہ چلنے کو کہا تھا۔

رکشہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ سلاوٹ پاڑہ شہر کی گنجان آبادی کا علاقہ تھا۔ ہم ایک جگہ رکشے سے اُتر گئے اور تنگ سی گلیوں میں پیدل چلنے لگے۔ اس مرتبہ میں درمیان میں تھا، سیتا میرے دائیں اور کلپنا بائیں طرف چل رہی تھی۔ ہم جس گلی میں چل رہے تھے وہ کافی کشادہ تھی۔ دونوں طرف دُکانیں اور اُوپر رہائشی مکانات تھے۔ گلی کا فرش پتھروں سے بنا ہوا تھا اور چلنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ آس پاس کے مکان سلاوٹ طرزِ تعمیر کا حسین شاہکار تھے۔ دروازوں کے ساتھ دیواروں اور بالکونیوں پر پتھروں پر بہت حسین اور باریک میناکشی کا کام تھا۔ مجھے دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی تھی۔

یہ سلاوٹ پاڑہ تھا۔ جہاں آبادی کی اکثریت سلاوٹوں پر مشتمل تھی۔ ان کے علاوہ اس علاقے میں مجبور، سپاہی، بنجارے، چھیپا اور چوڑی گر ذات کے لوگ بھی بکثرت آباد تھے۔

سیتا چلتے چلتے مجھے مختصر طور پر سلاوٹوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ پتھروں پر باریک او نہایت خوبصورت نقش و نگار بنانے والی یہ ہنرمند قوم صدیوں سے یہاں آباد تھی۔ گولڈن سٹ (جیسلمیر) کے پیلے پتھروں سے بنے ہوئے محلات اور حویلیوں پر نقش و نگار اور سنگ تراشی اُن کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ راجستھان کے علاوہ ہندوستان کے بیشتر مندروں کی دیواروں اور ستونوں پر نازک اور حسین نقش و نگار بھی انہی سلاوٹوں کی مہارت اور محنت کے مرہون منت ہیں۔ انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو جیسلمیر کے سلاوٹوں نے سندھ کی طرف نقل مکانی شروع کر دی۔ یہ لوگ پہلے حیدر آباد میں آباد ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ لوگ کراچی کا رُخ کرنے لگے۔

پتھروں پر نازک نقش و نگار اُبھارنے والے ان سلاوٹوں کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔ ان کے ہاتھوں میں کمال کی صفائی ہے۔ چھینی کو ایک خاص انداز میں پتھر پر رکھا جاتا ہے اور ہتھوڑا

کی نازک ضربوں سے پتھر پر نازک اور خوبصورت نقش اُبھرنے لگتے ہیں۔

ہم ایک اور کشادہ گلی میں نکل آئے۔ یہاں بھی رہائشی مکان تھے جو علاقے کے دوسرے مکانوں سے خاصے بڑے تھے۔ یہ خالص رہائشی علاقہ تھا۔ دُکانیں اِکا دُکا ہی تھیں۔ ہم تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کر کے اس سڑک سے ایک اور کشادہ اور پتھریلی گلی میں مُڑ گئے۔ مجھے حیرت تھی کہ سیتا نے میل ڈیڑھ میل دُور رکشہ کیوں چھوڑ دیا تھا؟ جبکہ ان کشادہ گلیوں میں گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی اور ہمارا رکشہ بھی آسانی سے اس طرف آ سکتا تھا۔ لیکن ذرا سا سوچنے کے بعد اپنے اس سوال کا جواب بھی خود ہی مل گیا تھا۔ سیتا خاصی محتاط واقع ہوئی تھی۔ حویلی سے نکل کر ہم رکشہ یا ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھے یہاں آ سکتے تھے۔ لیکن محض اس خیال سے کہ رکشہ یا ٹیکسی کے ذریعے ہماری منزل کا پتہ نہ لگا لیا جائے ہم پہلے ریلوے سٹیشن گئے تھے پھر دوسرے رکشے میں بیٹھ کر سلاوٹ پاڑہ آئے تھے اور رکشہ چھوڑ کر پیدل ہی ان گلیوں میں گھوم رہے تھے۔

لیکن اس مرتبہ ہمیں زیادہ نہیں چلنا پڑا۔ اس پتھریلی گلی میں تقریباً بیس گز آگے سیتا ایک مکان کے سامنے رُک گئی۔ مکان کا لکڑی کا دروازہ خاصا اُونچا اور اتنا چوڑا تھا کہ ایک کار آسانی سے اندر داخل ہو سکتی تھی۔ آبنوسی رنگت کی لکڑی کا محرابی دروازہ خاصا بھاری لگتا تھا۔ اس پر بھی سنگ تراشی کی طرح دیدہ زیب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دروازے کے دونوں طرف دیواروں کے ساتھ پتھر کی ایک چوکی بنی ہوئی تھی۔ چوکی پر ایک آدمی آسانی سے بیٹھ سکتا تھا۔ ان چوکیوں کے ساتھ ہی دیواروں کے ساتھ آرائشی ستون بنے ہوئے تھے جن پر ہنومان اور دوسری دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں کندہ تھیں۔ دیواروں پر بھی نیچے سے اوپر تک نازک اور خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دروازے کے عین اُوپر جہاں محراب تھی، ایک بڑا طاقچہ بنا ہوا تھا جس میں وشنو کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔

سیتا نے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ میں نے بیگ کندھے سے اُتار کر دیوار کے ساتھ چوکی پر رکھ دیا۔ گلی میں لوگوں کی آمد و رفت تھی لیکن کوئی خاص طور پر ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ تقریباً دو منٹ بعد بھاری دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر عورت کی صورت دکھائی دی۔ اتفاق سے اس وقت میں اور کلپنا سامنے تھے۔ وہ عورت اُلجھی ہوئی نظروں سے باری باری ہماری طرف دیکھنے لگی۔

''کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''ارے..... میں ہوں دُرگا! دروازہ پوری طرح کھولو۔ ہمیں اندر تو آنے دو! پھر پوچھنا کس کو ملنا ہے۔'' سیتا کی آواز سن کر دُرگا نامی اُس عورت نے مزید آگے ہو کر دروازے سے باہر جھانکا اور سیتا کو دیکھ کر اُچھل پڑی۔

''سیتا دیوی آپ.....'' اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''میں بڑی ابھاگیہ ہوں کہ تمہارے درشن ہوئے۔ آؤ..... اندر آؤ! آپ بھی پدھاریئے مہاراج..... اندر آ جائیے!'' اُس نے بات کرتے ہوئے ہم تینوں کو پرنام بھی کیا۔

میں نے پہلے سیتا اور کلپنا کو اندر داخل ہونے کا موقع دیا پھر بیگ اُٹھا کر خود بھی اندر داخل ہو گیا۔ دُرگا نے دروازہ بند کر دیا۔ سیتا کو دیکھ کر وہ کھلی جا رہی تھی۔ لگتا تھا سیتا کے آنے سے اُسے بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی۔

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ باہر سے معمولی نظر آنے والا یہ مکان اندر سے کسی حویلی کی طرح بہت شاندار اور بہت بڑا تھا۔ دروازے سے آگے ایک کشادہ اور پختہ روش تھی جو سامنے عمارت کے پورٹیکو تک چلی گئی تھی۔ پختہ روش کے دونوں طرف سرسبز لان تھے جن کے کناروں پر پھولدار پودوں کی کیاریاں تھیں۔ ایک طرف کا لان نسبتاً بڑا تھا اور اُس کے عین وسط میں فوارہ بھی لگا ہوا تھا جس کے اطراف میں تین جگہوں پر بانس کی کھپچیوں کے آرام دہ بینچ بنے ہوئے تھے۔ ہر بینچ پر دو آدمی آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔ دوسرے لان میں بھی تین بینچ رکھے ہوئے تھے۔ دونوں لانز کے اطراف میں ناریل کے اُونچے درختوں کی قطاریں تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ آہنی جالی کا ایک بہت بڑا پنجرہ تھا جس میں دو مور ٹہل رہے تھے۔

میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ گنجان آبادی میں ہونے کے باوجود یہ حویلی الگ تھلگ سی لگتی تھی۔ دائیں بائیں فصیل نما دیواریں خاصی اُونچی تھیں اور ان اطراف کے مکان اُن کے پیچھے چھپ کر رہ گئے تھے۔ حویلی کی عمارت دو منزلہ تھی۔ اُس کے پیچھے بھی کوئی مکان نظر نہیں آ رہا تھا جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس حویلی کے اطراف میں تمام مکان چھوٹے تھے۔ حویلی کی دو منزلہ عمارت بہت خوبصورت تھی۔ اُوپر کی منزل پر کئی خوبصورت محرابیں اور بالکونیاں تھیں۔ سب سے اُوپر ایک بہت بڑی اور خوبصورت چھتری بنی ہوئی تھی۔

''پدھاریئے مہاراج..... آپ رُک کیوں گئے؟'' دُرگا کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے بیگ اُٹھایا اور اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

وسیع و عریض پورٹیکو میں نیلے رنگ کی ایک پرانی سی کار کھڑی تھی۔ یہ پرانی کار اس شاندار حویلی سے بالکل لگا نہیں کھاتی تھی۔ پورٹیکو کے ساتھ برآمدے تک پہنچنے کے لئے تین کشادہ سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ سیڑھیاں اور وسیع و عریض برآمدے کا فرش دودھیا ماربل کا تھا۔ برآمدے کے ستونوں پر بھی ماربل لگا ہوا تھا۔ برآمدے کے کناروں پر پودوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ ہر ستون کے ساتھ رکھے ہوئے گملے میں بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ اُن کی پتیاں چاول کے دانوں کی طرح گول، ملائم اور کسی قدر لمبی تھیں اور یہ بیلیں اُوپر تک ستون کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ ماربل صرف اُس برآمدے ہی میں نظر آ رہا تھا۔ باقی عمارت پیلے پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ میں نے شہر میں اب تک جتنی بھی عمارتیں دیکھی تھیں سب پیلے پتھروں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ سیتا نے بتایا تھا کہ شہر کے گرد و نواح میں پہاڑیاں پیلے پتھروں ہی کی تھیں اور شہر کی تعمیر کے لئے پتھر وہیں سے لائے جاتے تھے۔ ریگستان میں پائی جانے والی پہاڑیوں کے پیلے

پتھروں کی ایک خاصیت یہ تھی کہ اُن میں سونے کی طرح چمک تھی۔ اور یہ چمک کبھی ماند نہیں پڑتی تھی۔ اور غالباً اسی وجہ سے اس شہر کو گولڈن سٹی کہا جاتا تھا۔

برآمدے کے دروازے سے آگے آٹھ فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا ایک کمرہ تھا اور اُس کے اندرونی دروازے کے دوسری طرف ایک وسیع لابی یا ہال تھا ایک کمرہ دائیں طرف تھا اور دو بائیں طرف۔ دائیں طرف والا کمرہ ہال ہی کی طرح بہت لمبا چوڑا تھا جس میں درمیانے درجے کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور دروازہ تھا اور اُس طرف غالباً کچن تھا۔ بائیں طرف بھی دراصل دو ہی دروازے تھے۔ ایک تو بیڈ رُوم تھا اور دوسرے دروازے سے آگے ایک کشادہ راہداری تھی۔ اُس میں بھی آمنے سامنے ایک ایک کمرہ تھا۔ یہ دونوں کمرے بھی بیڈ رُومز تھے۔ اور سامنے باتھ رُوم کا دروازہ تھا۔

لابی کے آخر میں اُوپر جانے کے لئے لکڑی کا کشادہ اور بل کھاتا ہوا گول زینہ تھا۔ زینے کے ساتھ سامنے والی دیوار کے آدھے حصے میں بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے اور باقی آدھے حصے میں باریک جالی تھی۔ اس طرف سے تازہ ہوا اور روشنی اندر آ رہی تھی۔ اُس لابی میں بھی ایک الگ کارپٹ بچھا ہوا تھا اور آمنے سامنے والی دیواروں کے ساتھ ذرا ہلکے قسم کے مگر آرام دہ صوفے لگے ہوئے تھے۔ میں نے بیگ قریبی صوفے پر رکھ دیا تھا۔

''اوپر آ جاؤ..... وہیں چل کر بیٹھیں گے۔'' سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے دوبارہ بیگ اُٹھانا چاہا تو سیتا کے اشارے پر میں نے بیگ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ میں اور کلپنا، سیتا کے ساتھ گول زینے پر چڑھتے ہوئے اُوپر آ گئے۔ اُوپر کا نقشہ بھی ویسے ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں برآمدے کی چھت پر بھی ایک کمرہ بنا ہوا تھا اور اُس سے آگے پورٹیکو کی چھت پر دبیز گھاس اُگی ہوئی تھی اور کناروں پر پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ زینے کے اختتام پر سامنے وسیع و عریض لابی تھی۔ مزید اُوپر جانے کے لئے دیوار کے ساتھ ماربل کی سیڑھیاں تھیں۔ ہم زینے کے سامنے لابی میں سے ہوتے ہوئے بائیں طرف والے ہال کمرے میں داخل ہو گئے۔ نیچے والا ہال کمرہ تو ڈرائنگ رُوم کے طور پر آراستہ تھا جبکہ یہ وسیع و عریض کمرہ بیڈ رُوم کا منظر پیش کر رہا تھا۔

اس خوابگاہ کو دیکھ کر میری آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وسط میں ایک بہت بڑا گول بیڈ تھا جس پر ہلکے گلابی رنگ کی ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی۔ بیڈ کی ایک سائیڈ پر ٹیک بنی ہوئی تھی جس کے ساتھ خوبصورت تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ان تکیوں ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس گول بیڈ پر کس طرف سر ہونا چاہئے اور کس طرف پیر۔

ایک طرف بہت قیمتی اور آرام دہ صوفہ بھی آراستہ تھا جبکہ ایک دیوار کے قریب سرکنڈے سے بنے ہوئے موڑھے بھی رکھے ہوئے تھے۔ بیڈ کے پچھلی طرف ایک شاندار بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے پچھلی طرف دیوار کے ساتھ شیشے کی لمبی چوڑی الماری تھی جس میں لاتعداد

خوبصورت گلاس اور جام آراستہ تھے لیکن شراب کی کوئی بوتل کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کھڑکیاں بھی محرابی اور کافی کشادہ تھیں جن کے سامنے ہرے رنگ کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد سیتا نے آمنے سامنے کی دیواروں پر صرف دو بتیاں جلائی تھیں۔ بلبوں کے سامنے شیڈ لگے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ روشنی دیواروں سے پھوٹ رہی ہو۔ ماحول بڑا خواب آگیں سا لگ رہا تھا۔ چھت پر تین فانوس بھی ٹنگے ہوئے تھے۔ درمیان والا فانوس بڑا تھا اور دائیں بائیں والے نسبتاً چھوٹے۔ لیکن سیتا نے ان میں سے کوئی فانوس جلانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

سیتا بیڈ پر ڈھیر ہوگئی۔ میں صوفے پر بیٹھا تو کلپنا بھی میرے قریب ہی دوسرے صوفے پر ٹک گئی۔ اُس کی آنکھوں میں شدید اُلجھن تھی اور انداز میں جھجک نمایاں تھی۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا وہ پشت کے بل چت لیٹی ہوئی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اُس کے سینے کا زیر و بم بہت ہی قیامت ڈھا رہا تھا۔ منی اسکرٹ نما گھاگھرا بھی کچھ سمٹ گیا تھا۔

میرا سانس تیز ہونے لگا۔ میں صوفے سے اُٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ پردہ ہٹا کر کھڑکی کھول دی اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کھڑکی سے سرسبز لان کا خوبصورت منظر نظر آ رہا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے چند منٹ سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ پیچھے سے ایک آواز سن کر میں مُڑ گیا۔ وہ دُرگا تھی جو دروازے میں کھڑی سیتا سے پوچھ رہی تھی کہ ہم لوگ چائے پئیں گے یا کچھ ٹھنڈا لینا پسند کریں گے۔

''چائے ہی چلے گی دُرگا دیوی!'' سیتا نے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ٹیلی فون کہاں ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''ٹیلی فون تو نیچے ہے..... کہو تو اُوپر لا دُوں؟'' دُرگا نے پوچھا۔

''ہاں..... اُوپر لا دو! اور چائے بھی اُوپر ہی لے آنا۔'' سیتا نے کہا۔

دُرگا چلی گئی۔ سیتا اُٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ ''چتون سنگھ کو صورتحال سے آگاہ کرنا بہت ضروری ہے۔'' اُس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ وہ بے خبری میں کسی مصیبت میں پھنس جائے۔''

''تمہارے اطمینان پر مجھے حیرت ہو رہی ہے.....'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اُس حویلی میں ہم اپنے بہت سے نشانات چھوڑ کر آئے ہیں جن سے جیسلمیر میں تمہاری موجودگی کا پتہ لگایا جا سکتا ہے..... اور جب تمہاری تلاش شروع ہوگی تو شاید یہ جگہ بھی محفوظ نہ رہے۔''

''تم اس کی چنتا مت کرو!'' سیتا نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''یہ جگہ ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔ اگر جیسلمیر میں میری موجودگی کا راز کھل بھی گیا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں اس حویلی میں آ سکتی ہوں۔''

مجھے سیتا کے سکون و اطمینان پر واقعی حیرت تھی۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ انڈین انٹیلی جنس ''را'' کے لئے کام کرتی ہے اور مجھے پکڑنے کے لئے ''را'' کے ہی ایک منصوبے کے تحت کشمیر گئی تھی۔ لیکن مجھے دیکھ کر اُس کی نیت بدل گئی..... کشمیری مسلمانوں پر ہندو فوجیوں کی زیادتیوں کو دیکھ کر بھی وہ اپنوں سے متنفر ہوگئی تھی۔ اُس کے سینے میں پہلے ہی ایک چنگاری سلگ رہی تھی۔ انتقام کی آگ..... گوپال سنگھ کے ہاتھوں اپنی عزت لٹنے کے بعد اُس نے اُس چنگاری کو بجھنے نہیں دیا تھا اور پھر کشمیر میں سب کچھ دیکھ کر یہ چنگاری بھڑک اُٹھی۔

ڈوڈا میں اپنے ماما کی بستی کے قریب غار کے سامنے، جہاں میں پناہ لئے ہوئے تھا، دو ہندو فوجیوں نے جب اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو یہ شعلہ جوالا بن گئی اور غالباً اُسی وقت اُس نے طے کر لیا تھا کہ ہندو فوجیوں کے خلاف اپنی جنگ شروع کر دے گی۔

جموں کے قریب مانسر جھیل کے کنارے ہندو فوجی افسروں کے قتل عام میں ہمارا ساتھ دے کر اُس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی ان بھیڑیوں کو اُن کی خونخواری کا مزہ چکھانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ مجھے میدانِ جنگ سے نکال لائی۔ وہ میری رکھشا چاہتی تھی۔ مجھے بچانا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کزن گوپال سے بھی اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔

اُس کی واپسی چوری چھپے ہوئے تھی۔ اُس نے کسی کو اپنے بارے میں اطلاع نہیں دی تھی۔ کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر واپس آ رہی ہے۔ لیکن جب ہنومان گڑھ کے گیسٹ ہاؤس میں ''را'' کے ایک ایجنٹ نے اُسے دیکھ لیا تو سیتا نے بڑی بے رحمی سے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ''را'' کے اُس ایجنٹ نے اپنی زبان بند رکھنے کے لئے اُس کے حسن و شباب سے لطف اندوز ہونے کی رشوت مانگی تھی اور سیتا کا کہنا تھا کہ وہ اُسے یہ رشوت دے بھی دیتی تو وہ اُس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ اُسے بار بار بلیک میل کرتا اور پھر کسی بھی وقت اُس کے بارے میں دوسروں کو خبر دے سکتا تھا۔ ایسی صورتحال سے بچنے کے لئے سیتا نے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

اور پھر جیسلمیر پہنچتے ہی وہ ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ اُس نے کیپٹن گوپال سنگھ سے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ وہ کیپٹن گوپال کو نامرد کر کے چھوڑ دینا چاہتی تھی تاکہ وہ زندگی بھر اس سزا کو یاد رکھ سکے۔ لیکن کیپٹن گوپال نے فرار ہونے کی کوشش کر کے خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ اُس کی لاش حویلی کے پچھلی طرف گڑھا کھود کر دبا دی تھی۔

یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا۔ کیپٹن گوپال کے قتل کو چھپایا جا سکتا تھا۔ صبح چتون سنگھ کو بلا لیا جاتا اور اگر کوئی کیپٹن گوپال کا پوچھنے آتا تو چتون سنگھ اُسے ٹال دیتا اور اس طرح ہم بھی اُس حویلی میں محفوظ رہتے۔ لیکن کلپنا کے آنے سے معاملہ گڑبڑ ہوگیا۔ ہم نے کلپنا کو حویلی میں پناہ دی تھی۔ دو غنڈے بھی اُس کا پوچھتے ہوئے حویلی کے پھاٹک تک آئے تھے اور میں نے اُنہیں بھگا دیا تھا۔ اُن غنڈوں کو بھگا دینے سے ہم مطمئن ہو گئے تھے اور یہی ہماری غلطی تھی۔ اگر ہم

اُسی وقت کلپنا کو کہیں چھپا دیتے اور گنگو کو اندر بلا کر اُسے خود کلپنا کو حویلی میں تلاش کرنے کا موقع دیتے تو وہ یقیناً مطمئن ہو جاتا اور دوبارہ اس طرف کا رُخ نہ کرتا۔ لیکن میں نے پستول کی زد پر اُسے چلے جانے پر مجبور کر دیا اور اُس کے دل میں شاید یہ شبہ جاگزیں ہو گیا تھا کہ کلپنا اسی حویلی میں موجود ہے۔ اور پھر رات کے آخری پہر وہ اپنے گنجے ساتھی کے ساتھ حویلی میں گھس آیا۔ لیکن اُسے اپنے ساتھی کی لاش چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

گنگو کا فرار ہو جانا ہی ہمارے لئے پریشانی کا باعث بنا تھا۔ وہ گنجا اگرچہ گنگو کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اُس کے سینے میں گنگو کا خنجر پیوست تھا اور خنجر کے دستے پر اُس کی اُنگلیوں کے نشان تھے۔ ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم اس قتل کے معاملے میں پولیس کو مطمئن کر سکتے تھے لیکن اس طرح سیتا کو سامنے آنا پڑتا۔ سیتا کے سامنے آنے کا مطلب یہ ہوتا کہ یہاں میری موجودگی بھی راز میں نہ رہ سکتی اور اس طرح ہم ایک نئے چکر میں پھنس جاتے۔ سیتا نے وہ حویلی چھوڑ دی۔ اُس کے خیال میں یہ نئی پناہ گاہ ہمارے لئے سب سے زیادہ محفوظ تھی۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ ہم یہاں بھی زیادہ دنوں تک محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔

دُرگا کے آنے سے میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ وہ نیچے سے ٹیلی فون لے آئی تھی۔ اُس نے ٹیلی فون سیٹ صوفے کے ساتھ شیشے کے ٹاپ والی ایک چھوٹی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور اُس کا پلگ پیچھے دیوار کے ساکٹ میں لگا دیا۔

''میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' دُرگا کہتے ہوئے باہر چلی گئی۔

سیتا میرے قریب سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور فون کا ریسیور اُٹھا کر نمبر ملانے لگی۔ رابطہ قائم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ کال کسی اور نے ریسیو کی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد چتون سنگھ لائن پر آ گیا.....

''ہیلو چتون سنگھ! میں سیتا بول رہی ہوں..... کیسے ہو؟'' اُس نے کہا۔

جواب میں جو کچھ کہا گیا اُسے سن کر سیتا کی آنکھوں میں تشویش سی اُبھر آئی۔ وہ تقریباً دس منٹ تک بات کرتی رہی۔ اُس نے چتون سنگھ کو کیپٹن گوپال کے بارے میں کچھ بتائے بغیر حویلی کی صورتحال سے آگاہ کر دیا۔

''مجھے اس حادثے کا سن کر افسوس ہوا چتون سنگھ!'' وہ آخر میں کہہ رہی تھی۔ ''تم میری بات کا برا مت ماننا۔ کیونکہ یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ اس طرح تم پولیس کے جھنجھٹ سے بچ جاؤ گے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ میری باتوں کا دھیان رکھنا! میں کسی مناسب وقت پر تم سے ملنے کی کوشش کروں گی۔'' اُس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا..... کس حادثے کی بات کر رہی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کل سہ پہر حویلی سے نکلنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد اُس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔'' سیتا کہنے لگی۔ ''وہ ایک آٹو رکشہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ رفتار خاصی تیز تھی۔ ایک موڑ پر اچانک ہی ایک کار

سامنے آ گئی۔ رکشہ ڈرائیور کے کنٹرول میں نہ رہ سکا اور کار سے ٹکرا کر قلابازیاں کھاتا ہوا ایک اور آٹو رکشے سے ٹکرا گیا۔ چتون سنگھ کے سر اور بازو پر چوٹیں لگی تھیں۔ خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ڈرائیور بھی زخمی ہوا تھا۔ لوگوں نے اُنہیں سرکاری ہسپتال پہنچا دیا جہاں آدھی رات کے قریب چتون سنگھ کو ہوش آ گیا۔ اس دوران اُس کے سر اور بازو کے ایکسرے لئے جا چکے تھے۔ تمام ہڈیاں محفوظ تھیں۔ اُس کے زخموں کی ڈریسنگ کر کے رات بھر اُسے ہسپتال ہی میں رکھا گیا۔ صبح اُس نے اپنے عزیز دلبر سنگھ کو اطلاع بھجوا دی جو آج صبح آٹھ بجے کے قریب اُسے ہسپتال سے گھر لے آیا۔ بہرحال! اُس کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''یہ حادثہ چتون سنگھ کے حق میں ہی بہتر ثابت ہوگا۔ وہ اس طرح کہ اگر آج ہمارے آنے کے بعد حویلی کی صورتحال پولیس کے علم میں آ چکی ہو یا کسی وقت پولیس وہاں پہنچ جائے تو چتون سنگھ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ پولیس اُسے پریشان نہیں کرے گی۔ وہ کل سہ پہر سے آج صبح آٹھ بجے تک سرکاری ہسپتال میں تھا اور حویلی میں جو کچھ بھی ہوا اُس کی عدم موجودگی میں ہوا۔ اس طرح اُس پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔''

''ہاں..... یہ بات تو ہے۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پولیس دیگر ذرائع سے بھی حویلی میں ہماری موجودگی کا پتہ لگا سکتی ہے۔ ہم وہاں بہت سے نشان چھوڑ کر آئے ہیں۔ مثلاً وہ خون آلود قالین جو ہم نے چھت پر ڈال دیا تھا، ہمارے بیڈ رُوم میں پڑے ہوئے کلپنا کے پھٹے ہوئے کپڑے، کلپنا والے بیڈ رُوم میں دھینگا مشتی کے آثار اور گنجے کی لاش۔ پولیس ان باتوں سے بہت کچھ اخذ کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ.....''

''اس کے علاوہ کیا؟'' سیتا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''میری اور تمہاری اُنگلیوں کے نشان جگہ جگہ پر موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس کے باوجود فوری طور پر ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا اور دُرگا کی طرف دیکھنے لگی جو ٹرے اُٹھائے اندر آ رہی تھی۔ سیتا نے مزید کوئی بات نہیں کی۔

دُرگا بھی وہیں بیٹھ گئی۔ چائے کے دوران وہ سیتا سے باتیں کرتی رہی۔ اُس سے اُس کے حالات پوچھتی رہی۔ میرے اور کلپنا کے بارے میں اُس نے سیتا سے ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تھا۔

''تم لوگ بیٹھو! میں بھوجن کا بندوبست کروں۔ دوپہر کے کھانے پر کھل کر باتیں ہوں گی۔'' دُرگا اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

''دُرگا دیوی!'' سیتا نے کہا۔ ''میں یہاں نہیں ہوں..... کہیں بھی نہیں ہوں..... تم نے میرے بارے میں کچھ نہیں سنا۔''

''میں نے تمہارے بارے میں کچھ سنا نہ تمہیں دیکھا.....'' دُرگا نے مسکرا کر کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

کلپنا اُس وقت سے اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر شدید اُلجھن کے تاثرات تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کی سرخی تو شاید رات بھر جاگنے کا نتیجہ تھی اور اُلجھن کے تاثرات اس بات کی عکاسی کر رہے تھے کہ وہ رات سے لے کر اب تک کی صورتحال کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ پہلے چند گھنٹے اُس پر سخت گراں تھے۔ میرے خیال میں پچھلے چند گھنٹے تو کیا وہ پچھلے کئی مہینوں سے اذیت کا شکار تھی۔

بوڑھا ٹھاکر بلبیر سنگھ اُس کی جوانی کو شکار کرنے کے لئے گھات لگائے بیٹھا تھا۔ وہ کئی مہینوں تک اُس بوڑھے شکاری سے خوفزدہ رہی تھی۔ پھر اُسے دھوکے سے یہاں لے آیا گیا۔ اُس کی ماں کو ٹھاکر سے کلپنا کی شادی کا جھانسہ دیا گیا تھا اور جب حقیقت آشکارہ ہوئی تو اُس نے بیٹی کو لے کر ٹھاکر کی حویلی سے بھاگنے کی کوشش کی مگر پکڑی گئی اور رام چند دھوبی کے ہاتھوں ماری گئی اور وہیں سے کلپنا کے بدترین ابتلا کا سفر شروع ہوا۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ ہمارے پاس پہنچ گئی۔ اور پھر گزشتہ رات تو وہ زندگی کے سنگین ترین تجربے سے دوچار ہوئی تھی۔ اُس جیسی لڑکیاں بہت دیر میں ایسے صدمات سے سنبھلتی ہیں۔ اور میرا خیال تھا کہ کلپنا بھی ابھی تک اُس صدمے سے نہیں سنبھل سکی تھی۔ اُس کے چہرے کی کشیدگی اور سراسیمگی اُس کی اندرونی کیفیت کا اظہار کر رہی تھی۔

''کلپنا!'' سیتا نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم رات بھر جاگی ہو۔ ذہنی صدمے سے بھی دوچار ہوئی ہو..... چاہو تو سو جاؤ! دوپہر کے کھانے کے سمے تمہیں جگا دُوں گی۔''

''میری آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی ہے۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے ہیں۔ میں واقعی سونا چاہتی ہوں۔'' کلپنا فوراً ہی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''مجھے بھوجن سے مت جگانا دیدی! بھوک بالکل نہیں ہے۔''

''آؤ..... میں تمہیں دوسرے کمرے میں چھوڑ دُوں۔'' سیتا بھی اُٹھ گئی اور میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ نجانے مجھے کیوں اُس کمرے میں اُلجھن سی محسوس ہو رہی تھی اور میں کسی اور جگہ بیٹھنا چاہتا تھا۔

ہم تینوں اُس کمرے سے نکل آئے اور لان کے آخر میں بائیں طرف والے دروازے میں داخل ہو گئے۔ سیتا نے دروازہ پوری طرح کھول کر کھٹکا لگا دیا تاکہ وہ دوبارہ بند نہ ہو جائے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں اُوپر کی منزل کا نقشہ بھی نیچے جیسا ہی تھا۔ اُس دروازے سے ایک کشادہ اور مختصر راہداری تھی۔ دائیں بائیں ایک ایک کمرہ تھا اور سامنے باتھ رُوم کا دروازہ تھا۔

سیتا دائیں طرف والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی اور بتی جلا دی۔ یہ بھی ایک شاندار بیڈ رُوم تھا۔ ڈبل بیڈ پر ہلکے نیلے رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ ملحقہ باتھ رُوم بھی تھا اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

''تم یہاں آرام سے سو جاؤ..... ہم سامنے والے کمرے میں ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

کلپنا میری طرف دیکھ کر جھجکتی ہوئی بستر پر لیٹ گئی۔ سیتا اور میں سامنے والے بیڈ رُوم میں آ گئے۔ یہ کمرہ دوسرے کمرے سے نسبتاً بڑا تھا اور اُس کی ایک کھڑکی سے بھی لان کے ایک حصے کو دیکھا جا سکتا تھا۔ سیتا نے اگرچہ بتی جلا دی تھی لیکن میں نے کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا اور کھڑکی پوری طرح کھول دی۔ تازہ ہوا کے ساتھ کچھ دُھوپ بھی اندر آنے لگی۔ اکتوبر کے مہینے کی نرم دُھوپ بری نہیں لگ رہی تھی۔

بیڈ کے علاوہ یہاں دو آرام دہ کرسیاں اور ایک کوچ بھی بچھا ہوا تھا۔ میں ایک کرسی کھینچ کر کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ سیتا میرے سامنے کوچ پر پہلو کے بل دراز ہوگئی۔ بازو کی کہنی کشن پر ٹکا کر سر ہتھیلی پر رکھ لیا تھا۔ سیتا کا رُخ میری طرف تھا۔ چنری تو اُس نے حویلی میں داخل ہوتے ہی اُتار پھینکی تھی۔ اس طرح اس پہلو کے بل لیٹنے سے مختصر سی چولی کچھ اور سمٹ کر رہ گئی تھی اور گداز سینے کے اُبھار جیسے چولی کی قید سے آزاد ہونے کو مچل رہے تھے۔

''یہ دُرگا دیوی کون ہے..... اور یہ حویلی کس کی ہے؟'' میں نے اُس کی طرف سے نظریں ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''دُرگا دیوی.....'' سیتا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ''تم اسے میرے پتا جی کی رکھیل کہہ سکتے ہو۔''

''کیا.....؟'' میں اُچھل پڑا۔ ''تم شاید مذاق کر رہی ہو۔''

''ایسی باتیں تو مذاق میں بھی کسی سے نہیں کہی جا سکتیں۔ لیکن چونکہ تم نے پوچھا اس لئے میں نے سچ سچ بتا دیا۔''

''اور یہ حویلی؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''یہ بھی پتا جی کی ملکیت ہے..... بلکہ تھی۔'' سیتا مسکرائی۔ ''کئی سال پہلے یہ حویلی پتا جی نے دُرگا دیوی کو دان کر دی تھی۔''

''دلچسپ!'' میں نے کہا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ راجستھان کے ہر بڑے شہر میں تمہارے پتا جی کے مکان اور حویلیاں ہیں۔ تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ راجوں مہاراجوں کی سرزمین ہے۔ تمہارے ہی کہنے کے مطابق ہند سرکار نے تمام ریاستیں ختم کر کے راجوں مہاراجوں کے اختیارات سلب کر لئے ہیں اور گزارے کے لئے اُن کے الاؤنس یا وظیفے مقرر کر دیئے ہیں۔ کیا تمہارے پتا جی بھی کسی ریاست کے راجہ تھے؟ اتنی جائیداد تو کسی راجہ ہی کی ہو سکتی ہے۔ ایسی شاندار حویلیاں..... میری تو عقل دنگ رہ گئی ہے۔''

سیتا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' وہ بولی۔ ''میرے پتا جی مہاراجہ سدھرشن سنگھ جے پور کی بغل میں ایک چھوٹی سی ریاست کے والی تھے۔ تمام ریاستوں سے اُن کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ سارسکا میں اُن کے شاندار محل میں آئے دن راجستھان کے تمام راجاؤں کی

دعوتیں ہوتی رہتیں۔ یہ محفلیں کئی کئی روز تک جمتیں۔ سارسکا میں میلوں دُور تک پھیلا ہوا بہت بڑا جنگل ہے جس میں چوہے سے لے کر شیر اور چیتے جیسے خونخوار درندے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ میرے پتا جی ان راجاؤں کے لئے شکار کا بندوبست کرتے اور جب تک وہ سارسکا میں رہتے اُن کی دل لگی کو ہر سامان مہیا کیا جاتا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''تمام راجاؤں نے پتا جی کو اپنے اپنے علاقے میں مفت زمینیں دیں۔ جن پر پتا جی نے شاندار حویلیاں تعمیر کروائیں۔ کچھ قدیم حویلیاں اُنہوں نے خرید لی تھیں جن میں سے بیشتر کو بعد میں ہندسرکار نے قومی ورثہ قرار دے کر اپنے قبضے میں لے لیا اور ملک کا بٹوارہ ہونے کے بعد جب ریاستیں ختم کر دی گئیں تو سارسکا پیلس بھی ہندسرکار نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ پتا جی گھر والوں کو لے کر جے پور منتقل ہو گئے اور وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ جے پور میں بھی اُن کی کئی حویلیاں ہیں اور یہاں جیسلمیر میں بھی۔ یہ دو حویلیاں جو تم دیکھ چکے ہو انہی میں سے ہیں۔''

''میں نے تمہارے پتا جی کی حویلیوں کی تعداد نہیں دُرگا دیوی کے بارے میں پوچھا تھا۔'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''ان کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ اور دُرگا ان میں سے ایک ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''جیسا کہ میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں کہ راجاؤں کے پاس فوجوں کو لڑانے اور بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ اُن کے راج ختم ہوئے، تمام اختیارات سلب ہو گئے تو اُنہوں نے دوسرے مشغلے اختیار کر لئے۔ ریچھ اور کتوں کی لڑائی، مرغ لڑانا، ریس کے گھوڑے پالنا، راگ رنگ کی محفلیں جمانا اور عورتیں پالنا اُن کے محبوب ترین مشاغل ہیں۔ جس طرح عربوں نے حرم بنا رکھے ہیں اسی طرح راجاؤں نے بھی خوبصورت عورتیں جمع کر رکھی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عرب شیخ کسی عورت سے باقاعدہ نکاح کر کے اپنے تصرف میں لاتے ہیں اور دو چار مرتبہ برتنے کے بعد اُسے حرم میں ڈال کر بھول جاتے ہیں۔ وہ اُن کی قانونی بیویاں ہوتی ہیں۔ لیکن ہندوستان کے راجے ان معاملات کو قانون اور دھرم سے بالکل الگ رکھتے ہیں۔ کوئی عورت پسند آ گئی تو اُسے اپنے دل میں بٹھا لیا۔ جی بھر گیا تو اُسے میلے کپڑوں کی طرح اُتار کر پھینک دیا۔ انہیں تم رکھیل کہہ لو یا داشتہ، وہ اپنے کسی حق کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ ان کی اولادیں دوسری چیزوں کی طرح باپ کے نام سے بھی محروم رہتی ہیں۔ دُرگا دیوی کا شمار بھی ایسی ہی عورتوں میں ہوتا ہے۔ مگر اس کی داستان دوسری عورتوں سے مختلف اور دلچسپ ہے۔''

''اور میں وہی داستان سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''چند سال پہلے پتا جی اپنے دوستوں کے ساتھ جودھپور گئے تھے۔'' سیتا کہنے لگی۔ جودھپور میں قیام کے دوران ایک روز وہ کیلانا جھیل پر چلے گئے۔ بہت خوبصورت جھیل ہے۔ بہت دُور

دُور سے لوگ سیر و تفریح کے لئے وہاں آتے ہیں۔ وہاں چند اچھے ریسٹورنٹ اور رہائشی ہوٹل بھی ہیں۔ دُرگا سے پتا جی کی ملاقات جھیل کنارے ایک رہائشی ہوٹل ہی میں ہوئی تھی۔ دُرگا اپنے ماتا پتا کے ساتھ مکرانا سے آئی ہوئی تھی۔ وہ بھی کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مکرانا میں سنگ مرمر کے پہاڑ ہیں اور دنیا کا بہترین سنگ مرمر اور ماربل انہی پہاڑوں میں ہوتا ہے۔ دُرگا کے پتا جی بھی سنگ مرمر ہی کے بزنس سے وابستہ تھے۔ پتا جی سے پہلی ملاقات میں ہی دُرگا اُن پر مرمٹی، اور پھر یہ ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ وہ لوگ ایک ہفتہ جھیل والے ہوٹل میں رہے پھر شہر آ گئے۔ پتا جی کا قیام تو وہاں اپنی ایک چھوٹی سی حویلی میں تھا جبکہ دُرگا اپنے ماتا پتا کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ حویلی میں آ کر پتا جی سے ملتی رہی۔ دُرگا کے ماں باپ نے صورتحال کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا اور وہ دُرگا کو زبردستی مکرانا واپس لے گئے۔ دُرگا مکرانا سے جے پور آتی رہی اور چوری چھپے پتا جی سے ملتی رہی۔

بیوی یعنی میری ماتا جی کے ہوتے ہوئے پتا جی دوسری شادی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن وہ دُرگا سے بھی دستکش ہونے کو تیار نہیں تھے۔ وہ جب بھی جے پور آتی پتا جی اُسے دوسری حویلی میں ٹھہراتے اور راتیں اُس کے ساتھ گزارتے۔ ایک روز وہ دُرگا کو ماتا جی والی حویلی میں لے آئے۔ ماتا جی اُسے دیکھ کر بھڑک اُٹھیں۔ ٹھاکروں اور راجہ مہاراجوں کی پتنیاں اس قسم کی صورتحال کی عادی ہوتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ ان کے پتی دوسری عورتوں کے ساتھ بھی دادِ عیش دیتے ہیں۔ لیکن یہ دیویاں اپنے پتیوں کے ان معاملات میں بھی مداخلت نہیں کرتیں۔ دُرگا کو دیکھ کر ماتا جی کے بھڑکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ جے پور یونیورسٹی میں اُن کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ دُرگا نے ماسٹرز کی ڈگری اسی یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔

گھر میں خوب ہنگامہ ہوا..... پتا جی دُرگا کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ ماتا جی جانتی تھی کہ پتا جی نے حویلی کے باہر دوسری عورتیں بھی رکھی ہوئی ہیں جن سے وہ وقتاً فوقتاً دل بہلاتے رہتے ہیں۔ اُنہوں نے اس شرط پر دُرگا کو برداشت کرنے کی اجازت دے دی کہ وہ اسے جے پور میں نہیں رکھیں گے۔ دُرگا کے ماں باپ نے بھی اُس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ پتا جی اُسے مکرانا بھی نہیں لے جا سکتے تھے۔ وہ اسے جیسلمیر لے آئے اور یہ حویلی اُس کے سپرد کر دی۔ وہ مہینے میں ہفتہ دس دن کے لئے یہاں ضرور آتے۔ لیکن حسب عادت اُن کا دل بھر گیا۔ آمد و رفت میں وقفے آنے لگے جو طویل ہوتے گئے۔ پتا جی نے دُرگا کے ساتھ یہ مہربانی ضرور کی کہ یہ حویلی قانونی طور پر اس کے نام منتقل کر دی اور اس کے لئے تاحیات ایک معقول رقم کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ تین چار مہینوں بعد پتا جی کو جب دُرگا کی یاد آتی ہے تو چند روز کے لئے یہاں آ جاتے ہیں۔ وہ بیڈ روم جہاں ہم پہلے گئے تھے پتا جی کے لئے مخصوص ہے۔''

''لیکن دُرگا سے تمہارے اتنے خوشگوار تعلقات کیوں ہیں؟'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ''اُس نے تمہاری ماں کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ تمہیں تو اُس سے نفرت ہونی

چاہئے تھی۔''

''دُرگا دیوی بہت اچھی مہیلا (خاتون) ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''رہی میری ماتا کے حق پر ڈاکے کی بات تو میری ماتا جی کو کس چیز کی کمی ہے؟ اور دوسری عورتیں..... اُن کا کیا کروں؟ اور میں نے تو ویسے بھی کبھی بڑوں کے معاملے میں مداخلت کی کوشش نہیں کی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''اس حویلی میں منتقل ہونے کے بعد بھی دُرگا دیوی وقتاً فوقتاً جے پور کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ یہ مجھے شروع ہی سے بہت اچھی لگتی تھی۔ یہ جب بھی جے پور آتی پتا جی مجھے اُس سے ملانے کے لئے ضرور لے جاتے۔ ماتا جی کو بھی اس کا پتہ چل گیا۔ بالآخر اُنہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ وہ دُرگا سے بھی ملنے لگیں اور کبھی یہاں بھی آنے لگیں۔ دُرگا مجھ سے عمر میں تیرہ چودہ سال ہی بڑی ہے۔ لیکن مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتی ہے۔''

دُرگا کے بارے میں میرا اندازہ بھی یہی تھا کہ اُس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی اور اب سیتا کی باتوں نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔

ہم دونوں بھی رات بھر نہیں سوئے تھے۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ ہم دونوں میں سے کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم دوپہر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر دُرگا ہمیں نیچے لے گئی۔

کھانے میں دو تین چیزیں تھیں۔ میتھی آلو کی بھجیا، پالک کے کوفتے جن میں پنیر استعمال کیا گیا تھا۔ سبزی کی ایک اور ڈش تھی اور اُس میں بھی پنیر شامل تھا۔ گوشت نہ ہونے کے باوجود کھانا بے حد عمدہ اور لذیذ تھا۔ سیتا نے دُرگا کو بھی میرا نام مہابیر ہی بتایا تھا۔ اگر اُسے بتایا جاتا کہ میں مسلمان ہوں تو شاید وہ میرے لئے گوشت بھی پکا لیتی لیکن سیتا کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی اس لئے اُس نے مجھے ہندو کے نام سے ہی متعارف کرایا تھا۔

کھانے کے بعد سستی طاری ہوگئی اور دماغ بوجھل ہونے لگا۔ میں سیتا کو وہیں چھوڑ کر اُوپر والے بیڈ رُوم میں آ گیا اور بستر پر لیٹا تو چند منٹ میں ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

بستر پر لیٹنے سے پہلے میں نے بتی بجھا دی تھی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ دماغ پر ابھی تک نیند کا خمار طاری تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے کروٹ لی تو میرا ہاتھ کسی سے ٹکرا گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سیتا ہوگی جو کسی وقت یہاں آ کر لیٹ گئی تھی۔ میں نے اُسے بازو کی لپیٹ میں لے کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ذرا کسمسائی تو میں نے اُسے سینے سے لپیٹ کر دونوں بانہوں میں سمیٹ لیا..... اُس کا گداز بدن میرے سینے میں ہلچل مچانے لگا۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی..... میں نے اُسے کچھ اور بھینچ لیا۔

ایسا کرنے میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ میں نے مجاہدانہ زندگی گزاری تھی۔ میرے ہاتھ رائفلوں اور گولہ بارود سے تو بہت اچھی طرح کھیلنا جانتے تھے لیکن کسی عورت کی طرف تو میں نے کبھی میلی نظر سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ انگوری طویل عرصہ میرے ساتھ رہی تھی۔ ہم پہاڑوں میں کئی مرتبہ ساتھ لپٹ کر سوئے تھے مگر میرے سینے میں شہوانی جذبات نے کبھی سر

نہیں اُبھارا تھا۔

اور پھر ڈوڈا میں سیتا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے ایک نئی زندگی دی تھی۔ وہ مجھ سے پیار کرنے لگی تھی۔ اور پھر غار ہی میں اُس نے مجھے زندگی کی ایک نئی لذت سے روشناس کرایا تھا..... میں اُس وقت انجانے سے جذبات کے سیلاب میں بہہ گیا تھا اور بہت دیر بعد جب حواس بحال ہوئے تھے تو مجھے اس طرح بہک جانے پر افسوس بھی ہوا تھا۔

اس کے بعد بھی سیتا نے ایک دو مرتبہ مجھے زیر کیا تھا۔ میں اگرچہ اُس سے بچنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن وہ مجھے گھیر ہی لیتی تھی۔ میں نے از خود کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس وقت نجانے مجھے کیا ہوا تھا..... نیند کا خمار تھا یا کچھ اور بات تھی میں اُسے اپنے آپ میں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور پھر وہ آواز سن کر میں چونک گیا..... میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور پھر یوں لگا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو..... دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ سیتا نہیں کلپنا تھی..... میں نے اُسے اپنے سے الگ ہٹا دیا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کلپنا بستر پر پڑی میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی اور چہرے پر سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور دماغ میں سنسناہٹ تھی۔ سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں پلنگ سے اُتر کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

جس لڑکی نے عزت بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی، جسے ہم نے غنڈوں سے بچا کر اپنے پاس پناہ دی تھی وہ کس طرح میری آغوش میں آنے کو مچل رہی تھی۔ کئی منٹ بعد میں اپنی کیفیت پر قابو پا سکا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا کلپنا پلنگ پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اُس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر اُس کے قریب آ گیا۔

''کلپنا!'' میں نے دھیمے لہجے میں اُسے پکارا۔ ''اپنے کمرے میں جاؤ! اگر سیتا نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو نجانے کیا سمجھے گی۔''

''مجھے معاف کر دو مہابیر جی!'' اُس نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں یہاں آ کر کھاٹ کے کنارے پر لیٹ گئی اور تم نے مجھے اپنی طرف کھینچا تو.....''

''بھول جاؤ اس بات کو۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''کچھ نہیں بگڑا۔ اگر مجھے بروقت ہوش نہ آ جاتا تو..... بہرحال! تم اپنے کمرے میں جاؤ!''

کلپنا نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا، پلنگ سے اُتر کر وہ میرے سامنے جھک گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرے پیر چھوئے اور باہر چلی گئی۔ میں کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ میرا دماغ

اب بھی سلگ رہا تھا۔ کلپنا کے گداز بدن کا لمس سینے میں ہلچل مچائے ہوئے تھا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا اور باتھ رُوم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے میرے دماغ کی تپش کچھ کم ہوگئی۔ میں دیر تک شاور کے نیچے کھڑا رہا۔

جب میں نیچے آیا تو لابی میں دُرگا سے آمنا سامنا ہوگیا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے پہلی مرتبہ اُسے گہری نظروں سے دیکھا۔ میک اَپ کے بغیر بھی وہ بے حد حسین تھی۔ دراز قامت، بھرا بھرا گداز جسم، چہرے کے نقوش بڑے دلفریب اور غزال جیسی موٹی آنکھیں۔ میں آٹھ دس سال پیچھے چلا گیا اور چشم تصور سے اُسے دیکھنے لگا۔ بھرپور جوانی میں تو وہ واقعی قیامت رہی ہوگی۔

''کیا دیکھ رہے ہو شمروز؟'' دُرگا کے منہ سے اپنا نام سن کر میں اس طرح اُچھلا جیسے میرے پیروں کے نیچے آگ بھڑک اُٹھی ہو..... میرا دماغ سنسنا اُٹھا۔

''سیتا لاکھ کوشش کرے، اُس کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی۔'' دُرگا میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول پڑی۔ ''وہ تمہیں اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر گرفتار کرنے کے لئے کشمیر گئی تھی۔ میں جانتی ہوں وہ جس کام کا عزم کر لیتی ہے اُسے ادھورا نہیں چھوڑتی۔ مجھے اُس کے واپس آنے کا پتہ چل گیا تھا اور یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ تم اُس کے ساتھ ہو۔ وہ جس طرح تمہیں ساتھ لئے چھپتی پھر رہی تھی اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ تمہیں اپنا بھگوان مان چکی ہے۔ جس شخص کے لئے اُس نے ہندسرکار سے دشمنی مول لی، اپنے کزن کو موت کے گھاٹ اُتار دیا وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہوسکتا۔ میں اُس کے انتخاب کی داد دیتی ہوں۔''

میرا دماغ سن ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے سلب ہو چکی ہوں..... میں خاموش کھڑا متوحش نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

''یہ..... یہ سب کچھ تمہیں..... سیتا نے بتایا ہے؟'' بالآخر میرے ہونٹوں کو حرکت ہوئی میری آواز کپکپا رہی تھی۔

''بالکل نہیں.....'' دُرگا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''تمہارے اُوپر جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ بھی سوگئی تھی اور ابھی تک سو رہی ہے۔''

''تو پھر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ.....''

''ایوننگ پیپر سے۔'' دُرگا نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ ''بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز سٹوری ہے۔ میں بتاؤں گی تو سارا سسپنس ختم ہو جائے گا۔ وہ اخبار رکھا ہے..... خود ہی پڑھ لو!'' اُس نے صوفے کے سامنے شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل پر پڑے ہوئے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایک گھنٹہ پہلے میں سبزی بھاجی لینے کے لئے بازار گئی تھی تو اخبار بھی لے آئی تھی۔ وہاں بیٹھو، میں تمہارے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔''

''میں باہر لان میں بیٹھوں گا..... چائے وہیں لے آنا۔'' میں نے جواب دیا۔ میں

برآمدے میں آ گیا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ میں برآمدے سے نکل کر فوارے والے لان کی طرف چلنے لگا۔ میں نے دبیز گھاس پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ دونوں لانز کے فینسی لیمپ پوسٹوں کی بتیاں جل اُٹھیں۔ یہ بتیاں اندر ہی سے دُرگا نے جلائی تھیں۔ میں ایک لیمپ پوسٹ کے قریب بینچ پر بیٹھ گیا اور اخبار کھول کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔

ہندی اخبار تھا۔ میں ہندی بول تو سکتا تھا مگر پڑھنا میرے لئے آسان نہیں تھا۔ میں اٹک اٹک کر پڑھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کوئی بات پلے نہیں پڑی سوائے اس کے کہ پولیس اُس حویلی تک پہنچ گئی تھی اور گنجے بدمعاش کی لاش دریافت کر لی تھی۔

برآمدے کی طرف سے آہٹ پا کر میں نے اُس طرف دیکھا، سیتا چلی آ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ ستا ہوا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ آنکھ کھلتے ہی باہر چلی آئی تھی۔

''میں کچھ زیادہ ہی گہری نیند سو گئی تھی۔'' وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم..... اوہ.....'' وہ بات کرتے کرتے رُک گئی۔ اُس کی نظریں بھی میری گود میں پڑے ہوئے اخبار پر جم گئیں۔ وہ خبر ہیڈ لائن میں تھی۔ اُس نے اخبار اُٹھا کر اپنے سامنے کر لیا۔ میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اُس کے چہرے پر سنسنی اور آنکھوں میں وحشت سی پھیلتی جا رہی تھی۔ پوری خبر پڑھنے کے بعد ہی اُس نے سر اُوپر اُٹھایا تھا۔

''یہ پڑھا تم نے؟'' اُس نے متوحش نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کوشش کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''ہندی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکتا۔ صرف اتنا سمجھ سکا ہوں کہ پولیس حویلی میں پہنچ گئی ہے۔ البتہ دُرگا نے کچھ باتیں بتائی تھیں جو شاید اس اخبار میں نہیں ہیں۔''

''پولیس نے کپن گوپال کی لاش برآمد کر لی۔'' سیتا نے کہا۔

''کیا.....؟'' میں اُچھل پڑا۔

''میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں۔'' سیتا نے اخبار پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''ایک خفیہ اطلاع ملنے پر پولیس حویلی میں داخل ہوگئی تھی۔ مہاراناد ھرمیش سنگھ کی حویلی میں پولیس کا داخل ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ وہ اطلاع ملنے کے بعد پولیس کمشنر نے حویلی پر چھاپہ مارنے کے لئے ڈپٹی کمشنر سے اجازت حاصل کی اور پولیس پارٹی ایک مجسٹریٹ کے ساتھ حویلی پہنچ گئی۔ پہلے حویلی کے ملازم چتون سنگھ کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ناکام ہو کر پولیس والے دیوار پھلانگ کر حویلی میں داخل ہوگئے اور اندر سے پھاٹک کھول دیا۔ عمارت میں داخل ہونے کے لئے اُنہیں برآمدے والے دروازے کا تالا توڑنا پڑا تھا۔ یہ آج دن کے گیارہ بجے کی بات ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''پولیس نے گنجے کی لاش فوراً ہی دریافت کر لی۔ حویلی کی تلاش کے دوران ہمارے بیڈ رُوم سے اُنہیں کلپنا کے اور میرے پھٹے ہوئے کپڑے بھی مل گئے اور چھت پر خون آلود قالین بھی مل گیا۔ قالین پر خون کے دھبے خشک ہو چکے تھے جس سے پولیس کو شبہ ہوا کہ اُس گنجے کے

علاوہ وہاں قتل کی کوئی اور واردات بھی ہوئی تھی۔ پوری حویلی کی تلاشی لی گئی۔ گیٹ کے پاس روش کی بجری پر بھی خون کے دھبے ملے تھے۔ ہم کیپٹن گوپال کی لاش کو وہاں سے گھسیٹ کر پچھلی طرف لے گئے تھے۔ پولیس جگہ جگہ خون کے دھبوں کا تعاقب کرتی ہوئی حویلی کے پچھلی طرف پہنچ گئی جہاں تازہ کھدی ہوئی جگہ دیکھ کر انہیں شبہ ہوا اور گڑھا کھود کر کیپٹن گوپال کی لاش بھی برآمد کر لی گئی۔ کیپٹن گوپال کی لاش دیکھ کر پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وہ کسی عورت کے انتقام کا نشانہ بنا ہے۔ حویلی کے ایک کمرے سے ملنے والے پھٹے ہوئے زنانہ کپڑے بھی پولیس کے اس شبے کو تقویت دیتے ہیں۔ پولیس نے حویلی سے لاتعداد فنگر پرنٹس محفوظ کر لئے ہیں اور گنجے کی لاش میں پیوست خنجر بھی اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ اُن کی رپورٹ ملنے کے بعد ہی کوئی حتمی نتیجہ اخذ کیا جا سکے گا۔

کیپٹن گوپال کی لاش ملنے کے بعد چھاؤنی میں بھی اطلاع دے دی گئی اور فوج کے بعض بڑے افسران وہاں پہنچ گئے تھے۔ حویلی کے ملازم چتون سنگھ کو بھی دوپہر دو بجے کے قریب تلاش کر لیا گیا مگر اُس نے اس سارے واقعہ سے لاعلمی کا اظہار کیا اور گزشتہ روز اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بتایا۔ ہسپتال کے ذرائع نے اس امر کی تصدیق کر دی کہ چتون سنگھ کو کل شام چھ بجے کے قریب زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا تھا اور وہ پوری رات ہسپتال رہا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب اُس کا ایک عزیز اطلاع پا کر اُسے لے گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق کیپٹن گوپال اور گنجے کو گزشتہ رات دس بجے سے صبح چار بجے کے دوران کسی وقت موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔ پولیس نے جے پور میں پتاجی کو بھی خبر کر دی ہے۔ وہ کل دوپہر سے پہلے کسی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق مہاراناد ھرمیش سنگھ کی حویلی میں دوہرے قتل کی واردات نے شہر میں سنسنی پھیلا دی ہے۔ ایک فوجی آفیسر کا قتل کوئی معمولی بات نہیں۔ انتظامیہ کی مشینری اور پورے شہر کی پولیس حرکت میں آ گئی ہے۔''

''صورتحال واقعی سنگین ہو گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''گنگو اور اُس بڑے ٹھاکر کے بارے میں کوئی خبر؟'' میں نے کہتے ہوئے برآمدے کی طرف دیکھا۔ کلپنا اور دُرگا برآمدے سے نکل کر اس طرف آ رہی تھیں۔ کلپنا نے ٹرے اُٹھا رکھی تھی جس میں چائے کے کپ رکھے ہوئے تھے۔

''پورے اخبار میں کہیں بھی اُن دونوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''وہ گنجا گنگو کے ہاتھوں مارا گیا اور یہ تو ممکن نہیں کہ قتل کی اطلاع اُس نے پولیس کو دی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے واپس جا کر بوڑھے ٹھاکر اور رام چند دھوبی کو صورتحال سے آگاہ کر دیا ہو اور اُن دونوں میں سے کسی نے خفیہ طور پر پولیس کو خبر کر دی ہو۔''

''ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔ لیکن.....'' دُرگا اور کلپنا کے قریب آ جانے سے اُس

نے جملہ مکمل نہیں کیا۔

دُرگا ہماری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی دوسرے بینچ پر بیٹھ گئی۔ کلپنا نے ٹرے فوارے والے حوض کی منڈیر پر رکھ دی اور ایک کپ اُٹھا کر پہلے سیتا کو دیا اور دوسرا کپ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے چائے دیتے ہوئے اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس نے تیسرا کپ دُرگا کے ہاتھ میں تھما دیا اور آخری کپ اُٹھا کر دُرگا کے قریب بینچ پر بیٹھ گئی۔ گزشتہ رات حویلی میں ذات پات کے حوالے سے سیتا کی باتیں سن کر اور اپنے ساتھ اُس کا رویہ دیکھ کر اُس نے بھی فوراً ہی ذہن سے ایسی باتیں نکال دی تھیں اور ہمارے برابر اُٹھتی بیٹھتی تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ وہ نہا کر آئی تھی اور نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے سیتا؟'' دُرگا نے چائے کی چسکی لے کر سیتا کی گود میں پڑے ہوئے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری کسی بات سے اختلاف کروں گی یا تمہارے ساتھ غیروں جیسا سلوک کروں گی... تم نے ایسا کیوں سوچا سیتا؟''

سیتا نے اُٹھ کر چائے کا کپ حوض کی منڈیر پر رکھ دیا اور دُرگا کے سامنے گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھ کر اپنا سر اُس کی گود میں رکھ دیا۔

''دُرگا دیوی.....'' وہ منمنائی۔ ''تم واقعی دیوی ہو۔''

دُرگا نے اپنا کپ بینچ کی سائیڈ میں گھاس پر رکھ دیا۔ ایک نظر میری طرف دیکھا اور سیتا کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگی۔ اور پھر جھک کر اُس کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔

سیتا اس طرح اُچھلی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو..... وہ متوحش نظروں سے دُرگا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

○○○

''کیا ہوا..... میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟'' دُرگا نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ''کس طرح چھپاؤ گی اس ہیرے کو لوگوں کی نظروں سے؟''

اب میں سمجھ گیا کہ دُرگا نے سیتا کے کان میں کیا سرگوشی کی ہوگی۔ سیتا نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ دُرگا کے سامنے سے ہٹ گئی اور حوض کی منڈیر سے اپنا چائے کا کپ اُٹھا کر میرے قریب آ گئی۔

''دُرگا دیوی!'' وہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہیروں کی پہچان ہر ایک کو نہیں ہوتی۔ اور پھر جو شخص ایسی قیمتی چیز اپنے پاس رکھتا ہے اُس کی حفاظت کرنا بھی جانتا ہے۔ اور جانتی ہو کہ میں نے ہمیشہ اپنی ہر چیز کی حفاظت کی ہے۔ ایک شخص نے دھوکے کے بل بوتے پر میری ایک متاع چھینی تھی اور اُس کا انجام بھی تم دیکھ چکی ہو۔'' سیتا نے کیپٹن گوپال کا نام لئے بغیر کہا۔ جسے وہ اپنے انتقام کا نشانہ بنا چکی تھی۔ ''اور یہ مجھے اپنی متاع سے بھی زیادہ عزیز ہے میں اپنی جان لڑا دُوں گی مگر اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دُوں گی۔''

''میں جانتی ہوں.....'' دُرگا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے کب تک دوسروں کی نظروں سے چھپاؤ گی۔''

''جب تک ممکن ہوگا۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہے.....'' دُرگا نے گہرا سانس لیا۔ ''تم وشواش لے کر میرے پاس آئی ہو اور میں تمہارے وشواش کو ٹھیس نہیں لگنے دُوں گی۔ اور مجھ سے جو ہو سکے گا تمہاری مدد کروں گی۔''

''اگر مجھے وشواش نہ ہوتا تو یہاں نہ آتی۔'' سیتا نے کہا۔ ''بہرحال! باقی باتیں بعد میں کر وقت ہوں گی۔ اس وقت کوئی ایسا ذکر مناسب نہیں۔'' اُس نے آنکھ سے کلپا کی طرف اشارہ کیا۔ پھر بولی۔ ''اس اخبار میں لکھا ہے کہ پتا جی کی حویلی میں ہونے والی درگھٹنا کے بارے میں اطلاع دی جا چکی ہے اور وہ کل دوپہر کے بعد کسی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔ کیا پتا جی اب بھی یہیں آ کر ٹھہرتے ہیں..... میرا مطلب ہے تمہارے پاس؟''

''تمہارے پتا جی کو شاید اب مجھ سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔'' دُرگا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''آخری مرتبہ وہ پانچ مہینے پہلے آئے تھے۔ اور میرے پاس صرف ایک رات رہے تھے۔ اُن کا زیادہ وقت جیٹھا نند کے ساتھ گزرتا ہے۔ اُس کی حویلی میں راگ رنگ کی

محفلیں سجتی ہیں..... اب دیکھو وہ کہاں ٹھہرتے ہیں؟ مجھے تو ابھی تک انہوں نے فون پر اطلاع نہیں دی۔''

''جیٹھا نند تو سنا تھا کہ ہندوستان سے باہر جانے والا ہے۔ اُس نے شاید سوئٹزرلینڈ میں جگہ خرید لی ہے۔ باقی زندگی وہیں گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔'' سیتا نے کہا۔

''گیا تھا.....'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایک مہینہ رہ کر واپس آ گیا۔ چٹی چمڑی والی میموں نے اُس کے نخرے برداشت نہیں کئے۔ یہ ہندوستانی عورتیں ہی ہیں جو ان بدھوں کے نخرے برداشت کر لیتی ہیں۔ انہیں جیسے بھی نوچا کھسوٹا جائے اُف تک نہیں کرتیں۔ لیکن وہ چٹی چمڑی والے..... اُنہوں نے اس بڈھے کو حد سے نہیں بڑھنے دیا اور وہ منہ لٹکائے واپس آ گیا۔ اب ہندوستانی عورتوں کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتا وہ۔''

میں نے اُن کی باتوں میں مداخلت نہیں کی۔ کلپنا بھی خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے جب بھی کلپنا کی طرف دیکھا تھا اُسے اپنی طرف ہی متوجہ پایا تھا لیکن ہر مرتبہ اُس نے نظریں جھکا لی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے خالی کپ ٹرے میں جمع کئے اور ٹرے اُٹھا کر اندر چلی گئی۔

''یہ لڑکی کون ہے..... کہاں سے ملی تمہیں؟'' دُرگا نے کلپنا کے جانے کے بعد سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کلپنا نام ہے اس کا..... لاوارث ہے۔ بڑا ستایا ہوئے ہے اس پر۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور پھر اُسے کلپنا کے بارے میں بتانے لگی۔

''میں نے اسے دو باتوں کے کارن چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''اگر اسے چھوڑ دیا جاتا تو یہ یا تو دوبارہ بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ جاتی یا پولیس کے..... دونوں صورتیں ہمارے حق میں نہ ہوتیں۔ یہ ہمارے بارے میں سب کچھ اُگل دیتی جس سے ہمارے لئے مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ ویسے میں اس خیال سے بھی اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں کہ اب اس دنیا میں اس کا ہے کون؟ کسی کے ہاتھ لگ گئی تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔''

''کیا یہ تمہاری اصلیت سے واقف ہے؟'' دُرگا نے پوچھا۔

''یہ ہماری اصلیت سے واقف نہیں..... لیکن اسے جیجا جی کہتی ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''بڑی بے شرم ہو گئی ہو تم.....'' دُرگا بھی مسکرا دی۔

''کلپنا بہت اچھی لڑکی ہے۔'' سیتا نے اُس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک ہی رات میں اس کے بارے میں اندازہ لگا چکی ہوں۔ تم بہت عرصے سے اکیلی رہ رہی ہو۔ تم اسے اپنے پاس رکھ لو! تمہارے کام کر دیا کرے گی اور تمہیں بھی آسانی ہو جائے گی۔''

''اگر تم یہ بات نہ بھی کہتیں تو میں اسے تم سے مانگ لیتی۔'' دُرگا نے کہا۔ ''واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے میں کچن میں برتن دھو رہی تھی تو یہ بھی وہاں آ گئی اور زبردستی مجھے ہٹا

کر برتن دھونے لگی۔ اور چائے بھی اسی نے بنائی تھی۔''

''کیا واقعی؟'' سیتا اُچھل پڑی۔ ''بڑی خوش ذائقہ چائے تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ واقعی تمہارے کام کی ہے۔ لیکن اگر کبھی پتا جی کی نظر اس پر پڑ گئی تو.....''

''چپ رہو.....'' دُرگا نے اُسے ڈانٹ دیا۔ ''اپنے باپ کے بارے میں ایسی باتیں تمہیں شوبھا نہیں دیتیں۔''

''باپ ہی ایسا ہو تو کیا، کیا جائے؟'' سیتا ڈھٹائی سے مسکرا دی۔ ''اس کا تجربہ تو تمہیں بھی ہے دُرگا دیوی!''

''ٹھیک کہتی ہو۔'' دُرگا نے گہرا سانس لیا۔ ''اس بڈھے کا ویسے کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ مجھے اُس کا خیال رکھنا پڑے گا۔''

کلپنا کے واپس آ جانے سے موضوع بدل گیا۔

''اچھا بھئی..... تم لوگ باتیں کرو میں رات کے بھوجن کی تیاری کروں۔'' دُرگا کہتے ہوئے اُٹھی تو کلپنا بھی اُس کے ساتھ ہی اُٹھ گئی۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ کام میں ہاتھ بٹاؤں گی۔'' اُس نے کہا۔ دُرگا کچھ کہنے کی بجائے مسکرا کر رہ گئی۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا۔ کل رات حویلی میں رونما ہونے والے واقعات..... پولیس کی تفتیش کس نتیجے پر پہنچے گی؟ کیپٹن گوپال کی لاش دیکھ کر پولیس کا یہ اندازہ تو بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ وہ کسی عورت کے انتقام کا نشانہ بنا ہے۔ بیڈ روم سے سیتا اور کلپنا کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ لیکن اُس گنجے کی لاش کو کہاں فٹ کیا جائے گا؟

پولیس کے لئے یہ کیس یقیناً بہت پیچیدہ ثابت ہو گا لیکن میرے خدشات بہرحال اپنی جگہ پر موجود تھے۔ پولیس نے حویلی سے فنگر پرنٹس بھی اُٹھائے تھے۔ میرے پرنٹس کی تو ظاہر ہے شناخت نہیں ہو سکے گی۔ لیکن پولیس کسی شبے کی بنا پر اگر سیتا کے پرنٹس کو چیک کرنے کی کوشش کرے تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ پولیس بعض اوقات سامنے کی ایسی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے جن سے فوری طور پر کوئی مثبت نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہو۔ لیکن بعض اوقات بال کی کھال نکالتے ہوئے یہ پولیس والے بہت دُور تک پہنچ جاتے ہیں۔

سیتا نے کیپٹن گوپال کو مردانگی سے محروم کر دیا تھا۔ کٹے ہوئے عضو سے ہی پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ گوپال کسی عورت کے انتقام کا نشانہ بنا تھا۔ کوئی ایسی عورت جو اپنی مرضی کے خلاف کیپٹن گوپال کی ہوس کا شکار ہوئی تھی۔

اگر کسی ذہین پولیس آفیسر نے کسی طرح یہ پتہ چلا لیا کہ کبھی سیتا کیپٹن گوپال کی زیادتی کا شکار ہوئی تھی تو گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ سیتا کے ساتھ وہ افسوس ناک واقعہ جے پور میں پیش آیا تھا،

مجرم تو گوپال تھا مگر اُس نے فوج میں اپنے عہدے اور تعلقات سے کام لے کر سیتا کے ایک غریب مسلمان دوست کو پھنسا دیا تھا اور پولیس نے اُسے مار مار کر موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ سیتا ہی کے کہنے کے مطابق جے پور میں اس واقعہ کو خاصی شہرت بھی ملی تھی۔ جیسلمیر اگرچہ جے پور سے ساڑھے چھ سو کلومیٹر دُور تھا مگر آج کے دور میں فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ کسی خبر کو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگتے۔

وہ خبر جیسلمیر کے اخبارات میں بھی چھپی ہو گی۔ اور اگر کسی پولیس آفیسر کے ذہن میں وہ یاد تازہ ہو گئی تو وہ گڑھے مُردے اُکھاڑنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ حویلی سے ملنے والے اُنگلیوں کے نشانات کو سیتا کی اُنگلیوں کے نشانات سے ملانے کی کوشش ضرور کی جائے گی۔ جے پور میں اُس کے گھر سے ایسی چیزیں منگوا لی جائیں گی جو اُس کے استعمال میں رہی ہوں گی۔ اور جب نشانات مل جائیں گے تو پولیس کو دو اور دو کا نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

دوسری طرف گنگو تھا جو فرار ہو گیا تھا۔ پولیس کو کسی خفیہ ذریعے سے حویلی کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ ہو سکتا ہے پولیس کو یہ اطلاع گنگو ہی نے دی ہو، یا ممکن ہے وہ حویلی سے فرار ہو کر سیدھا بوڑھے ٹھاکر بلبیر سنگھ کے پاس پہنچا ہو اور بلبیر سنگھ نے پولیس کو گمنام اطلاع دے دی ہو۔

ہو سکتا ہے پولیس کو اطلاع ان دونوں میں سے کسی نے نہ دی ہو کوئی تیسرا شخص..... رات کو حویلی میں فائرنگ بھی ہوئی تھی اور کلپنا کی چیخیں بھی گونجی تھیں۔ کوئی ایسا شخص جس نے چیخوں اور فائرنگ کی آوازیں بھی سنی ہوں، اور اُس نے گمنام رہ کر پولیس کو خبر کر دی ہو۔ لیکن میں نے یہ خیال بھی ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر کسی کو کسی گڑبڑ کا شبہ ہوا بھی تھا تو اُسے رات ہی کو پولیس کو اطلاع دے دینی چاہئے تھی آج دن کے گیارہ بجے تک انتظار کیوں کیا؟

میں جتنا سوچتا اُتنا ہی میرا ذہن اُلجھتا چلا گیا۔ معاملہ خاصا پیچیدہ ہو گیا تھا۔ سیتا کو اب بھی میرے خیالات سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ خاصی مطمئن تھی۔ اُس کے خیال میں پولیس کسی طرح بھی جیسلمیر میں اُس کی موجودگی کا سراغ نہیں لگا سکتی تھی۔

ہم دونوں لان ہی میں بیٹھے رہے۔ اور جب کلپنا نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو ہم اُٹھ کر اندر آ گئے۔ اس وقت بھی کھانے میں دو تین ڈشیں تھیں جو سب کی سب سبزیوں سے تیار کی گئی تھیں۔ میں سبزی خوروں میں پھنس گیا تھا اور کئی روز سے گوشت کھانے کو نہیں ملا تھا۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کلپنا کچن دھونے کے بعد صفائی وغیرہ کر رہی تھی۔ اُس نے دُرگا کو کئی کاموں سے فارغ کر دیا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر وہ بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اُسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ اُس کے ذہن سے ہر قسم کا ڈر خوف نکل گیا تھا اور یہاں وہ پوری طرح مطمئن تھی۔

رات کا ایک بج گیا۔ مجھے نیند آنے لگی تو میں اُٹھ کر اُوپر اُس کمرے میں آ گیا جو ہم نے

یہاں پہلے ہی منتخب کرلیا تھا۔ میں بستر پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔

○

صبح مجھے بری طرح جھنجھوڑ کر جگایا گیا..... میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح جگائے جانے سے آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں اور دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

''اے مہابیر سنگھ..... اُٹھو! جلدی کرو۔'' سیتا میرے کندھے کو جھٹکا دیتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔

''کیا ہے.....؟'' میں نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''قیامت آگئی ہے کیا؟''

''وہ قیامت سے بھی بڑی چیز ہے۔'' سیتا بولی۔ ''پتا جی آگئے ہیں..... جلدی اُٹھو! بھاگو یہاں سے۔''

میرے دماغ میں زوردار دھماکہ ہوا اور آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''کہاں ہیں تمہارے پتا جی؟'' میں بدحواسی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''وہ باہر گلی میں موجود ہیں۔ اندر آنے ہی والے ہیں۔'' سیتا نے کہا۔ میرے دماغ میں ایک اور دھماکہ ہوا۔ میں بیڈ سے اُتر کر جوتے پہننے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں سوچ رہا تھا کہ اگر سیتا کا باپ باہر گلی میں موجود ہے تو ہم حویلی سے کیسے نکل سکیں گے؟ حویلی کی دیواریں بھی اتنی اُونچی تھیں کہ ان پر چڑھنا محال تھا اور باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی مجھے اب تک نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے اُٹھ کر سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''جلدی آؤ!'' وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''کلپنا کہاں ہے؟'' میں نے کہتے ہوئے سیتا کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور اُسی لمحہ میری نظر کلپنا پر پڑ گئی۔ وہ دروازے کے سامنے راہداری میں کھڑی تھی۔ اُس کے جسم پر وہی لباس تھا جو کل شام کو پہن رکھا تھا۔ اُس کے بال بھی بکھرے ہوئے، چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں سرخ تھیں۔ ہم سیتا کے پیچھے تیزی سے چلتے ہوئے نیچے آگئے جہاں لابی میں دُرگا ہماری منتظر تھی۔ اُس کے چہرے پر بھی تشویش نمایاں تھی۔

ہم دُرگا کے ساتھ اسی راہداری میں آگئے جس کے عین اُوپر وہ راہداری تھی جس کے دائیں بائیں ہمارے وہ کمرے تھے جہاں سے ہم ابھی نکل کر آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ دُرگا ہمیں کسی کمرے میں چھپا دے گی، اور میرے خیال میں یہ حماقت ہی ہوتی۔ اگر یہاں کسی کمرے میں چھپانا تھا تو اُوپر والا کمرہ کیا برا تھا؟ مگر دُرگا کسی کمرے کا رُخ کرنے کی بجائے سامنے باتھ رُوم میں گھس گئی اور ہمیں بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔

میری آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔ کیا وہ ہمیں باتھ رُوم میں بند کرنا چاہتی تھی؟ میں نے

اندر قدم رکھتے ہوئے سوچا۔ لیکن میرا یہ خیال بھی غلط نکلا۔

باتھ رُوم کسی کمرے ہی کی طرح بہت کشادہ تھا۔ ایک طرف سنگ مرمر کا بہت بڑا باتھ ٹب بھی تھا اور یہ باتھ رُوم جدید ترین سہولتوں سے آراستہ تھا۔ فرش پر سنگ مرمر کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ تین دیواروں پر پانچ فٹ تک ٹائلز لگے ہوئے تھے۔ تمام ٹکڑے پانچ پانچ انچ کے تھے اور بڑی نفاست سے لگائے گئے تھے۔

دُرگا باتھ رُوم کا دروازہ بند کر ہی رہی تھی کہ باہر سے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ دائیں طرف کموڈ لگا ہوا تھا۔ اُس کے پیچھے دیوار کے ساتھ فلش ٹینکی تھی۔ اُس نے ٹینکی کا ڈھکنا اُٹھا دیا اور اندر بھرے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولنے لگی۔ ٹینکی میں بھرا ہوا پانی پُرشور آواز کے ساتھ کموڈ میں بہہ گیا اور دوسرے ہی لمحہ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پہلے تو میں اُسے اپنا واہمہ سمجھا تھا لیکن وہ جو کچھ بھی تھا حقیقت تھا۔ میں متوحش نظروں سے سامنے والی اُس دیوار کو دیکھ رہا تھا جس پر فرش سے چھت تک سنگ مرمر کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ وہ دیوار بیچ سے شق ہو رہی تھی۔ اُس کا ایک حصہ آہستہ آہستہ سرکتا ہوا بائیں طرف کی دیوار میں غائب ہو رہا تھا۔ اُس دیوار میں اتنا راستہ بن گیا تھا کہ ایک پہلوان قسم کا موٹا تازہ آدمی آسانی سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ ہم تینوں اُس دیوار کے دوسری طرف آگئے اور دیوار آہستہ آہستہ دوبارہ اپنی جگہ پر آنے لگی۔

''جیسے ہی موقع ملا میں آنے کی کوشش کروں گی۔'' دُرگا نے کہا۔ ''ویسے چنتا کرنے کی ضرورت نہیں..... یہاں تم لوگ بالکل محفوظ رہو گے۔''

دیوار اپنی جگہ پر آگئی۔ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے سیتا کی طرف دیکھا اور پھر دیوار کو اُوپر سے نیچے تک گھورنے لگا۔ اس طرف اگرچہ سنگ مرمر کے ٹکڑے نہیں لگے تھے، عام پلستر تھا جس پر رنگ کیا ہوا تھا لیکن اُس میں کوئی بال برابر لکیر بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ یہ دیوار دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔

یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور کچھ فرنیچر بے ترتیبی سے پڑا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ نامعلوم مدت تک ہمیں اس کمرے میں ہی قید رہنا پڑے گا۔ لیکن جب میں دوسری طرف گھوما تو بائیں طرف کی دیوار میں ایک دروازہ دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ سیتا مجھ سے پہلے ہی اُس دروازے کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔

میں نے کلپنا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے اُبھر آئے تھے۔ اس دوران سیتا دروازہ کھول چکی تھی۔ اس سے آگے ایک مختصر سی راہداری تھی۔ میں کلپنا کا ہاتھ پکڑ کر راہداری میں آگیا۔ راہداری کے اختتام پر ہال نما بڑا کمرہ تھا۔ اُس میں اوسط درجے کا فرنیچر لگا ہوا تھا۔ ایک ایک کمرہ اُس راہداری کے دائیں بائیں تھا اور ایک سامنے۔ اس کمرے کے ساتھ ایک اور راہداری تھی۔ دوسری طرف بھی ایک دروازہ تھا۔

مجھے تو یہ سب کچھ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ سیتا کی آنکھوں میں بھی حیرت اور اُلجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔ ہم لوگ ایک ایک کمرے میں گھومتے ہوئے کچن میں آ گئے۔ یہاں ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔

یہ تین بیڈ رُومز کا ایک مکمل مکان تھا اور اُس کی آراستگی اور سامان دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں کسی کی رہائش بھی ہے۔

سیتا نے آخری دروازہ کھولا تو میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی...... سامنے ایک کشادہ پختہ صحن تھا جس کے عین بیچ میں ایک گول کیاری تھی جس کے گرد تین چار اِنچ اُونچی پختہ منڈیر تھی اور اس کیاری میں تلسی کا پودہ لگا ہوا تھا۔ صحن کی دیواروں کے ساتھ بھی تین تین فٹ چوڑی کیاریاں تھیں جن میں پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ سامنے والی دیوار میں وہ دروازہ تھا جو غالباً گلی میں کھلتا تھا۔

سیتا اُس دروازے کی طرف بڑھی تو میں بھی اُس کے ساتھ ہی تھا۔ اُس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا، میں بھی گردن آگے نکال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ ایک تنگ سی گلی تھی جس میں مکانوں کے دروازے ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ یہ تمام مکان پرانی طرز کے تھے۔ دروازوں کے درمیانی فاصلے بتا رہے تھے کہ یہ مکان اندر سے کافی کشادہ ہوں گے۔

گلی تقریباً سو گز لمبی تھی۔ اس کے اختتام پر غالباً کوئی بازار تھا۔ اِکا دُکا لوگوں کی آمد و رفت دکھائی دے رہی تھی۔ البتہ گلی بالکل سنسان تھی۔ سیتا نے دروازہ بند کر کے کنڈا چڑھا دیا اور ہم ہال کمرے میں آ گئے جہاں کلپنا کھڑی متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے باپ کو ایسی کیا پڑی تھی کہ راتوں رات ساڑھے چھ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے صبح سویرے یہاں پہنچ گیا۔'' میں نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میری مخاطب ظاہر ہے سیتا ہی تھی۔

''مہاراج دھرمیش سنگھ کی حویلی میں دو افراد کا قتل کوئی معمولی بات نہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اور پھر کیپٹن گوپال سنگھ اُن کا بھتیجا تھا۔ اُس فوجی آفیسر کے قتل نے تو انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔ کل کے اخبار میں تو یہی لکھا تھا کہ پتا جی کو جے پور میں اطلاع دے دی گئی ہے اور وہ کل دوپہر تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس درگھٹنا نے پتا جی کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہو گا اور وہ رات ہی کو وہاں سے چل پڑے۔''

''ہمیں تو اُنہوں نے گھر سے بے گھر کر دیا ناں۔'' میں نے کہا۔ ''کتنی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ میرا خیال ہے ابھی تو سات بھی نہیں بجے ہوں گے۔''

''سوا سات......'' سیتا نے دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور کیا تمہیں یہ گھر نہیں لگ رہا؟ ہر چیز موجود ہے یہاں۔ اگر تم چاہو تو کسی بھی کمرے میں جا کر سو سکتے ہو۔''

''اب اگر جاگ گئے ہیں تو دوبارہ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیند تو تمہارے پتا کا نام سنتے ہی اُڑ گئی تھی۔ لیکن......''

''لیکن کیا؟'' سیتا نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''شاید ہمیں بھوکا رہنا پڑے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک تمہارے پتا کہیں چلے نہیں جاتے۔ اور اس وقت تک......''

اپنے عقب میں گھنٹی کی آواز سن کر مجھے یوں لگا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو...... میں اپنی جگہ سے کئی فٹ اُوپر اُچھل پڑا تھا۔ سیتا اور کلپنا بھی وحشت زدہ سی ہو گئی تھیں۔

میں سنبھل کر پیچھے مُڑا تو میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ صوفے کے ساتھ ذرا پیچھے ایک چھوٹی تپائی پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا اور اُس کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں اُلجھی ہوئی نظروں سے سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ مکان پتہ نہیں کس کا تھا اور فون کال بھی نجانے کس کے لئے...... ابھی تک تو ہمیں اس مکان میں کوئی ذی رُوح نظر نہیں آیا تھا۔

سیتا نے اشارہ کیا تو میں نے فون کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا لیکن بولا کچھ نہیں۔ دوسری طرف سے کسی کے بولنے کا منتظر تھا۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور ایک لمحہ بعد ہی ایک نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''سیتا...... میں دُرگا بول رہی ہوں۔''

''اوہ! دُرگا جی۔'' میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

''مہابیر جی......!'' دُرگا کی آواز سنائی دی۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں راجیو نام کا ایک آدمی مکان پر پہنچ جائے گا۔ وہ تم لوگوں کے ناشتے کھانے کا بندوبست کر دے گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''شکریہ دُرگا جی!'' میں نے کہا۔ ''تم نے جس طرح ہمیں حویلی سے نکالا تھا میں تو یہی سمجھا تھا کہ ہمیں فاقہ ہی کرنا پڑے گا۔'' جواب میں ہنسی کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور پھر لائن بے جان ہو گئی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔

''راجیو گاندھی ہمارے لئے ناشتہ لے کر آ رہے ہیں۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟'' سیتا نے مجھے گھورا۔ ''اُس کی تو راکھ بھی اب تک نیست و نابود ہو چکی ہو گی۔ پر شاید اُس کی آتما تم سے ملنے کے لئے آنے والی ہو۔''

''آتما ہو یا کوئی جیتا جاگتا انسان......'' میں نے کہا۔ ''بہرحال! ہمارے کھانے پینے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں......''

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی باہر کے دروازے پر دستک کی آواز اُبھری تو میں اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ ''وہ آ گیا ہے۔''

میں باہر آ گیا۔ بیرونی دروازے کے قریب پہنچ کر کنڈا گرانے سے پہلے میں نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا، وہ آدمی دروازے کے بالکل قریب کھڑا تھا اور اُس کے صرف کپڑے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اُسی لمحہ دستک ایک بار پھر اُبھری اور ساتھ ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''مہابیر جی! دروازہ کھولو..... راجیو آیا ہوں۔''

میں نے کنڈا گرا دیا۔ دُرگا نے اُسے میرا نام بھی بتا دیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی جو آدمی اندر داخل ہوا اُسے دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ گئی..... اُس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے بھی کچھ نکلتا ہوا تھا۔ آبنوسی رنگت، اُس نے دھوتی اور قمیض پہن رکھی تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اُس کا چوڑا سینہ ریچھ کی طرح سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ شیو تو شاید اُس نے کچھ دیر پہلے ہی بنایا ہو گا اور مونچھیں رُخساروں تک پھیلی ہوئی تھیں جس سے اُس کا چہرہ خاصا خوفناک ہو گیا تھا۔ موٹی موٹی سرخ آنکھیں، ایک کان میں چوڑی کی طرح بڑا سا بالا اور سر پر گوالوں کی طرح کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی پیتل کی ڈولی تھی جس میں دُودھ تھا اور دوسرے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا جس میں غالباً ناشتے کا سامان تھا۔

''نمسکار مہابیر جی!'' اُس نے دونوں ہاتھ کسی قدر اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آدھا گھنٹہ پہلے مجھے دُرگا دیوی نے بتایا تھا کہ مہمان آئے ہیں۔ ان کے کھان پین کا بندوبست کروں۔ ڈھابے پر دیر ہو گئی۔''

''اچھا..... ٹھیک ہے۔ پہلے ہمارے لئے چائے بناؤ، پھر ناشتہ تیار کرنا۔'' میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

وہ اندر داخل ہوا تو میں بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔ اُس نے سیتا کا نام لے کر پرنام کیا تو میں چونک پڑا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سیتا کو جانتا تھا۔ سیتا کے منہ سے بھی گہرا سانس نکل گیا۔

''کیسی ہو سیتا جی.....؟'' راجیو بولا۔ ''بہت عرصہ سے درسن نا ہی دیا ہو۔ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

''بس ٹھیک ہی جا رہی ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''تمہیں دُرگا نے یہاں بھیجا ہے نا..... اور اُس نے تمہیں کچھ سمجھایا بھی ہو گا۔''

''تم چنتا مت کرو سیتا جی!'' راجیو جلدی سے بولا۔ ''ہم نے سیتا دیوی کے بارے میں کچھ نہیں سنتا۔ درنتوں سے اُسے نہیں دیکھا ہوں۔''

''ٹھیک ہے..... اب جاؤ! پہلے ہمارے لئے چائے بناؤ۔'' سیتا نے کہا۔ راجیو کچن والی راہداری میں چلا گیا اور میں سیتا والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''یہ کیا چیز ہے؟'' میں نے کچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بڑی کتی شے ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بچپن سے ہمارے گھر میں

پلا ہے۔ پتا جی نے دُرگا کو یہ حویلی لے کر دی تو اسے بھی ساتھ بھیج دیا۔ کتے کی طرح وفادار ہے۔ جان دے دے گا پر مالک پر آنچ نہیں آنے دے گا۔ کل میں نے اسے حویلی میں نہیں دیکھا تو یہی سمجھی تھی کہ شاید دُرگا نے اسے واپس بھیج دیا ہے۔''

''اگر تمہارے پتا سے اس کا سامنا ہو گیا تو تمہارے بارے میں بتا تو نہیں دے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں.....'' سیتا بولی۔ ''دُرگا نے اسے سمجھا کر ہی یہاں بھیجا ہو گا۔ اور پھر مجھے حویلی کی بجائے یہاں دیکھ کر بھی بہت کچھ سمجھ گیا ہو گا۔''

''یہ مکان.....'' میں نے کہتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''میں نے سنا تھا کہ محلات اور حویلیوں میں زیرِ زمین سرنگیں اور خفیہ راستے ہوتے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ.....''

''ذرا سکون ہونے دو..... میں تمہیں یہاں کے تاریخی محلات اور حویلیوں میں خفیہ راستے اور سرنگیں دکھاؤں گی۔ انہیں دیکھ کر تم اطمینان سے حیران ہوتے رہنا۔ فی الحال تو میں حیران ہو رہی ہوں۔'' سیتا نے کہا۔

''کس بات پر حیرت ہے تمہیں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اس مکان پر.....'' سیتا بولی۔ ''میں دُرگا کی حویلی میں کئی بار آئی ہوں۔ حویلی میں تہہ خانوں کے بارے میں تو میں جانتی ہوں لیکن باتھ رُوم سے خفیہ راستہ اور یہ مکان..... مجھے اس کا علم نہیں تھا۔''

''پھر تو واقعی حیرت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے باپ کی حویلی اور تمہیں اس خفیہ راستے کا علم نہیں تھا۔''

''یہ ہندوستان ہے مائی ڈیئر!'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ خطہ تو راجوں مہاراجوں کا ہے جہاں گدی کے لئے اپنے مخالفین کو موت کے گھاٹ اُتار دینا بہت معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ اقتدار بہت بری چیز ہے۔ تم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ یہاں تخت و تاج اور گدی کے لئے باپ نے بیٹے کو اور بیٹے نے باپ کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں بھی کبھی عار محسوس نہیں کیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں تو محلاتی سازشیں بہت مشہور ہیں۔ برسرِ اقتدار شہنشاہ یا راجہ کو اپنی اولاد پر بھی بھروسہ نہیں ہوتا تھا۔ اولاد، خصوصاً بیٹا پیدا ہوتے ہی وہ اپنے بچاؤ اور فرار کے راستے بھی تیار کر لیتے تھے۔ کسی راجہ کے محل کے خفیہ خانوں اور سرنگوں کا علم اس کی اولاد کو بھی نہیں ہوتا تھا اور مصیبت کے وقت راجہ اپنی جان بچانے کے لئے وہی خفیہ راستے استعمال کرتا تھا۔''

''تو گویا تمہارے باپ کو بھی اپنی اولاد پر بھروسہ نہیں تھا؟'' میں نے کہا۔

''میرے باپ کا کوئی بیٹا نہیں تھا جس سے اُسے کوئی خطرہ محسوس ہوتا۔'' سیتا نے جواب

دیا۔ ''ہم صرف دو بہنیں ہیں۔ میری دیدی شادی کر کے امریکہ جا چکی ہے اور میں تو ویسے ہی بے ضرر سی لڑکی ہوں۔ اپنے باپ کی بہت لاڈلی۔ مجھ سے اُسے کیا خطرہ ہوگا جو وہ ایسی باتیں مجھ سے چھپانے کی کوشش کرے گا؟ اور ویسے بھی ہم دونوں بہنوں کی پیدائش سے پہلے ہی پتا جی کا راج سنگھاسن چھن چکا تھا۔ اور یہ حویلی.....'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''یہ حویلی تو اُنہوں نے بنی بنائی خریدی تھی جو بعد میں دُرگا کو دے دی تھی۔ اگر اُنہیں اس خفیہ راستے کا پتہ بھی تھا تو ہمیں کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن ہوسکتا ہے دُرگا کو اس کا علم ہو۔''

''اور اُس نے تم لوگوں کو کبھی نہیں بتایا۔'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''وہ تمہارے باپ کی رکھیل ہے۔ کروڑوں روپے مالیت کی یہ حویلی اُس نے دُرگا کو بخش دی تھی۔ دُرگا کو یقیناً تمہاری ماں کی طرف سے کوئی خطرہ ہوگا۔ اسی لئے تو اُس نے کسی ہنگامی صورتحال میں اپنے بچاؤ کا یہ راستہ چھپا کر رکھا ہوگا۔''

''بہت ذہین آدمی ہو۔'' سیتا مسکرائی۔ ''تمہارے دل میں ایسی بہت سی باتیں آسکتی ہیں اور آنی بھی چاہئیں۔ لیکن دُرگا کو میری ماں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ابتدائی چند برسوں میں ماتا جی اُس سے کچھ ناراض رہی تھیں لیکن پھر رفتہ رفتہ اُن کے دل سے میل نکل گیا اور اُنہوں نے دُرگا سے ملنا بھی شروع کر دیا۔ ماتا جی کو اس بات کا کوئی افسوس نہیں تھا کہ پتا جی نے یہ حویلی دُرگا کے نام ٹرانسفر کیوں کرائی تھی۔ اور ایک موقع پر تو دُرگا نے حویلی کے کاغذات ماتا جی کے چرنوں میں رکھ دیئے تھے اور حویلی سے دستبرداری کا اعلان کیا تھا مگر ماتا جی نے نہ تو کاغذات لئے اور نہ ہی حویلی پر حق جتایا۔ اُن کے پاس کافی ہے۔''

''ہوں.....'' میں نے گہرا سانس لیا۔ ''لیکن دُرگا نے یہ راز اب تک کیوں چھپائے رکھا؟''

''ہوسکتا ہے اسے کبھی بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگر اس کے دل میں کوئی کھوٹ ہوتا تو آج بھی ہمیں اس راز سے آگاہ نہ کرتی بلکہ پتا جی کی نظروں سے بچانے کے لئے ہمیں کسی اور طریقے سے حویلی سے نکالنے کی کوشش کرتی۔''

ہماری باتیں جاری تھیں کہ راجیو چائے لے کر آ گیا۔ اُس نے ہم تینوں کے سامنے ایک ایک کپ رکھا اور ہمارے سامنے ہی فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

کلپنا اتنی دیر تک ڈری سہمی بیٹھی رہی تھی لیکن اب ایک بار پھر اُس کا خوف بتدریج کم ہونے لگا۔ راجیو سیتا سے باتیں کر رہا تھا اور وہ دلچسپی سے باتیں سن رہی تھی۔

''راجیو!'' سیتا نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد راجیو کی برہنہ توند کی طرف اشارہ کیا۔ ''سب سے پہلے تم جا کر کوئی کرتہ پہنو اور اس توند کو چھپاؤ جسے دیکھ کر ڈر لگ رہا ہے۔''

''لو سن لو سیتا جی کی باتاں۔'' راجیو نے ہنس کر کہا۔ ''سیتا جی! سارا جیون تو تم نے راجیو اس توند پر کھیلتے ہوئے بتایا ہے۔ اب ڈر لگنے لگا تیرے کو۔''

میرے منہ میں چائے بھری ہوئی تھی۔ راجیو کی اس بات پر میں اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکا

منہ میں بھری ہوئی چائے کا فوارہ چھوٹ گیا اور سامنے بیٹھا ہوا راجیو ہی اُس کی زد میں آیا تھا۔

سیتا اور کلپنا بھی قہقہے لگانے لگیں۔ راجیو نے معصومیت سے جو بات کہہ دی تھی وہ اُس کا مفہوم نہیں جانتا تھا۔ وہ سر سے کپڑا اُتار کر اپنا چہرہ پونچھنے لگا جہاں میرے منہ کی چائے گری تھی۔ سیتا بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پا سکی تھی۔ راجیو ہونقوں کی طرح ہمارا منہ تک رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ اُس نے کیا غلط بات کہہ دی تھی۔

''کیا ہوا آپ لوگوں کو؟'' وہ باری باری ہمیں گھورتے ہوئے بولا۔ ''کیا کہہ دیا ہم نے؟''

''تم یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں بچپن میں تمہاری گود میں کھیلی ہوں۔'' سیتا نے کہا۔

''ہاں..... ہم تو یہی کہت ہوں۔'' راجیو بولا۔

''مگر تم نے تو یہ کہہ دیا کہ اپنا جیون تمہاری توند پر کھیلتے ہوئے بتایا ہے۔ بھئی اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں جوان ہونے کے بعد بھی.....''

''رام رام..... رام رام۔'' راجیو کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا اُٹھ گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو سیتا جی؟ تم تو ہماری بٹیا ہو..... اچھا ہم ناشتہ بنانے جا رہے ہیں۔'' وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد بھی ہم دیر تک ہنستے رہے۔

چائے پینے کے بعد ہم نے ایک بار پھر تینوں بیڈ رومز میں جھانکا۔ تینوں کے ساتھ اٹیچ باتھ تھے۔ ہم ایک ایک کمرے میں گھس گئے۔

تقریباً نو بجے ہم نے ناشتہ کیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد راجیو سودا لینے کے لئے بازار جانے لگا تو سیتا نے اُسے مرغی کا گوشت لانے کو بھی کہہ دیا تھا۔ ہندوؤں نے اگرچہ گائے کا گوشت اپنے اُوپر حرام کر رکھا تھا لیکن بیشتر لوگ بکرے یا مرغی وغیرہ کا گوشت بھی نہیں کھاتے تھے۔

ہم لوگوں نے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے جو کل رات ہمارے جسموں پر تھے۔ سیتا نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ صبح اس قدر افراتفری میں وہاں سے بھاگے تھے کہ کپڑے بدلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب راجیو واپس آ گیا۔ وہ کچھ پھل بھی لے آیا تھا۔ اُس نے پھل دھو کر پلیٹ میں ہمارے سامنے رکھ دیئے اور خود کچن میں جا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ہم پھل کھاتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ ایک اندرونی راہداری سے دُرگا کو برآمد ہوتے دیکھ کر ہم سب ہی چونک گئے۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا کہ اچانک دُرگا کہاں سے آ گئی۔ لیکن پھر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ مجھے وہ خفیہ راستہ یاد آ گیا۔

دُرگا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ سیتا کے قریب بیٹھ گئی۔

''تم تینوں سے سوری بھئی!'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم لوگوں کو اچانک ہی یہاں سے نکالنا پڑا۔ اگر چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو معاملہ گڑبڑ ہو جاتا۔ اور ہاں..... ناشتہ کیا یا نہیں؟''

''ناشتہ کرلیا۔ اور اب تو دوپہر کے کھانے کا انتظار ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ڈیڈی گئے؟'' سیتا نے پوچھا۔

''ہاں..... تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے گئے ہیں۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''وہ رات ایک بجے پور سے روانہ ہوئے تھے۔ ناشتہ اُنہوں نے یہاں پر ہی کیا تھا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ اُن کے آنے کی اطلاع دو تین منٹ پہلے مل گئی تھی۔'' چند لمحوں کو دُرگا خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''دراصل ہوا یوں کہ اُن کے گارڈز کی آگے آنے والی گاڑی حویلی کے دروازے پر پہنچ گئی تھی اور ایک گارڈ نے دروازہ کھلوانے کے لئے کال بیل بجادی تھی۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ تمہارے پتا جی کی گاڑی گلی کے موڑ پر دودھ والی ایک پک اَپ سے ٹکرا گئی تھی۔ اُس بے چارے کے دودھ کے سارے کین اُلٹ گئے۔ معاملے کو سلجھانے میں تمہارے پتا جی کو چند منٹ کی دیر ہوگئی۔ اگر حادثہ نہ ہوتا تو تم لوگوں کو وہاں سے نکلنے کا موقع نہ ملتا۔''

''پتا جی کہاں گئے ہیں؟'' سیتا نے ایک اور سوال کیا۔

''پولیس ہیڈ کوارٹر.....'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''پہلے وہ ٹیلی فون پر مختلف لوگوں سے رابطے کے اس سلسلے میں معلومات حاصل کرتے رہے اور پھر آدھا گھنٹہ پہلے پولیس ہیڈ کوارٹر گئے ہیں۔''

''واپس آئیں گے یا.....؟'' سیتا نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

''آج کی رات وہ جیسلمیر میں ہی رہیں گے۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''یہ نہیں بتایا کہ رات کو یہاں رہیں گے یا کسی دوست کے ہاں ٹھہریں گے۔ لیکن بہرحال تم لوگوں کو آج کی رات اسی مکان میں گزارنی پڑے گی۔''

سیتا اپنے باپ کے بارے میں کچھ اور باتیں پوچھتی رہی۔ پھر بولی۔ ''ایک بات اور دُرگا دیوی!'' اُس نے نظریں دُرگا کے چہرے پر جما دیں۔ ''یہ اس مکان کا کیا چکر ہے..... اور خفیہ راستہ؟ پہلے تو تم نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔''

''تم کتنے عرصے بعد یہاں آئی ہو؟'' دُرگا نے پوچھا۔

''تقریباً دو سال بعد۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''دو سال پہلے جب آخری مرتبہ تم یہاں آئی تھیں تو ایسی کوئی صورتحال نہیں تھی۔'' دُرگا نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' سیتا نے اُسے گھورا۔

''تقریباً ڈیڑھ سال پہلے راجیو نے مجھے بتایا کہ یہ مکان بک رہا ہے۔ قیمت اگرچہ زیادہ تھی لیکن میرے پاس رقم موجود تھی۔ میں نے خرید لیا۔ راجیو اس گلی میں رہتا ہے۔ اس نے سامنے والا مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔ کیا اُس نے تمہیں کچھ بتایا نہیں؟''

''کچھ نہیں..... لیکن وہ تو تمہارا خدمتگار ہے۔ اُس نے الگ مکان کیوں لیا؟'' سیتا نے پوچھا۔

''اُس نے شادی کر لی ہے۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''یہ ان دنوں کی بات ہے جب دو سال پہلے تم آخری مرتبہ یہاں سے ہو کر گئی تھیں۔ تمہارے جانے کے چند روز بعد ہی اُس نے شادی کر لی تھی۔''

''اچھا..... یہ بات ہے۔ ابھی اُس کی گردن ناپتی ہوں۔ اُس نے یہ بات ابھی تک مجھ سے چھپائے رکھی..... لیکن پہلے اس مکان کے بارے میں بتاؤ۔'' سیتا بولی۔

''میرا خیال تھا کہ بیچ کی دیواریں بھی تڑوا کر میں اس مکان کو حویلی میں شامل کرلوں گی۔ لیکن پھر اچانک ہی ایک اور خیال آیا اور میں نے اس میں وہ خفیہ راستہ بنالیا۔ اس کے لئے میں نے کاریگر جودھ پور سے منگوائے تھے اور لاکھوں روپے خرچ ہوئے تھے۔ راجیو کے علاوہ کسی اور کو اس مکان اور اس خفیہ راستے کا پتہ نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم پتا جی سے ڈرنے لگی ہو۔'' سیتا نے اُسے گھورا۔

''تمہارے پتا جی سے کیوں ڈرنے لگی۔'' دُرگا نے کہا۔ ''خوف تو مجھے اپنوں سے آنے لگا ہے جنہیں کئی سال بعد عزت کا خیال آیا ہے۔''

''میں سمجھی نہیں.....'' سیتا نے اُسے گھورا۔

''جب تمہارے پتا جی سے ملاقات ہوئی تھی تو میری منگنی ہو چکی تھی۔'' دُرگا کہنے لگی۔ ''ہے تو وہ ہمارے خاندان کا لیکن اُس وقت وہ ایک چھوٹا آدمی تھا۔ اُس کے ماں باپ کی مالی حالت بھی بہت کمزور تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں نے دولت کے لالچ میں مہاراج کو اپنے حسن کے جال میں پھنسایا ہے۔ وہ ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنا چاہتا تھا مگر ایک تو وہ مہاراج سے ڈرتا تھا اور پھر احساسِ کمتری میں بھی مبتلا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کے پاس بہت سی دولت ہوگی تو میں تمہارے پتا جی کو چھوڑ کر اس کے پاس چلی جاؤں گی۔ اُس نے دن رات محنت کی، کچھ فراڈ بھی کئے اور آج اُس کے پاس دولت کی ریل پیل ہے۔ تقریباً دو ہی سال پہلے وہ جیسلمیر منتقل ہو گیا تھا۔ اُس نے مین بازار کے عقب میں ایک چھوٹی سی حویلی بھی خرید لی تھی۔ ایک دو مرتبہ اُس نے دبے لفظوں میں اپنے من کی بات کہنے کی کوشش کی مگر میری طرف سے کورا جواب سن کر دھمکیوں پر اُتر آیا۔''

''اوہ.....'' سیتا بولی۔ ''تم نے پتا جی کو بتایا؟''

''میں تمہارے پتا جی کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''ان دنوں میں یہ مکان خرید چکی تھی اور اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیلاش جیسے آدمی کا کوئی بھروسہ نہیں..... ہوسکتا ہے کسی رات وہ غنڈوں کو لے کر حویلی پر چڑھ آئے۔ اس لئے میں نے بڑی رازداری سے اس مکان اور حویلی کے درمیان یہ خفیہ راستہ بنوا لیا۔ اور آج پہلی بار صحیح معنوں میں یہ راستہ استعمال ہوا ہے۔''

''اور کیلاش..... میرا مطلب ہے تمہارا منگیتر؟'' سیتا نے پوچھا۔

''وہ یہیں ہے..... جیسلمیر میں۔'' دُرگا نے بتایا۔ ''کبھی کبھی کسی جگہ سامنا ہو جاتا ہے۔ دھمکیاں تو ہر بار دیتا ہے مگر آج تک کسی دھمکی پر عمل نہیں کر سکا۔''

''ذرا حالات پُرسکون ہو لینے دو..... اُس سے بھی نمٹ لیں گے۔'' سیتا نے کہا۔ دُرگا اُسے گھور کر رہ گئی مگر بولی کچھ نہیں۔

دُرگا نے دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا۔ اس کے بعد بھی وہ ہمارے پاس بیٹھی رہی۔

''تم یہاں بیٹھی ہو، ایسا نہ ہو کہ پتا جی واپس آئیں تو گیٹ کی گھنٹیاں بجا بجا کر پریشان جائیں۔'' سیتا نے کہا۔

''میں نے تمام بندوبست کر رکھے ہیں۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں حو میں ایک ایسا سوئچ آن کر آئی ہوں کہ حویلی کے گیٹ پر کال بیل کا بٹن دبایا جائے گا تو یہاں گھنٹی بج اُٹھے گی۔'' اُس نے اندرونی راہداری والے دروازے کے اُوپر لگی ہوئی گھنٹی کی طرف اشارہ کیا جس کے ساتھ ہی ایک سرخ بلب بھی لگا ہوا تھا۔

اور پھر شام سات بجے ہم آنگن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو وہ گھنٹی بج اُٹھی..... سا ہی بلب روشن ہو گیا تھا اُس کی سرخ روشنی یہاں سے بھی دکھائی دے گئی تھی۔

دُرگا چائے کا کپ میز پر رکھ کر اندر کی طرف لپکی۔ میں اور سیتا بھی اُس کے ساتھ ہی اُ گئے تھے۔ اس کمرے میں پہنچ کر دُرگا نے سوئچ بورڈ پر ایک سوئچ آن کر دیا اور اس کے سا والا سوئچ آف کر دیا۔ سامنے والی دیوار شق ہو گئی۔ دُرگا ہماری طرف ہاتھ ہلاتی ہوئی اُس میں داخل ہو گئی اور چند سیکنڈ بعد ہی وہ خفیہ راستہ بند ہو گیا۔ ہمیں دونوں طرف سے اس راستے کے میکنزم کا پتہ چل گیا تھا۔

ہم دوبارہ آنگن میں آ گئے اور چائے پینے لگے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ سیتا نے دوڑ کر ریسیور اُٹھا لیا۔ وہ دُرگا ہی کی کا تھی۔ سیتا تقریباً دو منٹ تک بات کرتی رہی، پھر ریسیور رکھ دیا اور میرے سامنے آ کر کرسی بیٹھ گئی۔

''دُرگا بتا رہی تھی کہ پتا جی بہت غصے میں ہیں۔ وہ آج رات ہی کسی وقت جے پور کے روانہ ہو جائیں گے۔ وہ بعد میں ہمیں تفصیل سے سب کچھ بتائے گی۔''

چائے کے خالی کپ ابھی میز پر پڑے ہوئے تھے۔ راجیو کچن میں رات کے کھانے تیاری کر رہا تھا۔ وہ کپ اُٹھانے کے لئے آیا تو سیتا کو اچانک ہی جیسے کوئی بات یاد آ گئی۔

''ارے راجیو.....!'' وہ اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''سچ بتاؤ..... تمہاری توند پر کون کھیلتا ہے؟''

''لاجونتی.....'' راجیو کے منہ سے بے اختیار نکلا، پھر وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔ ''وہ..... وہ جی! بات یہ ہے کہ.....''

راجیو کی سادگی پر ہم بے اختیار ہنس پڑے۔

''تم نے اپنی شادی کی بات کیوں چھپائی..... ہمیں بتایا کیوں نہیں؟'' سیتا نے کہا۔

''تم نے بتانے کا موقع ہی کب دیا سیتا دیوی؟'' راجیو نے کہا۔

''وہ سامنے والے گھر میں رہتی ہے نا؟'' سیتا نے کہا۔ ''کھانا تیار ہو جائے تو اُسے لے کر آنا..... وہ کھانا ہمارے ساتھ کھائے گی۔''

''اچھا بٹیا..... لے آؤں گا اُسے۔ پر میں نے اُسے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' راجیو نے کہا۔

''کوئی بات نہیں.....'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں خود ہی بتا دُوں گی کہ اس سے پہلے میں تمہاری توند پر کھیلا کرتی تھی۔''

''سیتا جی.....!'' راجیو چیخ اُٹھا۔ ''وہ مجھے گھر سے نکال دے گی۔''

''ڈرتے ہو اُس سے؟'' سیتا نے اُسے گھورا۔

''وہ میری جورو ہے..... وہ رُوٹھ گئی تو میرا گھر برباد ہو جائے گا۔'' راجیو کی آواز رو دینے والی تھی۔

''اچھا جاؤ..... اپنا کام کرو! کچھ نہیں کہوں گی اُس سے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم مذاق کر رہی ہو۔'' راجیو نے کہا اور کچن کی طرف چلا گیا۔

ہم دیر تک اُس کی سادگی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

رات کے کھانے پر لاجونتی بھی موجود تھی۔ وہ عمر میں راجیو سے کم از کم پندرہ سال چھوٹی تھی۔ یہی کوئی چوبیس پچیس سال کی تھی۔ دھان پان سی، پتلے ہونٹ اور تیکھے نقوش، اُس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ کھانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک ہمارے پاس رہی۔

دُرگا کی طرف سے اطلاع ہمیں صبح ہی ملی تھی، بلکہ صبح سات بجے وہ خود ہی آئی تھی اور ہمیں اپنے ساتھ حویلی میں لے گئی تھی اور ناشتہ ہم نے وہیں کیا تھا۔

''تمہارے پتا جی صبح چار بجے یہاں سے گئے تھے۔ دو چار روز بعد شاید پھر واپس آئیں گے ایک دن کے لئے۔'' دُرگا نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں ہوا کیا؟ وہ تو بتاؤ!'' سیتا نے پوچھا۔ اُس کی طرح میں بھی صورتحال سے واقف ہونے کے لئے بے چین تھا۔

''تمہارے پتا جی بہت غصے میں تھے۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''اُنہوں نے اس درگھٹنا کی ساری ذمہ داری کیپٹن گوپال پر ہی ڈال دی ہے جو خود بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی اور پھر سیتا کے باپ سے حاصل ہونے والی معلومات سے ہمیں آگاہ کرنے لگی۔

اُس کے مطابق حویلی کے ملازم چتون سنگھ نے مہاراج دھرمیش سنگھ (سیتا کا باپ) کو بتایا تھا کہ کیپٹن گوپال دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ اکثر یہاں آتا تھا۔ وہ عورتوں کو بھی لے کر آتے تھے۔ بعض اوقات دو تین گھنٹہ رہ کر چلے جاتے تھے اور بعض اوقات رات یہیں گزار دیتے تھے۔ ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب تو یہاں خوب ہڑبونگ ہوتی تھی۔ رات بھر راگ رنگ کی محفل جمتی تھی۔ کیپٹن گوپال اور اُس کے فوجی دوست بھی ننگے ہو کر ناچتے تھے۔ یہ ہنگامہ صبح تک جاری رہتا تھا۔ اور پھر وہ لوگ سارا دن مرے ہوئے کتوں کی طرح پڑے رہتے تھے۔

چتون سنگھ نے بتایا کہ اُس شام بھی کیپٹن گوپال اپنے دو فوجی افسر دوستوں کے ساتھ آیا تھا۔ اُن کے ساتھ دو لڑکیاں بھی تھیں۔ کیپٹن گوپال نے چتون سنگھ کو چھٹی دے دی اور وہ اپنے کزن کے گھر کی طرف جاتے ہوئے راستے میں حادثے کا شکار ہو گیا اور رات بھر ہسپتال میں پڑا رہا۔ اُسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اُس کی عدم موجودگی میں حویلی میں کیا ہوا تھا۔

چتون سنگھ کے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ یا تو کیپٹن گوپال اور اُس کے دوستوں میں جھگڑا ہوا تھا جس سے گوپال اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ دوستوں نے اُسے حویلی کے پچھلی طرف زمین کھود کر دفن کر دیا، یا وہ کسی عورت کے ہاتھوں مارا گیا۔ ممکن ہے گوپال سے کوئی بدلہ لینے کے لئے اُس کے فوجی دوستوں نے بھی اُسی عورت کا ساتھ دیا ہو جس نے کسی تیز دھار آلے سے گوپال کو مردانگی سے محروم کیا تھا۔

ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ جب وہ فوجی آفیسر گوپال کے کریا کرم سے فارغ ہوئے تھے تو اُس وقت وہ بدمعاش کسی طرح حویلی میں گھس آئے تھے۔ شاید اُن لڑکیوں کی وجہ سے گوپال کے دوستوں اور بدمعاشوں میں معرکہ ہوا تھا جس میں ایک بدمعاش مارا گیا اور دوسرا بھاگ گیا۔ فوجی آفیسر بھی ان عورتوں کے ساتھ حویلی سے بھاگ گئے۔ عورتوں نے حویلی چھوڑنے سے پہلے کپڑے بھی بدلے تھے۔ حویلی کے ایک بیڈ روم سے دو عورتوں کے پھٹے ہوئے کپڑے ملے تھے جس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ حویلی میں آنے والی عورتوں کی تعداد دو تھی۔

حویلی میں پائی جانے والی گنجے بدمعاش کی لاش کی شناخت ہو گئی تھی۔ وہ بازارِ حسن کا مشہور بدمعاش رنگا تھا۔ پچھلے تین چار روز سے اُسے گنگو نامی بدمعاش کے ساتھ دیکھا جا رہا تھا۔ پولیس کو شبہ تھا کہ اُس رات گنگو ہی رنگا کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد سے گنگو غائب تھا اور پولیس اُسے تلاش کر رہی تھی۔ پولیس کو ان دو عورتوں کی بھی تلاش تھی جو اُس رات کیپٹن گوپال اور اُس کے دوستوں کے ساتھ حویلی میں آئی تھیں۔ اور اُن فوجی افسروں کو بھی تلاش کیا جا رہا تھا جو کیپٹن گوپال کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے لئے حویلی میں آتے رہتے تھے۔

پولیس ہیڈ کوارٹر میں مہارانا کی ملاقات ایک اعلیٰ فوجی آفیسر سے بھی ہوئی تھی جو کیپٹن گوپال اور دوسرے فوجی آفیسروں کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور مہارانا نے اُس کی دھمکیوں سے مرعوب ہوئے بغیر اُسے وارننگ دی تھی کہ وہ اپنے افسروں کو پٹا ڈال کر رکھیں جو کتوں کی

طرح اِدھر اُدھر منہ مارتے پھر رہے ہیں۔

چتون سنگھ کو میں بہت سیدھا سادھا سمجھتا تھا لیکن وہ بہت چالاک ثابت ہوا تھا۔ اُس کے بیان نے ساری کہانی ہی بدل کر رکھ دی تھی اور اس کہانی میں سیتا کا نام تک نہیں آیا تھا۔

''مہاراج نے حویلی کی نگرانی کے لئے اب تین اور آدمی رکھے ہیں اور اُنہیں سختی سے حکم دیا ہے کہ جو بھی شخص حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کرے اُسے گولی سے اُڑا دیا جائے۔'' دُرگا نے آخر میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اب ہم اس حویلی کا رُخ نہیں کر سکتے۔'' سیتا نے کہا۔

''ظاہر ہے.....'' دُرگا نے سر ہلایا۔ ''اگر تمہیں اپنی موجودگی راز میں رکھنی ہے تو اُس حویلی میں قدم رکھنا بھی خطرناک ہوگا۔''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کب تک اس طرح چھپ کر بیٹھے رہیں گے؟'' میں نے اُن کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو اب تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ سیتا مجھے یہاں لے کر کیوں آئی ہے۔ کیا محض.....''

''دھیرج..... دھیرج.....'' سیتا ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ اُس نے کن انکھیوں سے کلپنا کی طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اُس کی موجودگی میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ''یہاں آ کر تم گھاٹے میں نہیں رہو گے۔'' وہ بولی۔ ''وقت آنے پر سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔''

''سیتا ٹھیک کہہ رہی ہے.....'' دُرگا نے اُس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں بھی تمہارے کرنے کو بہت کچھ ہے۔ سیتا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ بات اگر صرف پریم کی ہوتی تو سیتا تمہیں جیسلمیر کی بجائے کہیں اور لے جاتی۔ شملہ، ڈلہوزی، نینی تال یا کوئی اور ایسی جگہ جہاں کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ لیکن یہ تمہیں ایک خاص مقصد سے یہاں لے کر آئی ہے اور تم یہاں رہ کر اپنے لئے بہت کچھ کر سکتے ہو..... مگر تھوڑا انتظار کرو! دُھول ذرا بیٹھنے دو..... مطلع صاف ہونے دو۔''

اُس وقت کلپنا کی موجودگی میں کھل کر کوئی بات نہیں ہو سکی تھی لیکن شام کو لان میں چائے کے دوران کھل کر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ کلپنا اُس وقت اندر کسی کام میں مصروف تھی۔

بات ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات سے شروع ہوئی تھی۔ پاکستان کو آزاد ہوئے ترپن سال ہو چکے ہیں مگر ہندوستان نے آج تک پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان کو جب بھی موقع ملا اس نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی بھرپور کوشش کی..... بنگالیوں نے غداری کی تو ہندوستان نے اُن کا بھرپور ساتھ دیا اور پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا۔

ہندو ذہنیت سے کون واقف نہیں..... اُن کی گھناؤنی سازشیں اس حصے کے امن کے لئے ہمیشہ ہی خطرہ بنی رہی ہیں۔ اس کے توسیع پسندانہ عزائم سے کون واقف نہیں؟ پہلے آسام کو

ہڑپ کیا، پھر سکم اور بھوٹان پر طاقت کے بل بوتے پر تسلط جمایا۔ ''گوا'' پر پنجے گاڑے۔ کشمیر
فوج کشی کی، مگر کشمیری حریت پسندوں نے ہندوؤں کی حاکمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا
کشمیری عوام کے مطالبہ آزادی کو قابل گردن زدن جرم قرار دیا گیا۔ اس قوم پر ظلم و بربریت
کے وہ پہاڑ ڈھائے گئے کہ ہلاکو اور چنگیز خان جیسے ظالم اور جابر لوگوں کی رُوح بھی کانپ گئی ہ
گی۔ ہندوستان نے مظلوم کشمیریوں پر دہشت اور بربریت کی انتہا کر دی کہ کوئی بھی انسان ا
رُوح فرسا مظالم کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔

ایک تو ہندوستان نے پاکستان کے وجود کو شروع دن سے ہی دل سے تسلیم نہیں کیا ا
دوسرے مظلوم کشمیری عوام سے پاکستان کی ہمدردی بھی ہندوستان کو کھل گئی اور پاکستان کو اس
سزا دینے کے لئے بھارتی حکمران شروع ہی سے گھناؤنی سازشوں میں مصروف رہے۔ پاکستا
کا ایک حصہ الگ کر کے بھی اُن کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ وہ اب بھی پاکستان کے وجود کو مٹانے
درپے ہیں۔

ہندوستان نے پاکستان میں اپنے ایجنٹوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ تخریب کاری، بموں
دھماکے اور دہشت گردی سے اُس نے پاکستان کی سلامتی کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ پاکستا
کے مختلف شہروں میں اگرچہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کے بے شمار تربیت یافتہ ایجنٹ مو
ہیں لیکن تخریب کاری اور دہشت گردی کے ذریعے خونریزی کے لئے وہ زیادہ تر پاکست
باشندوں کو آلہ کار بناتے ہیں۔

کسی بھی ملک میں ایسے بے ضمیر لوگوں کی کمی نہیں جو پیسے کی خاطر ملک تو کیا اپنی ماں کا
کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ پاکستان میں بھی ایسے بے ضمیر لوگوں کی کمی نہیں ہے جو پیسے
لالچ میں آ کر ''را'' کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دہشت گردی اور تخریب کاری
باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔

''اور یہ تربیت راجستھان میں دی جاتی ہے.....'' سیتا کہہ رہی تھی۔

''عورت اور دولت کے لالچ میں اپنے دیش کا سودا کرنے والے بے ضمیر لوگوں کو سندھ
طرف سے سرحد پار کر کے راجستھان پہنچا دیا جاتا ہے جہاں مختلف کیمپوں میں اُنہیں تخری
کاری اور دہشت گردی کی تربیت دے کر واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ ان کیمپوں میں اُن کی
طرح برین واشنگ کر دی جاتی ہے کہ اُن کے دلوں میں اپنے دیش یا اپنے لوگوں کے
ہمدردی ختم ہو جاتی ہے۔ اُنہیں جلاد بنا دیا جاتا ہے اور وہ واپس جا کر اپنے ہی بے گناہ لوگوں
موت برساتے ہیں۔ بے گناہوں کو خون میں نہلا دیا جاتا ہے اور سڑکوں پر اُن کی لاشیں بچھا
جاتی ہیں۔''

سیتا خاموش ہو گئی۔ یہ میرے لئے ایک نیا انکشاف تھا..... میرے جسم میں سنسنی کی لہ
پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔

''بھارتی حکمرانوں کی تخریب کاری اور دہشت گردی کی پالیسی اب پاکستان تک محدود نہیں رہی۔'' سیتا کہہ رہی تھی۔ ''را'' نے ایک اور خوفناک منصوبہ بنایا ہے۔ اور وہ منصوبہ یہ ہے کہ پاکستانی نوجوانوں کے ذریعے جموں اور کشمیر میں وسیع پیمانے پر تخریب کاری اور دہشت گردی کی وارداتیں کرائی جائیں۔ کشمیریوں کو جب یہ پتہ چلے گا کہ اُن کے ہمدرد بن کر آنے والے، اُن میں گھل مل جانے والے پاکستانی اُن پر موت برسا رہے ہیں تو اُنہیں پاکستان سے بھی نفرت ہو جائے گی۔ پاکستان اور کشمیریوں میں اختلافات بڑھیں گے جن کا فائدہ ہندوستان اُٹھائے گا۔ اور اس منصوبے کا ایک اور خوفناک پہلو یہ ہے کہ اسرائیلی انٹیلی جنس ''موساد'' کے ماہرین ان نوجوانوں کو تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دے رہے ہیں۔''

مجھے رگوں میں اپنا خون جمتا ہوا محسوس ہونے لگا..... یہ منصوبہ واقعی بہت خوفناک تھا۔ اگر یہ سازش کامیاب ہو گئی تو کشمیری عوام پاکستان کی حمایت اور ہمدردی سے بھی محروم ہو جائیں گے اور یہ بے گناہ اور معصوم لوگوں کی سرزمین، جنت نظیر وادی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے متعصب ہندوؤں کے انتقام کی آگ میں جلتی رہے گی۔

''نہیں نہیں..... ایسا نہیں ہونا چاہئے۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تو اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں تمہیں جیسلمیر کیوں لائی ہوں۔'' سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیمپ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

سیتا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے دُرگا کی طرف دیکھا اور پھر میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ سیتا اُن کیمپوں کے بارے میں بتا رہی تھی جہاں پاکستان سے اغواء کر کے لائے ہوئے نوجوانوں کی برین واشنگ کر کے اسرائیلی ''موساد'' کے ایجنٹ اُنہیں تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دے رہے تھے۔

میں خاموش بیٹھا اُس کی باتیں سن رہا تھا اور میرے رگ و پے میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔

○○○

شدید سردی کی ایک لہر تھی جو میری ریڑھ کی ہڈی میں برقی رو کی طرح دوڑ رہی تھی۔ اور رگوں میں خون تو جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ دماغ پر سناٹا سا چھا گیا۔

بہت ہی خوفناک منصوبہ تھا۔ پاکستانی نوجوان کشمیر جائیں گے۔ کوئی ان پر شبہ نہیں کرے گا۔ انہیں اپنا سمجھ کر اُن کے لئے اپنے گھروں کے دروازے وا کر دیئے جائیں گے اور ان کی خدمت کی خاطر میں کوئی کمی نہیں چھوڑی جائے گی۔ اور جب یہی نوجوان اُن کی عورتوں کو بے آبرو کریں گے، اُن کے گھروں کو جلا کر ملبے کا ڈھیر بنا دیں گے اور اُن کے لئے موت کے فرشتے بن جائیں گے تو اُن کے دلوں میں پاکستان کے لئے نفرت پیدا ہو گی، اعتماد اُٹھ جائے گا۔ نفرت اور بے اعتمادی کی یہ خلیج وسیع اور گہری ہوتی جائے گی اور اس طرح پاکستان اور کشمیری عوام ایک دوسرے سے دُور ہوتے جائیں گے۔ اور اس کا فائدہ بھارت اُٹھائے گا۔

کشمیر پاکستان کی ہمدردیوں سے محروم ہو جائے گا یا اس میں کمی آ جائے گی۔ بھارت کو کشمیر پر اپنی گرفت مزید مضبوط کرنے کا موقع مل جائے گا۔ ان پر مظالم بڑھ جائیں گے اور آزادی کی وہ تحریک جو نصف صدی سے جاری تھی دم توڑ دے گی۔ کشمیر کی آزادی کے لئے جو ہزاروں قربانیاں دی گئی تھیں وہ رائیگاں نہیں جائیں گی۔ مظلوم کشمیری ظلم کی چکی میں پستے رہیں گے اُن کی چیخیں گونجتی رہیں گی مگر سننے والا کوئی نہیں ہو گا۔ ان کی عورتوں کی عصمتیں لٹتی رہیں گی مگر کوئی انہیں بچانے والا نہیں ہو گا۔ ان کے گھر جلتے رہیں گے اور شعلے پھیلتے رہیں گے۔

''نہیں..... ایسا نہیں ہو گا۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''ایسا ہونا بھی نہیں چاہئے۔'' سیتا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کب اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ''اگر ایسا ہو گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ تمام قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔ آزادی کی ساری تحریکیں ختم ہو جائیں گی۔ شہیدوں کی روحیں تڑپ اُٹھیں گی۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے..... بالکل نہیں ہونا چاہئے۔''

''نہیں ہو گا..... بالکل نہیں ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ! وہ کیمپ کہاں ہے؟ میں تباہ کر دُوں گا اُسے۔''

''دھیرج..... دھیرج۔'' سیتا نے میرا کندھا دبایا۔ ''اب یہ بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ میں تمہیں یہاں کیوں لائی ہوں۔ کشمیر میں رہ کر تم بھارتی سیناؤں کے خلاف لڑتے رہتے ایک کو مارتے تو اُس کی جگہ دس اور آ جاتے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ پھر کوئی پاکستانی نوجوان

تمہارے گروہ میں گھس جاتا۔ تم اُس پر اعتماد کرتے اور موقع پا کر وہی تمہاری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتا۔ تمہیں یہاں لانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایسا موقع ہی نہ آنے دو۔ آزادی کی تحریکوں کو نقصان ہمیشہ غداروں نے پہنچایا ہے اور غداروں کو شناخت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور جب شناخت ہوتی ہے تو تحریک کو نا قابل تلافی نقصان پہنچ چکا ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اگر شیخ مجیب الرحمٰن غداری نہ کرتا تو مشرقی پاکستان بنگلہ دیش نہ بنتا۔ اُس نے آخری وقت قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ وہ ڈھاکہ پہنچتے ہی اپنے لوگوں کو سمجھائے گا اور انہیں بتائے گا کہ پاکستان ایک رہے گا تو مضبوط رہے گا۔ پاکستان کی سلامتی ہی میں ان کی بقا ہے۔ لیکن ڈھاکہ پہنچتے ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔ اُس نے پاکستان کے خلاف اتنا زہر اُگلا جس کی مثال نہیں ملتی۔ مکتی باہنی کو آشیر باد دیا اور اُسی مکتی باہنی نے مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے باشندوں پر اس قدر ظلم کئے کہ ہٹلر کی رُوح بھی شرمندہ ہو گئی ہو گی۔ بے گناہوں کے قتل عام سے خون کے دریا بہا دیئے اور وہ بے گناہ دھوکے میں اپنوں ہی سے مارے گئے۔ یہی سب کچھ کشمیر میں ہو گا۔ مشرقی پاکستان میں بھی ہندوؤں کی سازش کام کر رہی تھی اور کشمیر میں بھی ایسی ہی گھناؤنی سازش کے ذریعے خون کے دریا بہائے جائیں گے۔ کشمیریوں کو تنہا کر دیا جائے گا۔ پاکستانی تمہارے اپنے ہیں۔ وہ کشمیر کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں تم لوگوں سے سچی ہمدردی ہے لیکن جب پاکستانی نوجوان ہی تم لوگوں پر موت برسائیں گے تو کتنا دُکھ ہو گا تم لوگوں کو..... اور وہ پاکستانی نوجوان بھی یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ اُن کی تو یہاں برین واشنگ کر دی گئی ہو گی۔ اُن کے دماغ تو یہودیوں اور ہندوؤں کے طابع ہوں گے۔ وہ لوگ وہی کریں گے جو اُنہیں کہا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ کشمیر کی تحریک آزادی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ یہ جذبے سرد نہیں ہونے چاہئیں۔ صرف وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنا حق چھیننا جانتی ہوں۔ کشمیری اپنا حق لینے کی کوشش کر رہے ہیں اور مجھے وشواش ہے کہ ان کی کوششیں ضرور کامیاب ہوں گی۔ لیکن..... اگر بھارت کی یہ نئی سازش کامیاب ہو گئی تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ مٹ جائے گا سب کچھ.....''

''مجھے بتاؤ وہ کیمپ کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔

''راجستھان میں ایک نہیں بہت سے کیمپ ہیں جہاں پاکستان سے اغواء کئے ہوئے نوجوانوں کو تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''انہیں ٹریننگ دے کر سرحد پار پاکستانی شہروں میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک کیمپ ایسا ہے جہاں اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' کے ماہرین بھارتی ماہرین کے ساتھ اُن لوگوں کو خاص ٹریننگ دے رہے ہیں جنہیں جموں اور کشمیر بھیجا جائے گا۔ یہ گروپ ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔ ابھی صرف ان نوجوانوں کی برین واشنگ ہو رہی ہے۔ جو نوجوان اس مرحلے میں کامیاب ہوں گے اُنہیں اگلے مرحلے کے لئے

منتخب کیا جائے گا۔ اور جن پر شبہ ہوگا کہ اُن کے کام کے نہیں ہیں یا وہ آگے چل کر اُن کے لئے مشکلات پیدا کریں گے اُنہیں گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ اُس کیمپ کا وجود کشمیر کے لئے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے۔ تمہارے لئے اس کیمپ کو ختم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے لئے جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔ اس کیمپ کو تباہ کر کے تم اپنے دیش کی ایسی خدمت کرو گے جسے تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔''

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ سیتا ''را'' کی ایجنٹ تھی۔ وہ ایک منصوبے کے تحت مجھے گرفتار کرنے کے لئے کشمیر گئی تھی۔ وہ اتفاق سے مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن مجھے اپنے جال میں پھنسانے کی بجائے خود میری محبت کا شکار ہوگئی۔ اور پھر اُس نے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ اُسے بھارتی فوجیوں سے شدید نفرت اور کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی ہے۔ وہ کشمیریوں کو مظلوم اور بھارتی فوجیوں کو ظالم اور غاصب سمجھتی تھی۔ اُس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ خود بھی ایک فوجی کے ستم کا شکار ہو کر اپنی عزت کھو بیٹھی تھی۔ ویران پہاڑوں میں دو اور ہندو فوجیوں نے اُسے مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اُسے بچا لیا تھا۔

سیتا کے جذبات کچھ اور شدید ہو گئے تھے۔ اپنی محبت اور اپنے خلوص کا یقین دلانے کے لئے اُس نے مجھے اپنی سپردگی میں دے دیا تھا۔ اور پھر جموں میں مانسر جھیل کے کنارے رنگ رلیاں مناتے ہوئے بھارتی فوج کے اعلیٰ افسروں پر مجاہدین کے ساتھ حملے میں حصہ لے کر اُس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اُسے بھارتی فوجیوں سے واقعی شدید نفرت اور کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی ہے۔ وہ مجھے میرے محاذ سے دُور لے آئی تھی۔ اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی کہ مجھے کشمیر کے محاذ سے ہٹا دے گی۔ میرے دل میں قدم قدم پر سیتا کے بارے میں شبہات جنم لیتے رہے۔ مجھے ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا رہتا کہ وہ کسی بھی وقت مجھے کسی اتھارٹی کے حوالے کر دے گی۔ لیکن میرے یہ اندیشے غلط ثابت ہوتے رہے۔

سیتا مجھے جیسلمیر لے آئی۔ راستے میں ہنومان گڑھ کے ایک گیسٹ ہاؤس میں ''را'' کے ایک آدمی نے اُسے دیکھ لیا۔ سیتا میری اور اپنی آمد کو مخفی رکھنا چاہتی تھی۔ اُس نے ''را'' کے اُس ایجنٹ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور مجھے لے کر جیسلمیر پہنچ گئی۔ اور یہاں اگلے ہی روز اُس نے اپنے کزن کیپٹن گوپال کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس طرح اُس نے اپنا انتقام لے لیا بلکہ ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ اُسے بھارتی فوجیوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ کیپٹن گوپال کے قتل کے فوراً ہی بعد کلپنا والا واقعہ پیش آ گیا اور ہمیں وہ حویلی چھوڑنی پڑی۔ سیتا مجھے اس طرح حفاظت میں لئے ہوئے تھی جیسے میں ہی اُس کے لئے سب کچھ ہوں۔ اور کل تو اُس نے دُرگا کے سامنے کہہ بھی دیا تھا کہ وہ میرے لئے اپنی جان بھی لڑا دے گی۔

میری وجہ سے سیتا اپنوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکی تھی۔ اُس نے اپنے کزن کیپٹن گوپال کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مانسر جھیل کے کنارے کئی اعلیٰ فوجی افسروں کو موت کی نیند

سلا دیا۔ اور اب وہ میرے ہاتھوں ایک ایسا کیمپ تباہ کروانا چاہتی تھی جہاں جنونیوں اور قاتلوں کی کھیپ تیار کی جا رہی تھی۔ جو سیتا کے بقول کشمیر میں خوفناک تباہی پھیلانے والے تھے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ سیتا یہ سب کچھ کیوں کر رہی تھی؟ کیا کسی کے دل میں انتقام کا جذبہ اتنا شدید ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی سلامتی کو داؤ پر لگا دے.....؟

ہندوستان نصف صدی سے جموں اور کشمیر پر طاقت کے بل بوتے پر تسلط جمائے ہوئے تھا اور یہ تسلط برقرار رکھنے کے لئے ہر سال کروڑوں روپے کا بجٹ خرچ ہو رہا تھا۔ اُس کے ہزاروں فوجی مارے گئے تھے اور سیتا اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے بھارتی حکمرانوں کی نصف صدی کی محنت پر پانی پھیر دینا چاہتی تھی۔

سیتا ''را'' کی ایجنٹ کی حیثیت سے مجھے گرفتار کرنے کے لئے کشمیر گئی تھی۔ وہ مجھ تک پہنچ گئی اور میرے عشق میں مبتلا ہوگئی۔ وہ مجھے وہاں سے لے بھی آئی تھی۔ اُس نے کیپٹن گوپال کو قتل کر کے اپنی بے عزتی کا بدلہ بھی لے لیا تھا۔ اس کے بعد سب کچھ ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ وہ مجھے لے کر کسی اور پُرسکون جگہ پر چلی جاتی اور مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کرتی کہ آگ اور خون کے کھیل میں کچھ نہیں رکھا۔ کشمیریوں کو لڑنے دو۔ ہم میدانِ جنگ سے بہت دُور پُرسکون جگہ پر آ گئے ہیں جہاں کوئی خطرہ نہیں۔ آؤ! ہم سب کچھ بھول کر پریم کے گیت گائیں اور ایک دوسرے کی محبت میں کھو کر جیون بیتا دیں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اُس نے دہشت گردی کے کیمپ کی بات کر کے میرے جذبات کو اور مہمیز کیا تھا۔ سینے میں دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دے کر بھڑکایا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ کیا واقعی وہ کشمیر کو ایک گھناؤنی سازش سے بچانا چاہتی تھی یا اُس کے من میں کچھ اور تھا؟ وہ کوئی خاص مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی؟ ایسا مقصد جو اُس کے لئے کشمیر کی قیمت سے بھی زیادہ اہم تھا؟''

سیتا ایک سابق راجہ کی بیٹی تھی۔ سازشیں ان راجاؤں کی فطرت کا خاصہ تھیں۔ وہ اپنی ریاست کی وسعت اور اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کے تانے بانے بنتے ہی رہتے تھے۔ اور سیتا بھی ایک راجہ ہی کی بیٹی تھی جس سے اُس کا راج پاٹ چھن گیا تھا۔ سیتا اُس راجہ کی بیٹی تھی۔ سازش کے جراثیم اُس کے خون میں بھی ہوں گے۔ لیکن وہ ایسی کیا بات تھی جس کے لئے وہ اپنے ہی دیش کو داؤ پر لگانے کو تلی ہوئی تھی؟

میں جیسے جیسے سوچتا گیا میرا ذہن اُلجھتا گیا۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو..... کہاں کھو گئے؟'' سیتا کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میرے خیالات منتشر ہو گئے۔

''اوہ..... کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تمہاری باتوں نے مجھے بری طرح اُلجھا دیا ہے۔''

''اس میں کون سی اُلجھن ہے مہابیر!'' اس مرتبہ دُرگا نے لب کشائی کی۔ وہ جس طرح

شروع سے ہماری گفتگو میں حصہ لے رہی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے کچھ جانتی تھی۔ ''سیتا تو تمہیں ایک موقع فراہم کر رہی ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''اگر تم نے ذہانت اور عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس کیمپ کو تباہ کر اور اس سازش کو بے نقاب کر دیا تو تم اپنے کشمیر کے لئے بہت بڑا کارنامہ انجام دے سکو گے۔ بھارت کو عالمی تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وقتی طور پر اس کی توجہ بٹ جائے گی اور کشمیر میں جاری آزادی کی تحریک ایک ایسے سیلاب کی صورت اختیار کر جائے گی جسے روکنا بھارتی سینا کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔''

''اور پھر ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔'' سیتا نے اُس کے خاموش ہوتے ہی کہا۔ ''کشمیر تمہاری طرح میرا بھی خواب بن چکا ہے۔ ہم دونوں ایک ساتھ اُس سرزمین پر قدم رکھیں گے کتنا اچھا لگے گا۔''

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور پھر اُس نے دُرگا کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر میری طرف جھک کر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔

میں گڑبڑا سا گیا..... میں نے کن انکھیوں سے دُرگا کی طرف دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''یہ مت سمجھنا کہ تم اکیلے ہو گے۔'' دُرگا نے کہا۔ ''ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور تم جانتے ہو جب نیت صاف ہو تو دنیا کی کوئی طاقت بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکتی۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ تم سے سیتا کا پریم اور وطن سے تمہاری محبت ضرور رنگ لائے گی۔ وطن سے دُور وطن کی سیوا کے اس محاذ پر بھی کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔''

''میں نے اپنے وطن کی خدمت اور آزادی کے لئے رائفل اُٹھائی تھی۔'' میں نے سیتا کا سر اپنے سینے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''رائفل اب میرے ہاتھ میں نہیں رہی لیکن یہاں بھی اگر مجھے موقع مل رہا ہے تو میں اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش ضرور کروں گا خواہ اس کے لئے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لیکن میں اس کیمپ کے بارے میں ذرا اور تفصیل سے جاننا چاہتا ہوں۔''

''دیش سے محبت کا جذبہ اتنا سچا اور اتنا شدید ہو تو طوفان بھی راستہ نہیں روک سکتا۔'' دُرگا نے کہا۔ ''سیتا تمہیں اس کیمپ کے بارے میں بتائے گی۔ تم لوگ باتیں کرو، میں اور چائے کر لاتی ہوں۔''

وہ خالی کپ اُٹھا کر برآمدے کی طرف چلی گئی۔ سیتا اُٹھ کر ایک بار پھر میرے سامنے والی بینچ پر بیٹھ گئی۔

''تم اُس کیمپ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''وہ کیمپ یہاں سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔'' سیتا کہنے لگی۔ ''راجستھان کی تاریخ بہت دلچسپ ہے اور جیسلمیر کی تاریخ دلچسپ ترین۔ یہ شہر راجستھان کے تمام شہروں میں قدیم ترین ہے۔ اس کی بنیاد 1156ء میں بھٹی حکمرانوں نے رکھی تھی اور اسے راجھستان کا پہلا دارالخلافہ ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ اس کا قدیم نام لودروا تھا۔ ہر طرف سے ریت کے ٹیلوں میں گھرا ہوا یہ شہر زیادہ عرصہ تک آباد نہ رہ سکا۔ بعد میں آنے والے بھٹی خاندان کے حکمرانوں ہی نے وہاں سے دس گیارہ میل دُور کھلی جگہ پر ایک اور بستی بسانا شروع کر دی جہاں پانی وافر مقدار میں موجود تھا۔ یہ بستی آباد ہوتی چلی گئی اور لودروا اُجڑتا چلا گیا۔ نئی بستی جیسلمیر کے نام سے ایک شہر کی صورت اختیار کر گئی اور لودروا وقت کے حوادث کا شکار ہو کر کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا۔ چاروں طرف سے ریت کے ٹیلوں میں گھرے ہوئے لودروا کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ ریت کے بعض ٹیلے تو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی طرح ٹھوس ہو چکے ہیں جبکہ بیشتر ٹلے ایسے ہیں جو ہوا سے اپنی جگہ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ہوا سے ریت پر ایسی ایسی لہریں اور ایسے ایسے نقش معرض وجود میں آ جاتے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

لودروا کے کھنڈرات پہلے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ لیکن چند سال پہلے اس طرف سیاحوں کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی گئی اور ان قدیم کھنڈرات کو شہر ممنوعہ قرار دے دیا گیا۔ اور وہ علاقہ فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ لوگ یہی سمجھتے رہے کہ ان کھنڈروں میں شاید کوئی بہت بڑا خزانہ دریافت ہوا ہے اور اس علاقے کو فوج کے حوالے کر کے سیاحوں کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی گئی ہے لیکن میں جانتی ہوں وہاں کیا ہے۔'' وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''مجھے ایک مرتبہ وہاں جانے کا موقع ملا تھا جب ''را'' کی طرف سے مجھے ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ ان دنوں فوج کی نگرانی میں وہاں جگہ جگہ کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ کھنڈرات اپنی جگہ موجود تھے۔ اُن کے بیچ میں ایسی چھوٹی چھوٹی نئی عمارتیں بھی معرض وجود میں آ رہی تھیں جن کا مقصد اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ مجھے ایک ہفتہ وہاں رکھ کر جے پور واپس بھیج دیا گیا۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں دہشت گردی کی تربیت کے لئے ایک جدید ترین کیمپ بنایا گیا ہے۔ یہاں سے تربیت حاصل کرنے والوں کو سری لنکا اور پاکستان بھیجا جاتا۔ پاکستان کی طرح بھارتی حکمرانوں نے سری لنکا میں بھی طویل عرصہ سے پنگا بازی شروع کر رکھی ہے۔ سری لنکا کے باغیوں کو بھی یہاں تخریب کاری، دہشت گردی اور گوریلا جنگ کی تربیت دی جاتی ہے جو واپس جا کر اپنے ہی شہروں میں آگ اور خون کا کھیل کھیلتے ہیں۔

اُس کیمپ کے علاوہ راجستھان میں اور بھی بہت سے کیمپ ہیں جہاں پاکستانی نوجوانوں کو دہشت گردی اور تخریب کاری کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ بھارتی حکمرانوں نے طے کر رکھا ہے کہ پاکستان میں امن اور شانتی نہیں ہونے دیں گے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک پاکستان میں

کوئی بھی حکومت جم کر نہیں رہ سکی۔ ایک تو وہاں کے سیاستدانوں کو اپنے دیش سے کوئی محبت نہیں۔ وہ قوم کی خدمت کا جذبہ لے کر نہیں دولت سمیٹنے کے لئے سیاست میں آتے ہیں۔ وہاں کی سیاست پرمٹ اور پلاٹ کے گرد گھومتی ہے۔ اسمبلیوں میں آ کر بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں سے لمبے لمبے قرضے لینا اور ڈکار لئے بغیر انہیں ہضم کر لینا وہاں کے سیاستدانوں کا وطیرہ بن چکا ہے۔ سرکار میں کرپشن اس سے بھی زیادہ ہے۔ وہاں تو رشوت کے بغیر کوئی جائز کام بھی نہیں ہوتا۔ سرکار سے آٹھ دس ہزار روپیہ مہینہ تنخواہ پانے والے سرکاری آفیسر جاگیرداروں جیسی ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان سے بڑے افسروں کی تو بات ہی کیا وہ تو شہنشاہ ہیں۔ عالیشان کوٹھیاں، قیمتی کاریں..... اور ٹھاٹھ باٹھ معمولی بات ہے۔ معمولی درجے کے ملازمین بھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر زندگی گزار رہے ہیں۔

سارا دباؤ عوام پر ہے۔ مہنگائی کے عفریت نے عام آدمی کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ بیروزگاری بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان یا تو منشیات یا جرائم کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ وہ چوری، ڈکیتی اور راہزنی کی وارداتیں کرنے پر مجبور ہیں اور ایسے ہی مایوس نوجوان غیر ملکی ایجنٹوں کا آسانی سے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ ''را'' کے ایجنٹ پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں خوبصورت لڑکیاں بھی ہیں جو ایسے نوجوانوں کو تلاش کر کے پھانستی ہیں۔ چند چھوٹی چھوٹی آزمائشوں کے بعد جب ان ایجنٹوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ شکار ان کے مطلب کا ہے تو اس کے گرد جال تنگ کر دیا جاتا ہے۔ بعض کو بلیک میلنگ سے پھانسا جاتا ہے اور بعض کو حسین عورتوں، شراب اور دولت کا لالچ دے کر شکنجے میں جکڑ لیا جاتا ہے۔ ایسے نوجوانوں کو سرحد پار کروا کے راجستھان پہنچا دیا جاتا ہے جہاں پہلے اُن کی برین واشنگ کی جاتی ہے۔ اُن کے ذہنوں میں اپنے ہی ملک کے خلاف نفرت اور تعصب کا زہر بھر دیا جاتا ہے اور پھر انہیں تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت دے کر واپس بھیج دیا جاتا ہے اور وہ اپنوں ہی کے لئے عذاب بن جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے بھارتی حکمرانوں نے جموں و کشمیر کے حوالے سے ایک نئی پالیسی اختیار کی۔ پالیسی نہیں گھناؤنی سازش..... اس کی تفصیل میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ کس طرح پاکستانی نوجوانوں کو تخریب کاری کی تربیت دے کر کشمیر بھیجا جائے گا اور اُن کی سرگرمیوں سے کس طرح کشمیریوں کے دلوں میں پاکستان سے نفرت پیدا کی جائے گی۔ دونوں کے تعلقات بگڑ بھی گئے تو ان کا فائدہ بھارت کو پہنچے گا۔

راجستھان میں مختلف مقامات پر تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت کے ڈیڑھ سو سے زیادہ کیمپ ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے نئی پالیسی کے تحت بھارتی حکمرانوں نے اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ موساد پہلے بھی مختلف معاملات میں ''را'' کی مدد کرتی رہی ہے۔ ''موساد'' کو ایسی تخریبی سرگرمیوں کا نصف صدی کا تجربہ ہے۔ تخریب کاری،

دہشت گردی اور ایسی ہی گھناؤنی سازشوں سے اپنا وجود برقرار رکھا ہوا ہے۔ ''موساد'' کے ماہرین کے معاہدے کے بعد اُنہیں یہاں بلا لیا گیا۔ ان یہودی ماہرین نے راجستھان کے مختلف کیمپوں کا دورہ کر کے ڈیڑھ سو نوجوانوں کو منتخب کیا جنہیں لودروا کے اس کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ چھ مہینے پہلے اس کیمپ میں تربیتی پروگرام شروع ہو جانا چاہئے تھا مگر وہاں ایک مندر کی وجہ سے اُس پر عمل نہ ہو سکا۔''

''مندر کی وجہ سے.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاں.....'' سیتا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہاں ایک بہت بڑا جین مندر ہے۔ اُس علاقے پر سیاحوں کے لئے پابندی لگنے سے پہلے جین کے بعض پیروکار مندر کی یاترا کے لئے جاتے رہتے تھے۔ پابندی لگنے کے بعد جین مندر کمیٹی نے جے پور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی۔ یہ کیس صرف پانچ مہینے چل سکا۔ سکیورٹی کے نقطہ نظر سے ہائی کورٹ نے یاتریوں کی آمدورفت پر تو پابندی عائد رکھی البتہ یہ اجازت دے دی کہ دو پنڈت یا پجاری مندر کی دیکھ بھال کے لئے وہاں رہ سکتے ہیں۔ وہ مندر کھنڈر نگر کے شروع ہی میں ہے۔ اس کے آس پاس صرف تین چار چھوٹی چھوٹی عمارتوں کے کھنڈر ہیں۔ اُس کیمپ کی انتظامیہ نے ایک بہت لمبی اور اُونچی دیوار کھڑی کر کے اس جین مندر کو کیمپ سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ مندر میں رہنے والا کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ اس دیوار کے دوسری طرف کیا ہو رہا ہے۔''

''اُس کیمپ تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟'' میں نے سیتا کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''جب کسی کام کا ارادہ کر لیا جائے تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیمپ کا رُخ کرنے سے پہلے ہمیں شہر میں چند چھوٹے چھوٹے کام کرنے ہوں گے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تم شہر کے راستوں سے مانوس ہو جاؤ۔ اس طرح تمہیں یہاں کی کچھ تاریخی عمارتیں دیکھنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ اور میرا خیال ہے تم یہ کام کل ہی سے شروع کر دو۔''

''یعنی میں اکیلا؟'' میں سیتا کی اس تجویز پر گڑبڑا سا گیا۔

''یہاں تمہیں کوئی جانتا تو نہیں کہ تم کون ہو۔ پینتیس لاکھ کی آبادی میں کون تم پر توجہ دے گا؟'' سیتا نے کہا۔ ''میرا باہر نکلنا فی الحال خطرناک ہوگا۔ کلپنا کو بھی تمہارے ساتھ نہیں بھیجا جا سکتا۔ البتہ دُرگا تمہارا ساتھ دے سکتی ہے۔'' وہ خاموش ہو کر برآمدے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی گردن گھما کر دیکھا، کلپنا ٹرے اُٹھائے چلی آ رہی تھی جس میں چائے کے تین کپ تھے۔ اُس کے پیچھے ہی دُرگا بھی تھی۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' دُرگا نے ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مہابیر کھلی فضا میں رہنے کا عادی ہے..... حویلی کی قید سے اس پر بوریت طاری ہونے لگی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''یہ شہر کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے ساتھ۔''

''میرے ساتھ.....'' دُرگا ہنس پڑی۔ ''مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ مگر دو چار دن رُک جاؤ! مہاراج کی حویلی والا معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے۔ ہوسکتا ہے اس دوران مہاراج خود بھی ایک دن کے لئے یہاں آ جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں تو تمہارے ساتھ باہر کی سیر کر رہی ہوں اور پیچھے مہاراج یا اس کا کوئی آدمی یہاں پہنچ جائے۔ ایسی صورت میں سیتا کے لئے پریشانی ہوسکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے..... دو چار روز بعد ہی سہی۔'' میں نے کہتے ہوئے کلپنا کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا۔ کلپنا اپنے لئے چائے نہیں لائی تھی۔ اُس نے ایک کپ سیتا کو دے دیا اور دوسرا دُرگا کو اور حوض کی منڈیر پر بیٹھ کر پانی سے کھیلنے لگی۔ اُس نے اُس وقت سیتا کا دوسرا جوڑا پہن رکھا تھا جو اُس پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔

چائے کے دوران ہم مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ کلپنا حوض کی منڈیر پر بیٹھی پانی سے کھیلتی ہوئی بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

○

مہارانا دھرمیش سنگھ صبح آ کر شام کو واپس چلا گیا تھا۔ اور ہمیں وہ پورا دن دوسرے مکان میں گزارنا پڑا تھا۔

مہارانا نے پولیس کی تفتیش سے یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیا تھا کہ وہ روز روز جے پور سے یہاں نہیں آ سکتا۔ البتہ پولیس کسی مزید تفتیش کے لئے کسی وقت حویلی میں داخل ہونا چاہے تو چتون سنگھ اُن کی خواہش کا احترام کرے گا۔

پولیس ابھی تفتیش کا کوئی راستہ متعین نہیں کر سکتی تھی۔ کیپٹن گوپال سنگھ کے قتل کے حوالے سے فوج کا پولیس پر خاصا دباؤ تھا، لیکن پولیس ابھی تک اندھیرے ہی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ نہ تو گنگو کا سراغ ملا تھا اور نہ ہی پولیس ان عورتوں میں سے کسی کا پتہ چلا سکی تھی جو اُس رات حویلی میں موجود تھیں۔ اور پولیس اُن دو عورتوں کا سراغ لگا بھی کیسے سکتی تھی؟ جبکہ وہ دونوں (سیتا اور کلپنا) اس وقت محفوظ ترین پناہ گاہ میں تھیں۔ البتہ پولیس نے بعض ایسی عورتوں کو ضرور پکڑا تھا جو اس سے پہلے کیپٹن گوپال اور اُس کے فوجی دوستوں کے ساتھ حویلی میں آ کر داد عیش دیتی رہی تھیں۔ اُن میں دو تو سوسائٹی گرلز تھیں اور ایک کسی دولت مند ٹھاکر کی بیٹی تھی۔ لیکن اُن تینوں نے اُس رات جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ وہ تو اُس رات ایک نائٹ کلب میں تھیں اور تیسری فوجی میس میں آفیسروں کا جی بہلا رہی تھی۔ اس طرح پولیس کی تفتیش اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

میں اس خوبصورت حویلی کی قید میں واقعی بور بلکہ بیزار ہو گیا تھا۔ اور دُرگا نے بھی میری اس کیفیت کو بھانپ لیا اور اُس نے وعدہ کیا کہ آج وہ مجھے گھمانے کے لئے لے جائے گی۔

اُس روز موسم بھی خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد دُرگا تیار ہونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی اور تقریباً ایک

گھنٹے بعد جب وہ باہر نکلی تو اُسے دیکھ کر میں سانس لینا بھول گیا۔ اور پلک جھپکے بغیر اُس کی طرف دیکھتا رہا.....

وہ واقعی قیامت تھی۔ ہلکے سے میک اَپ نے اُسے چلتی پھرتی قیامت بنا دیا تھا۔ نیلی ساڑھی بھی اُس پر خوب جچ رہی تھی۔ ساڑھی ناف سے نیچے تھی اور بلاؤز بھی بہت مختصر تھا۔ گلے میں سونے کی چین تھی جس میں لگا ہوا لاکٹ سینے سے چپکا ہوا تھا۔ کانوں میں ہیرے کے بندے اور ناک میں بھی کیل تھی جس میں لگا ہوا ننھا سا ہیرا روشنی سے چمک رہا تھا۔ میں دس سال پیچھے جا کر چشم تصور سے اُسے دیکھنے لگا۔ دس سال پہلے سیتا کا باپ دُرگا پر مرمٹا تھا تو اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

''کہاں کھو گئے؟'' دُرگا نے میرے چہرے کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''ماضی میں.....!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور پھر سیتا اور دُرگا کے قہقہوں کی آواز سن کر میں جھینپ سا گیا۔

''دُرگا جی! خیال رکھنا..... یہ میری امانت ہے۔'' سیتا نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

دُرگا اُسے گھور کر رہ گئی۔

دُرگا مجھے لے کر خفیہ راستے سے حویلی کے عقبی مکان میں لے آئی اور مجھے عقبی گلی میں نکال دیا۔ ''آگے بازار میں بائیں طرف مُڑ کر چلتے رہنا۔ میں تمہیں اُس طرف ملوں گی۔'' اُس نے گلی میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ دُرگا مجھے ساتھ لے کر حویلی کے گیٹ سے نہیں نکلنا چاہتی تھی تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ یہ احتیاط بہرحال اچھی تھی۔ میں گلی میں چلتا ہوا تقریباً سو گز آگے بازار میں بائیں طرف مُڑ گیا اور فٹ پاتھ پر ٹہلنے والے انداز میں چلنے لگا۔ خاصا بڑا اور بارونق بازار تھا۔ میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہو رہی تھی حالانکہ مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہاں میرا صورت آشنا کوئی نہیں تھا لیکن نجانے میرے دل میں یہ خوف کیوں تھا جیسے اچانک ہی درجنوں رائفلیں مجھے زد پر لے لیں گی۔ لیکن میرے یہ خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا ہوا تقریباً ایک فرلانگ آگے نکل چکا تھا۔ پھر نیلے رنگ کی ایک کار پیچھے سے میرے قریب آ کر رُکی اور ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''مہابیر..... آ جاؤ!''

میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ دُرگا تھی جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

اُس نے جھک کر دروازے کے لاک کی ناب اُٹھا دی۔ میں نے دروازہ کھولا اور اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دُرگا نے سیدھے ہوتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ کار دیکھنے میں پرانی سی لگتی تھی لیکن اُس کا انجن بہترین حالت میں تھا اور آواز پیدا کئے بغیر چل رہا تھا۔

دُرگا ہلکی رفتار سے گاڑی چلا رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ مجھے راستوں اور مشہور عمارتوں کے

بارے میں بتاتی جارہی تھی۔

''سب سے پہلے ہم شہر کے زیریں حصے کی طرف جائیں گے۔'' دُرگا نے ایک سڑک پر گاڑی موڑتے ہوئے کہا۔ ''اُس طرف چند تاریخی حویلیاں ہیں جنہیں دیکھنے کے لئے لاتعداد سیاح آتے ہیں۔ ان میں سالم سنگھ کی حویلی، نتھ مل جی کی حویلی اور پتوؤں کی حویلیاں خاصی مشہور ہیں۔ انہیں تو قدیم طرزِ تعمیر کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔'' اُس نے گاڑی ایک اور سڑک پر موڑ دی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ انگریزوں نے اپنی حکومت کے آخری دور میں ان حویلیوں کو اُکھاڑ کر انگلستان لے جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن اسی دوران ہندوستان کو سرکار انگلشیہ سے آزادی مل گئی اور پہلی ہند سرکار نے ان حویلیوں کو قومی ورثہ قرار دے دیا۔''

ایک اور سڑک پر موڑ کر اُس نے کار روک لی۔ سامنے ہی پتوؤں کی حویلیاں تھیں۔ اُن تک پہنچنے کے لئے ہمیں ایک چوڑی گلی تک پیدل چلنا پڑا۔ وہ پانچوں حویلیاں واقعی فنِ تعمیر کا حسین ترین شاہکار تھیں۔ پانچوں حویلیاں ساتھ ساتھ تھیں۔ اُن میں لگے ہوئے پتھروں پر نہایت خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ پتھروں کی خوبصورت نازک جالیاں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اُن حویلیوں کی تعمیر میں کہیں بھی سیمنٹ، چونے یا کسی اور مسالے کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ پتھروں کو تراش کر ایک دوسرے سے اس طرح جوڑا گیا تھا کہ کہیں کوئی معمولی سا رخنہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اُس وقت لاتعداد ملکی اور غیر ملکی سیاح وہاں موجود تھے اور اُن کی طرح میں بھی حیرت سے انسانی ہاتھوں سے بنائے ہوئے یہ شاہکار دیکھ رہا تھا۔ دُرگا مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک حویلی کے اندر لے گئی۔ اندر کا منظر اس سے بھی زیادہ حسین تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ بعض سیاح انسانی ہاتھوں سے بنائے ہوئے اس شاہکار کے علاوہ میرے پہلو میں قدرت کے اس حسین شاہکار کو بھی دیکھ رہے تھے جس کا نام دُرگا تھا۔ ہم دونوں ایک ستون کے قریب کھڑے اُس پر بنے ہوئے خوبصورت نقش و نگاہ دیکھ رہے تھے کہ کسی کیمرے کی فلیش گن چمکی..... ایک لمحہ کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

وہ غالباً کوئی مقامی سیاح تھا جس نے تصویر کھینچی تھی۔ میں اُس شخص کی طرف بڑھا مگر دُرگا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''چھوڑو..... رہنے بھی دو! اُس نے اپنے شوق کے لئے تصویر کھینچی ہے ہمارا کیا جائے گا؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں وہاں سے نکل کر دوسری حویلی میں آگئے۔ یہ حویلی بھی پہلی حویلی کی طرح حسین تھی اور دُرگا مجھے ان حویلیوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''پتوؤں کی یہ حویلیاں 1800ء سے 1860ء کے درمیانی عرصہ میں بافنا خاندان نے تعمیر کروائی تھیں۔ یہ خاندان پانچ بھائیوں پر مشتمل تھا۔ ہر بھائی نے اپنی ضرورت اور عیش و آرام

مدِنظر رکھتے ہوئے اپنی اپنی حویلی تعمیر کروائی اور ان حویلیوں میں اب بھی اسی خاندان کے لوگ آباد ہیں۔ پتوا تجارت پیشہ تھے۔ اُن کی تجارت سندھ، افغانستان، سنٹرل ایشیا اور دوسری طرف چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ افیون، سونا چاندی، گرم مصالحے اور ہر اُس چیز کی تجارت کرتے تھے جس سے منافع کی توقع ہو۔ یہ لوگ اس قدر مالدار تھے کہ اودھے پور اور جیسلمیر کے راجواڑے بھی اُن سے بڑی بڑی رقمیں سود پر اُدھار لیتے تھے۔ اس طرح ان لوگوں نے راجواڑوں سے بھی بہت کمایا۔''

میں بڑی توجہ سے دُرگا کی باتیں سن رہا تھا۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے بار بار اُس تصویر کا خیال آرہا تھا جو اُس آدمی نے کھینچی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک عورت اور دو بچے بھی تھے۔ اُس آدمی پر اگرچہ کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن نجانے کیوں میں اپنے آپ میں بے نام سی بے کلی محسوس کرنے لگا تھا۔ اگر دُرگا مجھے نہ روکتی تو میں اُس شخص سے کیمرہ چھین کر فلم ضائع کر دیتا۔ میں حویلیوں میں گھومتا ہوا اب بھی اُس شخص کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ مگر وہ شخص مجھے دوبارہ نظر نہیں آیا۔

ہم پتوؤں کی حویلی سے فارغ ہو کر سالم سنگھ کی حویلی میں آگئے۔ قلعے کے پچھلی طرف واقع سالم سنگھ کی حویلی بھی اپنی ایک منفرد تاریخ رکھتی تھی۔ اس حویلی تک پہنچنے کے لئے ہمیں کئی تنگ سی گلیوں سے گزرنا پڑا تھا۔ اُس وقت آسمان پر بادل چھٹ گئے تھے اور ڈوبتے ہوئے سورج کی الوداعی کرنوں میں حویلی کی چھتریاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ حویلی ایک اُونچے چبوترے پر تعمیر کی گئی تھی۔ نیچے سے کسی قدر تنگ مگر اُوپر جا کر بالکونیوں اور چھتریوں کی صورت میں پھیلتی چلی گئی تھی۔ جیسلمیر کے مخصوص پیلے پتھروں سے بنی ہوئی اس حویلی کی دیواروں اور ستونوں پر جاذبی پھول پتیاں، مور، ہرن اور دوسرے جانوروں اور پرندوں کے نقش بڑی خوبصورتی سے تراشے گئے تھے۔ سالم سنگھ اپنی اس سات منزلہ حویلی سے قلعے تک ایک پل تعمیر کرانا چاہتا تھا مگر وہ ایسا نہ کرسکا۔

میں دُرگا کو سیاحوں کی ایک ٹولی کے پاس چھوڑ کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں کا ماحول پتوؤں کی حویلی سے بالکل مختلف تھا۔ اندر ہو کا عالم طاری تھا۔ لمبی لمبی راہداریاں اور غلام گردشیں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چھتوں پر جنگلی کبوتروں نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ اُن کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ ماحول پر عجیب سی وحشت طاری کئے ہوئے تھی۔ میں ایک تنگ سی گول سیڑھی پر چڑھتا ہوا اُوپر بالکونی میں چلا گیا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور باہر بھی ملگجا اندھیرا پر پھیلا رہا تھا۔ میں نے بالکونی سے نیچے جھانکا تو حویلی کے گیٹ کے قریب دو تین سیاح کھڑے تھے اور سامنے والی گلی سنسان پڑی تھی۔

میں واپس جانے کے لئے مُڑا تو ایک کونے سے سسکیوں کی آواز سن کر چونک سا گیا..... میں نے اُس طرف دیکھا، مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ میں اُسے اپنا واہمہ سمجھ کر آگے بڑھ

گیا۔لیکن سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک گیا..... سسکیوں کی آواز پھر سنائی دی تھی...

میں نے مُڑ کر اُس طرف دیکھا تو سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا..... قدیم راجستھانی لباس میں ملبوس ایک لڑکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اگرچہ شام کا اندھیرا تھا مگر اُس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بے پناہ اُداسی تھی۔ وہ ہلکی ہلکی سسکیاں بھر رہی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً ہی خیال آیا کہ شاید وہ کوئی سیاح ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ اس حویلی میں آئی ہوگی اور بچھڑ گئی۔ وہ اندھیرے سے ڈر کر یہاں بیٹھ کر رونے لگی تھی۔ یا ہو سکتا ہے وہ کوئی گائیڈ لڑکی ہو اور اُس کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی صورتحال پیش آئی ہو۔

''کیا بات ہے لڑکی..... کیوں رو رہی ہو؟'' میں نے اُس کے قریب پہنچ کر نرم اور ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

اُس نے پلکوں کی بھاری جھالر آنکھوں پر سے اُٹھائی اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا سب لوگ چلے گئے.....؟'' اُس کی آواز میں عجیب سا ترنم تھا۔

''ہاں..... سب چلے گئے۔'' میں نے بدستور نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''تم کون ہو..... کس کے ساتھ آئی تھیں؟''

وہ خاموش رہی اور پلکیں جھپکے بغیر میری طرف دیکھتی رہی۔

''میرا خیال ہے تم اپنی فیملی کے ساتھ آئی تھیں اور اُن سے بچھڑ گئی ہو..... یا تم کوئی گائیڈ ہو۔ کن لوگوں کے ساتھ آئی تھیں؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''میں کسی کے ساتھ نہیں آئی..... یہیں رہتی ہوں میں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور اُس نے پلکیں اب بھی نہیں جھپکی تھیں۔

''کیا مطلب.....'' میں اُچھل پڑا۔ ''کیا تم کہنا چاہتی ہو کہ تم اسی اُجاڑ اور سنسان حویلی میں رہتی ہو؟''

''ہاں.....'' اُس نے جواب دیا۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔ ''میرا نام کنیا کماری ہے..... میں اسی حویلی میں رہتی ہوں۔ سالم سنگھ نے مجھے اپنی خوابگاہ میں طلب کیا۔ میں اُس کے دروازے تک تو آ گئی پھر خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلی۔ میں جانتی تھی وہ میرے ساتھ کیا کرے گا۔ وہ خوبصورت لڑکیوں کو اپنی خواب گاہ میں بلاتا ہے، رات بھر اُن کے شریر کو نوچتا ہے، جھنجھوڑتا ہے اور صبح اُس کی لاش ملتی ہے حویلی کی کسی ویران نکر میں۔ میں جانتی تھی وہ میرے ساتھ بھی یہی کرے گا..... میں ڈر کر بھاگ نکلی۔ سالم سنگھ کے آدمیوں نے مجھے پکڑنے کے لئے میرا پیچھا کیا۔ میں دوڑتی رہی۔ اندھیری راہداریوں میں مجھے باہر کا راستہ نہیں ملا۔ میں یہاں چھپ کر بیٹھ گئی۔''

''تمہیں کس نے اپنی خواب گاہ میں طلب کیا تھا.....؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔ سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی چلی گئی..... سردی محسوس ہونے کے باوجود

میری پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا..... زبان سوکھ کر کانٹے کی طرح تالو میں چبھنے لگی۔ ''کیا تم اُسے جانتی ہو.....؟'' میری آواز میں بھی ہلکی سی کپکپاہٹ آ گئی تھی۔

''ہاں.....!'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''اگر جانتی نہ ہوتی تو تمہیں یہ سب کچھ کیسے بتاتی؟'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''سالم سنگھ کے پتا دیوان سروپ سنگھ کو راجہ کے ایک قریبی رشتے دار نے قتل کر دیا تھا۔ سالم سنگھ نے راجہ سے فریاد کی مگر اُسے انصاف نہیں ملا۔ سالم سنگھ کے سینے میں بدلے کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اُس نے سوگند اُٹھائی کہ راجہ کے خاندان کو برباد کر دے گا..... ختم کر ڈالے گا اُن سب کو۔ لیکن اُس وقت وہ چھوٹا تھا اور ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وقت کا انتظار کرنے لگا۔ سے گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑکتی رہی۔'' وہ خاموش ہو کر سنسان اور اندھیری راہداری کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس نے پہلی مرتبہ میرے چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

اُس کی نظریں ایک بار پھر میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ اس بار بھی اُس کی پلکوں کو جنبش نہیں ہوئی تھی۔

''سالم سنگھ جب جوان ہوا تو اُسے اُس کے باپ کی چھوڑی ہوئی جگہ پر ریاست کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔'' کنیا کماری نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ دیوان سالم سنگھ بہت نرم گفتار تھا۔ اُس کا شریر بھی عورتوں کی طرح نرم اور نازک تھا۔ وہ جین تھا..... یہ امن اور شانتی کا دھرم ہے۔ کسی ذی رُوح کو دُکھ پہنچانا اس دھرم میں بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا ہے۔ جانوروں تک سے نرمی اور رحم کا سلوک جین دھرم کی تعلیمات کا ایک خاص پہلو ہے۔ اس تعلیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ رات کو شمع نہ جلائی جائے تاکہ کوئی پروانہ اُس میں جل کر اپنی جان نہ دے دے۔ لیکن سالم سنگھ کو دھرم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس کے اصولوں کا پابند نہیں سمجھتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں ریاست کا دیوان (وزیر اعظم) ہونے کے ناطے اُسے بہت سے اختیارات حاصل تھے اور اختیارات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے بہت جلد راجہ مول راج کو بے دست و پا کر دیا اور ریاست کے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔

سالم سنگھ انسان سے بھیڑیا بن گیا..... وہ بہت ظالم آدمی تھا۔ اُس نے رعایا کو بھی اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لئے اُس نے شاید ریاست کو تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ راجہ مول راج اُس کی شکتی کے سامنے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بے بسی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُسے اپنی جان کا بھی خوف تھا۔ اُسے یقین تھا کہ سالم سنگھ اُسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ سالم سنگھ کے مظالم بڑھتے جا رہے تھے۔ تاجروں پر تو اُس نے

مظالم کی انتہا کر دی۔ وہ خوفزدہ ہو کر راتوں کو اندھیرے میں شہر سے بھاگنے لگے مگر سالم سنگھ کے ہرکارے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کرنے والے بے شمار لوگ اس کے ہاتھوں مارے گئے۔''

وہ خاموش ہوگئی...... میں بھی خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بالکونی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ میں اب بھی خاموش تھا۔ بالآخر اُس نے خود ہی کہنا شروع کیا۔

''راجہ مول راج گھٹ گھٹ کر مر گیا۔ اُس کے بیٹے گج سنگھ نے راج گدی سنبھال لی۔ اُس نے موقع پاتے ہی پہلی فرصت میں بڑی ہوشیاری سے سالم سنگھ کو قتل کروا دیا۔ اس طرح جیسلمیر کے لوگوں کو دیوان سالم سنگھ کے ظلم وستم سے نجات مل گئی۔''

''مگر تم یہ سب کچھ کیسے جانتی ہو؟'' میں نے بے اختیار ہو کر پھر اپنا وہی سوال دُہرایا۔

کنیا کماری نے تیزی سے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور اُس کی پلکوں کو اب بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔

''میں سالم سنگھ کی کنیز ہوں......'' اُس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔ ''اب چلے جاؤ...... اُس کے آدمی میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے دیکھ لیا تو تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔ جاؤ...... چلے جاؤ......''

میں کچھ کہنے کی بجائے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس ساری گفتگو کے دوران اُس نے ایک مرتبہ بھی پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔ ایک انجانے خیال سے میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں پھیلنے لگیں۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اُس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی اور میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا...... پھر میرے اندر کھڑے رہنے کی بھی سکت نہیں رہی...... اور میں اسی جگہ بیٹھتا چلا گیا......

O

وہ آواز بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی...... کوئی میرا نام لے کر پکار رہا تھا۔

''مہابیر...... مہابیر کہاں ہو تم......؟''

دُور سے آتی ہوئی یہ شیریں اور مترنم آواز کانوں میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں بالکونی سے چند گز دُور سیڑھیوں کے قریب ایک ستون سے ٹیک لگائے اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ میری ٹانگیں سامنے کو پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ آواز ایک بار پھر سنائی دی...... اس مرتبہ میں نے پہچان لیا۔ وہ دُرگا کی آواز تھی جو حویلی کے نچلے حصے میں کسی جگہ سے مجھے پکار رہی تھی۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں...... مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کچھ وقت لگ گیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ وہاں کسی ذی رُوح کا وجود نہیں تھا اُس کے قدموں کے نشان تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ کہاں گئی؟

کیا وہ حقیقت تھی یا میں نے جاگتے میں کوئی خواب دیکھا تھا...... یا وقت مجھے پیچھے لے گیا تھا کہیں بہت دُور...... ماضی میں......!

میرا ذہن بری طرح اُلجھ گیا تھا۔ شاید ہمارے دماغ میں کچھ ایسے خلیے موجود ہیں جو گزرے واقعات کی ذہنی تصویر بھی اُتار سکتے ہیں۔ شاید جو کچھ گزرتا ہے مرتا نہیں ہے۔ ہمارے آس پاس دُھندلے دُھندلے نقوش کی صورت میں، خواب جیسی سلیف حالت میں موجود رہتا ہے۔ شاید کسی بہت حساس دماغ کا انٹینا ٹی وی کی لہروں کی طرح انہیں گرفت میں لے کر دماغ کی سکرین پر لا سکتا ہے......

دُرگا کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ وہ مجھے اپنے آس پاس نہ پا کر پریشان ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور تیزی سے سیڑھیاں اُترتا ہوا نیچے آ گیا۔ مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا...... جب میں حویلی میں داخل ہوا تھا تو راہداریاں تاریک اور سنسان تھیں۔ اور جب اُوپر سے بالکونی سے جھانک کر دیکھا تھا تو اُس وقت بھی حویلی کے دروازے کے سامنے دو تین آدمی دکھائی دیئے تھے، اور سامنے والی گلی سنسان پڑی تھی۔ لیکن اس وقت حویلی میں بہت سے سیاح موجود تھے۔ راہداریاں بالکل تاریک نہیں تھیں تاہم ملگجا سا اندھیرا تھا۔ لیکن دُور سے کسی کو دیکھ کر شناخت کیا جا سکتا تھا۔

دُرگا مجھے نظر آ گئی...... وہ پریشانی سے مجھے تلاش کرتی ہوئی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ اور پھر اُس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔

''ارے...... کہاں غائب ہو گئے تھے تم مہابیر؟'' اُس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

''اُوپر چلا گیا تھا......'' میں نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''میں تو پریشان ہو گئی تھی۔'' دُرگا بولی۔ ''آؤ! اب واپس چلیں۔ اب اتنا وقت نہیں ہے کہ کوئی اور حویلی دیکھ سکیں۔ کہیں بیٹھ کر تھوڑی دیر آرام کرتے ہیں۔''

حویلی میں موجود سیاح بھی واپس جا رہے تھے۔ میں دُرگا کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔ اُس نے اب بھی میرا ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور بعض لوگ مُڑ مُڑ کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ حویلی کے باہر آ کر میں رُک گیا اور گردن اُٹھا کر اُوپر بالکونی کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا...... کیا دیکھ رہے ہو؟'' دُرگا نے پوچھا۔

''میرے ساتھ ایک عجیب سی بات ہوئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اُسے کنیا کماری کے بارے میں بتاتے ہوئے جھجک رہا تھا کہ وہ میرا مذاق اُڑائے گی۔

''کیا......'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں چند لمحے خاموش کھڑا اُوپر بالکونی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر جھجکتے ہوئے اُس پراسرار لڑکی کے بارے میں بتانے لگا جس نے میرا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔

''اور وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا......'' دُرگا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اور پھر اپنے ہاتھ کی

پشت سے میری پیشانی کو چھوتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا مہابیر؟''

''ہاں..... میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اُس کا ہاتھ ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بعض لوگ عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ''وہ شاید میرا واہمہ تھا یا میں نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا تھا۔''

''وہ نہ تو تمہارا واہمہ تھا نہ تم نے جاگتے میں کوئی خواب دیکھا تھا۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''اس علاقے میں خوبصورت گائیڈ لڑکیاں گھومتی رہتی ہیں جو سیاحوں کو بیوقوف بنانے کے لئے ایسے ڈرامے کرتی رہتی ہیں۔ وہ بھی کوئی گائیڈ لڑکی ہوگی جو تمہیں بیوقوف بنا گئی۔''

''لیکن وہ غائب کہاں ہوگئی؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم نے کہا ہے نا کہ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی اور تمہارا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا اور تم وہیں بیٹھ گئے تھے۔ اور پھر تمہاری آنکھ میری آواز سے کھلی تھی۔'' دُرگا نے کہا۔

''ہاں..... یہ درست ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ لڑکی یقیناً ہپناٹزم جانتی ہوگی۔'' دُرگا نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اُس نے تمہیں ہپناٹائز کر دیا تھا۔ ذرا اپنی جیبیں ٹٹول کر دیکھو! وہ تمہیں کوئی چپت تو نہیں لگا گئی؟''

میں چند لمحے دُرگا کو گھورتا رہا۔ وہ میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔ لیکن اُس کے دوبارہ کہنے پر جب میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا تو میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ پراسرار لڑکی کنیا کماری واقعی مجھے چپت لگا گئی تھی..... میری جیبیں خالی تھیں۔

○

گنجان آبادی والی تنگ سی گلیوں سے گزر کر ہم اُس کشادہ گلی میں آ گئے جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔ دُرگا نے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور میں پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار گلیوں سے نکل کر ایک بار رونق سڑک پر آ گئی۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور بازار میں برقی قمقموں کی رنگ برنگی روشنیاں جگمگا اُٹھی تھیں۔ میں اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھا کبھی سامنے اور کبھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا۔

''کیا ہوا مہابیر.....'' دُرگا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم یکایک خاموش کیوں ہو گئے؟''

''کچھ نہیں.....'' کچھ بھی نہیں ہوا۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''سمجھ گئی۔'' دُرگا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''تم نے اس واقعہ کا ضرورت سے زیادہ ہی اثر لیا ہے۔ ارے بھول جاؤ اس بات کو۔ بڑے شہروں میں اس قسم کے واقعات رونما ہوتے

ہی رہتے ہیں۔ بس ذرا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

''اُس لڑکی نے کس خوبصورتی سے مجھے بیوقوف بنا دیا۔'' میں نے کہا۔ ''اُس نے کتنی شاندار کہانی گھڑی تھی۔ میں تو اُس کی باتوں کے سحر میں کھو کر ماضی میں پہنچ گیا تھا اور یہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔''

''اگر وہ اتنی شاندار کہانی نہ گھڑتی تو تم اُس کے جال میں کیسے پھنستے؟'' دُرگا نے کہا۔ ''وہ پلک جھپکے بغیر مسلسل تمہاری طرف دیکھتی رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ باتوں کے دوران تمہیں ٹرانس میں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور بالآخر اس میں کامیاب ہوگئی۔''

''ہاں..... شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن.....''

''ارے بھول جاؤ سب کچھ۔'' دُرگا نے ہاتھ اسٹیئرنگ سے اُٹھا کر میری ران پر مارا۔ ''بس آئندہ ذرا محتاط رہنا۔'' میں اُچھل پڑا۔ مجھے دُرگا سے اس بے تکلفی کی توقع نہیں تھی۔ اُس نے ہاتھ ہٹا کر دوبارہ اسٹیئرنگ پر رکھ لیا۔

اگلے چوک پر ہماری گاڑی ٹریفک جیم میں پھنس گئی۔ گاڑیوں کے ہارنوں کی آوازوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تنگ سا بازار تھا اور اس ٹریفک میں منی ٹرک بھی نظر آ رہے تھے، کاریں بھی، اُونٹ گاڑیاں اور گدھا گاڑیوں کے علاوہ آٹو رکشہ اور سائیکل رکشے بھی نظر آ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ آگے چوک پر ایک بڑا مال بردار ٹرک فٹ پاتھ سے ٹکرا کر اُلٹ گیا تھا جس کی وجہ سے راستہ بلاک ہو گیا تھا۔ سڑک کے فٹ پاتھ دُکانداروں نے اپنا سامان پھیلا کر گھیر رکھے تھے جس سے ٹریفک میں مزید رُکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔

دُرگا نے اپنی کار بڑی مشکل سے ہجوم سے نکال کر ایک تنگ سی گلی میں موڑ دی۔ بعض چھوٹی گاڑیاں اور آٹو رکشے اس گلی سے بھی نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عجیب سی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ جس کو جس طرف راستہ نظر آتا اُس طرف اپنی گاڑی گھسائے لئے جا رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد کئی تنگ گلیوں کے چکر کاٹ کر بالآخر ہم ایک اور بازار میں نکل آئے۔ اور پھر مختلف سڑکوں پر گھومنے کے بعد مین بازار میں پہنچ گئے۔ دُرگا اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اور بالآخر اُس نے ایک بہت بڑے شاپنگ سنٹر کے سامنے کار روک کر انجن بند کر دیا اور اپنی طرف کا شیشہ چڑھانے لگی۔ میں نے بھی اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا اور دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا۔

شاپنگ سنٹر بہت بڑا تھا۔ سینکڑوں دُکانیں تھیں جہاں ہر قسم کا مال بھرا ہوا تھا۔ دُرگا نے ایک ہاتھ کندھے پر لٹکے ہوئے پرس پر رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام کر وہ بڑی شان سے شاپنگ سنٹر میں داخل ہوئی۔

سرینگر میں، میں نے کچھ بڑی دُکانیں دیکھی تھیں۔ لیکن اس قسم کا اتنا بڑا شاپنگ سنٹر وہاں نہیں تھا۔ میں اندر داخل ہو کر حیرت بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ روشنیوں سے

جگمگاتی دُکانوں میں گاہکوں کی بھرمار تھی اور گاہکوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ بیشتر عورتیں ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ بہت سی عورتیں راجستھانی لباس میں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بعض عورتوں کے ساتھ مرد بھی تھے۔ لیکن وہ سب اُلو کے پٹھے لگ رہے تھے۔ کسی نے بچے کو گود میں اُٹھایا ہوا تھا اور کوئی سامان اُٹھائے بیگم کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

دُرگا مجھے لے کر گارمنٹس کی ایک بہت بڑی دُکان میں داخل ہوگئی۔ یہاں خواتین کے ملبوسات بھی تھے اور مردانہ بھی۔ دونوں پورشن الگ الگ تھے۔ شوکیسز میں صرف ساڑھیاں اور زنانہ راجستھانی ملبوسات ہی ڈسپلے کئے ہوئے تھے۔ صرف ایک شوکیس میں ایک ڈمی پر مردانہ راجستھانی لباس ڈسپلے کیا ہوا تھا۔ اُس دکان میں زیادہ گاہک زنانہ ملبوسات والے شعبے میں تھے اور ظاہر ہے خریدار بھی عورتیں ہی تھیں۔ دُرگا مردانہ ملبوسات والے شعبے کے ایک کاؤنٹر کے سامنے رُک گئی۔ اس طرف بھی کچھ گاہک تھے لیکن ایک سیلز مین فوراً ہی ہماری طرف متوجہ ہوگیا۔

''ان کے سائز کی کچھ شرٹس اور پینٹس دکھاؤ.....!'' دُرگا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں گڑبڑا سا گیا۔ سیلز مین فوراً ہی اِنچی ٹیپ سے میری کمر اور گردن ناپنے لگا اور پھر اُس نے ہمارے سامنے پینٹوں اور شرٹوں کا ڈھیر لگا دیا..... دُرگا نے اپنی پسند سے میرے لئے چھ پینٹس اور چھ شرٹس منتخب کیں اور مجھے ٹرائی رُوم کی طرف دھکیل دیا۔

اس طرف سے فارغ ہو کر دُرگا نے زنانہ شعبے سے سیتا اور کلپنا کے لئے بھی کچھ کپڑے خریدے۔ اُن میں زیادہ تر ساڑھیاں اور راجستھانی لباس تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم اُس دُکان سے باہر نکلے۔ دوسری دُکانوں سے کچھ اور چیزیں بھی خریدی گئیں۔ جب ہم شاپنگ سنٹر سے باہر نکلے تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ تمام سامان پچھلی سیٹ پر ڈال دیا گیا۔ کار ایک بار پھر مختلف سڑکوں پر گھومنے لگی اور بالآخر دُرگا نے کار رام باغ روڈ پر واقع عالیشان رام گڑھ پیلس ہوٹل کی پارکنگ میں روک لی۔

بہت شاندار ہوٹل تھا اور اُسے غالباً جیسلمیر کا سب سے بڑا ہوٹل ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ فائیو اسٹار رہائشی سہولتوں کے علاوہ یہاں ایک شاندار ریسٹورنٹ، بار رُوم، کلب اور سوئمنگ پول بھی تھا۔ اس قسم کے ہوٹلوں میں وہی لوگ آسکتے تھے جن کی جیبوں میں نوٹ مچلتے تھے۔

ہم ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ یہ شام کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ ایسے ہوٹلوں میں اصل رونق تو دس گیارہ بجے کے بعد دیکھنے میں آتی ہے۔ اس وقت بھی بہرحال لوگوں کی معقول تعداد وہاں موجود تھی۔

ہم ایک میز کے قریب پہنچے تو ایک باوردی ویٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر ہمارے لئے کرسیاں کھینچ دیں۔ بیٹھنے کے بعد دُرگا نے کافی کا آرڈر دے دیا۔

''سیتا پریشان ہو رہی ہوگی..... خاصی دیر ہوگئی ہے ہمیں گھر سے نکلے ہوئے۔'' میں نے

دُرگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کافی پی کر چلتے ہیں..... ویسے میں نے سیتا کو بتا دیا تھا کہ ہمیں دیر ہو جائے گی۔'' دُرگا نے جواب دیا۔

اور پھر باتیں کرتے کرتے وہ چونک گئی..... وہ میرے پیچھے کسی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ ایک دراز قامت آدمی خونخوار نظروں سے دُرگا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ساتھ بھی ایک عورت تھی اور اُس نے بھی دُرگا کی طرح نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

''کون ہے یہ آدمی؟'' میں نے دُرگا سے پوچھا۔

''کیلاش۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ میں سمجھ گیا وہ دُرگا کا سابق منگیتر تھا۔

''ڈر رہی ہو؟'' میں نے دُرگا کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''ڈرے میری جوتی.....'' دُرگا نے خالص عورتوں کے انداز میں کہا۔ ''یہاں اگر اس نے کوئی بدتمیزی کی تو اسے پچھتانا پڑے گا۔''

ویٹر نے ہمارے سامنے کافی سرو کر دی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے ایک بار پھر پیچھے مُڑ کر اور اِدھر اُدھر دیکھا، کیلاش نظر نہیں آیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ میں نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی تھی۔ ہم وسیع و عریض برآمدے سے نکل کر پارکنگ کی طرف آ گئے۔ اور پھر اچانک ہی دو آدمیوں نے کسی طرف سے نکل کر ہمارا راستہ روک لیا..... میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور میں باری باری اُن دونوں کے چہروں کو تکنے لگا.....!!

○○○

وہ دونوں صورتوں سے چھٹے ہوئے ہی لگتے تھے۔

وہ دونوں قد میں برابر ہی تھے..... مگر ساڑھے پانچ کے اُوپر کوئی نہیں تھا۔ ایک نے جینز اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، سر کے بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے اور پیچھے کی طرف بنے ہوئے تھے۔ مانگ درمیان میں تھی۔ اُس کی داڑھی سفید تھی مگر اُوپر کو اُٹھی ہوئی مونچھیں بڑی خطرناک تھیں۔ دائیں آنکھ کے اُوپر تقریباً ایک اِنچ لمبا زخم کا پرانا نشان تھا۔ اُس کے ایک کان میں سونے کی بالی تھی جو کان کی لو سے چپکی ہوئی تھی۔

دوسرے نے بیل باٹم قسم کی پتلون اور میرون کلر کی اُونچی شرٹ پہن رکھی تھی جس کے اُوپر والے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور گلے میں سونے کی چین صاف نظر آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر مونچھیں نہیں تھیں البتہ مغل کٹ گول چھوٹی داڑھی تھی۔ سر کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے جنہیں قابو میں رکھنے کے لئے اُس نے الاسٹک کا ایک اِنچ چوڑا بینڈ لگا رکھا تھا۔

آدھا گھنٹہ پہلے دُرگا نے ریسٹورنٹ میں اپنے سابق منگیتر کیلاش کو دیکھا تھا۔ کیلاش کو دیکھ کر دُرگا پریشان ہو گئی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ کوئی بدتمیزی ضرور کرے گا اور میں نے بھی اپنے آپ کو کسی ناخوشگوار صورتحال سے نمٹنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔

میں نے بھی کیلاش کو دیکھا تھا۔ وہ نہایت مہذب شکل وصورت کا مالک تھا اور لباس بھی مہذبانہ تھا۔ اُس کے ساتھ عورت بھی خاصی مہذب لگتی تھی۔ رام گڑھ پیلس جیسے فائیو اسٹور ہوٹلوں میں ایسے ہی مہذب لوگوں کی آمد و رفت اچھی لگتی تھی۔ دُرگا اگرچہ اُسے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی مگر نجانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ اس جگہ کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔ وہ ایک معزز آدمی تھا۔ اُسے اپنی عزت کا بھی خیال ہو گا۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے اُسے بھی ذلت اُٹھانی پڑے۔

میرا یہ خیال تو درست نکلا تھا کہ وہ یہاں ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ دُرگا کو بُرے انجام کی دھمکیاں دے چکا تھا۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھا کہ دُرگا مہارانا دھرمیش سنگھ کی رکھیل ہے۔ بڑے لوگوں کی داشتاؤں کو بھی ایسے معاشرے میں بڑی عزت حاصل ہوتی ہے۔ اُن کا بھی احترام ہوتا ہے اور اُنہیں بھی ایک معزز مقام حاصل ہوتا ہے۔

یہ تو میں دیکھ چکا تھا کہ جتنی دیر ہم ریسٹورنٹ میں بیٹھے رہے تھے اس دوران تین چار آدمیوں

اور عورتوں نے دُرگا کو پرنام کیا تھا۔ وہ بھی معززین ہی تھے۔ آگے پیچھے خود وہ دُرگا کو طوائف سمجھ کر گالیاں دیتے ہوں گے مگر اُس کے سامنے تو وہ لوگ اُس کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔

کیلاش خود سامنے نہیں آیا تھا مگر اُس نے دو غنڈے بھیج دیئے تھے۔ اور ان غنڈوں کا انتظام بھی اُس نے شاید ٹیلی فون کے ذریعے کیا تھا۔ اُن دونوں غنڈوں کو سامنے دیکھ کر دُرگا کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی...... اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی۔ چند روز پہلے میں سیتا کی حویلی میں دو غنڈوں سے نمٹ چکا تھا اور مجھے کچھ آئیڈیا ہو گیا تھا کہ ایسے لوگوں سے کس طرح نمٹنا چاہئے۔

ہم نے اُن سے بچ کر آگے نکلنے کی کوشش کی۔ دُرگا کی گاڑی پیچھے کھڑی تھی۔ ہم دو کاروں کے بیچ سے گزر کر آگے نکل گئے۔ لیکن وہ دونوں غنڈے بھی اس طرف آ گئے اور عین اُس وقت ہمارا راستہ روک لیا جب دُرگا اپنی کار کے قریب پہنچ رہی تھی۔

''کیا گڑبڑ ہے دُرگا دیوی؟'' داڑھی والے نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ''اُس بڈھے سے جی بھر گیا جو اس لونڈے کو ساتھ لئے گھوم رہی ہو؟''

''شٹ اَپ!'' دُرگا نے اُسے جھاڑ دیا۔ ''راستہ چھوڑو میرا..... ورنہ تم جانتے ہو میں کیا کر سکتی ہوں۔''

''تمہیں کون نہیں جانتا دُرگا جی.....!'' اُس شخص نے جواب دیا۔ ''بہت اُونچے درجے کی طوائف ہو جو صرف مہارانا دھرمیش سنگھ کے کھونٹے سے بندھی ہوئی ہو..... چیز تو واقعی غضب کی ہو۔ اسی لئے تو اُس بڈھے نے خوش ہو کر تمہیں وہ حویلی بخشش میں دے دی۔ اگر کوٹھے پر بیٹھتی تو تمہارا جیون انت ہو جانے پر بھی اتنی دولت جمع نہیں کر سکتی تھیں۔''

''بند کرو یہ بکواس!'' دُرگا نے چیختے ہوئے اُس پر ہاتھ اُٹھا دیا۔ وہ تھپڑ مارنا چاہتی تھی مگر اُس غنڈے نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''زیادہ غصہ مت دکھاؤ دُرگا دیوی!'' وہ غرایا۔ ''ایک بار ہمارے ساتھ چلی چلو..... چودہ
طبق روشن نہ کر دیئے تو دریودن کا نام بدل کے رَ
''تم ضرورت سے زیادہ پھیلتے جا رہے ہو
آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''اپنی جگہ پر کھڑا رہ لونڈے!'' مونچھوں وا
میں نے اُس کی طرف دیکھا اور اُسے سوچنے
ہوئے اُس کے پیٹ میں زوردار گھونسہ رسید کر د
توقع نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس قسم کی لڑائی
میں نے پہل کر دی تھی۔
وہ غنڈہ کراہتا ہوا دوہرا ہوا تو میں نے گھٹنے

سا
ے دوڑا
دوسری طرف
۔ وہ غنڈہ شاید اُس

ہو گیا۔ میں نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اُس کی مونچھیں پکڑ لیں اور نیچے جھکتا چلا گیا..... اُس کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔ میں نے پشت کے بل زمین پر ٹک کر اُسے پیروں کی مدد سے اُوپر اُچھال دیا۔ وہ میرے اُوپر سے اُلٹی قلابازی کھاتا ہوا دھب کی آواز سے پشت کے بل گرا۔ میں تیزی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اُس پر ٹھوکریں برسانا شروع کر دیں۔

دوسرا غنڈہ شاید اس غیر متوقع صورتحال پر کنفیوژ ہو گیا تھا۔ وہ اب بھی دُرگا کا ہاتھ پکڑے حیرت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ دُرگا نے اُس کے کنفیوژن سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ پہلے اُس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرس غنڈے کے منہ پر مارا اور پھر اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے اُس کی کلائی پر دانت گاڑ دیئے..... وہ غنڈہ بلبلا اُٹھا۔ اُس نے دُرگا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا کر دُرگا پر پل پڑا۔ اُس پر شاید جنون طاری ہو گیا تھا۔ اُس نے دُرگا کی ساڑھی کھینچ دی اور اُس کے بلاؤز پر ہاتھ ڈال کر زور سے اپنی طرف کھینچا..... دُرگا نے ایک بار پھر اُس کی کلائی پر دانت گاڑ دیئے۔

دُرگا کا بلاؤز تو اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا لیکن اس مرتبہ اُس غنڈے نے دُرگا کے بال پکڑ لئے اور زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

میں مونچھوں والے سے بھڑا ہوا تھا لیکن اس دوران مجھے دُرگا کی مدد کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے پیر کی ایک زوردار ٹھوکر داڑھی والے کی پنڈلی پر ماردی..... ہڈی پر چوٹ پڑنے سے وہ بلبلا اُٹھا اور ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا..... اُس نے دُرگا کے بال چھوڑ دیئے تھے۔

مونچھوں والے غنڈے کو اس دوران سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی تو میری پوزیشن کچھ اور نازک ہو گئی۔ مونچھوں والے نے مجھے کچھ اس طرح گرفت میں لیا تھا میرا سر نیچے تھا اور ٹانگیں اُوپر..... اُس نے میری کمر کو بانہوں کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ میرا سر زمین سے تقریباً آٹھ اِنچ اُوپر تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون دماغ میں جمع ہو رہا ہو.....

اُس غنڈے نے مجھے کسی قدر اوپر اُٹھا کر نیچے کی طرف جھٹکا دیا، میرا سر پختہ فرش سے ٹکرایا۔ میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا، آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچنے لگیں..... غنڈے نے ایک بار پھر مجھے اُوپر اُٹھایا اور دوبارہ میرا سر فرش سے ٹکرانا چاہتا تھا لیکن اس مرتبہ میں نے اُسے موقع نہیں دیا اور دونوں پیر اُس کی گردن پر لپیٹ دیئے۔ وہ گردن چھڑانے کے لئے زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔ میں نے ٹانگوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ وہ غنڈہ پہلو کے بل نیچے گرا۔ میں نے میں بڑی سے اپنی ٹانگیں اُس کی گردن سے الگ کیں اور اُٹھ کر اُس کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر حاصل ہوتا ہے وہ بلبلا اُٹھا۔

یہ تو میں دیکھ چکا سرے غنڈے کی طرف متوجہ ہو گیا جو دُرگا کو رگید رہا تھا۔ میں نے اُس کی

کھوپڑی پر بھی ٹھوکر رسید کر دی۔ اس دوران مونچھوں والا غنڈہ بھی اُٹھ گیا تھا۔ میں تیزی سے اُس پر پل پڑا۔ میں دُرگا کے سامنے کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں کون ہوں..... جموں کشمیر میں بھارتی فوج کے لئے میرا نام دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ میری گرفتاری پر کروڑوں روپے کے انعامات مقرر تھے اور کئی سازشی منصوبے عمل میں لائے گئے تھے۔ میں کسی کے ہاتھ نہیں لگا تھا اور یہاں دو غنڈوں کے درمیان اپنے آپ کو کمزور ثابت کر کے اپنے نام کی توہین نہیں کرانا چاہتا تھا۔

مجھ پر اُس وقت جنون طاری ہو رہا تھا اور میں نتیجے کی پرواہ کئے بغیر پلٹ پلٹ کر اُن دونوں غنڈوں پر حملے کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑے غنڈے سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے لونڈا سمجھ کر میرا مذاق اُڑایا تھا اور یہ لونڈا اُن کے لئے قہر بن گیا تھا۔

اُن دونوں کے ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا اور اب وہ میرا مقابلہ کرنے کی بجائے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دُرگا کو شاید وہ بھول ہی گئے تھے جسے وہ اُٹھانے کے لئے آئے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنے بڑے ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں اتنا زوردار ہنگامہ ہو رہا تھا اور ابھی تک کسی کو خبر نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ پارکنگ پلاٹ گیٹ سے ہٹ کر بہت فاصلے پر تھا اور اتفاق سے اس وقت کوئی نئی گاڑی ہوٹل میں داخل نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی ہوٹل سے جانے کے لئے پارکنگ کی طرف آیا تھا۔

اس مار دھاڑ میں ایک غنڈے کا ہاتھ ایک بار پھر دُرگا کے منہ پر پڑ گیا۔ اس مرتبہ دُرگا نے عقلمندی یہ کی کہ اُس نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ دُرگا کی یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ لابی میں اُس کی چیخوں کی آواز سن لی گئی۔ چند لوگ دوڑتے ہوئے باہر آ گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ دُرگا بدستور چیخ رہی تھی۔ کئی آدمی چیختے ہوئے پارکنگ کی طرف دوڑ پڑے۔ اُن میں دو ہوٹل کے سکیورٹی گارڈز بھی تھے۔

وہ دونوں غنڈے اب بھاگنے کے چکر میں تھے۔ اُن میں ایک تو کسی طرح اپنے آپ کو چھڑا کر عقبی دیوار کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، دوسرے نے بھی کوشش تو کی مگر وہ اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں اُسے نیچے گرا کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور دُرگا نے بھی اُس کے سر پر سینڈل برسانے شروع کر دیئے تھے۔

پانچ چھ آدمی دوڑتے ہوئے پارکنگ میں پہنچ گئے۔ لمبے تڑنگے دو سکیورٹی گارڈز سب سے آگے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ ایک نے تو وہیں رُک کر پستول اُس غنڈے کی کھوپڑی سے لگا دی جسے میں نے گرفت میں لے رکھا تھا اور دوسرا عقبی دیوار کی طرف دوڑا جہاں دوسرا غنڈا دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ گارڈ نے فائر کر دیا مگر وہ غنڈہ دیوار کے دوسری طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ گارڈ بھی دیوار پر چڑھ گیا، لیکن پھر اُتر کر واپس آ گیا۔ وہ غنڈہ شاید اُس طرف گلی کی تاریکی میں غائب ہو چکا تھا۔

دونوں سکیورٹی گارڈز نے پہلے تو اُس غنڈے کی خوب اچھی طرح دھنائی کی تھی جسے میں نے پکڑا تھا پھر اُسے دونوں طرف سے پکڑ کر اُٹھا دیا۔ ہوٹل کا منیجر بھی اس ہنگامے کی اطلاع پا دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ فوراً ہی دُرگا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ دُرگا کی حالت کافی ناگفتہ بہ تھی۔ لباس پھٹ گیا تھا..... بال بکھر گئے تھے۔

''کیا ہوا..... یہ کون ہے؟'' منیجر نے غنڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جس کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

''میں اپنے دوست کے ساتھ کافی پی کر واپس جا رہی تھی کہ یہاں اس نے اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ ہمارا راستہ روک لیا۔'' دُرگا نے بتایا۔ ''یہ لوگ مجھے زبردستی اُٹھا لے جانا چاہتے تھے۔ میرا یہ دوست مزاحمت نہ کرتا تو وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتے۔''

''دوسرا کہاں ہے؟'' منیجر نے اس مرتبہ گارڈز سے پوچھا۔

''وہ بھاگ گیا سر.....!'' ایک گارڈ نے جواب دیا۔ ''اس کو اِن شریمان نے پکڑ رکھا۔'' اُس نے میری طرف اشارہ کیا۔

''یہ غنڈے ہوٹل میں داخل کیسے ہوئے؟'' منیجر بولا۔

''ہم لوگ اندر کی ڈیوٹی پر تھے سر! یہ تو باہر والے گارڈز بتائیں گے کہ یہ اندر کیسے آئے تھے۔'' اُس گارڈ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے..... اسے اندر لے چلو!'' منیجر نے کہا پھر دُرگا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ بھی تشریف لائیے دُرگا دیوی! جو کچھ بھی ہوا مجھے اس کا افسوس ہے۔''

ہم لوگ منیجر کے دفتر میں آ گئے۔ زخمی غنڈے کو ایک طرف قالین پر بٹھا دیا گیا۔ ایک گارڈ اُس پر پستول تان کر کھڑا ہوگیا۔

میرا نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا جس سے خون رِس رہا تھا۔ منیجر نے الماری سے فرسٹ ایڈ بکس نکالا اور مجھے کرسی پر بٹھا کر میرا ہونٹ صاف کر کے بینڈیج لگا دی۔ دُرگا ایک کرسی پر بیٹھی اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کا بلاؤز پھٹ گیا تھا اور اُس نے ساڑھی سے اپنا سینہ ڈھک رکھا تھا۔ تین چار اور آدمی بھی کمرے میں موجود تھے۔ وہ سب اس شہر کے معززین تھے اور وہ سب لوگ دُرگا کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔

ایک بار پھر ساری کہانی دُہرائی گئی۔

''ٹھیک ہے دُرگا جی!'' منیجر نے دُرگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب صورتحال یہ ہے کہ اگر پولیس میں رپورٹ آپ کی طرف سے لکھوائی جائے تو آپ کی بھی کھینچا تانی ہوگی۔ ہوٹل کی ہے یہ خبر سن کر مہاراجا بھی ناراض ہوں۔ وہ پہلے ہی اپنی حویلی میں ہونے والے واقعہ سے پریشان ہیں اور ہم اُنہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ اور یقیناً آپ بھی ایسا نہیں چاہیں گی۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یہ کوئی ایسی معمولی بات

بھی نہیں جسے نظر انداز کر دیا جائے۔ میں فون کر کے پولیس کو بلوا لیتا ہوں اور بہتر ہوگا کہ اس معاملے سے پولیس ہی کو نمٹنے دیا جائے۔ آپ حضرات کا کیا خیال ہے؟'' اُس نے کمرے میں موجود دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر گردھاری!'' ایک آدمی نے گویا سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ دوسروں نے بھی تائید میں سر ہلا دیئے۔

''تو یہ طے ہوا کہ اس معاملے سے پولیس کو ہی نمٹنے دیا جائے۔'' منیجر گردھاری نے اس مرتبہ دُرگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ شانت رہئے گا دیوی جی! ان لوگوں کو سزا ضرور ملے گی۔''

''تو پھر.....'' دُرگا نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''تو پھر میرا اور میرے دوست کا نام نہیں آنا چاہئے۔''

''آپ کو پریشانی سے بچانے کے لئے ہی تو ہم نے یہ سوچا ہے۔'' منیجر نے کہا۔ ''ویسے آپ نے شریمان جی کا تعارف نہیں کرایا۔''

''یہ میری دیدی کے دیور ہیں..... آج ہی مکرانا سے آئے ہیں۔ اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں اور آتے ہی یہ درگھٹنا پیش ہوگئی۔''

''ویری سیڈ!'' منیجر نے کہا۔ اور ایک بار پھر ہم دونوں سے اس واقعہ کی معذرت کرنے لگا۔ پھر بولا۔ ''آپ جائیے دیوی جی! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں اپنے دو گن مین آپ کے ہمراہ کر دُوں؟''

''نہیں..... اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''ایسے دو چار لوگوں کے لئے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔''

دُرگا نے کرسی چھوڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی منیجر اور دوسرے لوگ بھی اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ سب نے ہاتھ جوڑ کر دُرگا کو پرنام کیا۔ منیجر تو پارکنگ تک ہمارے ساتھ آیا تھا۔ وہ بار بار معذرت کر رہا تھا۔

دُرگا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ گاڑی چلا سکتی۔ اس لئے ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی اور دُرگا پسنجر زسیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں زیادہ اچھی طرح ڈرائیونگ نہیں جانتا تھا مگر اتنا اناڑی بھی نہیں تھا۔

ہوٹل کی پارکنگ سے گاڑی نکال کر میں سڑک پر لے آیا اور دُرگا کے کہنے پر اُسے بائیں طرف موڑ دیا۔ دُرگا مجھے ایسے راستے بتا رہی تھی جہاں ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے کچھ اندرونی چوٹیں لگی ہوں گی جن میں غالباً اب تکلیف شروع ہوگئی تھی۔

ایک مرتبہ اُس نے پہلو بدلا تو ساڑھی کا پلو ڈھلک کر نیچے لٹک گیا۔ اُس وقت میں نے بھی

اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کا بلاؤز چیتھڑے کی طرح جھول رہا تھا۔ میری نظر اُس کے عریاں سینے پر پڑی تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسٹیئرنگ پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور گاڑی سڑک پر لہرا گئی.....

''گاڑی سنبھالو.....!'' دُرگا چیخی۔

میں فوراً ہی حواس میں آ گیا اور اگر اسٹیئرنگ نہ سنبھال لیتا تو گاڑی سڑک کے کنارے درخت سے ٹکرا جاتی۔ دُرگا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُس نے فوراً ہی ساڑھی کے پلو سے سینہ ڈھانپ لیا تھا۔

اُس بازار میں داخل ہوتے ہی میں نے پہچان لیا۔ جب حویلی سے الگ الگ نکلے تھے تو میں یہیں سے دُرگا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا تھا۔ میں نے کار کی رفتار کم کی تو دُرگا بول پڑی۔

''اس وقت ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ ہماری گلی میں سناٹا ہوگا۔ تمہیں یہاں اُترنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ ہی چلو!''

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اُس بازار میں زیادہ تر راشن اور اناج کی دُکانیں تھیں۔ بہت سی دُکانیں بند ہو چکی تھیں، اِکا دُکا کھلی ہوئی تھیں یا نچلے درجے کے ایک دو ریسٹورنٹ تھے جہاں پُرشور آواز میں فلمی گانوں کے ریکارڈ چل رہے تھے۔

دُرگا کے کہنے پر میں نے کار دائیں طرف ایک کشادہ گلی میں موڑ لی اور سو گز کا فاصلہ طے کر کے اُسے ایک بار پھر دائیں طرف کی گلی میں موڑ دیا۔ دُرگا نے ٹھیک کہا تھا۔ حویلی والی گلی میں اس وقت سناٹا تھا۔ میں نے پھاٹک کے سامنے کار روک کر ہارن بجایا۔ دو منٹ بعد پھاٹک میں ایک مربعہ اِنچ کی ایک کھڑکی سے کسی نے جھانک کر دیکھا اور پھر پھاٹک کھل گیا۔ میں کار اندر لیتا چلا گیا۔

پھاٹک سیتا نے کھولا تھا۔ گاڑی اندر داخل ہوتے ہی اُس نے پھاٹک بند کر دیا اور جس وقت میں اور دُرگا کار سے اُتر رہے تھے اُسی وقت گیٹ کی طرف سے آتی ہوئی سیتا اور لالہ سے کلپنا بھی ہمارے قریب پہنچ گئی تھی۔ ہماری حالت دیکھ کر وہ دونوں اُچھل پڑیں۔ کلپنا کے چہرے پر تو ہوائیاں سی اُڑنے لگی تھیں۔

''یہ..... یہ کیا ہوا دُرگا جی؟'' سیتا باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا.....؟'' وہ مجھے ٹٹولنے لگی۔ ''یہ سب کیا ہوا..... کیسے ہوا؟''

''ایک وقت میں صرف ایک ہی سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مسکرانے کی کوشش میں ہونٹ کی تکلیف کی وجہ سے میرے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ ''تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ لفڑا ہو گیا تھا۔ اور دوسرے سوالوں کا جواب بعد میں دیا جائے گا۔''

''دُرگا جی..... تم ہی بتاؤ! یہ سب کیا ہے..... تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے؟'' سیتا دُرگا کی

طرف متوجہ ہو گئی۔

''مہابیر کا جواب درست ہے۔'' دُرگا نے بھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''لفڑا ہو گیا تھا۔ باقی تفصیل بعد میں۔'' دُرگا ساڑھی سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کے دو منٹ بعد میں بھی سیتا اور کلپنا کو حیران و پریشان چھوڑ کر بیڈ رُوم میں آ گیا۔

میں تقریباً ایک گھنٹے بعد اپنی مرمت کر کے اور لباس بدل کر باہر آیا تو دُرگا ہال کمرے میں سیتا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور کلپنا کچن میں تھی۔ دُرگا نے شب خوابی کا لباس، بش شرٹ اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ شرٹ کا اُوپر والا بٹن کھلا ہوا تھا۔ دُرگا کے بائیں رُخسار پر نیل سا پڑ گیا تھا جس پر اُس نے شاید کوئی کریم لگا لی تھی۔ وہ بار بار دایاں پہلو بھی دبا رہی تھی۔

سیتا بڑی توجہ سے دُرگا کی باتیں سن رہی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھا تو وہ اُٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ ''دُرگا جی نے مجھے سب بتا دیا ہے۔'' وہ ایک بار پھر مجھے ٹٹولتے ہوئے بولی۔ ''آج تم نے دُرگا جی کے سامنے میری لاج رکھ لی۔ تم نے ثابت کر دیا کہ میرا انتخاب غلط نہیں ہے۔''

''مہابیر واقعی بہت ہمت والا ہے۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر آج یہ ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو صورتحال کچھ اور ہی ہوتی۔ اب بات میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ کشمیر میں بھارتی سورماؤں پر تمہارے نام کی دہشت کیوں ہے۔ تم دو بدو لڑائی میں اتنے زیادہ خطرناک ہو تو جب رائفل تمہارے ہاتھوں میں ہو تو تم تو قیامت بن جاتے ہو گے۔''

''مجھے افسوس ہی رہے گا کہ سیتا نے میرے ہاتھوں سے رائفل چھین لی۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

سیتا کی آنکھوں میں اُداسی بھر گئی۔ ''پریشان کیوں ہوتے ہو؟'' وہ میرے چہرے کو تکتے ہوئے بولی۔ ''میدان جنگ نہ سہی لیکن یہاں بھی تم اپنے محاذ پر ہو..... اور سیتا تمہارے ساتھ ہے۔ یہاں رہ کر تم جو کچھ بھی کرو گے وہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ تم ابھی صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے لیکن یہ ایک کامیابی حاصل کرنے کے بعد تم کشمیر میں جنگ کا نقشہ بدل دو گے۔ اور تمہارا یہ کارنامہ ڈھکا چھپا نہیں رہے گا۔ کشمیر کا بچہ بچہ جان لے گا کہ آزادی کا پرچم بلند کرنے والوں میں تمہارا بھی ہاتھ ہے اور.....'' وہ کلپنا کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

''کھانا لگاؤں دیدی..... بارہ بجنے والے ہیں۔'' کلپنا نے قریب آ کر کہا۔

''ہاں..... لگا دو! بھوک لگ رہی ہے۔'' دُرگا بولی۔

''اتنی مار کھانے کے بعد بھی پیٹ نہیں بھرا دُرگا جی؟'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری.....'' دُرگا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ایسی باتیں تم سے نہیں تو اور کس سے کروں گی دُرگا جی؟'' سیتا اُٹھ کر اُس سے لپٹ گئی۔ اُس کے اس طرح لپٹنے سے دُرگا بے اختیار کراہ اُٹھی۔

کھانے کے بعد دُرگا کو وہ گولڈن سیب یاد آ گئے جو ہوٹل جانے سے پہلے ہم نے بازار سے

خریدے تھے۔

''اوئے..... میری تو مت ہی ماری گئی۔'' وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے بازار سے پھل اور تم لوگوں کے لئے کچھ چیزیں خریدی تھیں۔ گاڑی میں رکھی ہوئی ہیں ابھی لے کر آتا ہوں۔ مہابیر! تم میرے ساتھ آؤ۔''

میں میز سے اُٹھا تو سیتا بھی اُٹھ گئی۔ وہ پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی۔ ہم باہر نکلے تو دُرگا پور میں کھڑی ہوئی کار کا پچھلا دروازہ کھول چکی تھی۔ میں نے اور سیتا نے پچھلی سیٹ پر سے تم چیزیں اُٹھالیں اور اندر آکر صوفوں کے درمیان قالین پر ڈھیر کردیں اور ہم لوگ بھی قالین پر بیٹھ گئے۔

''کلپنا! تم بھی آؤ..... برتن بعد میں سمیٹ لینا۔'' دُرگا نے اُسے آواز دی۔

کلپنا بھی ہمارے قریب آکر بیٹھ گئی۔ دُرگا نے سب سے پہلے وہ چیزیں نکالیں جو کلپنا کے لئے خریدی گئی تھیں۔ اُن میں تین ساڑھیاں اور تین جدید تراش کے راجستھانی لباس تھے۔ کلپنا کے چہرے سے اُس کی خوشی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ مارے عقیدت کے وہ بار بار دُرگا کے پاؤں چھو رہی تھی۔ اس کے بعد سیتا کی چیزیں اُس کے حوالے کی گئیں۔ سیتا بھی اس قدر خوش ہوئی کہ وہ دُرگا سے لپٹ گئی اور اُسے زور سے بھینچ لیا۔ دُرگا کراہ اُٹھی۔

''سوری دُرگا جی!'' سیتا نے اُسے چھوڑ دیا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم زخمی زخمی ہو رہی ہو۔''

دُرگا نے جواب میں مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

اور پھر میرے لئے خریدے گئے کپڑے بھی اُنہیں دکھائے گئے۔

''اور تم دُرگا جی.....'' سیتا اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم نے اپنے لئے کچھ نہیں خریدا؟''

''میرے پاس اتنے کپڑے ہیں کہ روزانہ دو دو جوڑے بھی تبدیل کروں تو سال بھر میں ختم نہ ہوں۔''

''اور ایک جوڑا تو کم ہوگیا ناں۔'' سیتا بولی۔ ''میرا مطلب ہے وہ ساڑھی جو تم پھڑوا آئی ہو۔''

''یہ درگھٹنا بعد میں پیش آئی تھی۔ بہرحال! موقع ملے گا تو اپنے لئے بھی تمہاری پسند سے ایک ساڑھی خریدلوں گی۔'' دُرگا نے جواب دیا۔

سیتا اور کلپنا دیر تک چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر دیکھتی رہیں۔ پھر سیتا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس لفڑے سے قطع نظر آج کا دن کیسا رہا..... کہاں کہاں گئے تھے! کیا کچھ دیکھا؟''

''چند حویلیاں دیکھی ہیں جنہیں فن تعمیر کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں بتاتی ہوں.....'' دُرگا جلدی سے بولی۔ اُس کے ہونٹوں پر شوخ سی مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ ''سالم سنگھ کی ایک کنیز سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔''

میں نے دُرگا کو گھور کر دیکھا مگر وہ اس وقت تفریح کے موڈ میں تھی۔

''اوہو.....'' سیتا نے میری طرف دیکھا۔ ''کیسی تھی وہ..... بہت بوڑھی ہوگئی ہوگی۔ دو ڈھائی سو سال.....''

''بالکل جوان تھی وہ.....'' دُرگا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''تمہاری اور کلپنا کی طرح۔ خوبصورت بھی تم جیسی ہوگی۔ اس لئے تو یہ اپنا سب کچھ ہار گئے۔''

''کہاں ہے وہ حرافہ..... میں اُس کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہوں گی۔ اُس کی ٹانگیں توڑ دوں گی، اُس کی آنکھیں پھوڑ دوں گی اور.....''

''اُس کی آنکھوں ہی میں تو سب کچھ ہے۔'' دُرگا نے ایک بار پھر اُس کی بات کاٹ دی۔ اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مزے لے لے کر میرے ساتھ سالم سنگھ کی حویلی میں پیش آنے والا واقعہ سنانے لگی۔

میں اپنی بیوقوفی پر شرمندگی اور ندامت سی محسوس کر رہا تھا اور سیتا اور کلپنا قہقہے لگا رہی تھیں۔

ہم رات کو بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر کلپنا اور سیتا قالین پر بکھری ہوئی چیزیں سنبھالنے لگیں اور میں اُٹھ کر بیڈ رُوم میں آگیا۔ ہونٹ کے علاوہ میرے جسم کے بعض دوسرے حصوں میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ بائیں کندھے میں تکلیف زیادہ تھی۔ میں بستر پر لیٹتے ہی ہاتھ سے کندھا دباتے دباتے سوگیا۔

میری آنکھ صبح دیر سے کھلی تھی۔ سیتا بھی میرے بیڈ پر سو رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک خاموش لیٹا سامنے والی دیوار کو گھورتا رہا، پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔ میں نے سیتا کو جگانے کی کوشش کی مگر وہ کروٹ بدل کر سوگئی۔ ''کیا ہے..... سونے دو نا!'' وہ نیند میں بڑبڑائی۔

میں نے اُسے چھوڑ دیا اور باتھ رُوم میں گھس گیا۔

سیتا گیارہ بجے کے قریب بیدار ہوئی تھی۔ ظاہر ہے ہمارے پاس سونے کے علاوہ اور کام ہی کیا تھا۔ دیر تک سوتے رہیں اور رات کو دیر تک دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہیں۔ میں ہال کے کمرے میں آیا تو کلپنا قالین پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی اور دُرگا صوفے پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ کلپنا مجھے دیکھ کر چائے بنانے کے لئے اُٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

''کوئی خاص خبر؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے دُرگا کی طرف دیکھا۔

''خاص تو نہیں کہہ سکتے لیکن دلچسپ خبریں ہیں۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مثلاً؟'' میں نے پوچھا۔

''رات کو رام گڑھ پولیس سے جس غنڈے کو پولیس کے حوالے کیا تھا اُس نے یہ اعتراف کر لیا ہے کہ کیلاش نے اُنہیں مجھ پر حملہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ اُن کا منصوبہ تو مجھے اغواء کرنے کا تھا لیکن اُنہیں کیلاش سے یہ حکم بھی ملا تھا کہ کسی وجہ سے اغواء میں ناکام ہونے کی صورت میں مجھے زخمی کردیا جائے یا کم از کم میرا چہرہ بگاڑ دیا جائے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''پولیس نے کیلاش کو بھی پکڑ لیا تھا لیکن اُس نے کوئی الزام قبول کرنے سے انکار کردیا۔ پولیس

اسے باقاعدہ گرفتار کرنا چاہتی تھی لیکن یہاں اُس نے بھی سوسائٹی میں کچھ جگہ بنا رکھی ہے اُس کے چند حواری آڑے آ گئے۔ اُن میں ایک سابق ریاست جیسلمیر کا سابق دیوان ہے۔ ظاہر ہے اُس کا اثر ورسوخ اب بھی ہے۔ اُس کی وجہ سے کیلاش گرفتاری سے بچ گیا۔''

''اور کیا تمہارا مہارانا کچھ نہیں کرے گا؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ تو سابق مہاراجہ ہے۔ اُس کے تو دیوان سے زیادہ تعلقات ہونے چاہئیں۔''

''میں مہارانا کو اس معاملے میں نہیں گھسیٹنا چاہتی تھی۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''کیلاش اگرچہ بہت عرصہ سے میرے راستے میں آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے مہارانا کو کبھی کچھ نہیں بتایا۔ لیکن اب تو بات سامنے آ گئی ہے۔ مہارانا کو بھی پتہ چل جائے گا۔ اور ظاہر ہے اُس کے پوچھنے پر مجھے سب کچھ بتانا پڑے گا اور مہارانا خاموش نہیں بیٹھے گا۔ وہ تو کیلاش کو مچھر کی طرح چٹکی میں مسل کر رکھ دے گا۔''

''تمہیں شروع ہی میں مہارانا کو بتا دینا چاہئے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اُسی وقت کیلاش کا بندوبست ہو جاتا تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔''

''میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ہنگامہ ہو......'' دُرگا بولی۔ ''لیکن بہرحال اس معاملے نے سر اُٹھایا ہے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کیلاش کو اپنے جرم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے کچھ دولت جمع کر لی ہے تو اس کے اندر بہت شکتی آ گئی ہے۔''

''اور دوسرے غنڈے کا کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ پکڑا گیا یا نہیں؟''

''نہیں...... پولیس اُسے تلاش کر رہی ہے۔'' دُرگا نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ خبر ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اخبارات بڑے لوگوں کے بارے میں سکینڈل بنانے میں موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔'' دُرگا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''کل رات تم میرے ساتھ تھے اور تم نے غنڈوں کو مار مار کر لہولہان کر دیا تھا۔ اخبار والوں نے میرے اور تمہارے بیچ ناطے جوڑنے کے لئے بڑی دلچسپ سرخیاں لگائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دُرگا دیوی کے ساتھ وہ سورما کون تھا جس نے شہر کے دو نامی گرامی بدمعاشوں کا بھرکس نکال دیا...... کیا دُرگا دیوی بوڑھے مہارانا سے اُکتا چکی ہے؟ کیا مہارانا دھرمیش سنگھ دُرگا کے ساتھ کسی نوجوان کو برداشت کر لے گا؟ وغیرہ وغیرہ......'' بات ختم کرتے ہوئے دُرگا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''بہت خوش ہو رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ خبر تمہارے مہارانا تک پہنچ گئی تو وہ تم سے اُس نوجوان کے بارے میں ضرور پوچھے گا۔''

''مہارانا کو مجھ پر پورا وشواش ہے۔'' دُرگا نے مسکراتے جواب دیا۔ ''اگر وشواش نہ ہوتا تو وہ مجھے یہاں اکیلا نہ چھوڑتا۔ میری نگرانی کے لئے کسی کو یہاں ضرور رکھا ہوتا۔ اس سے پہلے بھی

ایسی باتیں ہوتی رہی ہیں مگر مہارانا نے کبھی ایسی باتوں پر توجہ نہیں دی۔''

''لیکن اس مرتبہ تو معاملہ کچھ سنگین نظر آتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ دونوں خبریں ایک ساتھ چھپی ہیں...... اس کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہوگا۔''

''دیکھا جائے گا...... مجھے اس کی پرواہ نہیں۔'' دُرگا نے کندھے اُچکا دیئے۔

''ویسے تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت جلدی خیال آ گیا......'' دُرگا مسکرا دی۔ ''تم لوگ تو سو گئے تھے مگر میں رات بھر تکلیف سے کراہتی رہی۔ صبح چار بجے کے قریب میں نے کلپنا کو جگایا۔ اُس نے کڑوے تیل میں ہلدی ملا کر مالش کی تو کچھ سکون ملا۔ ذرا دیکھو تو یہاں سوجن ہو رہی ہے کیا؟'' وہ میری طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اُس نے وہی رات والا سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے بش شرٹ کو پکڑ کر اُوپر اُٹھا دیا۔ اُس کی پشت بالکل برہنہ ہو گئی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دائیں شولڈر بلیڈ پر نیلا سا دھبہ تھا اور وہ جگہ واقعی سوجی ہوئی تھی۔ دُرگا ہاتھ موڑ کر اُنگلیوں سے اُس جگہ کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ...... اس جگہ...... بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے اُنگلیوں سے اس جگہ کو ٹٹولا تو دُرگا کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ میں نے کلپنا کو کچن کی طرف سے آتے دیکھ کر دُرگا کی شرٹ نیچے کھینچ دی۔

''نیل پڑ گیا ہے......'' میں نے کہا۔ ''دو تین روز کڑوے تیل اور ہلدی کی مالش سے ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسی چوٹوں کے لئے ہمارے ہاں یہی علاج ہوتا ہے۔ ہلدی درد کو کھینچتی ہے۔''

''ہاں...... تمہیں تو ایسی باتوں کا خاصا تجربہ ہوگا۔'' دُرگا مسکرائی۔

''ہاں...... میں نے بھی بہت چوٹیں کھائی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اسی دوران کلپنا نے ہم دونوں کے سامنے کافی ٹیبل پر چائے رکھ دی اور قالین پر بیٹھ کر دوبارہ سبزی بنانے لگی۔ میرا خیال تھا کچن کی طرف سے آتے ہوئے اُس نے مجھے دُرگا کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ سر جھکائے سبزی بناتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

سیتا اُس روز دوپہر کے کھانے کے وقت بیدار ہوئی تھی۔ اگر اُسے جھنجھوڑ کر نہ جگایا جاتا تو وہ شاید شام تک سوتی رہتی۔

اور پھر اُسی رات دس بجے کے قریب جے پور سے سیتا کے پتا جی کا فون آ گیا۔ میں اور سیتا فون کے قریب بیٹھے ہوئے تھے مگر ہم میں سے کسی نے فون کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ کال دُرگا نے ریسیو کی تھی۔ وہ پندرہ بیس منٹ تک کل رات ہوٹل میں پیش آنے والے غنڈہ گردی کے واقعہ کے بارے میں بات کرتی رہی، اور پھر میں نے اُسے یہ کہتے ہوئے سنا۔

''مہارانا! وہ میرا عاشق نہیں رشتے دار ہے۔ مکرانا سے آیا ہوا ہے۔ میں اُسے کھانا کھلانے کے لئے ہوٹل لے گئی تھی...... نہیں۔ وہ اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ اخبار والے

تو ایسے ہی ہیں۔ انہیں تو اخبار بیچنا ہے۔ تمہارے بارے میں بھی تو کئی بار ایسی باتیں لکھ چکے ہیں۔ ہاں ہاں...... میں سمجھ رہی ہوں۔ ٹھیک ہے...... حویلی والے معاملے میں مجھے کوئی زیادہ جانکاری نہیں ہے۔ بس اخبار ہی سے پتہ چلتا ہے۔ ویسے مجھے وشواش ہے کہ پولیس کچھ نہیں کر سکے گی اور یہ معاملہ ٹھپ ہو جائے گا۔ ہاں ٹھیک ہے...... جے رام جی کی۔'' اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ سیتا اور میں سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

''تمہارے پتا جی بھی کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو اُسے چھوڑتے نہیں۔'' اُس نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو وہ کیلاش کو جان سے مار ڈالنے کی بات کر رہے تھے پھر کہنے لگے کہ وہ اُسے شہر سے ہی نکلوا دیں گے۔''

''اس قسم کے لوگوں کو تو واقعی شہر سے نہیں دنیا ہی سے نکال دینا چاہیے۔'' سیتا نے اپنے باپ کی حمایت کی۔ میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ وہ دونوں دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتی رہیں۔

تین چار روز گزر گئے...... ہم لوگ عملی طور پر حویلی کے قیدی بن کر رہ گئے تھے۔ دُرگا ہی وہ واحد ہستی تھی جس کا حویلی کے باہر آنا جانا تھا۔ کلپنا اس لئے باہر نہیں جا سکتی تھی کہ وہ معاملہ ابھی تک دبا ہوا تھا۔ گنگو ابھی تک مفرور تھا۔ یا تو وہ شہر سے بھاگ گیا تھا یا شہر ہی میں کسی جگہ چھپا ہوا تھا اور پولیس اُسے تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔ رام چند دھوبی اور بوڑھا ٹھاکر ظاہر ہے اس شہر میں تھے۔ یہ اندیشہ بہرحال موجود تھا کہ اگر کلپنا حویلی سے باہر نکلی تو دیکھ نہ لی جائے۔ سیتا بھی فی الحال باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ میرے لئے فی الحال کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ شمروز کی حیثیت سے مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا مگر ہوٹل والے ہنگامے سے گڑبڑ ہو گئی تھی جس وجہ سے میں باہر نکلنے سے گریز کر رہا تھا۔ اور یوں بھی بگڑے ہوئے چوکھٹے کے ساتھ باہر نکلنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔

دو روز اور گزر گئے...... اور پھر یہ دلچسپ خبر سننے میں آئی کہ چند مسلح ڈاکوؤں نے کیلاش کی حویلی پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ حملہ رات کے وقت ہوا تھا۔ کیلاش کے دوست بھی موجود تھے اور کرائے کی عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں۔ ڈاکوؤں نے کیلاش اور اُس کے دوستوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کیلاش کو گن پوائنٹ پر لے کر اُس کی تجوری خالی کروالی تھی اور گھر کا سارا قیمتی فرنیچر اور قالین وغیرہ آنگن میں ڈھیر کر کے آگ لگا دی گئی تھی۔ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ تمام سامان کیلاش اور اُس نے دوستوں ہی سے اُٹھوا کر باہر ڈھیر کروایا گیا تھا۔ سامان پر گھاسلیٹ چھڑک کر اُسے آگ بھی کیلاش ہی کے ہاتھوں لگوائی گئی تھی۔ اور وہ ڈاکو جاتے ہوئے اُن تینوں عورتوں کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ ستم بر آں...... کیلاش جب اس واقعہ کی رپورٹ لکھوانے تھانے پہنچا تو ساری بات سننے کے بعد پولیس نے نقدی اور زیورات لوٹے جانے کی تو نامعلوم ڈاکوؤں کے خلاف رپورٹ درج کر لی لیکن قیمتی ساز و سامان کو نذر آتش

کئے جانے کی رپورٹ نہیں لکھی کیونکہ پولیس کے مطابق سامان کو آگ کیلاش نے خود اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی۔ کسی دوسرے کو اس سلسلے میں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

اس سے اگلے روز رات کے وقت کیلاش کے ساتھ ایک اور افسوس ناک واقعہ پیش آیا...... بعض نامعلوم لوگوں نے اُس کے دفتر کا تالا توڑ کر تمام فرنیچر اور فائلیں وغیرہ باہر نکال کر آگ لگا دی تھی۔

ہمیں گفتگو کے لئے ایک نیا موضوع مل گیا تھا۔ ممکن ہے لوگ ان وارداتوں کو پراسرار سمجھ رہے ہوں لیکن ہمارے لئے اس میں کوئی پراسراریت نہیں تھی۔ سیتا کے پتا جی نے یہ طے کر لیا تھا کہ اُس کو اُس کی گستاخی کی سزا دیں گے اور اُسے اس شہر سے بھاگنے پر مجبور کر دیں گے اور مہارانا دھرمیش سنگھ کے اس منصوبے پر عمل شروع ہو چکا تھا۔

میرا چوکھٹا ٹھیک ہو گیا تھا اور کوئی تکلیف بھی نہیں رہی تھی۔ اور پھر اُس روز میں نے ایک بار پھر حویلی سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اپنے ساتھ کلپنا کو بھی لے جانا چاہتا تھا۔ کلپنا زندگی بھر تو حویلی میں قید ہو کر نہیں رہ سکتی تھی۔ میں چاہتا تھا اُسے لے کر باہر نکلوں وہ کسی کی نظروں میں آئے اور جو ہونا ہے وہ ہو جائے۔ سر پر تلوار لٹکی ہوئی تھی اس سے تو نجات مل جائے گی۔

سیتا اور دُرگا میری اس تجویز سے متفق تھیں۔ لیکن کلپنا کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑنے لگی تھیں۔ لیکن بہرحال وہ میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ کلپنا نے نئے کپڑوں میں سے ایک جوڑا پہنا تھا۔ چولی، گھاگھرا اور چنری۔ اس لباس میں وہ واقعی بہت حسین لگ رہی تھی۔ چنری آج کل صرف فیشن کے طور پر استعمال ہوتی تھی لیکن اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اس سے گھونگھٹ نکال کر چہرہ چھپایا جا سکتا تھا۔

ہم جب خفیہ راستے سے پچھلے مکان میں آئے تو سیتا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر بار بار مسکرا رہی تھی۔

''واپس آؤ گے نا؟'' اُس نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اُسے گھورا۔ ''کیا تم سمجھتی ہو کہ میں کہیں بھاگ جاؤں گا؟''

''کوئی بھروسہ نہیں......'' سیتا مسکرائی۔ ''کلپنا بہت حسین لڑکی ہے۔ اس کے لئے ایک خون بھی ہو چکا ہے...... کیا پتہ تم اسے لے کر کہیں بھاگ جاؤ اور میں یہاں بیٹھی تمہارا انتظار کرتی رہوں۔''

''اگر کبھی بھاگنے کی ضرورت پیش آئی تو تم بھی میرے ساتھ ہوگی...... فکر مت کرو۔'' میں نے کہا۔

ہم دروازہ کھول کر پچھلی گلی میں نکل گئے۔ سیتا اُس وقت تک دروازے میں کھڑی رہی جب تک ہم گلی سے نکل کر بازار کا موڑ نہیں گھوم گئے۔ کچھ دُور تک ہم لوگ پیدل چلتے رہے پھر سامنے ایک ٹیکسی رُکوالی اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

''کہاں جانا ہے مہاراج؟'' ڈرائیور نے اپنے سامنے لگا ہوا آئینہ درست کرتے ہوئے کہا۔

''کہیں بھی لے چلو بھایا!'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم تو اس شہر میں نئے آئے ہیں سیر و تفریح کرنے..... جہاں دل چاہے لے چلو.....''

''پنوڑی کی حویلیاں.....؟''

''وہ سب ہم دیکھ چکے ہیں۔'' میں نے ڈرائیور کی بات کاٹ دی۔ ''کسی تفریح کی جگہ لے چلو..... گھومنے پھرنے کی جگہ۔''

''سمجھ گیا مہاراج..... آپ کو سیر کرنی ہے۔'' ڈرائیور نے کہتے ہوئے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

ٹیکسی شہر کی مختلف سڑکوں پر ہلکی رفتار سے دوڑتی رہی اور ڈرائیور کسی ماہر گائیڈ کی طرح راستوں اور عمارتوں کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔ اُس نے کئی مرتبہ کسی عمارت یا کسی چوک پر ٹیکسی روکی تھی اور اُن جگہوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا تھا۔ اور بالآخر شہر کے مختلف علاقے گھمانے کے بعد وہ ہمیں امر ساگر لے گیا۔ یہ وسیع و عریض علاقہ تالابوں، چھوٹی چھوٹی مصنوعی جھیلوں، کنوؤں اور خوبصورت چھتریوں پر مشتمل تھا۔ کئی خوبصورت پارک تھے۔ یہ چھتریاں دراصل راجاؤں اور مہاراجاؤں کی سمادھیاں تھیں۔ خوبصورت قبرستان..... جس جگہ کسی راجہ کی چتا جلائی گئی تھی وہاں چبوترہ بنا کر خوبصورت بارہ دری اور اُس کے اُوپر نہایت خوبصورت چھتری بنا دی گئی تھی۔ لاتعداد چھتریاں تھیں اور یہ چھتریاں یعنی راجوں مہاراجوں کا قبرستان لوگوں کے لئے ایک بہترین تفریح گاہ بن گئی تھیں۔

ہم بہت دیر تک مختلف جگہوں پر گھومتے رہے۔ کلپنا چنری کا گھونگھٹ نکالے میرے ساتھ جڑ کر چل رہی تھی۔ بعض لوگ مسکرا مسکرا کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم ایک پارک میں بینچ پر بیٹھ گئے۔ بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ میں نے ایک ٹھیلے سے بھیل پوری منگوالی۔ یہ چاٹ کھانے کے لئے کلپنا کو گھونگھٹ اُٹھانا پڑا تھا۔ اسی دوران ایک پارسی جوڑا ہمارے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ یہ لوگ بمبئی سے آئے ہوئے تھے۔ مرد کی عمر پچاس اور عورت کی پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔

''نئی نئی شادی ہوئی ہے.....!'' عورت نے پہلے کلپنا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کلپنا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پارسی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھی جوڑی ہے..... نجر نہ لگے۔'' پارسی عورت مسکرا دی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے اور پھر اُٹھ کر ایک طرف کو چل دیئے۔ سورج غروب ہونے والا تھا..... چہل پہل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کلپنا نے بھیل پوری کھانے کے لئے گھونگھٹ اُٹھایا تھا تو دوبارہ چنری کو چہرے پر ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

ہم سڑک پر آ گئے..... کلپنا اب بے جھجک سی ہو کر چل رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دُور تک

پیدل چلا جائے لیکن ایک خالی ٹیکسی ہمارے قریب آ کر رُک گئی۔ میں نے پیدل چلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ویسے بھی ان پارکوں میں، چھتریوں میں اور کنوؤں اور تالابوں میں گھوم گھوم کر کلپنا تھک گئی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ شہر کے کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کافی یا چائے پئیں اور پھر حویلی کا رُخ کریں۔

میں نے دروازہ کھول کر کلپنا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ کر دوسری طرف سرکنے لگی۔ میں ٹیکسی میں بیٹھنے کے لئے جھکا ہی تھا کہ نجانے کس طرف سے ایک آدمی میرے اُوپر آ گرا..... اُس آدمی نے مجھے پکڑ کر ایک طرف کھینچا، پیٹ پر زوردار گھونسہ مارا اور زوردار دھکا دے کر گرا دیا.....

ٹیکسی اس دوران حرکت میں آ چکی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ مجھے دھکا دینے والا شخص دوڑتا ہوا ٹیکسی میں بیٹھ گیا..... دروازہ دھڑ سے بند ہوا اور ٹیکسی کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی..... میں نے کلپنا کی چیخ بھی سنی تھی۔

میں ایک دم بدحواس ہو گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میرے ساتھ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ یہ کوئی سنسان اور ویران جگہ نہیں تھی، تفریح گاہ تھی۔ سڑک پر بیسیوں لوگ کھڑے تھے اور اتنے لوگوں کی موجودگی میں کسی لڑکی کو چھین کر لے جانے کی کوشش واقعی دیدہ دلیری تھی۔ لیکن مجھ سے کوئی چیز چھین لینا معمولی بات نہیں تھی۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو ایسی کوشش میں دو غنڈے میرے ہاتھوں اپنا بھرتہ بنوا چکے تھے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس اچانک صورتحال نے ایک لمحہ کو میرے حواس مختل کر دیئے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا..... ٹیکسی بہت دُور نکل چکی تھی۔ لوگ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک آدمی موٹر سائیکل سٹارٹ کر رہا تھا۔ اُس کے قریب شاید اُس کی بیوی کھڑی تھی۔ میں دوڑ کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔

''بھائی صاحب پلیز.....!'' میں نے سماجت کی۔ ''غنڈے میری پتنی کو اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ موٹر سائیکل مجھے دے دیں..... وعدہ کرتا ہوں ایک گھنٹے سے پہلے پہلے اس جگہ واپس لے آؤں گا۔''

وہ کوئی شریف آدمی تھا۔ اُس نے موٹر سائیکل میرے حوالے کر دی۔ موٹر سائیکل سٹارٹ ہو چکی تھی۔ میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہی ہینڈل سنبھالا اور پیر سے گیئر بدلتے ہوئے ایکسی لیٹر گرپ گھما دی۔ مجھے کشمیر کے پہاڑوں میں موٹر سائیکل چلانے کا تجربہ تھا اور یہ تو ہموار سڑک تھی۔ ٹریفک بھی زیادہ نہیں تھا۔ میں موٹر سائیکل کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

وہ ٹیکسی آگے والے چوک سے بائیں طرف گھوم چکی تھی۔ اُس چوک پر پہنچ کر میں نے بھی موٹر سائیکل اُسی طرف موڑ دی۔ اس طرف ٹریفک کچھ اور کم تھا۔ میرے اور ٹیکسی کے درمیان تقریباً دو سو گز کا فاصلہ تھا۔ میں بائیک کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

ٹیکسی ایک اور سڑک پر گھوم گئی تھی اور مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ یہ سڑک شہر سے باہر جانے والی تھی۔ آبادی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی اور سامنے بہت دُور پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

میرے اور ٹیکسی کے درمیان فاصلہ بھی بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ آبادی اب پیچھے رہ گئی تھی۔ سڑک سے ہٹ کر دُور دُور اِکا دُکا چھوٹی چھوٹی عمارتیں یا احاطے سے نظر آ رہے تھے۔ وہ ٹیکسی سڑک سے اُتر کر ایک ایسی ہی عمارت کے سامنے رُک گئی جس کے گرد بہت لمبا چوڑا احاطہ تھا۔ ٹیکسی رُکتے ہی پہلے ڈرائیور نیچے اُترا اور پھر دوسرے آدمی نے نیچے اُتر کر کلپنا کو باہر کھینچ لیا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے احاطے کے پھاٹک کی طرف دوڑنے لگا۔ کلپنا چیختے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی۔ احاطے کا لکڑی کا پھاٹک ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ لوگ پھاٹک میں داخل ہو چکے تھے۔

میں نے موٹر سائیکل پھاٹک کے سامنے روک لی اور اُسے چھوڑ کر دوڑتا ہوا پھاٹک میں داخل ہو گیا..... ایک طرف بہت لمبا چوڑا شیڈ بنا ہوا تھا جس کے سامنے بڑے بڑے پیلے پتھروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ شیڈ کے ساتھ ایک مختصر سی عمارت تھی اور وہ دونوں غنڈے کلپنا کو اس عمارت ہی میں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ اندازہ تو میں نے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی لگا لیا تھا کہ وہ عمارت ویران تھی اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دُشواری پیش نہیں آئی کہ اس شیڈ میں کبھی پتھر کاٹنے اور تراشنے کی مشینیں لگی ہوں گی۔

اُن دونوں میں سے کسی کے پاس ریوالور یا پستول جیسا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو مجھے راستے ہی میں گرانے کی کوشش کی جاتی یا اب قریب آنے سے روکا جاتا۔ وہ مجھے بڑی آسانی سے گولی کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ لیکن اُس کے پاس ریوالور یا پستول نہیں تھا۔

ایک غنڈہ کلپنا کو کھینچتے ہوئے ویران عمارت کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ ڈرائیور نے لمبے پھل والا چاقو نکال لیا اور مجھے روکنے کے لئے تن کر کھڑا ہو گیا۔

میں دُور ہی سے کسی طاقتور سپرنگ کی طرح اُچھلا اور ہوا میں اُڑتا ہوا اُس کے اُوپر جا گرا۔ میرا ایک پیر اُس کے منہ پر اور دوسرا اُس کے سر پر لگا۔ وہ چیختا ہوا پشت کے بل گرا۔ اُس کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا..... اُس کے منہ سے نکلنے والی دوسری چیخ بڑی خوفناک تھی۔ اُس کی کھوپڑی پتھر سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی تھی۔ میں بھی اُس کے قریب ہی گرا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُٹھ کر اُس بدمعاش کی طرف لپکا جو کلپنا کو کھینچتا ہوا عمارت کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ عمارت ایک اُونچے چبوترے پر بنی ہوئی تھی اور پتھر کی چار کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ کلپنا ایک سیڑھی پر اڑ گئی اور وہ شخص اُسے اُوپر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُس نے شاید اپنے ساتھی کا انجام دیکھ لیا تھا۔ وہ کلپنا کو چھوڑ کر شیڈ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اُس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اُسی وقت کلپنا کی چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''مہابیر! پکڑ لو اسے..... مار ڈالو..... یہ رام چند دھوبی ہے۔ اس نے میری ماں کو مار ڈالا تھا۔ مار دو اسے.....''

تو وہ رام چند دھوبی تھا..... پہلے تو میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ اُس رات ہوٹل میں جو غنڈہ میرے ہاتھوں پٹ کر بھاگ گیا تھا یہ اُس کے ساتھی ہوں گے۔ لیکن معاملہ کچھ اور نکلا تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ رام چند دھوبی شیڈ میں بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اُس کی گردن دبوچ لی اور اُسے مارتا ہوا کھلی جگہ پر لے آیا۔

یہاں اُس کا داؤ چل گیا۔ وہ مجھے زمین پر گرا کر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگا..... مگر میں نے اُس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی اور اُسے دُور اُچھال دیا اور پھر اُسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر میں نے اُسے دبوچ لیا۔

''تم سمجھتے تھے کہ اس طرح کلپنا کو لے دوڑو گے؟'' میں نے اُس کا گلا دباتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس کی ماں کو مار ڈالا تھا اور اس کی زندگی بھی برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ تم انسان نہیں بھیڑیئے ہو..... تمہیں جینے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ تمہاری شامت ہی آئی تھی جو اس وقت تم نے کلپنا کو اغواء کرنے کی کوشش کی تھی۔ گنگو کہاں ہے؟ جلدی بتاؤ..... ورنہ تمہارا گلا گھونٹ دُوں گا۔''

''ب..... بتاتا ہوں۔'' رام چند دھوبی کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔ میں نے اُس کے گلے پر گرفت ڈھیلی کر دی۔ ''وہ..... وہ.....'' رام چند دھوبی بولا۔ ''وہ رام ڈیوڑے میں واقع کالی کے پرانے مندر میں چھپا ہوا ہے۔''

''اور وہ بوڑھا ٹھاکر..... وہ کہاں ہے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''وہ..... وہ اپنی حویلی میں ہے۔'' رام چند دھوبی نے جواب دیا۔

''وہ دونوں تو پولیس کی گرفت میں آ ہی جائیں گے۔ مگر تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ تم کلپنا کی ماں کے ہتھیارے ہو۔ اس کی سزا تمہیں ہم دیں گے۔''

رام چند دھوبی نے اچانک ہی مجھے پیروں سے دھکیل کر پیچھے گرا دیا۔ میں ریت پر گرا اور سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ رام چند دھوبی کی خوفناک چیخ سن کر چونک گیا اور پھر دوسرے ہی لمحہ میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں۔ کلپنا ایک طرف کھڑی رام چند دھوبی کو دیکھ رہی تھی جس کا سر کچلا جا چکا تھا۔ کلپنا نے اُس کے سر پر جو پتھر مارا تھا وہ بھی اُس کے قریب ہی پڑا تھا اور خون سے تر ہو چکا تھا۔

کلپنا نے بڑی ہمت سے کام لیا تھا۔ وہ ایک بڑا سا پتھر اُٹھائے موقع کی تاک میں تھی اور موقع ملتے ہی اُس نے وار کر دیا تھا..... وہ اُس کی ماں کا قاتل تھا اور اُس نے بدلہ لے لیا تھا اور اب وہ ایک طرف کھڑی دہشت زدہ سی نظروں سے رام چند دھوبی کی لاش کو دیکھتے

ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں کلپنا کی طرف بڑھا تو وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ کسی انجانے خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اُس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

''ڈرو نہیں.....'' میں اُسے تسلی دے رہا تھا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

دس بارہ منٹ بعد ہی کلپنا اپنے خوف پر قابو پا سکی تھی۔ اُس وقت اندھیرا کچھ گہرا ہو گیا تھا۔ میں کلپنا کا ہاتھ پکڑ کر احاطے سے باہر لے آیا۔ موٹر سائیکل ریت پر گری ہوئی تھی۔ میں نے اُٹھا کر کک لگاتے ہوئے انجن سٹارٹ کیا اور کلپنا کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ وہ پہلی مرتبہ موٹر سائیکل پر بیٹھی تھی۔ اُس نے مردوں کی طرح ایک پیر ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف رکھا تھا۔ اُس نے میرے ساتھ چمٹ کر دونوں بانہیں میرے سینے پر لپیٹ لی تھیں۔

ہمیں پارک کے قریب پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ آدمی اپنی بیوی کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ میں نے موٹر سائیکل اُس کے حوالے کرتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ وہ بدمعاش میری پتنی کو ایک سنسان سڑک پر پھینک کر بھاگ گئے تھے۔

میں کلپنا کو لے کر ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ گیا۔ میں نے رکشہ ایک بارونق بازار میں ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رُکوا لیا اور کلپنا کو لے کر ریسٹورنٹ میں ایک فیملی کیبن میں بیٹھ گیا۔ کلپنا اب بھی دہشت زدہ سی تھی لیکن چائے پینے کے بعد اُس نے اپنی کیفیت پر بڑی حد تک قابو پا لیا۔

ریسٹورنٹ سے نکلتے ہوئے دروازے کے ساتھ ہی نیوز اسٹینڈ پر ایک میگزین دیکھ کر میں رُک گیا۔ میگزین کے سرورق پر پتوڑی کی ایک حویلی کی تصویر میں نے پہچان لی اور بغیر کسی ارادے کے وہ میگزین خرید لیا۔ حویلی تک واپس جانے کے لئے بھی میں نے آٹو رکشہ کو ترجیح دی تھی۔

دُرگا اور سیتا ہماری حالت دیکھ کر چونک گئیں اور پھر انہیں وہ سب کچھ بتانا پڑا۔

کلپنا اب بھی خوفزدہ تھی۔ دُرگا اُٹھ کر اُس کے پاس آ گئی اور اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

اُس رات ہم دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ سیتا نے میز پر سے وہ میگزین اُٹھا لیا اور پھر ایک دم چیخ اُٹھی۔

''اوہ دُرگا جی..... یہ دیکھو! میگزین میں تمہاری تصویر۔''

پہلے وہ رسالہ دُرگا نے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھا دیا۔ پورے صفحہ کی رنگین تصویر تھی۔ وہ پتوڑی کی حویلی میں نفیس ستون کے قریب کھڑی تھی۔ میرا چہرہ بھی نمایاں تھا۔ ستون پر نقش و نگار اور دُرگا کے حوالے سے کیپشن تھا۔ ''قدرت اور انسانی ہاتھوں کی خطاطی کے دو شاہکار۔''

یہ تصویر دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی.....!

○○○

دُرگا کی عمر اگرچہ پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ میک اپ کے بغیر بھی بہت حسین لگتی تھی۔ لیکن اُس روز ہلکے سے میک اپ سے اُس کا حسن اس طرح نکھر آیا تھا کہ میرا دل بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔ اللہ میاں نے شاید اُسے خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اُس روز جب میں اُس کے ساتھ گیا تھا تو لوگ مُڑ مُڑ کر اُس کی طرف دیکھتے تھے اور پتوڑی کی حویلی میں اُس فوٹو گرافر نے بھی اُسے تاڑ لیا تھا اور تصویر کھینچ لی تھی۔

اُس فوٹو گرافر کے ساتھ ایک عورت اور دو بچے بھی تھے۔ ہو سکتا ہے وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح سیر و تفریح کے لئے یہاں آیا ہو اور اُس نے یہ تصویر شوقیہ طور پر کھینچ لی ہو۔ لیکن جب یہ تصویر ڈیولپ ہو کر اُس کے سامنے آئی تو اُس نے سوچا ہو گا کہ اس تصویر کو کسی رسالے میں چھپنا چاہئے۔ اور شاید اس خیال سے اُس نے یہ تصویر اس رسالے کو بھیج دی تھی۔

یہ رسالہ قدیم فن تعمیر اور پتھروں پر نقش کاری کے حوالے سے ہی مضامین اور تصاویر شائع کرتا تھا۔ اور اُس کے سرورق پر پتوڑی کی حویلی کی تصویر دیکھ کر ہی میں نے خرید لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس رسالے کے مضامین پڑھنے سے راجستھان کی قدیم عمارتوں اور مختلف شہروں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہو گا اور مجھے بہت کچھ جاننے کا موقع ملے گا۔ مگر اس رسالے میں یہ تصویر دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا تھا..... اگر صرف دُرگا کی تصویر ہوتی تو میرے لئے پریشانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔ لیکن اس تصویر میں میرا چہرہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے..... تم یہ تصویر دیکھ کر پریشان کیوں ہو گئے..... اچھی نہیں لگی کیا؟'' میں دُرگا کی آواز سن کر چونک گیا۔ میرے خیالات منتشر ہو گئے۔

''تصویر بہت اچھی ہے..... تم واقعی قدرت کا ایک حسین شاہکار ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں اس تصویر کی اشاعت کے بعد آنے والے حالات کی تصویر دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور وہ تصویر جس قدر بھیانک ہو گی اُس کا اندازہ لگانا دُشوار ہے؟''

''کیا مطلب؟'' دُرگا نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری بات سن کر سیتا بھی چونک گئی تھی۔

''مطلب بعد میں بتاؤں گا..... اس وقت تو میں کلپنا کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہیں اس کا مطلب بھی سمجھانا پڑے گا۔'' دُرگا بولی۔

''کلپنا بھی ہماری طرح دشمنوں میں گھری ہوئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آج یہ پہلا دن میرے ساتھ نکلی تھی اور اتفاق سے رام چند دھوبی کی نظروں میں آ گئی۔ وہ دنیا کا سب سے احمق آدمی تھا جس نے دن دیہاڑے اُسے اغواء کرنے کی کوشش کی اور میرے نہیں بلکہ کلپنا کے ہاتھوں مارا گیا۔ رام چند دھوبی اکیلا نہیں تھا۔'' میں خاموش ہو کر کلپنا کی طرف دیکھنے لگا۔

''اُس کا اصل دشمن تو وہ بوڑھا ٹھاکر ہے جو اُسے حاصل کرنا چاہتا ہے اور اُس پر ہزاروں روپے خرچ کر چکا ہے۔ گنگو بدمعاش کے ساتھی کے قتل کی وجہ سے شاید وہ دبک کر بیٹھ گیا ہے۔ لیکن معاملہ جیسے ہی ٹھنڈا ہو گا یا اُسے پتہ چلے گا کہ کلپنا اسی شہر میں ہے تو وہ اُسے حاصل کرنے کی دوبارہ کوشش کرے گا۔''

''میرے خیال میں ایسا نہیں ہو گا.....'' سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اُسے جب یہ پتہ چلے گا کہ رام چند دھوبی بھی اس چکر میں مارا گیا ہے تو شاید وہ یہ شہر ہی چھوڑنے کی کوشش کرے۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ بڈھے جو ہوتے ہیں نا بہت ضدی ہوتے ہیں۔ اور پھر ٹھاکر..... جس نے کلپنا کے لئے اپنی عزت تک داؤ پر لگا ڈالی۔ کلپنا تو واقعی ایسی چیز ہے کہ اس کے لئے دو چار قتل بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ تین قتل اب تک ہو چکے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ معاملہ یہاں نہیں رُکے گا۔ گنگو بھی اسی شہر میں موجود ہے اور ٹھاکر بھی۔ اس سے پہلے کہ اُن کی طرف سے کسی ردعمل کا اظہار ہو ہمیں اُن کی طرف قدم بڑھا دینا چاہئے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' سیتا نے مجھے گھورا۔

''جب تک کلپنا کے دشمن ختم نہیں ہو جاتے یہ سکون سے نہیں رہ سکے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ.....!'' سیتا نے گہرا سانس لیا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ اب ٹھاکر اور گنگو کو بھی ختم کر دیا جائے؟''

''ہاں..... نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔'' میں نے کہا۔

''تین قتل ہو چکے ہیں.....'' سیتا نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''دو قتل اور کرنا چاہتے ہو..... اس کے بعد اگر کوئی اور ایسا شخص سامنے آ گیا تو.....؟''

''میرا خیال ہے اور کوئی سیتا کو نہیں جانتا۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''اگر ہمیں کلپنا سے واقعی ہمدردی ہے تو ہمیں اس کی حفاظت کو یقینی بنانا ہو گا۔ یا پھر ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ہم اس کی سرکھشا سے ہاتھ اُٹھا لیں اور اسے ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلتا کر دیں۔''

''نہیں نہیں..... میں نہیں جاؤں گی یہاں سے۔'' کلپنا جلدی سے بولی۔ اُس کے چہرے پر اب بھی خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔

''تمہیں یہاں سے کوئی نہیں نکال رہا۔'' دُرگا نے اُسے ایک بار پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ''تم اس لڑکی کو مزید خوفزدہ کرنے کی کوشش مت کرو مہابیر! جب تک ہم زندہ ہیں کوئی اس کی طرف

آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر دُرگا نے کلپنا کو سونے کے لئے اُس کے کمرے میں بھیج دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اس لڑکی کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آ رہے ہیں۔ اُس رات مہارانا کی حویلی میں اُسے اُٹھانے کی کوشش میں اُس کے سامنے ایک قتل ہو گیا اور آج دو آدمی اور مارے گئے۔ وہ پہلے ہی خوفزدہ ہے۔ ہمیں اس کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

''اُس کے سامنے ایسی باتیں کرنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب کچھ اُس کے لئے ہو رہا ہے۔ ہم کوئی پیشہ ور قاتل نہیں ہیں کہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارتے پھریں۔ اُس کے اندر بھی تو کچھ اعتماد پیدا ہو۔''

''کسی میں اعتماد پیدا کرنے کا یہ طریقہ کچھ عجیب سا نہیں؟'' دُرگا نے مجھے گھورا۔

''عجیب تو ہے..... لیکن ہمیں ایسا کرنا پڑے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا چھوڑو..... یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔'' دُرگا نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم میری اس تصویر کے بارے میں بات کر رہے تھے اور تم نے کچھ خدشات کا اظہار کیا تھا۔'' اُس نے میگزین کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں.....'' میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''اس تصویر میں تمہارے ساتھ میرا چہرہ بھی بہت واضح نظر آ رہا تھا۔'' میں نے میگزین کھول کر تصویر کی طرف اشارہ کیا اور انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کرنے لگا۔

دُرگا نے تو شاید اس بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن سیتا کی آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی تھی۔

''لیکن..... میرا خیال ہے کہ کشمیر کی پولیس، بھارتی فوج یا انٹیلی جنس کے پاس تمہاری کوئی تصویر نہیں ہے۔'' سیتا نے کہا۔

''یہ اپنے آپ کو تسلی دینے والی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر اُن کے پاس میری کوئی تصویر ہوتی تو سینکڑوں بار اخبارات میں چھپ چکی ہوتی۔ اور میں اس طرح آزادی سے نہ گھوم رہا ہوتا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کشمیر میں مجھے بائی فیس تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پولیس، فوج یا انٹیلی جنس ہی کا کوئی آدمی مجھے پہچانتا ہو۔ یہ تصویر لوگوں کی نظروں میں تو آئے گی اور اُن میں میرا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے۔'' میں خاموش ہو کر باری باری دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ''غدار ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جن کی وجہ سے ہم بار بار نقصان اُٹھاتے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ملک و قوم کا نہیں صرف اور صرف اپنا ذاتی مفاد عزیز ہوتا ہے۔ اگر کسی ایسے ہی شخص نے میری یہ تصویر دیکھ لی تو وہ انعام کے لالچ میں پولیس، فوج یا انٹیلی جنس سے رابطہ کر سکتا ہے۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے.....'' دُرگا گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں زیادہ پریشان اس لئے نہیں ہوں کہ اس قسم کے میگزین کتنے لوگ پڑھتے ہیں، میرا خیال ہے ان کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ آج کل تو شوبز کے میگزین ہی چلتے ہیں۔ اُن میں ایکٹریسوں کی بڑی خوبصورت نیم عریاں رنگین تصاویر بھی ہوتی ہیں اور اُن کے بارے میں دلچسپ معلومات بھی۔ ایسے میگزین کون خریدنا یا پڑھنا پسند کرتا ہے؟ یہ تو صرف بک سٹالوں کی زینت بن کر ہی رہ جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں محتاط تو رہنا ہی پڑے گا۔''

''ہاں..... ہم تو محتاط رہیں گے۔ لیکن میرے خیال میں پتے ہمارے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

دُرگا نے میری ہر بات غور سے سنی تھی۔ اُسے کچھ تشویش بھی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے محتاط رہنے کا مشورہ بھی دے دیا تھا۔ لیکن میرے خیال میں وہ اس معاملے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھی۔ شاید وہ سمجھتی ہو کہ اس تصویر کے ذریعے ہمارا سراغ لگانا ممکن نہیں ہوگا۔ پولیس اور انٹیلی جنس ویسے بھی بعض معمولی باتوں پر گڑھے مُردے اُکھاڑ پھینکتی ہے۔ اور یہ تو بہت معمولی سی بات تھی۔ اُنہیں صرف یہ کرنا تھا کہ دہلی میں میگزین کے دفتر سے یہ معلوم کر کے کہ یہ تصویر انہیں کہاں سے ملی تھی؟ آیا اُن کے اپنے فوٹو گرافر نے کھینچی تھی یا کسی فری لانسر نے اُنہیں فروخت کی تھی۔ فوٹو گرافر کوئی بھی ہو اُس سے آسانی سے پتہ چلایا جاسکتا تھا کہ اُس نے یہ تصویر کب اور کہاں کھینچی تھی۔ اور دُرگا تو اس شہر کی معروف ہستی تھی۔ اُسے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہ ہوتا۔

دُرگا نے احتیاط کا مشورہ دیا تھا اور احتیاط یہی ہوسکتی تھی کہ ہم اس حویلی کو چھوڑ دیں اور جہاں بھی جائیں اس کے بارے میں دُرگا کو بھی نہ بتایا جائے۔ لیکن ہوسکتا ہے میرے یہ اندیشے بھی بے بنیاد ہوں..... اُس میگزین میں عام آدمی کی دلچسپی کی کوئی بات نہیں تھی۔ اُسے تو وہی خرید سکتا تھا جسے تاریخ اور قدیم فنِ تعمیر سے کوئی دلچسپی ہو۔ دُرگا نے ٹھیک کہا تھا کہ لوگ فلم ایکٹریسوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

اگلے روز میں صبح دس بجے کے قریب بیدار ہوا تو دُرگا بازار سے سودا وغیرہ لے آئی تھی۔ میز پر اخبار بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ اخبار اُٹھا لیا۔ پہلے صفحہ پر ہی وہ خبر تھی۔ اس کے ساتھ رام چند دھوبی اور اُس کے ساتھی ٹیکسی ڈرائیور اور ٹیکسی کی تصویر بھی چھپی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی تصویر تو پہچانی جارہی تھی لیکن رام چند دھوبی کا چہرہ ناقابلِ شناخت تھا۔ کلپنا نے پتھر سے اُس کا سر اس طرح کچل دیا تھا کہ اُس کا چہرہ قابلِ شناخت نہیں رہا تھا۔

اس خبر کو اخبار نے اپنے مخصوص رنگ میں شائع کیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور خبر بھی تھی۔ امرساگر سے ایک لڑکی کو زبردستی اغواء کرلیا گیا تھا۔ عینی شاہدوں کے بیانات بھی چھاپے گئے تھے۔ اُن کے مطابق وہ لڑکی شادی شدہ تھی اور اپنے پتی کے ساتھ سیر کرنے آئی تھی کہ اُسے ایک ٹیکسی میں اغواء کرلیا گیا۔ لڑکی کے پتی نے ایک موٹر سائیکل پر ٹیکسی کا پیچھا کیا تھا۔ اُن میں

کوئی بھی ٹیکسی کا نمبر نوٹ نہیں کرسکا تھا۔ اُنہیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ نوجوان اپنی پتنی کو اُن غنڈوں سے چھڑانے میں کامیاب ہوسکا تھا یا نہیں؟ البتہ اخبار نے اپنے طور پر ان دونوں خبروں میں تعلق جوڑنے کی کوشش کی تھی۔

رپورٹ کے مطابق شہر سے دُور اُس ویران احاطے کے باہر جہاں ٹیکسی کھڑی تھی قریب ہی ریت پر موٹر سائیکل کے پہیوں کے نشان بھی پائے گئے تھے۔ رپورٹ نے قیاس آرائی کی تھی کہ ممکن ہے اُس لڑکی کا پتی موٹر سائیکل پر اُن غنڈوں کا پیچھا کرتا ہوا اس ویران احاطے تک پہنچ گیا ہو اور وہ دونوں غنڈے اُس کے ہاتھوں مارے گئے ہوں۔ اخبار میں بہرحال اُس شخص کا بیان نہیں تھا جس کی موٹر سائیکل پر میں نے ٹیکسی کا پیچھا کیا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ اب وہ اس سلسلے میں پولیس سے رابطہ بھی نہیں کرے گا۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ وہ دونوں غنڈے میرے ہاتھوں مارے گئے تھے اور اس واردات میں اُس کی موٹر سائیکل استعمال ہوئی تھی۔ پولیس اُسے پریشان کرسکتی تھی۔ اور ظاہر ہے وہ اپنی گردن نہیں پھنسوانا چاہے گا۔

دُرگا کچن میں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور ہم دونوں اخبار کی اُس خبر پر تبصرے کرنے لگے۔

''تم تو واقعی بڑے ظالم ہو۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ ''تم نے ان دونوں کا کیا حشر کردیا..... اس کی تو صورت ہی پہچانی نہیں جاتی۔'' اُس نے اخبار میں رام چند دھوبی کی ناقابلِ شناخت تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ رام چند دھوبی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ظلم کا مقابلہ تو طاقت سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو تم سوچ سکتی ہو کہ وہ لوگ کلپنا کا کیا حشر کرتے۔''

ہم کافی دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

وہ دن بڑا بوریت میں گزرا۔ کلپنا تو دن بھر اپنے کمرے میں پڑی رہی تھی۔ کل والے واقعہ سے وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہوگئی تھی اور اُسے بخار بھی ہوگیا تھا۔ میں بھی ایک مرتبہ اُسے دیکھ کر آیا تھا اور سیتا اور دُرگا تو بار بار اُس کے کمرے کے چکر لگا رہی تھیں۔ شام کو میں پھر سیتا کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا گیا۔ کلپنا کی باتوں سے پتہ چلا کہ اب وہ گنگو اور ٹھاکر سے خوفزدہ تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ٹھاکر اُس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس وقت تک محفوظ تھی جب تک اس حویلی میں تھی۔ اور ظاہر ہے وہ زندگی بھر حویلی کی دیواروں میں قید ہو کر نہیں رہ سکتی تھی۔

''اگر تم چاہو تو ہم تمہیں کہیں اور چھوڑ دیں؟'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے دُور کسی دوسرے شہر جہاں تمہارے کوئی رشتہ دار ہوں..... جہاں تم اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکو۔''

''میں اپنے آپ کو صرف یہاں سرکشت سمجھتی ہوں۔ آپ لوگوں کے پاس۔'' کلپنا نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ میرے لئے کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ میں

جہاں بھی جاؤں گی وہ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔ اور پھر میرا اب آپ لوگوں کے سوا ہے بھی کون؟ مجھے اپنے پاس ہی رہنے دیں۔ میں جیون بھر آپ لوگوں کی سیوا کرتی رہوں گی۔''

''ہم زبردستی تمہیں کہیں نہیں بھیجیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''تم ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ان چند دنوں کے دوران تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہم کانٹوں بھرے راستے پر چل رہے ہیں..... ہمارے چاروں طرف موت کے سائے منڈلا رہے ہیں اور آگے چل کر تو ہمارا راستہ اور بھی دُشوار ہو جائے گا۔ کیا تم اس راستے پر ہمارا ساتھ دے سکو گی؟''

''کوشش کروں گی مہابیر جی.....!'' کلپنا نے جواب دیا۔ ''لیکن میں ایک بات کا آپ کو وشواش دلاتی ہوں۔ آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچنے دُوں گی۔ جیون دے دُوں گی پر اپنے کارن آپ لوگوں پر کوئی آنچ نہیں آنے دُوں گی۔''

''تو پھر یہ ڈر خوف کیسا؟'' میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''صرف دو لاشیں دیکھ کر تمہیں بخار چڑھ گیا۔ تم تو ویسے بڑی بہادر لڑکی ہو۔ تم نے کل رات جس طرح رام چند دھوبی کا سر کچلا تھا اُس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ زیادہ حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ تم جیسی بہادر لڑکی نے اپنے آپ پر اس طرح خوف طاری کر لیا کہ بخار چڑھ گیا۔''

''کل میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی مہابیر جی.....!'' کلپنا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں کچھ دیر کلپنا سے باتیں کرتا رہا پھر باہر آ گیا۔ سیتا وہیں بیٹھی رہی تھی۔

اس وقت شام کا جھٹپٹا تھا۔ مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے کچن میں جھانکا، دُرگا وہاں نہیں تھی۔ میں اُس راہداری میں گھسا جہاں ایک بیڈ رُوم دُرگا کے استعمال میں تھا اور دوسرا خالی پڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دُرگا اپنے کمرے میں ہوگی اور میں اُسے چائے کے لئے کہہ کر باہر لان میں چلا جاؤں گا۔

میں دُرگا والے کمرے کا دروازہ کھول کر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ مگر پہلا قدم اندر رکھتے ہی جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لئے ہوں..... دُرگا باتھ رُوم سے نہا کر نکلی تھی۔ اُس کے بدن پر مختصر سا تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور دروازہ بند کر کے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر لان میں آ کر ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میرے اس طرح بے دھڑک کمرے میں گھس آنے پر دُرگا نے اگرچہ کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن مجھے اپنی اس حرکت پر ندامت ہو رہی تھی۔ مجھے اس طرح بے دھڑک کمرے میں داخل نہیں ہونا چاہئے تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد سیتا کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں..... اُس کے ساتھ کلپنا بھی تھی۔ اس کے پندرہ بیس منٹ بعد دُرگا بھی چائے بنا کر لے آئی۔ اُس نے میکسی قسم کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا اور سر پر تولیہ پگڑی کی طرح بندھا ہوا تھا۔ میری طرف چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''لودروا کیمپ جانے کا کوئی پروگرام تم نے بنایا یا نہیں؟'' میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے سیتا کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس حساس موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کلپنا کی موجودگی کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے کمرے میں اُس سے جو باتیں ہوئی تھیں اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر وہ میری اور سیتا کی اصلیت سے واقف ہو بھی گئی تو اس راز کو سینے میں ہی چھپائے رکھے گی۔

''میں سمجھتی ہوں اب ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''لودروا والے مندر کی دیکھ بھال جین دھرمی کمیٹی کے ذمے ہے اور یہ کمیٹی چند پنڈتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں دو پنڈتوں کا تعلق جیسلمیر ہی سے ہے۔ وہ دونوں جیسلمیر کے جین مندر میں ہوتے ہیں۔ ان سے کسی طرح یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ لودروا والے مندر تک کس طرح رسائی ہو سکتی ہے۔''

''کیا وہ تمہیں آسانی سے بتا دیں گے.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''نہیں..... اس کے لئے ہمیں کوئی حکمت عملی اختیار کرنی پڑے گی۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''اور مجھے یقین ہے کہ میں اُن سے بہت کچھ اُگلوا لوں گی۔''

''اور یہ جین مندر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''زیادہ دُور نہیں ہے.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''ہم کل دن میں وہاں جا کر اُن دونوں پنڈتوں میں سے کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔''

''تم..... میرا مطلب ہے کہ تم جاؤ گی؟'' میں نے کہا۔

''چھپ کر بیٹھے رہنے سے تو کام نہیں چلے گا۔ باہر نکلنا ہی ہوگا۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر وہ بتانے لگی کہ جین مندر جانے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔''

''لیکن اگر کسی نے تمہیں پہچان لیا تو.....؟''

''میں اپنے چہرے پر ایسی تبدیلی لانے کی کوشش کروں گی کہ میرا کوئی جاننے والا بھی مجھے سیتا کی حیثیت سے شناخت نہ کر سکے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اُس سے تفصیل جاننے کی کوشش نہیں کی۔

اگلے روز دُرگا نے مجھے جلدی جگا دیا۔ سیتا گزشتہ رات میرے کمرے میں نہیں سوئی تھی۔ میں اُٹھ کر باتھ رُوم میں گھس گیا اور تقریباً پون گھنٹے میں تیار ہو کر جب میں کمرے سے نکل کر راہداری میں آیا تو دُرگا کے ساتھ ایک عورت کو کھڑے دیکھ کر چونک گیا..... وہ کوئی پجارن تھی۔ اُس نے پھولدار کپڑے کی چولی اور گھاگھرا پہن رکھا تھا۔ لیکن اُس نے اُوپر سیندوری رنگ کی ایک چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ جسم کا کچھ حصہ آگے اور کچھ پیچھے سے اس چادر میں چھپ گیا تھا۔ سر کے عین وسط میں بالوں کا جوڑا تھا، کانوں میں بُندے اور دونوں کلائیوں میں سونے کے کڑے تھے۔ اُس کی آنکھیں گہری نیلی اور پیشانی پر کشکا بنا ہوا تھا۔

وہ سیتا تھی..... اُس کے گال کسی قدر پھولے پھولے سے تھے۔ اُس کے ان پھولے ہوئے گالوں اور گہری نیلی آنکھوں کی وجہ سے پہلی نظر میں تو میں بھی اُسے نہیں پہچان سکا تھا۔

سیتا میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

''بہت خوب.....'' میں نے کہا۔ ''پہلی نظر میں تو میں بھی تمہیں نہیں پہچان سکا تھا۔''

''سچ بتانا.....'' سیتا نے کہا۔ ''کیا ایسی حسین گوپی دیکھ کر کوئی پنڈت یا پجاری اپنی زبان پر قابو رکھ سکتا ہے؟''

''میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''چلو..... تم لوگ ناشتہ کر لو!'' دُرگا نے کہا۔ ''زیادہ دیر ہو گئی تو مندر میں یاتریوں کی بھیڑ لگ جائے گی اور تم لوگ کسی پنڈت سے اطمینان سے بات نہیں کر پاؤ گے۔''

ہم میز پر بیٹھ گئے اور دُرگا نے ہمارے سامنے ناشتہ لگا دیا۔ ناشتے کے بعد دس بجے کے قریب دُرگا نے ہمیں حویلی کے خفیہ راستے سے پچھلی گلی میں نکال دیا۔

ہم گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ بازار میں رونق تھی۔ میں نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ٹی شرٹ پینٹ سے باہر تھی، پیروں میں ہوائی چپل تھی۔ ہمیں چونکہ مندر کے اندر جانا تھا اس لئے میں نے جوگرز نہیں پہنے تھے اور سیتا نے بھی سینڈل ہی پہن رکھے تھے۔

میرا اور اُس کا ساتھ عجیب سا تھا لیکن میرے خیال میں یہاں کوئی بھی بات عجیب نہیں تھی۔ اور بقول شخصے یہاں سب چلتا تھا۔ سامنے سے آنے والے لوگ سیتا کو دیکھ کر پرنام کے لئے دونوں ہاتھ اُٹھا دیتے اور بعض لوگ اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر رہ جاتے۔

تھوڑی دُور چلنے کے بعد ہمیں ایک آٹو رکشہ مل گیا جس نے دس منٹ میں ہمیں جین مندر پہنچا دیا۔ شہر میں اگرچہ اور بھی جین مندر تھے لیکن سب سے بڑا مندر یہی تھا جہاں ہم آئے تھے۔ اور سیتا کے خیال میں پنڈت بھولے ناتھ سے اس مندر میں ملاقات ہو سکتی تھی یا یہاں سے اُس کا پتہ معلوم ہو سکتا تھا۔

رکشہ چھوڑ کر ہمیں تنگ سی گلیوں میں کچھ دُور تک پیدل چلنا پڑا تھا۔ مندر کے سامنے والی گلی کسی قدر کشادہ تھی اور یہاں سے وہاں تک لاتعداد دُکانیں تھیں جن میں ہار، پھول، ناریل، مٹھائیاں، مورتیاں اور ایسی ہی لاتعداد چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ یاتری انہی دُکانوں سے یہ چیزیں خرید کر مندر میں چڑھاوا چڑھاتے تھے۔ دُکانوں کے علاوہ گلی میں لاتعداد ٹھیلے بھی تھے جن پر یہی سب کچھ لدا ہوا تھا۔

مندر کا چبوترہ بہت اُونچا تھا۔ اُس کے عالیشان گیٹ تک پہنچنے کے لئے سنگ مرمر کی تیرہ کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے دونوں طرف اُوپر سے نیچے تک لاتعداد بھکاری بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں کچھ تو واقعی ایسے تھے جو معذور تھے اور کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن بہت سے ہٹے کٹے بھی تھے جنہیں اس مندر سے مفت میں کھانے کو مل جاتا تھا اور یہی لوگ ایسی جگہوں

پر جیب تراشی کی وارداتیں بھی کرتے تھے۔

سیڑھیوں کے اختتام پر سنگ مرمر ہی کا بہت کشادہ چبوترہ تھا۔ اُس سے آگے مندر کا گیٹ تھا جس کے دونوں طرف بہت بڑے اور بہت اُونچے ستون تھے۔ ان ستونوں پر نقش کاری کا بڑا خوبصورت کام تھا۔ چبوترے پر بھی اور مندر کے اندر بھی یاتریوں کی بھیڑ تھی۔ گیٹ کے دونوں طرف جوتے رکھنے کی جگہ تھی۔ جوتوں کی نگرانی کے لئے دونوں طرف ایک ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے سینڈل اُتار کر ایک طرف رکھ دیئے اور اندر داخل ہو گئے۔ یاتری سیتا کو ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر پرنام کر رہے تھے اور میں حیرت زدہ سی نظروں سے مندر کو دیکھ رہا تھا۔ اُس روز دُرگا کے ساتھ میں نے جتنی تاریخی عمارتیں دیکھی تھیں وہ فن تعمیر کا شاہکار تھیں۔ اُن میں پتھروں پر نقش کاری کا کام دیکھ کر میں عش عش کر اُٹھا تھا۔ مگر وہ عمارتیں اب اس مندر کے سامنے مجھے ہیچ لگ رہی تھیں۔

بہت وسیع و عریض ہال تھا۔ چھت بہت اُونچی تھی اور لاتعداد سنگ مرمر کے بڑے بڑے ستون تھے۔ ہر ستون کا پھیلاؤ اتنا بڑا تھا کہ مجھ جیسے تین تین آدمی بھی ہاتھ سے ہاتھ ملا کر اُسے بانہوں کے گھیرے میں نہیں لے سکتے تھے۔ سنگ مرمر کے ان ستونوں پر نقش کاری کا اتنا باریک اور حسین کام تھا کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ انہی پتھروں پر جگہ جگہ مورتیاں بھی تراشی ہوئی تھیں۔ فرش سے لے کر چھت تک کہیں ایک انچ بھی ایسی جگہ نظر نہیں آتی تھی جو خالی ہو۔ اُوپر چاروں طرف کشادہ بالکونیاں تھیں۔

اُس مرکزی ہال میں عین سامنے سنگ مرمر ہی کے چبوترے پر ایک بہت بڑی مورتی تھی۔ یہ مورتی بھی سنگ مرمر کے بہت بڑے پتھر کو تراش کر بنائی گئی تھی۔ میں حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سیتا مجھ سے چند گز آگے نکل گئی تھی۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔

یاتریوں کا بہت رش تھا۔ لوگ اس جین مندر کی یاترا کے لئے بہت دُور دُور سے آتے تھے۔

سیتا ایک پجاری کے قریب رُک گئی۔ وہ پجاری شکل ہی سے کچھ بدمعاش قسم کا لگتا تھا۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم، گنجا سر اور سرخ آنکھیں۔ گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی کئی مالائیں تھیں۔ وہ بڑی گہری نظروں سے سیتا کو دیکھ رہا تھا۔

''پنڈت بھولا ناتھ جی کے درشن کہاں ہوں گے مہاراج؟'' سیتا نے دونوں ہاتھوں سے پرنام کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں پہلی بار آئی ہو؟'' پجاری نے اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کر ڈالا۔

''جی مہاراج!'' سیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''بہت دُور سے مندر یاترا کو آئی ہوں۔ پنڈت بھولا ناتھ جی کے درشن بھی کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہمیں ہی بھولا ناتھ کیوں نہیں سمجھ لیتیں؟ اس طرف چلو تو ہم تمہیں اپنے درشن کرا دیں۔''

پجاری نے آنکھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

میرا خون کھول اُٹھا۔ کمبخت مندر جیسی پوتر جگہ پر کھڑا تھا اور اُس کے من میں کھوٹ بھرا ہوا تھا۔ میرا دل تو چاہا تھا کہ اُس کی گردن مروڑ دُوں مگر میں کوئی نیا ہنگامہ کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''مہاراج.....'' سیتا نے ناگوار سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔

میں نے اُس پجاری کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر بڑا وحشیانہ پن سا تھا۔ اُس نے سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں کندھے اُچکاتا ہوا سیتا کے پیچھے چل پڑا۔

پنڈت بھولا ناتھ کو تلاش کرنے میں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اُس کی تلاش میں ہم نے مندر کے بہت سے حصے گھوم لئے تھے اور مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ مندر کا مرکزی ہال بہت بڑا تھا جہاں ایک چبوترے پر بھگوان کی مورتی بھی نصب تھی۔ کسی اور جگہ پر اس قسم کی مورتی نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن عمارت میں لا تعداد راہداریاں اور غلام گردشیں تھیں۔ کئی بڑے بڑے کمرے تھے۔ دو تین کمروں میں، میں نے بعض پنڈتوں اور پجاریوں کو جاپ میں مصروف دیکھا تھا۔

ایک پجاری ہمیں اُس کمرے میں لے گیا جہاں پنڈت بھولا ناتھ موجود تھا۔ وہ اس مندر کا پروہت تھا اور اُس کی شان ہی نرالی تھی۔ وہ اس وقت راجہ اندر بنا بیٹھا تھا..... پنڈت بھولا ناتھ کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ بھاری بھرکم جسم اور قد مناسب ہی تھا۔ گنجا سر، ماتھے پر کشکا، کانوں میں سونے کی بالیاں اور ایک کلائی میں سٹیل کے تین چار کڑے تھے۔ گلے میں آبنوسی لکڑی کے موتیوں کی مالا تھی۔ پنڈت کی اپنی رنگت بھی آبنوسی ہی تھی۔ وہ کلین شیو تھا اور لگتا تھا جیسے کچھ دیر پہلے ہی شیو بنا کر آیا ہو۔

پنڈت بھولا ناتھ کے چہرے پر اُس پجاری کی طرح وحشیانہ پن نہیں تھا جو ہمیں راستے میں ملا تھا۔ وہ ایک گدی پر براجمان تھا اور ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر ایک ٹانگ آگے کو پھیلا رکھی تھی۔ دوسرا گھٹنا کھڑا تھا۔ اُس کے اِردگرد حسین گوپیوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ اُن میں دو عورتیں ایسی بھی تھیں جن کا تعلق مندر سے نہیں تھا۔ اُن میں سے ایک نے قیمتی ساڑھی پہن رکھی تھی اور وہ پنڈت کی ٹانگ دبا رہی تھی۔ دوسری عورت دوسری ٹانگ دبا رہی تھی۔ اُس نے چولی اور گھاگھرا پہن رکھا تھا۔ وہ دونوں اس طرح بیٹھی ہوئی تھیں کہ فراخ گریباں سے اُن کے سینے جھانک رہے تھے۔ ایک گوپی پنڈت بھولا ناتھ کے سر پر بہت ہولے ہولے چمپی کر رہی تھی۔ ایک اور گوپی کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا۔ وہ وقفے وقفے سے گلاس پنڈت کے ہونٹوں سے لگا دیتی۔ پنڈت ایک چسکی لیتا اور وہ گلاس ہٹا لیتی۔

مندروں کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا اور آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ مندر واقعی عیاشی کے اڈے تھے۔ دنیا کی کوئی بھی قوم اپنی عبادت گاہوں کے تقدس کو اس طرح پامال نہیں کرتی۔ مسلمان، عیسائی، سکھ، یہودی اور ہر قوم اپنی عبادت گاہوں کے تقدس کا

خیال رکھتی ہے۔ اور ہندو اپنی عبادت گاہوں کو عیاشی کے اڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہاں شراب بھی پی جاتی ہے اور عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں بھی منائی جاتی ہیں۔ گو یہاں مندر کی سیوک کہلاتی ہیں لیکن یہ دراصل پنڈتوں اور پجاریوں کی سیوا کرتی ہیں۔ اُن کی ہوس کی آگ ٹھنڈی کرتی ہیں۔

اُس کمرے میں دو پجاری بھی تھے۔ ایک دروازے کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا اونگھ رہا تھا لیکن میرے خیال میں وہ آنکھوں میں باریک سی جھری پیدا کئے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دوسرا پجاری کمرے کے دوسری طرف دیوار کے قریب آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھی بند تھیں لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ آنکھیں بند کئے بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

میں ایک طرف کھڑا ہو گیا اور سیتا نے جھک کر پنڈت بھولا ناتھ کے چرن چھوئے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

''میں آپ کے درشن کو بہت دُور سے آئی ہوں مہاراج!'' وہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے آپ کا آشیرباد چاہئے۔''

''کیا چاہتی ہو.....؟'' پنڈت بھولا ناتھ نے پوچھا۔ اُس کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔

''میں مندر یاترا پر نکلی ہوں مہاراج!'' سیتا نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنا جیون مندروں اور آپ جیسے مہاپرشوں کے لئے وقف کر دیا ہے مہاراج۔''

''یہ مورکھ کون ہے؟'' پنڈت بھولا ناتھ نے میری طرف اشارہ کیا۔

''یہ میرا پتی ہے مہاراج!'' سیتا نے جواب دیا۔ ''مہابیر نام ہے ان کا۔''

''تو دھرم سے واقف نہیں ہے۔'' پنڈت نے کہا۔ ''تو نہیں جانتی کہ مندر سیوا وہی کر سکتی ہے جو کنواری ہو۔ کوئی شادی شدہ ناری گوپی نہیں بن سکتی۔''

''میں کنواری ہوں مہاراج!'' سیتا نے کہا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو.....؟'' پنڈت نے اُسے گھورا۔ ''وہ تمہارا پتی ہے اور تم کنواری کیسے ہو سکتی ہو؟''

''مہاراج.....'' سیتا نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''مجھے بچپن ہی سے دھرم، مندر اور آپ جیسے مہاپرشوں کی سیوا کا شوق تھا۔ میری شادی ہوئی تو میں نے سہاگ رات ہی کو اپنے پتی سے اپنے من کی بات کہہ دی تھی۔ میرے پتی نے مجھے چھوا تک نہیں۔ پتی کے ہوتے ہوئے بھی میں کنواری ہوں مہاراج!''

''کیا چاہتی ہو؟'' پنڈت بھولا ناتھ نے پوچھا۔

''میں مندروں کی یاترا کے لئے نکلی ہوئی ہوں مہاراج!'' سیتا نے جواب دیا۔ ''سنا ہے یہاں سے کچھ دُور لودروا میں بھی ایک بہت قدیم مندر ہے۔ لیکن مجھے بتایا گیا کہ اُس طرف یاتریوں کو جانے کی اجازت نہیں۔ میں اُس مندر کی یاترا کے لئے آپ کی آگیا لینے آئی ہوں

مہاراج!''

پنڈت بھولا ناتھ لودرو امندر کے نام پر چونک گیا۔ اُس نے پہلے میری طرف دیکھا، پھر سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ سیتا اس دوران اپنا حربہ استعمال کر چکی تھی۔ وہ دوزانو ہو کر کسی قدر آگے کو جھکی بیٹھی تھی۔ اُس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے اُوپر سے چادر ہٹا دی اور وہ منظر دیکھ کر میں اُچھل پڑا..... سیتا نے جو چولی پہن رکھی تھی اُس کے سامنے کے رُخ پر کپڑا نہیں تھا جالی تھی۔ اور جالی سے اُس کا سینہ پوری طرح برہنہ ہو رہا تھا۔

سیتا نے چند سیکنڈ کے توقف سے چادر اپنے جسم پر درست کر لی۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے یہ سب کچھ اتفاقیہ طور پر ہوا ہو مگر یہ اتفاق اپنا کام کر گزرا تھا۔

''مجھے نراش مت کیجئے مہاراج!'' وہ پنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں بہت دُور دیش سے آئی ہوں۔ لودرو امندر کی یاترا ضرور کروں گی۔''

''لودرو امندر کی یاترا پر ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔'' پنڈت بھولا ناتھ نے کہا۔ ''یہ پابندی تو سرکار نے لگا رکھی ہے۔''

''مجھے نراش مت کیجئے مہاراج.....'' سیتا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے چادر ایک بار پھر سرکا دی اور جھلک دکھا کر چادر درست کر لی۔

''کوئی وچار کرنا پڑے گا۔'' پنڈت بھولا ناتھ بولا۔ پھر دروازے کے قریب کھڑے ہوئے پجاری کو مخاطب کیا۔ ''موتن داس..... اس ناری کو ہمارے پوجا والے استھان پر لے جاؤ!''

سیتا کھل اُٹھی۔ وہ پنڈت کے سامنے سے اُٹھ کر میری طرف آ گئی اور وہ پجاری ہمیں لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

ہم وہاں سے تیسرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک طرف چبوترے پر بھگوان کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اُس کے آگے تازہ پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لوبان کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیتا مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور میں اُس پجاری موتن داس کے ساتھ دروازے کے قریب ہی کھڑا رہا۔

تقریباً دس منٹ بعد سامنے کی دیوار شق ہوئی اور اُس میں پیدا ہونے والے خلا سے پنڈت بھولا ناتھ کو برآمد ہوتے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس مندر کا یہ پہلا خفیہ راستہ تھا جو میری نظروں میں آیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہاں اور بھی ایسے بہت سے خفیہ راستے ہوں گے۔

پنڈت بھولا ناتھ نے مورتی کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑے اور گردن گھما کر میرے قریب کھڑے ہوئے موتن داس کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں نے اُس کا اشارہ دیکھ لیا تھا لیکن انجان بنا کھڑا رہا۔ موتن داس نے کچھ کہے بغیر میرا بازو پکڑ لیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

موتن داس دروازے کے سامنے کھڑا رہا اور میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر مندر کے ستونوں اور

دیواروں پر کاشی کاری کا کام دیکھتا رہا۔ مندر میں یاتریوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔

پنڈت بھولا ناتھ نے جس طرح سیتا کو الگ کمرے میں پہنچایا تھا اس سے میں اُس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ لیکن مجھے سیتا کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ پوری تیاری کر کے آئی تھی۔ اُس کے ساتھ زبردستی بھی نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ دو آدمیوں کے قابو میں آنے والی نہیں تھی۔ اور پنڈت بھولا ناتھ تو اکیلا تھا۔

لیکن میرے ذہن میں یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر سیتا کو وہاں سے کسی اور کمرے میں لے جایا گیا جہاں اُس کے اور گرگے بھی ہوئے تو سیتا کیا کر سکے گی اور میں اُس کی کیا مدد کر سکوں گا..... لیکن بہرحال سیتا اپنی حفاظت کرنا جانتی تھی۔ مجھے اُس کی طرف سے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں مندر میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ میں اس وقت ایک ستون کے سامنے کھڑا کاشی کاری کے کام اور اُس پتھر پر تراشی ہوئی ایک مورتی دیکھ رہا تھا کہ اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے چونک گیا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ سیتا تھی..... اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

''چلو..... اب چلیں۔'' اُس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم دونوں مندر سے باہر آ گئے۔ سیڑھیاں اُتر کر بائیں طرف والی گلی میں مُڑے ہی تھے کہ اُس پجاری نے ہمارا راستہ روک لیا جس سے شروع میں ملاقات ہوئی تھی.....

''دیوی جی.....!'' وہ سیتا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔ ''ہمارے بھی درشن کر لیتی تو اچھا تھا..... تمہاری تمام آشائیں پوری ہو جاتیں۔''

سیتا نے بلا توقف اُس کے منہ پر چانٹا رسید کر دیا..... چانٹا اس قدر زوردار تھا کہ اُس کی آواز بھی اُبھری تھی اور وہ پجاری بھی لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔ آس پاس کے لوگ گھوم کر اُس طرف دیکھنے لگے۔ پجاری گال سہلاتا ہوا سیتا کی طرف بڑھا..... اُس کی آنکھیں تو پہلے ہی سرخ تھیں۔ چانٹا کھا کر خون اُتر آیا۔ میں تیزی سے اُس کے سامنے آ گیا۔

''مہاشے.....!'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری کوئی اور آشا ہو تو میں پوری کر دُوں؟'' سیتا اُس پجاری کو بے نقط سنا رہی تھی۔ دو تین آدمی آگے آ گئے۔ اُنہوں نے صورتحال کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ پجاری کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے ایک طرف لے گئے۔

ہم گلیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔

''اب کیا پروگرام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب گھر ہی چلیں گے..... اس طرح پھرنا ٹھیک نہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ میں نے سیتا

کی طرف دیکھا کچھ بال اُس کے جوڑے سے نکل کر بکھر گئے تھے۔ چہرے کا میک اَپ بھی کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ بار بار چادر کے اندر سینے پر لے جا رہی تھی۔

میں نے ایک آٹو رکشہ روک لیا۔ یہی سواری ہمارے لئے سب سے زیادہ محفوظ تھی۔ رکشہ تیزی سے سڑکوں پر دوڑتا رہا۔ بازار میں گلی کے موڑ سے پہلے ہم نے رکشہ چھوڑ دیا اور جب گلی میں داخل ہوئے تو تیسرے مکان سے ایک بوڑھا آدمی اور دو عورتیں باہر نکلیں۔ اُن کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ مرد اور عورتوں نے ہاتھ اُٹھا کر سیتا کو پرنام کیا۔

دُرگا کے خدمت گار راجیو کا مکان اُس مکان کے سامنے تھا۔ میں نے اپنے مکان کا رُخ کرنے کی بجائے راجیو والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ دستک کے جواب میں ہمارے والے مکان کا دروازہ کھل گیا۔

''میں یہاں ہوں مہابیر جی!'' راجیو کی آواز سن کر میں نے اُس طرف دیکھا۔ ''مجھے دُرگا دیوی نے بتا دیا تھا کہ آپ لوگ باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں یہاں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔''

ہم مُڑ کر دروازے میں داخل ہو گئے اور اُس کے دو تین منٹ بعد ہم حویلی میں موجود تھے۔ دُرگا سے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد سیتا اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔ میں دراصل سیتا سے پنڈت بھولا ناتھ سے تنہائی میں ملاقات کا حال جاننا چاہتا تھا۔

سیتا نے دروازہ بند کر دیا اور میری طرف گھومتے ہوئے جسم پر اوڑھی ہوئی چادر اُتار کر پھینک دی۔ اور میں اُس کی حالت دیکھ کر اُچھل پڑا..... اُس کی چولی سامنے سے پھٹی ہوئی تھی اور دائیں طرف سینے کے اُبھار پر قریب قریب دو سرخ نشان نظر آ رہے تھے جیسے کسی نے اُس جگہ دانت گاڑھ دیئے ہوں.....

''یہ..... یہ کیا ہوا؟'' میری آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی۔

''میں پنڈت بھولا ناتھ سے آشیر باد لینے گئی تھی۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو آشیر باد دینے کا ان پنڈتوں اور پجاریوں کا یہی طریقہ ہے۔ کمبخت نے بھوکے بھیڑیئے کے طرح دانت گاڑھ دیئے اور چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔''

''پنڈت سے بات کیا ہوئی؟ میرا مطلب ہے.....''

''تم باہر چلو..... میں تھوڑی دیر میں آ کر بتاتی ہوں۔'' سیتا نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میں کمرے سے نکلا تو سیتا نے دروازہ بند کر لیا۔ میں ہال کی طرف جانے کی بجائے کلپنا والے کمرے میں آ گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ میں واپس مُڑنا چاہتا تھا کہ کلپنا کی آواز سن کر رُک گیا۔

''میں جاگ رہی ہوں مہابیر جی.....!''

میں نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ کلپنا کے ہونٹوں پر اگرچہ خفیف سی مسکراہٹ تھی لیکن اُس کا چہرہ ستا ہوا سا لگ رہا تھا۔ میں اُس کے بیڈ کے قریب آ گیا۔ کلپنا نے اُٹھنے کی کوشش کی تو

دوبارہ ڈھیر ہو گئی۔ میں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں چونک گیا..... مجھے یوں لگا جیسے دہکتا ہوا انگارہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا گیا ہو۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اُس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔ پیشانی بھی تپ رہی تھی۔ اُسے تیز بخار تھا۔

''ارے..... تمہیں تو تیز بخار ہو رہا ہے۔ لیٹ جاؤ..... میں دُرگا کو بلا کر لاتا ہوں تاکہ تمہارے دوادارو کا کوئی بندوبست کیا جائے۔'' میں نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر دوبارہ لٹا دیا۔

کلپنا نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں بھی سرخی بھری ہوئی تھی۔ میں جب وہاں سے ہٹنے لگا تو کلپنا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''میرے پاس بیٹھ جاؤ مہابیر جی! تھوڑی دیر کو.....''

اُس کے لہجے میں نجانے کیا بات تھی کہ میں انکار نہیں کر سکا اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں ہولے ہولے اُس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ اور پھر میں نے آہستگی سے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کلپنا نے آنکھیں کھول دیں۔

''بخار بہت تیز ہو رہا ہے.....'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''آرام سے لیٹی رہو..... میں دُرگا سے بات کرتا ہوں۔ شاید ڈاکٹر کو بلانا پڑے۔''

کلپنا میری طرف دیکھتی رہی اور میں اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ دُرگا مجھے ہال ہی میں مل گئی۔ میں نے اُسے کلپنا کے بارے میں بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔

''ایک گھنٹہ پہلے تو وہ بالکل ٹھیک تھی..... یہاں میرے ساتھ بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔'' دُرگا نے کہا۔ وہ میرے ساتھ کلپنا والے کمرے میں آ گئی۔ اُسے دیکھ کر دُرگا مزید پریشان ہو گئی۔ میں کلپنا کے قریب بیڈ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر کرب کے تاثرات بھی نمودار ہو رہے تھے۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔

''یہاں..... یہاں پیڑ ہو رہی ہے.....''

میں نے دُرگا کی طرف دیکھا اور پھر کلپنا کے سینے پر ہاتھ سے ہلکا ہلکا دباؤ ڈالنے لگا۔

''یہاں درد ہو رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں.....'' کلپنا نے اپنا ہاتھ بھی میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

میں کچھ دیر تک اُس کے سینے اور پسلیوں کو ٹٹولتا رہا، پھر دُرگا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یا تو ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑے گا یا ڈاکٹر کو یہاں بلانا ہوگا۔''

دُرگا بھی سمجھ گئی تھی کہ بخار اور پسلیوں میں درد کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی تشویش بڑھ گئی۔

''میرا خیال ہے ڈاکٹر کو یہیں بلانا ہوگا..... مگر یہاں نہیں۔ دوسرے گھر میں۔'' دُرگا نے کہا۔ ''تم اسے لے کر آؤ..... میں راجیو کو بھیجتی ہوں ڈاکٹر کو بلانے کے لئے۔''

دُرگا باہر چلی گئی۔ میں نے کلپنا کی طرف دیکھا اور اُسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ اُس کا جسم

ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور میرے خیال میں وہ اپنے پیروں پر نہیں چل سکتی تھی۔ میں نے جھک کر اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ کلپنا کے چہرے کی سرخی کچھ اور گہری ہو گئی۔ اور جب میں کلپنا کو گود میں اُٹھائے کمرے سے نکل رہا تھا تو ٹھیک اُسی وقت سیتا والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سیتا کلپنا کو میری آغوش میں دیکھ کر چونک گئی۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی آنکھیں سلگ اُٹھیں.....

''یہ..... یہ کیا حرکت ہے مہابیر.....؟'' اُس کی آواز میں تلخی تھی۔

''کلپنا کو تیز بخار ہے..... اور سینے میں درد ہو رہا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ نمونیہ نہ ہو گیا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''دُرگا دوسرے مکان میں گئی ہے۔ چلو..... تم بھی آگے چلو!''

سیتا اپنا غصہ بھول گئی۔ اُس نے آگے بڑھ کر ہاتھ کی پشت سے کلپنا کی پیشانی کو چھوا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں کلپنا کو اُٹھائے اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ دوسرے مکان میں کلپنا کو بستر پر لٹا دیا۔ دُرگا جھک کر پیار سے کلپنا کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''راجیو گیا ہے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''ٹھیک ہو جاؤ گی۔ گھبراؤ نہیں۔''

''یہاں..... یہاں بہت پیڑ ہو رہی ہے۔'' کلپنا ایک ہاتھ سے سینہ دباتے ہوئے کراہنے لگی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

''سردی لگ رہی ہے؟'' دُرگا نے پوچھا تو کلپنا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دُرگا دوسرے کمرے سے کمبل لے آئی۔ اُس نے کلپنا کو کمبل اوڑھا دیا اور سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم اس کے پاس بیٹھو! میں بوتل میں پانی گرم کر کے لاتی ہوں۔ ڈاکٹر آتا ہی ہو گا۔ اور اس مکان میں میرا ڈاکٹر کے سامنے آنا درست نہیں ہے۔'' دُرگا حویلی میں چلی گئی۔ سیتا، کلپنا کے پاس پلنگ کی پٹی پر ٹک گئی اور میں بھی ایک کرسی گھسیٹ کر قریب ہی بیٹھ گیا۔

کلپنا سینے کے درد سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بار بار اپنی ماں کو یاد کر رہی تھی۔ سیتا پلنگ پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور اُسے اپنی گود میں سمیٹ لیا۔

''پریشان کیوں ہو رہی ہو..... ہم ہیں نا۔'' وہ اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد راجیو ڈاکٹر کو لے کر آ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر ڈاکٹر مسلمان تھا۔ سیتا نے کلپنا کو لٹا دیا اور خود بھی بیڈ سے اُتر آئی۔ پندرہ منٹ کے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ نمونیہ ہی تھا..... اُس وقت ڈاکٹر کے بتانے پر کلپنا نے یہ انکشاف کیا کہ اُس نے ٹھنڈے پانی سے نہالیہ تھا۔ ہلکا سا بخار تو اُسے دو تین دن سے ہو رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی میں نہانے سے نمونیہ کا حملہ ہو گیا تھا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں.....'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''انجکشن میں نے لگا دیا ہے۔ اور یہ دوائیں بھی باقاعدگی سے استعمال کرائیے۔'' اُس نے نسخہ لکھ کر سیتا کے حوالے کر دیا۔ ''کہیں سے اچھا شہد مل جائے تو استعمال کرائیے۔ خدانخواستہ رات کو بھی کسی وقت تکلیف ہو تو مجھے بلا سکتے ہیں۔ اس کاغذ پر میرے کلینک اور گھر کا فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے..... لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی

ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''خالص شہد کستوری لال پنساری کی دُکان پر مل جائے گا..... میں ابھی لے کر آتا ہوں۔'' راجیو نے کہا۔

''تم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہی چلے جاؤ اور یہ دوائیں بھی لیتے آنا۔'' میں نے سیتا کے ہاتھ میں پکڑا ہوا نسخہ اور جیب سے چند نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ڈاکٹر کو اُس کی فیس بھی ادا کر دی اور اُس کا شکریہ ادا کر کے اُسے رخصت کرنے کے لئے دروازے تک اُس کے ساتھ آیا۔ میرے منہ سے بے اختیار ''اللہ حافظ'' کے الفاظ نکلے تو اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

سیتا ایک بار پھر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ کلپنا اب بھی ایک ہاتھ سے سینہ دبا رہی تھی۔ اس دوران دُرگا بھی آ گئی۔ وہ ربڑ کی بوتل گرم پانی سے بھر کر لے آئی تھی۔ وہ بھی پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اور بوتل کمبل کے اندر اُس کے سینے پر رکھ دی۔

دس پندرہ منٹ بعد کلپنا کے چہرے پر کرب کے تاثرات کم ہونے لگے۔ اُس کی تکلیف کم ہو رہی تھی اور وہ بتدریج پُرسکون ہوتی چلی گئی۔ راجیو بھی شہد اور دوائیں لے کر آ گیا۔ کلپنا کو دوائیں دینے کے علاوہ شہد کا ایک چمچہ بھی چٹا دیا گیا۔ اُن دواؤں میں شاید کوئی نیند کی گولی بھی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد کلپنا سو گئی۔ سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ اُس کی سانس کی رفتار خاصی تیز تھی۔

میں بھی ایک مرتبہ نمونیے کا شکار ہو چکا تھا اور میرا خیال تھا کہ کلپنا اب کم از کم ایک ہفتے تک بستر سے نہیں اُٹھ سکے گی۔

ہم نے اپنا ڈیرہ بھی وہیں جما لیا تھا۔ رات دو بجے کے قریب کلپنا پھر بے چین ہونے لگی۔ میں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ اُس کا گھر شاید زیادہ دُور نہیں تھا۔ اُسے پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اُس نے کلپنا کو دیکھا اور انجکشن دیا اور اُسے دیکھنے کے لئے تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا رہا اور پھر مطمئن ہو کر رخصت ہو گیا۔ وہ کہہ گیا تھا کہ صبح کلینک پر جانے سے پہلے اسے دیکھتا جائے گا۔

کچھ دیر بے چین رہنے کے بعد کلپنا سو گئی۔ ہم کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھے رہے اور پھر دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ بیچ کا دروازہ کھول دیا گیا تھا تاکہ کلپنا کو بھی دیکھتے رہیں۔ دُرگا بھی ہمارے پاس ہی رہی۔ راجیو البتہ اپنے گھر چلا گیا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو اُسے بلا لیا جائے گا۔ لیکن رات کو اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

صبح پانچ بجے کے قریب دُرگا حویلی میں چلی گئی۔ رات بھر جاگنے سے سیتا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رات کو میں نے کئی مرتبہ اُسے اپنا سینہ سہلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ دُرگا نے بھی یہ بات نوٹ کی تھی، اُس نے سیتا سے کچھ پوچھا بھی تھا مگر سیتا نے اُسے ٹال دیا تھا۔ رات کو مجھے سیتا سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اور اب دُرگا کے جانے کے بعد میں نے سب سے پہلا

سوال یہی کیا۔

''پنڈت بھولا ناتھ سے کیا معلوم ہوا؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یا اُس نے تمہیں ٹھینگا دکھا دیا؟''

''ٹھینگا تو میں نے اُسے دکھایا تھا۔'' سیتا مسکراتے ہوئے اُٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے میکسی پہن رکھی تھی۔ دونوں گھٹنے اُٹھائے تو میکسی پنڈلیوں سے اُوپر تک سرک گئی۔ ''یہ پنڈت اور پجاری شراب اور عورت کے لئے تو اپنے بھگوان کو بھی بیچ ڈالتے ہیں اور میں تو اُس سے چند باتیں ہی معلوم کرنا چاہتی تھی۔

''کیا بتایا اُس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ سرکار نے لودروا مندر کی یاترا پر پابندی لگا رکھی ہے۔ کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں اور یہ بات ہم پہلے سے جانتے ہیں۔'' سیتا نے کہا۔ ''دوسری بات یہ کہ مندر کی دیکھ بھال کے لئے دو پجاریوں کی ڈیوٹی لگانی ہوتی ہے۔ اور ہر پندرہ دن بعد پجاری بدل جاتے ہیں۔ اس مندر پر ڈیوٹی دینے والے پجاری اپنا دو ہفتوں کا کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر جاتے ہیں کیونکہ یہاں سے اُن کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھا جاتا۔ بس یہ ہوتا ہے کہ نئے دو پجاری مندر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں پہلے سے ڈیوٹی دینے والے واپس آ جاتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ وہ لوگ ایک دوسرے کو جانتے بھی ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم بھی چند روز کے لئے اُس مندر کی دیکھ بھال کی سیوا کر سکتے ہیں۔'' میں نے اُس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''میں بھی یہی کہنا چاہتی تھی۔'' سیتا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اور پجاریوں کی یہ ڈیوٹی کب تبدیل ہو گی..... میرا مطلب ہے کس دن؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اگلے سنیچر کو۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''آج منگل ہے.....'' میں نے کہا۔ ''آج کا دن ملا کر پانچ دن۔ ٹھیک ہے..... اُس وقت تک کلپنا بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ سنیچر کے دن صبح ہی جانا ہو گا؟''

''نہیں..... شام کو۔'' سیتا نے کہا۔ ''شام کو سورج غروب ہونے کے بعد ہی نئے پجاری وہاں پہنچتے ہیں اور پہلے والے واپس آ جاتے ہیں۔ اور ہمیں دس گیارہ میل کا یہ فاصلہ پیدل ہی طے کرنا ہو گا۔''

''میں تو پہاڑوں میں میلوں سفر کرنے کا عادی ہوں۔ تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تم یہ فاصلہ طے کر سکو گی یا نہیں؟'' میں نے کہا۔

''جب ہم ڈوڈا میں ماما کے گاؤں سے بھاگے تھے تو میں نے وہ کٹھن سفر تمہارے کندھوں پر بیٹھ کر تو نہیں کیا تھا۔'' سیتا نے کہا۔

''کچھ فاصلہ تو واقعی ایسے ہی طے ہوا تھا جیسا تم کہہ رہی ہو۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اب تمہیں یہ کشٹ نہیں اُٹھانا پڑے گا۔'' سیتا نے کہا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ راجیو آ گیا۔ اُس نے صورتحال کا جائزہ لیا۔ کلپنا کے بارے میں پوچھا اور پھر ہمارے لئے چائے بنانے کے لئے کچن میں گھس گیا۔

تین چار روز تک کلپنا کی حالت خاصی ابتر رہی اور پھر وہ آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی۔ اس بیماری نے اُسے نچوڑ کر رکھ دیا اور وہ سوکھ کر بالکل کانٹا ہو گئی تھی۔

اُسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے کے لئے کئی روز درکار تھے اور ظاہر ہے ہم اتنا لمبا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ہفتے کا دن تھا..... سیتا اور میں نے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ہمارے پاس اتنا راشن تھا کہ ہم پندرہ دن آرام سے کھا سکتے تھے۔ ویسے ہمیں اتنے روز اُس مندر میں رہنا نہیں تھا۔

سہ پہر کے قریب ہم شہر سے نکل کر لودروا کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑے۔ شہر سے تین چار میل نکلنے کے بعد ہم ریت کے ایک ٹیلے کے قریب رُک گئے۔ ریت تپی ہوئی تھی۔ شدید گرمی تھی۔ ہم پسینے میں تر ہو رہے تھے لیکن ہمیں یہ گرمی برداشت کرنی تھی۔ اور اس کے بعد رات کو ہونے والی سردی بھی۔

سورج غروب ہو گیا..... اندھیرا پھیلنے لگا۔ موسم میں بھی بتدریج خنکی پیدا ہو رہی تھی۔

اور پھر ہمیں وہ نظر آ گئے جن کا ہمیں انتظار تھا.....

وہ دونوں پجاری شہر سے آنے والے راستے پر باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ تاروں کی مدھم سی روشنی میں اُن کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہے تھے۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم دونوں آنے والے لمحات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے.....!

○○○

آسمان پر چاند نہیں تھا۔ تاروں کی لو میں نظر کسی حد تک کام کر رہی تھی۔ ہم شہر سے دو میل سے زیادہ دُور نہیں تھے لیکن ریت کے پہاڑی نما ٹیلوں کی وجہ سے شہر ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ تاہم ان ٹیلوں کے دوسری طرف اُٹھتی ہوئی مدھم روشنی سے یوں لگ رہا تھا کہ اُس طرف زمین پر آگ لگی ہوئی ہو۔

ہمارے چاروں طرف ریگستان تھا..... ٹیلے تھے۔ ہوا زیادہ تیز نہیں تھی لیکن ریت پر اُس کی سرسراہٹ عجیب پراسرار سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ یہ وہی ریگستان تھا جہاں دن کے وقت گرمی کی شدت سے دماغ تک پگھل جاتا تھا لیکن شام ڈھلتے ہی انگاروں کی طرح تپتی ہوئی ریت ٹھنڈی ہونا شروع ہوگئی تھی اور اس وقت ہوا کے سرسراتے ہوئے جھونکے بہت خوشگوار لگ رہے تھے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ جیسے جیسے رات بیتتی جائے گی سردی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور رات کے آخری پہر تو سردی بڑھ جائے گی۔

میں ریگستان میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ پہلو میں ہلکی سی ٹھیس لگنے سے میں چونک گیا..... میرے قریب بیٹھی ہوئی سیتا مجھے کہنی سے ٹھوکے دیتی ہوئی شہر کی طرف سے آنے والے راستے کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ میں نے گردن گھما کر اُن کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہیولے قریب آ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے اور اُن کے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ رہا ہوگا جو بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر کچھ دیر بعد آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ ہم دونوں صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے..... میں نے جو پروگرام بنایا تھا وہ اگرچہ کسی حد تک شرمناک تھا مگر سیتا کو شاید اُس کی پرواہ نہیں تھی۔ شہر کے جین مندر میں پنڈ بھولا ناتھ پر بھی یہی حربہ استعمال کر کے وہ لودروا مندر کے بارے میں مفید معلومات حاصل کر چکی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی حسین عورت کو دیکھ کر مرد پھسلنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اور ان پنڈتوں اور پجاریوں کو تو میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ یہ تو عورتوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ سیتا جیسی حسین عورت ہو، رات کا سناٹا ہو تو کون کافر اپنے آپ پر قابو رکھ سکے گا.....؟

وہ لوگ قریب آ گئے۔ سیتا نے مجھے ایک بار پھر کہنی سے ہلکا سا ٹھوکا مارا اور خود ریت پر لیٹ کر ہولے ہولے کراہنے لگی۔ میں بھی اُونچی آواز میں بولنے لگا۔ سیتا کے کراہنے اور میرے اُونچی آواز میں بولنے کا مقصد یہ تھا کہ آنے والے ہماری طرف متوجہ ہو جائیں۔

ہمارا اندازہ غلط نہیں نکلا..... وہ دونوں ٹیلے کے دوسری طرف رُک گئے۔ پہلے آپس میں کچھ باتیں کرتے رہے، پھر اُن میں سے ایک کی اُونچی اور کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اُس آواز میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔

''اِدھر کون ہے..... ٹیلے کے پرلی اور کون ہے؟''

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ اُس کے کراہنے کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔ میں بڑبڑاتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ٹیلے پر چڑھ کر دوسری طرف آ گیا۔ اُن دونوں پجاریوں کو دیکھ کر میں نے ڈنڈوت کیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''آپ دونوں کو بھگوان نے فرشتہ بنا کر ہماری مدد کو بھیج دیا ہے مہاراج!''

''تم کون ہو مہاراج؟'' اُن میں سے لمبے قد والے پجاری نے کہا۔ میرے لباس سے وہ مجھے کوئی پنڈت یا پجاری ہی سمجھا تھا۔ ''تمہارے ساتھ کون ہے؟ مجھے تو کوئی ناری لگتی ہے۔''

''جی ہاں مہاراج!'' میں نے جواب دیا۔ ''کالی ماں کی سیوک ہے..... ہم دونوں شام سے پہلے پتوا سے چلے تھے۔ جیسلمیر کے دُرگا مندر جانے کے لئے۔ اندھیرا ہونے کے بعد راستہ بھٹک گئے۔ سمتری دیوی کے سینے میں پیڑ اُٹھی ہے..... بہت بیاکل ہو رہی ہے۔ اچھا ہوا آپ اس طرف آ گئے۔ ہماری مدد کرو مہاراج!''

''اوہ..... کہاں ہے وہ؟'' اُس پجاری نے پوچھا۔

''اُدھر..... ٹیلے کے پرلی اور پڑی ہے۔'' میں نے اشارہ کیا۔

''چلو دیکھتے ہیں۔'' وہ دونوں میرے ساتھ ٹیلے کے دوسری طرف آ گئے جہاں سیتا ریت پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔

وہ دونوں پجاری اُس کے پاس بیٹھ گئے۔

''کیا ہوا گوپی..... کہاں تکلیف ہے؟'' لمبے قد والے اُس پجاری نے پوچھا۔

''یہاں..... اس جگہ۔'' سیتا اپنا سینہ مسلنے لگی۔ پھر اُس نے پجاری کا ایک ہاتھ پکڑ کر سینے پر رکھ لیا۔ ''یہاں پنڈت جی..... اس جگہ.....'' وہ پجاری کا ہاتھ پکڑے اپنے سینے کے اُبھار پر پھیر رہی تھی۔ ''یہاں..... ذرا اچھی طرح دیکھیں پنڈت جی!'' سیتا کراہی۔

''مہاراج..... آپ دونوں ذرا پرلی اور کو چلے جاؤ! میں گوپی کو اچھی طرح دیکھ لوں..... بہت کشٹ ہے اس کو۔'' پجاری نے کہا۔

''گئی بھینس پانی میں۔'' میں بڑبڑایا اور دوسرے پنڈت کا ہاتھ پکڑ کر ٹیلے کے دوسری طرف آ گیا اور اُسے ساتھ لے کر ریت پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک ٹیلے کی اوٹ سے سیتا کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، پھر ایسے لگا جیسے اُن دونوں میں اٹھا پٹخ ہو رہی ہو..... دونوں کے غرانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

''شاید ناری کو کشٹ زیادہ ہے۔ میرا منتر کوئی منتر کر رہا ہے۔'' میرے ساتھ بیٹھے ہوئے

پجاری نے کہا۔

''سنا ہے کبھی کبھی منتر اُلٹے بھی ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اور اُسی وقت ٹیلے کی اوٹ سے دوسرے پجاری کی چیخ سنائی دی۔

''یہ..... یہ کیا ہوا؟'' میرے پاس بیٹھا ہوا پجاری اُچھل پڑا۔

''منتر اُلٹا ہو گیا مہاراج.....'' میں نے کہا۔ ''اب تمہارا منتر میری منتری کے قابو میں آ گیا ہے۔ وہ اُس کی گردن توڑ دے گی۔ اور میں تمہاری گردن مروڑ دُوں گا۔''

''کیا مطلب..... کیا کہہ رہے ہو مورکھ؟'' وہ اُچھل پڑا۔ اُس کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔ اُس نے اپنی جگہ سے ہٹنا چاہا تو میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ چھڑانے کے لئے زور آزمائی کرنے لگا اور دوسرے ہاتھ سے اُس نے میرے سینے پر زوردار گھونسہ مار دیا۔ ساتھ ہی وہ اُونچی آواز میں چیخ بھی رہا تھا۔ اگر وہ لاؤڈ اسپیکر پر بھی چیختا تو مجھے پرواہ نہ ہوتی۔ یہاں میلوں دُور تک کوئی اُس کی آواز سننے والا نہیں تھا۔

میں نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور ہم میں زور آزمائی ہونے لگی۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میں بھی اُس کے ساتھ اُٹھتا چلا گیا۔ ٹیلے کے دوسری طرف سے بھی اُٹھا پٹخ اور غرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے شبہ تھا کہ کہیں سیتا اُس کے قابو میں نہ آ جائے۔

میرا حریف درمیانے قد اور چھریرے بدن کا مالک تھا لیکن مجھ سے زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے پوری قوت استعمال کر رہا تھا۔ اور میرے خیال میں وہ خوفزدہ سا ہو گیا تھا اور مقابلہ کرنے کی بجائے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگنے کے چکر میں تھا..... میں جانتا تھا کہ جب کسی بڑے سے بڑے سورما پر بھی کسی قسم کا خوف طاری ہو جائے تو اُسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی تھی۔

اُس نے مجھے ٹانگ سے اڑنگا دے کر گرانے کی کوشش کی مگر اُس کا اپنا ہی پیر ریت میں دھنس گیا جس سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر گر گیا..... میں بھی اُس کے ساتھ ہی گرا تھا لیکن سنبھل کر فوراً ہی اُس کی گردن گرفت میں کر لی۔ وہ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن میرے بازو کی لپیٹ بڑی سخت تھی۔ اُس کے منہ سے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے دونوں پیر ریت پر جمانے کی کوشش کی لیکن پیر ریت میں دھنس رہے تھے۔ اس طرح پوری طاقت استعمال نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ بھی اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے پوری طاقت استعمال کر رہا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ میری کلائی پر تھے اور ٹانگیں بری طرح پٹخ رہا تھا۔

میں نے بازو کو زوردار جھٹکا دیا، اُس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی چیخ نکلی۔ وہ بری طرح مچلا۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا..... اس مرتبہ کڑک کی آواز سنائی دی۔ وہ اس طرح تڑپنے لگا جیسے بیل کو گرفت میں لے کر اُس کے گلے پر چھری پھیر دی گئی ہو..... میں اُس کی گردن کو مسلسل جھٹکے دیتا رہا۔ اگرچہ گردن کی ہڈی پہلے ہی جھٹکے میں ٹوٹ چکی تھی لیکن میں نے اپنی کارروائی

جاری رکھی۔ اور پھر سیتا کی چیخ سن کر چونک گیا.....

''شمروز! پکڑو اُسے..... وہ بھاگ رہا ہے۔'' میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سیتا کا حریف پجاری اپنے آپ کو سیتا سے چھڑا کر ایک طرف بھاگ رہا تھا۔ اصولی طور پر اُسے اُس طرف بھاگنا چاہئے تھا جس طرف سے وہ آئے تھے لیکن بدحواسی میں اُسے سمت کا خیال نہیں رہا تھا اور وہ صحرا کے اندر بھاگ رہا تھا۔

میں نے اپنے حریف کو چھوڑ دیا۔ وہ ریت پر پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے دوسرے پجاری کی طرف دوڑ لگا دی جو تقریباً پچاس گز دُور جا چکا تھا۔ ریت میں پیر دھنس رہے تھے اور دوڑنے میں خاصی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ پجاری بھی ایسی ہی مشکل سے دوچار تھا اور بار بار گر رہا تھا۔ میں فاصلہ کم کرنے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر اُس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ پجاری دوڑتے ہوئے مدد کے لئے چیخ رہا تھا لیکن ظاہر ہے شہر سے دو میل دُور اس لق و دق صحرا میں اُس کی مدد کے لئے کون آتا؟

وہ ایک بار پھر لڑکھڑا کر گرا اور اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے دُور ہی سے چھلانگ لگا دی..... اُس کا ایک پیر میری گرفت میں آ گیا۔ وہ پھر منہ کے بل گرا۔ اس مرتبہ میں نے اُسے اُٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اُس کے اُوپر سوار ہو کر اُس کی گردن گرفت میں لے لی۔ اُس پجاری کی گردن مروڑنے میں، میں نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔

میں کچھ دیر تک کھڑا ہانپتا رہا اور پھر بڑی مشکل سے اُس کی لاش کو ریت پر گھسیٹتا ہوا اُس طرف لے آیا۔ سیتا بھی تقریباً بیس گز میری طرف آ چکی تھی۔ وہ بھی لاش گھسیٹنے میں میری مدد کرنے لگی۔

دوسرا پجاری بھی ختم ہو چکا تھا..... دونوں کی لاشیں قریب قریب ڈال دی گئیں۔ ہم کچھ دیر ریت پر بیٹھے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے پھر اُن دونوں لاشوں کو ٹھکانے لگانے کی سوچنے لگے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز تو تھی نہیں جس سے گڑھا کھودا جاتا۔ ریت نرم تھی، ہم دونوں آرام سے ریت کو ہٹاتے رہے۔

آدھے گھنٹے میں اتنا گڑھا بن گیا کہ ان دونوں لاشوں کو اندر ڈال کر اُوپر ریت ڈال دی گئی۔ گڑھا ہم نے ٹیلے کے دوسری طرف ہوا کے رُخ پر کھودا تھا تاکہ ہوا سے ٹیلے کی ریت اُڑ اُڑ کر اس پر پڑتی رہے۔

میں نے فارغ ہو کر سیتا کی طرف دیکھا، اُس کے جسم پر بہت مختصر لباس تھا۔ سیندوری رنگ کا چوغا پھٹ کر اُس کے جسم سے الگ ہو گیا تھا، یا پھر اُس کمبخت پجاری نے ہی اُسے بے لباس کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اپنا چوغہ سیتا کو دے دیا اور سیتا والا چوغہ چادر کی طرح اپنے اُوپر ڈال لیا۔ میں نے ایک طرف پڑی ہوئی پوٹلیا اُٹھائی اور لودروا کی طرف جانے والے راستے پر تیز تیز چلنے لگے۔ ہم ایک گھنٹہ لیٹ ہو چکے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ مندر میں موجود

پجاری ہم پر شبہ نہ کریں۔

چاند نکل آیا تھا۔ مدھم سی چاندنی میں دُور تک پھیلا ہوا ریگزار بڑا پراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ چاندنی میں مندر کا ہیولہ دُور سے دکھائی دینے لگا۔ چاندنی رات، دُور دُور تک پھیلی ہوئی ویرانی اور اُس ویرانے میں مندر کا ہیولہ بڑا پراسرار لگ رہا تھا۔

ہم مندر سے تقریباً دو سو گز دُور تھے کہ دو ہیولے اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

''وہ ہمارے انتظار میں تھے..... اور میرا خیال ہے وہ ہمیں دیکھتے ہی چل پڑے تھے۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ قریب پہنچیں تو تم ذرا الگ ہٹ کر بیٹھ جانا۔ انہیں شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ تم عورت ہو۔''

''تم فکر مت کرو..... قریب آنے دو انہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔

ہمارے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ سیتا راستے سے تقریباً دس گز دُور ہٹ کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے فطری ضرورت نے اُسے مجبور کر دیا ہو۔ میں بھی رُک گیا۔

وہ دونوں پجاری قریب پہنچ گئے۔ وہ دونوں ہٹے کٹے اور لمبے تڑنگے تھے۔ وہ میرے سامنے آ کر رُک گئے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر انہیں پرنام کیا۔ اُن دونوں نے بھی ہاتھ جوڑ دیئے۔

''دیر ہو گئی مہاراج.....'' میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''راستے میں متر کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، اس لئے آہستہ آہستہ چل کر آ رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں مہاراج.....'' اُن میں سے ایک نے کہتے ہوئے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے لائق کوئی سیوا ہو تو.....''

''نہیں مہاراج! اب وہ ٹھیک ہو گئی..... میرا مطلب ہے اُس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے۔ آپ اپنی منزل کھوٹی نہ کریں۔ آپ سدھاریئے!''

اُن دونوں کو 'ہو گئی' کے لفظ پر شبہ نہیں ہوا تھا۔ اور یہ لفظ میرے منہ سے بھی بے اختیار نکل گیا تھا۔ لیکن میں نے بروقت اپنی زبان پر قابو پا لیا تھا۔

''اچھا..... ہم چلتے ہیں۔ جے رام جی کی۔''

''جے رام جی کی۔'' میں نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

وہ تقریباً بیس گز آگے نکل گئے تو سیتا اُٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ ''یہ کیا حماقت تھی۔'' اُس نے مجھے گھورا۔ ''اگر انہیں شبہ ہو جاتا تو.....؟''

''اب تو بات ختم ہو گئی نا۔'' میں نے کہا۔ ''چلو! وہ مندر اپنے سیوکوں کا انتظار کر رہا ہے۔''

ہم دونوں چلتے ہوئے مندر کے قریب آ گئے۔ مندر کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بس سمجھ لیجئے کہ تقریباً ہزار مربع گز رقبے پر زمین کی سطح سے تقریباً چھ فٹ اُونچی کنکریٹ کی چوکی جس پر وہ عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ اُوپر پہنچنے کے لئے پانچ کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ یہ عمارت دراصل عریض بارہ دری کی طرح تھی۔ کوئی گیٹ نہیں تھا۔ چاروں طرف سے کھلا ہوا تھا۔ چھت

بڑے بڑے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ عمارت کے چاروں کونوں پر البتہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ بارہ دری کے وسط میں بڑے ستون کے ساتھ ایک پانچ فٹ اُونچا چبوترہ تھا جس پر ایک بڑی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اُس مورتی کا سر غائب تھا، ایک بازو بھی نہیں تھا، دوسرا بازو کہنی سے غائب تھا۔ اور یہی ٹوٹا پھوٹا بھگوان جین مت کے پیروکاروں کے لئے مقدس تھا۔

یہ مندر صدیوں پرانا تھا۔ یہ مورتی بھی اُسی وقت یہاں رکھی گئی ہو گی۔ لیکن صدیوں کے حوادث نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اور بگڑے ہوئے حلیے کا یہی پتھر ہندوؤں کا وہ بھگوان تھا جس کی یاترا کے لئے وہ دُور دُور سے آتے تھے۔ ایک کونے میں واقع کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر کوئی لیمپ یا مشعل جل رہی تھی جس کی زرد روشنی دروازے کے باہر بھی جھلک رہی تھی۔

سیتا دروازے پر رُک کر اندر جھانکنے لگی۔ اور پھر وہ اندر چلی گئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی اندر آ گیا۔ یہ کمرہ آٹھ بائی آٹھ فٹ سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ آٹھ فٹ اُوپر چاروں دیواروں میں کھڑکیاں تھیں جن میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ اُن سے نیچے کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ البتہ دو دیواروں میں ایک ایک دو دو اینٹیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔ ایک سوراخ سے باہر دُور تک ریگستان میں دیکھا جا سکتا تھا جبکہ دوسری دیوار سے مندر کا عقبی کمپاؤنڈ اور وہ اُونچی دیوار نظر آ رہی تھی جس سے اس مندر اور لودروا کھنڈر اور شہر کو ایک دوسرے سے الگ کیا گیا تھا۔

ایک دیوار میں لگے ہوئے کنڈے میں وہ مشعل اٹکی ہوئی تھی جس میں کسی جانور کی چربی جل رہی تھی۔ دروازہ اور چاروں طرف کھڑکیاں کھلی ہونے کی وجہ سے کمرے میں نہ تو مشعل کے دھوئیں کے گھٹن تھی اور نہ ہی چربی جلنے کی تیز بو تھی۔ موم سے ملتی جلتی بو بہت ہلکی تھی اور قابل برداشت تھی۔ فرش پر ایک حصے میں چٹائی بچھی ہوئی تھی جس پر دو آدمی آسانی سے سو سکتے تھے۔ کسی دیوار میں کوئی الماری وغیرہ نہیں تھی۔ ایسی عمارتوں میں عام طور پر دیواروں ہی میں جگہ بنا کر طاقچے یا سلیب وغیرہ لگا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں کچھ نہیں تھا۔ البتہ چاروں دیواروں میں تقریباً چار فٹ کی بلندی پر آٹھ انچ اُونچے اور چھ انچ چوڑے طاقچے بنے ہوئے تھے جن میں یاتو موم بتیاں رکھی جاتی ہوں گی یا چراغ جلائے جاتے ہوں گے۔ لیکن اب کچھ نہیں تھا۔

میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گٹھڑی ایک دیوار کے قریب رکھ دی۔ اُس گٹھڑی میں ہمارے کپڑے اور کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ سیتا نے شہر والے جین مندر کے پنڈت بھولا ناتھ سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ اس مندر میں ایک باورچی خانہ بھی ہے جہاں ضروری برتن موجود ہیں۔ وہاں رہنے والے پجاری اپنا کھانا خود تیار کرتے ہیں۔ سیتا اپنے ساتھ خاصی مقدار میں چاول، مصالحے اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی لے آئی تھی۔ خوراک کے مہر بند ڈبے چیزوں کے علاوہ تھے۔

سیتا تھک گئی تھی۔ وہ فرش پر بچھی ہوئی پیال پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور ٹانگیں آگے کو پھیلا لیں۔ میں بھی تھک گیا تھا۔ میں بھی دوسری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سیتا کچھ دیر تک

باتیں کرتی رہی۔ پھر اُس نے مزید ٹانگیں پسار لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں بھی تھک چکا تھا اور مجھ پر بھی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

کمرے کے دروازے پر کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا جسے بھیڑ لیا جاتا۔ لیکن میرے خیال میں یہاں ہمیں کوئی خطرہ تو نہیں تھا۔ اس ویرانے میں کون آئے گا؟ تھوڑی دیر بعد میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔

میں پتہ نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ سیتا نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے خوابیدار سے لہجے میں پوچھا۔

''باہر کوئی ہے.....!'' سیتا نے سرگوشی کی۔ ''آواز آ رہی ہے..... جیسے کوئی پیر گھسٹ کر چل رہا ہو۔'' اُس کے لہجے میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سیتا میرے اُوپر لدی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے ایک طرف ہٹایا اور آواز سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن سناٹے میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

''یہاں کون آئے گا اس ویرانے میں.....'' میں نے کہا۔ ''تمہارا وہم ہو گا۔ آرام سے سو جاؤ!'' اور ٹھیک اسی لمحہ وہ آواز سنائی دی۔ صاف محسوس ہوا تھا جیسے کوئی پیر گھسٹ کر چل رہا ہو۔ سرسراہٹ کی آواز میرے اعصاب پر طاری ہونے لگی..... قدیم عمارتوں میں بھوتوں اور بدروحوں کی بہت سے باتیں سن رکھی تھیں اور یہ تو مندر تھا..... یہاں نجانے کیا کیا گل کھلتے رہے ہوں گی..... کتنی معصوم عورتوں کی عصمتیں لٹی ہوں گی یہاں..... اُن کی روحیں اب بھی کہیں بھٹک رہی ہوں گی۔

یہ خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... اگر واقعی یہاں بھوتوں یا بدروحوں کا ڈیرہ ہے تو ہم یقیناً پھنس گئے تھے۔ اور شاید اُس وقت سیتا کے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔

''وہ کسی کی بھٹکتی ہوئی آتما تو نہیں؟'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' میں نے اُس کے ساتھ اپنے آپ کو بھی تسلی دی۔ ''آؤ..... دیکھتے ہیں باہر کون ہے؟''

سیتا نے جلدی سے پوٹلی کھول کر چاقو نکال لیا۔ ہم اپنے ساتھ کسی قسم کا اسلحہ یا کوئی بھی ہتھیار نہیں لانا چاہتے تھے۔ لیکن سیتا نے مہر بند خوراک کے ڈبے کھولنے کے لئے یہ رام پوری چاقو رکھ لیا تھا۔ اُس نے بٹن دبا کر چاقو کھول لیا۔ اُس کا پھل تقریباً چھ انچ لمبا تھا..... اُس نے چاقو میرے ہاتھ میں تھما دیا اور میرے دائیں بازو سے لپٹ کر کھڑی ہو گئی۔

''اگر واقعی کوئی بدروح ہوئی تو کیا یہ چاقو ہماری کوئی مدد کر سکے گا؟'' میں نے کہا۔

''ہو سکتا ہے وہ کوئی آتما نہ ہو، کوئی انسان ہو۔'' سیتا بولی۔

ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ اُس وقت تیز ہوا چل رہی تھی اور سیٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ پہلے ہم اُس طرف آئے جہاں سے مندر میں داخل ہوئے تھے۔ چاند آسمان کے وسط

میں پہنچ چکا تھا۔ ویرانہ، سرسراتی ہوئی ہوا اور چاندنی..... تینوں نے مل کر ماحول کو خاصا خوفناک بنا دیا تھا۔

اس طرف دُور دُور تک کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہم دوسری طرف آ گئے۔ سیتا نے دونوں ہاتھوں سے میرا بایاں بازو پکڑ رکھا تھا اور وہ میرے ساتھ چپکی ہوئی چل رہی تھی۔

دوسری طرف کمپاؤنڈ خاصا وسیع و عریض تھا۔ وہ دیوار مندر کے چبوترے سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھی۔ اور اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ بھی بنا ہوا تھا جس کے قریب ہی لکڑیوں اور خشک جھاڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں کمپاؤنڈ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ بائیں طرف سے وہ آواز سنائی دی۔ سیتا چیختی ہوئی میرے ساتھ لپٹ گئی۔ مجھے بھی سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا..... لیکن دوسرے ہی لمحہ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ ایک بڑی سی خشک جھاڑی تھی و ہوا کے زور سے ایک طرف سرک رہی تھی اور اُس کے سرکنے سے سرسراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسے کوئی پیر گھسٹ کر چل رہا ہو۔

''وہ رہی بدروح..... میں نے دیکھ لیا ہے اُسے۔ اب وہ میرے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتی۔'' میں نے سیتا کو اپنے سے الگ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ ''بھب..... بھاگو.....'' وہ ہکلائی۔ ''بھاگ چلو یہاں سے..... ہم آتماؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

''دیکھو تو سہی..... کتنی حسین ہے وہ۔ اور اُس کے بکھرے ہوئے بال کتنے لمبے ہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ اُس کے بالوں کو چھو کر دیکھوں۔''

''نہیں نہیں.....'' وہ چیخی۔ ''قریب مت جانا۔ وہ تمہیں مار ڈالے گی۔'' سیتا بہادر لڑکی تھی، اس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت وہ جس طرح ڈر رہی تھی مجھے اس پر بھی زیادہ حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ روحوں پر ان کا عقیدہ بہت پختہ تھا۔ وہ تلوار سے نہیں ڈرتے تھے لیکن آتماؤں کے نام سے اُن کی جان نکلتی تھی۔

میں نے زبردستی سیتا کو اپنے سے الگ کیا اور جھاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ دیکھو..... وہ ہے بدروح جس سے تم ڈر رہی ہو۔''

ٹھیک اُسی وقت جھاڑی نے اپنی جگہ سے پھر حرکت کی، اس کے ساتھ ہی سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ سیتا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اور اُس نے اپنا سر میرے سینے سے ٹکا دیا۔

میں نے اُسے اپنے سے الگ کیا اور چبوترے سے اُتر کر نیچے آ گیا اور وہ جھاڑی اُٹھا کر اس کمرے کے قریب پہنچ گیا جہاں لکڑیوں اور سوکھی ہوئی جھاڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

یہ کوئی باقاعدہ کمرہ نہیں تھا۔ کمپاؤنڈ کی فصیل کے ساتھ دو دیواریں کھڑی کر کے ٹین کی چھت ڈال دی گئی تھی۔ دروازے پر کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔

پتھر رکھ کر دو چولہے بنے ہوئے تھے اور کچھ برتن ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

''یہ کچن ہے.....'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پوٹلی میں ٹارچ بھی رکھی ہوئی ہے۔ لے کر آؤ! دیکھیں اس میں کیا کیا ہے؟''

''ابھی کون سا ہمیں کچھ پکانا ہے..... صبح دیکھ لیں گے۔'' سیتا نے کہا۔

اُس وقت آدھی رات بیت چکی تھی۔ ہم خاصی دیر سو لئے تھے اور اس وقت نیند نہیں آ رہی تھی۔ کمرے میں جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم چبوترے کی سیڑھی پر بیٹھ گئے اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میرا تجسّس بڑھ رہا تھا اور میں لودروا کے اُن کھنڈرات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان لینا چاہتا تھا جہاں دہشت گردی اور تخریب کاری کا کیمپ قائم کیا گیا تھا۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ ریگستان کی ہوا میں خنجر کی سی کاٹ آ گئی تھی۔

''چلو..... اندر چلیں۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' سیتا نے کہا۔

میں نے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا۔ اور تب مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اُس نے چوغہ نہیں پہنا تھا۔ اُس کے جسم پر وہی مختصر لباس تھا جو گھر سے روانہ ہوتے وقت چوغے کے نیچے پہنا تھا۔ مختصر سی چولی اور گھٹنوں کے اُوپر تک کا گھاگھرا۔ میں نے بھی چوغا اُتار رکھا تھا۔ میں نے پاجامہ اور کرتہ پہن رکھا تھا لیکن مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ میری ساری زندگی کشمیر کے برف پوش پہاڑوں میں گزری تھی۔ راجستھان کی سردی میرا کیا بگاڑ سکتی تھی؟

ہم کمرے میں آ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ باہر کے مقابلے میں کمرے کی فضا گرم تھی۔ مگر سیتا کو اب بھی سردی لگ رہی تھی اور وہ میرے ساتھ لپٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور پھر وہ اس طرح نیم دراز ہو کر سو گئی کہ اُس کا سر میری گود میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے ہٹانے کی کوشش نہیں کی اور خود بھی آنکھیں بند کر لیں۔

اور پھر تڑتڑاہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھلی گئی..... سیتا بھی بدحواس ہو کر اُٹھ گئی۔ تڑتڑاہٹ کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آٹو میٹک رائفلوں کی مسلسل فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ میں بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر چھلانگ لگا کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا..... فائر کی یہ آوازیں کمپاؤنڈ وال کے دوسری طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔

''میں تو ڈر ہی گئی تھی۔'' اپنے قریب سیتا کی آواز سن کر میں نے ڈر کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ ''ادھر دہشت گردی کی تربیت کا کیمپ ہے۔ اور ظاہر ہے.....''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہر طرف چٹی دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق صبح آٹھ بجے کا وقت ہو رہا ہو گا۔ فصیل کے دوسری طرف سے رہ رہ کر فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور کبھی کبھار بم کا کوئی

دھماکہ بھی فضا میں گونج پیدا کر دیتا۔

ہم کچھ دیر یہ آوازیں سنتے رہے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ میں نے کچن کا جائزہ لیا۔ وہاں ضرورت کے برتن موجود تھے۔ تین پتیلیاں، چائے دانی اور تام چینی کی تین چار پلیٹیں۔ یہ ساری چیزیں دُھلی ہوئی تھیں اور لکڑی کی ایک چوکی پر رکھی ہوئی تھیں۔ کچن کی دیواریں اور چھت دُھویں سے کالی ہو رہی تھی۔ اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُس کچن میں ایک نلکا بھی تھا جس کے نیچے پلاسٹک کی ایک بالٹی پانی سے بھری ہوئی رکھی تھی۔ نلکے کا پائپ پچھلی دیوار سے نکلا ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مندر کے لئے پانی کا یہ انتظام کیمپ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ کیمپ میں یقیناً پانی کا معتدل انتظام ہو گا اور مجھے یقین تھا کہ کسی بڑے جنریٹر وغیرہ کے ذریعے بجلی کا نظام بھی ہو گا۔ مگر مندر کو بجلی نہیں دی گئی تھی۔

سیتا نے اپنی پوٹلی کھول لی..... اُس میں چائے کی پتی اور خشک دودھ وغیرہ بھی موجود تھا۔ میں نے کچن کے اندر ایک چولہے میں آگ جلا دی اور سیتا چائے تیار کرنے لگی۔

ہم نے مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر چائے پی اور پھر گھوم پھر کر مندر کا جائزہ لینے لگے۔ باقی تین کمروں میں بھی کسی دروازے کے پٹ نہیں تھے۔ وہ تینوں کمرے بھی پہلے کمرے سے مختلف نہیں تھے۔ البتہ ایک کمرہ کسی قدر بڑا تھا اور اُس میں اُوپر جانے کے لئے ایک تنگ سا زینہ بھی تھا جو دیواروں کے ساتھ ساتھ گھومتا ہوا اُوپر چلا گیا تھا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اور گردآلود سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ سیتا بھی میرے پیچھے آ رہی تھی۔

اُوپر کشادہ بالکونیاں تھیں جو نیچے سے بھی نظر آتی تھیں۔ بالکونیوں کے باہر کی طرف تقریباً چار فٹ اُونچی دیوار تھی اور یہ دیوار کئی جگہوں سے ٹوٹ چکی تھی۔ بعض جگہوں پر دیوار تو موجود تھی مگر مختلف جگہوں سے چند اینٹیں نکلی ہوئی تھیں اور ان سوراخوں سے باہر جھانکا جا سکتا تھا۔ ہم دونوں چاروں طرف گھوم کر اس طرف آ گئے جہاں سے کھنڈروں کے اس شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ کھنڈر مندر کی دیوار سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے سے شروع ہوتے تھے۔ مندر کے آگے جو اُونچی دیوار تھی جو نجانے کب تعمیر کی گئی تھی اور اُس دیوار سے آگے دونوں طرف خار دار جھاڑیوں کی باڑھ تھی جو دُور تک چلی گئی تھی۔ باڑھ تقریباً دس فٹ اُونچی تھی اور اس قدر گنجان تھی کہ انسان تو کیا بلی کا بچہ بھی اُس میں سے نہیں گزر سکتا تھا۔

لودروا نام کا یہ قدیم شہر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بلکہ اُسے ایک گاؤں کہنا ہی مناسب رہے گا۔ گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیدل چلتے ہوئے زیادہ سے زیادہ پچیس تیس منٹ میں فاصلہ طے کیا جا سکتا تھا۔ کئی گلیاں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے چوراہے تھے۔ قدیم کھنڈروں میں چند چھوٹی عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بعض عمارتیں دو منزلہ تھیں اور میرا خیال تھا کہ ان عمارتوں کو تعمیر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ دو بنگلہ ٹائپ کی عمارتیں بالکل الگ تھلگ دکھائی دی تھیں۔ گاڑیاں بھی مختلف سمتوں میں آتی جاتی نظر آ رہی تھیں اور کچھ فوجی جیپیں مختلف

جگہوں پر کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔

کھنڈروں کی اُس بستی کے دوسری طرف صحرا میں ایک جگہ غبار سا اُٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہاں بم کا دھماکہ ہوا تھا۔

''وہ جو بنگلہ نما عمارتیں دیکھ رہے ہو نا.....'' سیتا نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اسرائیلی انٹیلی جنس ''موساد'' کے ماہرین کی رہائش گاہیں ہیں۔ کم از کم چار اسرائیلی ماہرین اس وقت اس بستی میں موجود ہیں۔ انڈین ماہرین بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور اس کیمپ میں کم از کم ڈیڑھ سو نوجوانوں کو تربیت دی جا رہی ہے۔ اگر یہ کیمپ تباہ کر دیا جائے تو تم اپنی قوم کی بہت بڑی خدمت کر سکو گے۔''

''کیا اس کیمپ کی تباہی سے پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری کی سرگرمیاں ختم ہو جائیں گی..... اور کیا کشمیر کے حوالے سے انہوں نے جو منصوبہ بنایا ہے وہ خاک میں مل جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کہنا مشکل ہے.....'' سیتا نے جواب دیا۔ ''جودھ پور، اودھے پور اور دوسری جگہوں پر بھی تخریب کاری اور دہشت گردی کی تربیت کے کیمپ کام کر رہے ہیں۔ لیکن اسرائیلی ماہرین صرف اسی کیمپ میں ہیں۔ اور یہاں صرف اُن لڑکوں کو تربیت دی جا رہی ہے جنہیں کشمیر بھیجا جائے گا۔ اس لئے تمہارے لئے سب سے پہلے اس کیمپ کو تباہ کرنا ضروری ہے۔''

''لیکن اس کیمپ میں داخل ہونے کا تو کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں کشمیر میں فوجی کیمپوں کی تباہی کا تجربہ ہے۔ یہاں تو اتنی زیادہ سکیورٹی بھی نہیں ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''ویسے ابھی ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ اندر داخل ہونے کی کوئی نہ کوئی ترکیب مل ہی جائے گی۔''

باتیں کرتے ہوئے میں گہری نظروں سے کھنڈروں کی اس بستی کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک شکستہ مکان کے سامنے درخت کے نیچے بیس بائیس آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے اُن کی تعداد زیادہ ہو۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی اُن کے ساتھ کھڑا ہاتھوں کو مختلف انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کوئی چیز بھی تھی لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا دُشوار تھا کہ وہ کیا چیز تھی؟ وہ شخص کیا کہہ رہا تھا؟

اور پھر ایک جیپ کو بستی کی گلیوں میں گھوم کر اس طرف آتے دیکھ کر میں چونک گیا..... وہ جیپ بائیں طرف مُڑ گئی۔ میری نظریں بھی اُس جیپ کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔ ڈرائیور کے علاوہ جیپ میں صرف ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اب جیپ کا رُخ بستی میں آمد و رفت کے اس گیٹ کی طرف تھا جو بائیں طرف مندر سے تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ گیٹ کے اندر کی طرف ایک گارڈ رُوم بھی تھا لیکن وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جیپ گیٹ کے سامنے رُک گئی اور اُسی وقت گارڈز رُوم سے ایک لمبا تڑنگا آدمی نکل کر

سامنے آ گیا۔ اُس نے جیپ میں بیٹھے ہوئے شخص سے کوئی بات کی اور پھر خاردار تاروں والا گیٹ کھول دیا۔ جیپ گیٹ سے نکل کر جیسلمیر شہر کی طرف جانے والے راستے پر دوڑنے لگی۔ وہ راستہ بھی مندر سے تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے سے گزر گیا تھا۔ میرا خیال تھا وہ جیپ شہر کی طرف جا رہی تھی۔ لیکن پھر جیپ کا رُخ مندر کی طرف مُڑ گیا.....

''وہ جیپ اسی طرف آ رہی ہے..... نیچے چلو! جلدی۔'' میں نے کہا۔ میں اور سیتا دوڑ کر اُس محراب کے پاس پہنچ گئے جہاں نیچے جانے کے لئے زینہ تھا۔ نیچے آتے ہی سیتا اُس کمرے میں گھس گئی جہاں ہمارا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔ ہم دونوں نے زرد کپڑے والے چوغے پہنے اور کمرے سے نکل آئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمیں اپنی کیا مصروفیات ظاہر کرنی چاہئیں؟ اور پھر ایک ستون کے قریب دو تین جھاڑو دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ رات بھر تیز ہوا سے فرش پر ریت کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس مندر میں پجاریوں کی ڈیوٹی لگانے کا مقصد مندر کی دیکھ بھال تھا۔ اور دیکھ بھال کا مطلب یہ تھا کہ مندر میں ریت جمع نہ ہونے دی جائے۔ میں نے ایک جھاڑو اُٹھا کر سیتا کی طرف اُچھال دیا اور دوسرا خود سنبھال لیا اور ہم دو مختلف سمتوں سے فرش پر ریت صاف کرنے لگے۔

میرے کان جیپ کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک منٹ بعد ہی جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی تو میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔

مزید ایک منٹ بعد جیپ مندر کے سامنے نمودار ہو کر رُک گئی۔ میں اور سیتا اپنا کام چھوڑ کر اُس طرف دیکھنے لگے۔ اگر جیپ کے رُکنے کے بعد بھی ہم اُس پر توجہ دینے کی بجائے اپنے کام میں مصروف رہتے تو ہمارا کردار مشتبہ ہو سکتا تھا۔

وہ آدمی جیپ سے اُتر آیا..... اُس نے جینز کی پتلون اور سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اُس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ کلین شیو اور سر کے بال چھوٹے تھے۔ اُس کی گردن سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آیا تو ہم دونوں نے اُسے پرنام کیا۔ پرنام کرتے ہوئے بھی جھاڑو ہم دونوں کے ہاتھوں میں تھے۔

اُس شخص نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیئے لیکن سیتا کو دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ شاید اُس کے خیال میں یہاں مرد پجاریوں ہی کو ہونا چاہئے تھا مگر یہاں ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر وہ اُلجھ گیا تھا۔ اس دوران ڈرائیور بھی جیپ سے اُتر کر اُوپر آ گیا۔

''حکم کیجئے مہاراج!'' سیتا نے کہا۔ ''آپ کون ہیں اور یہاں کیسے آنا ہوا؟''

''میں اس علاقے کا سکیورٹی انچارج ہوں.....'' وہ شخص بولا۔ ''جگل نام ہے میرا۔ مجھے

معلوم ہے کہ ہر پندرہ دن بعد یہاں پجاریوں کی ڈیوٹی بدل جاتی ہے اور میں یہاں آنے والے پجاریوں کو یہ وارننگ دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ وہ صرف مندر کی سیوا کریں۔ تاروں کی باڑھ میں داخل ہونے کی کوشش اُن کے لئے خطرناک ثابت ہوگی۔ تم لوگوں کو باڑھ کے اندر دیکھ کر کسی وارننگ کے بغیر گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔''

''ہم سمجھ گئے مہاراج!'' میں نے جھاڑو نیچے پھینک کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''ہم صرف مندر کی سیوا کو آئے ہیں..... یہ ہمارا سبھاگیہ ہے کہ ہمیں اس سیوا کے لئے چنا گیا ہے۔ ہم اپنے کام سے کام رکھیں گے۔''

''تمہارا سامان کہاں ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''پوٹلی اس کمرے میں رکھی ہے مہاراج!'' میں نے اشارے سے بتایا۔ ''جگل نامی اُس شخص نے ڈرائیور کو اشارہ کیا وہ کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد واپس آ کر اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم لوگوں کے پاس کوئی ہتھیار؟'' جگل نے کہتے ہوئے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

''ہم یوگی اور سادھو لوگ ہیں مہاراج! کسی ہتھیار کا ہمارے پاس کیا کام؟'' میں نے کہا۔

''میں اپنے اطمینان کے لئے تلاشی لینا چاہوں گا۔'' جگل بولا۔

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

جگل نے ایک بار پھر ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور میرا چوغہ اُتروانے کے بعد اس طرح میری جامہ تلاشی لینے لگا جیسے کوئی ہتھیار بہت چھوٹی سی چیز ہو جسے پاجامے کے نیفے میں بھی چھپایا جا سکتا ہو۔

ڈرائیور میری تلاشی لے رہا تھا اور جگل خود سیتا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اُس کا چوغہ بھی اُتروا دیا گیا۔ جگل نے چوغہ جھٹک کر اُسے زمین پر ایک طرف ڈال دیا اور سیتا کے لباس کو ٹٹولنے لگا۔ میں کن انکھیوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔ سیتا اپنا بدن چرانے کی کوشش کر رہی تھی اور جگل اُس کے جسم کو ٹٹول رہا تھا۔ اُس نے سیتا کے گریبان میں بھی ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اُس وقت سیتا کسمسا کر رہ گئی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو سیتا اُس کے چہرے کا نقشہ بدل چکی ہوتی لیکن اس وقت وہ خاموش رہی۔

''ٹھیک ہے.....'' جگل پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تم لوگوں کو خبردار کر دیا ہے۔ تاروں کی باڑ کے قریب جانے کی کوشش مت کرنا ورنہ نتائج کی ذمے داری تم لوگوں پر ہوگی۔''

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شہر کے مندروں میں تو گوپیوں کو دیکھا ہے لیکن مجھے خیال نہیں تھا کہ تم جیسی حسین لڑکی کو ایسے ویرانے میں بھی بھیج دیا جائے گا۔ کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''

''ڈر کاہے کا مہاراج؟'' سیتا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم دھرم چاری

ہیں..... سیوا ہمارا دھرم ہے۔ ہمیں ڈر کیوں لگنے لگا۔''

''ٹھیک ہے..... شاید تم لوگوں سے دوبارہ ملاقات ہو۔'' جگل نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور سیڑھیاں اُتر کر جیپ میں جا بیٹھا۔ ڈرائیور نے بھی سیٹ سنبھال لی اور انجن سٹارٹ کر کے جیپ کو دائرے کی صورت میں گھماتا ہوا واپس لے گیا۔ جگل بار بار مُڑ کر سیتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں سے اُس کی نیت کو تاڑ لیا تھا۔ اور میرا خیال بلکہ یقین تھا کہ وہ دوبارہ بھی ضرور آئے گا۔ اور اُس وقت تک آتا رہے گا جب تک ہم یہاں ہیں۔''

''کتے کا بچہ.....'' سیتا نے دانت کچکچائے اور اس طرح کپڑے جھاڑنے لگی جیسے اُس کے ہاتھ لگانے سے کپڑے میلے ہو گئے ہوں۔

''شانتی..... شانتی۔'' میں نے کہا۔ ''شانت رہو مائی ڈیئر! اس راستے کا انتخاب تم نے ہی کیا تھا۔ غصہ کرنے یا تلملانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی تو وہ تمہاری صورت دیکھ کر گیا ہے۔ لیکن وہ دوبارہ بھی آئے گا۔ غصہ کھانے کی بجائے بہتر ہے کہ ہم کچھ اور کھانے کے بارے میں سوچیں..... مثلاً ناشتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اوہ.....'' سیتا مسکرا پڑی۔ ''اُس کمبخت کی وجہ سے میں بھول ہی گئی تھی کہ ہم نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا۔''

ہم نے جھاڑو وہیں چھوڑ دیئے۔ سیتا تھیلے میں سے اُبلے ہوئے مٹروں والا ایک ڈبہ نکال لائی۔ اُس نے پتیلی میں پانی بھر کر چولہے پر رکھ دیا اور جب پانی کھول گیا تو ڈبہ اُس میں ڈال دیا۔ میں پانی کی بالٹی اُٹھا کر باہر لے آیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوا تو سیتا ڈبہ کھول کر ایک پلیٹ میں مٹر نکال چکی تھی۔ دس منٹ ڈبہ کھولتے ہوئے پانی میں رہنے سے مٹر اس طرح گرم ہو گئے تھے جیسے تازہ پکے ہوئے ہوں۔ اُن کے ذائقے میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ہم مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے مٹر کھاتے رہے۔ یہی ہمارا ناشتہ تھا۔ اس دوران ہم جگل کے بارے میں باتیں بھی کرتے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی شرارت کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جو چمک دیکھی تھی اس سے میں نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔

ہمارے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا سوائے اس کے کہ بیٹھے باتیں کرتے رہتے یا مندر کا معائنہ کرتے رہتے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سب سے پہلے ہم نے مندر کے فرش سے ریت صاف کی کہ ہم اس سیوا کے لئے یہاں آئے تھے۔ اگر یہ بھی نہ کرتے تو جگل کی طرح آنے والا کوئی شخص کسی قسم کے شبہے میں مبتلا ہو سکتا تھا۔

ریت اُڑنے سے ہمارے حلیے بگڑ گئے تھے۔ یہ غنیمت تھا کہ یہاں پانی بھی موجود تھا۔ میں بالٹی بھر کر کھلی جگہ پر بیٹھ گیا اور پاجامے سمیت نہانے لگا۔ نہا کر میں نے تھیلی میں سے دوسرا چوغہ نکال کر پہن لیا اور پاجامہ اور کرتہ دھو کر ریت پر پھیلا دیا۔ میں نے پانی کی بالٹی بھر کر رکھ دی تھی۔

سیتا نہانے بیٹھی تو میں مندر کے سامنے والی طرف کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور رہگزر کی طرف تکنے لگا۔ اُس وقت تقریباً دس بج رہے تھے۔ تیز دُھوپ چمک رہی تھی اور تپش بڑھ رہی تھی۔ دُھوپ میں جھلملاتی ہوئی ریت پر نظریں ٹکانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

اپنے پیچھے ہلکی سی آہٹ پا کر میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سیتا میرے قریب کھڑی تھی۔ وہ ننگے پیر تھی۔ جسم پر ساڑھی کی طرح زرد چادر لپیٹ رکھی تھی اور بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔

''گرمی بڑھ رہی ہے اور ہمیں کئی روز یہاں رہنا ہوگا۔'' وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ابھی تو دس بجے ہوں گے..... جیسے جیسے سورج اُوپر آتا جائے گا گرمی کی شدت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔'' میں نے کہا۔

ہم کافی دیر وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ حدت بڑھ گئی تھی۔ گرم ہوا کے تھپیڑے ہمارے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ ہم باہر والی سیڑھیوں سے اُٹھ کر مندر کے اندرونی حصے میں آ گئے اور ایک بار پھر گھوم پھر کر مندر کا معائنہ کرنے لگے۔ اس دوران اُوپر کا ایک چکر بھی لگا کر آئے تھے۔

سیڑھیاں اُترتے ہوئے سیتا کا دھکا لگنے سے میں لڑکھڑا گیا۔ سنبھلنے کی کوشش میں میرا ایک پیر سب سے نیچے والی سیڑھی پر دیوار کے بالکل ساتھ پڑا اور مجھے یوں لگا جیسے اُس جگہ پیر کا بوجھ پڑنے سے اینٹ نیچے دب گئی ہو..... میں اُچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ سیتا نے بھی میرے ساتھ ہی چھلانگ لگائی تھی۔

اور پھر ہلکی سی کھٹ کھٹ کی آواز سن کر ہم دونوں چونک گئے..... یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہتی ہو لیکن کوئی رُکاوٹ پیش آ رہی ہو..... یہ آواز سیڑھیوں کے نیچے سے آ رہی تھی۔

میں نے معنی خیز نگاہوں سے سیتا کی طرف دیکھا اور جھک کر سیڑھیوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ کھٹ کھٹ کی بہت ہلکی سی یہ آواز سیڑھیوں کے نیچے دیوار کے بالکل قریب سے آ رہی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس جگہ کو گھورنے لگا۔ مگر اُس جگہ گہری تاریکی تھی اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ہاتھ سے دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ دیوار کے ساتھ فرش پر ہاتھ رکھا تو بری طرح چونک گیا۔ میرے ہاتھ کو بہت ہلکا سا جھٹکا لگا تھا..... میں نے ہاتھ اُسی جگہ پر روکے رکھا۔ وہ اینٹ بہت خفیف سے انداز میں اپنی جگہ پر آگے پیچھے حرکت کر رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ اینٹ اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہتی ہو مگر کوئی رُکاوٹ تھی جس سے وہ معمولی سی حرکت کر کے رہ جاتی تھی۔

''یہ..... یہ دیکھو سیتا! یہ اینٹ اپنی جگہ سے حرکت کر رہی ہے۔'' میں نے سیتا سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں مندروں کے اندر خفیہ راستوں اور تہہ خانوں کا تصور اُبھر آیا۔

سیتا میرے قریب بیٹھ گئی۔ اینٹ کو متحرک پا کر وہ بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ کھٹ کھٹ کی ہلکی سی آواز اُس اینٹ سے اُبھر رہی تھی۔

''کوئی گڑبڑ ہے.....!'' سیتا بڑبڑائی۔

''ٹارچ لے کر آؤ! مجھے لگتا ہے یہاں کوئی خفیہ راستہ موجود ہے۔'' میں نے کہا اور سیتا اُٹھ کر اُس کمرے سے باہر چلی گئی۔ ہم اپنے ساتھ ایک ٹارچ اور کچھ فاضل ڈرائی سیل بھی لے کر آئے تھے۔

اُس کمرے میں بھی ریت کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ غالباً یہاں آنے والے پجاریوں نے ہمیشہ مندر کے مرکزی ہال اور اُوپر کی بالکونیوں اور دیواروں وغیرہ کی صفائی پر ہی توجہ مرکوز رکھی تھی اور ان کمروں پر کبھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ ایک رہائشی کمرے کے علاوہ تمام کمروں کے فرش ریت کی تہوں میں چھپے ہوئے تھے۔ میں اُس اینٹ کے آس پاس سے ریت ہٹانے لگا۔

چند منٹ بعد سیتا ٹارچ لے کر آ گئی۔ اُس کی تیز روشنی میں پہلے میں نے اُس اینٹ کا جائزہ لیا۔ وقفے وقفے سے اُس میں بہت معمولی سی حرکت پیدا ہو رہی تھی۔ میں روشنی میں فرش کے دوسرے حصوں اور سیڑھیوں کے نیچے دیوار کا جائزہ لینے لگا لیکن کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا.....

''سیتا.....!'' میں نے کہا۔ ''سب سے نیچے والی سیڑھی پر دیوار کے بالکل ساتھ والی اینٹ پر پیر رکھ کر کھڑی ہو جاؤ!''

سیتا میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی سیڑھی پر ڈالی۔ سب سے نیچے والی سیڑھی سنگ مرمر سے تراشی ہوئی اینٹوں سے بنائی گئی تھی اور اس سے اوپر کی سیڑھیوں کی تعمیر میں عام اینٹیں استعمال کی گئی تھیں۔

سیتا اُس سیڑھی پر دیوار کے بالکل ساتھ ملی ہوئی اینٹ پر پیر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اینٹ دب گئی اور سیتا اُچھل کر نیچے اُتر آئی۔

''یہ..... یہیں پر کوئی گڑبڑ ہے۔'' وہ اُس اینٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ اُس کے لہجے میں سنسنی کی سی کیفیت نمایاں تھی۔

میں ٹارچ کی روشنی میں اُس اینٹ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ دوسری اینٹوں کے برابر آ چکی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ دوسری مرتبہ اس اینٹ کے دبنے سے کھٹ کھٹ کی وہ ہلکی سی آواز ختم ہو گئی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں سیڑھیوں کے نیچے والی اینٹ کا جائزہ لیا۔ اُس میں بھی اب کوئی حرکت نہیں تھی۔ میں نے ٹارچ سیتا کو تھما دی اور اُس کی روشنی میں اُس جگہ سے ریت صاف کرنے لگا۔

میں نے خاصا لمبا چوڑا رقبہ ریت سے صاف کر دیا۔ پورا فرش سنگ مرمر کی اینٹوں کا تھا اور انہیں اس طرح جوڑا گیا تھا کہ اُن میں بہت معمولی سی جھریاں نظر آ رہی تھیں جن میں ریت بھری ہوئی تھی۔ میں ناخنوں سے اُس اینٹ کی اطراف کی جھریوں سے ریت نکالنے لگا۔

سیتا نے ایک بار پھر سیڑھی والی اینٹ کو دبایا۔ فرش والی اینٹ میں پھر حرکت پیدا ہوئی۔ اس مرتبہ یہ حرکت پہلے سے نمایاں تھی۔

''ایک منٹ..... میں چاقو لے کر آتی ہوں۔ اس کی نوک سے ریت صاف کرو!'' سیتا نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس میں اب شبہے کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ سیڑھی والی اینٹ کا کوئی تعلق فرش کی اینٹ سے بھی تھا۔ اندر کوئی ایسا میکنزم تھا جو دونوں میں کوئی رابطہ قائم کئے ہوئے تھا۔ اور اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی خفیہ تہہ خانہ یا خفیہ راستہ موجود ہے۔ سیتا مجھ سے بھی زیادہ سنسنی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ وہ دو منٹ بعد ہی چاقو لے کر واپس آ گئی۔ میں نے چاقو کی نوک سے فرش کی اینٹ کے اطراف کی جھریوں سے ریت اچھی طرح صاف کر دی اور سیتا کو اشارہ کیا۔ وہ سیڑھی والی اینٹ پر پیر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ فرش کی اینٹ میں پھر حرکت پیدا ہوئی۔ اس مرتبہ وہ اپنی جگہ سے تقریباً ایک سینٹی میٹر اُوپر اُٹھ آئی تھی..... مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جھریوں میں ریت بھری ہوئی ہونے کی وجہ سے اس اینٹ کو پوری طرح اُوپر آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں چاقو کی نوک سے جھریوں میں ریت صاف کرتا رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے کی کوشش کے بعد سیڑھی والے پتھر کے میکنزم کو بار بار استعمال کرنے سے فرش کی اینٹ تقریباً تین انچ اُوپر آ گئی جسے میں نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر تھوڑی سی محنت سے باہر کھینچ لیا۔ اُس اینٹ کے نیچے تقریباً آٹھ انچ گہرا کھڈ تھا جس میں نیچے ایک آہنی کنڈا لگا ہوا تھا..... میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر سنسنی کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''اس کنڈے کو کھینچو..... یہاں یقیناً کوئی تہہ خانہ ہے۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

میں نے دو اُنگلیاں کنڈے میں پھنسالیں اور اُسے اِدھر اُدھر حرکت دینے کے بعد اوپر کھینچنے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ ذرا سی کوشش سے کنڈا اُوپر آ گیا..... اور اس کے ساتھ ہی بہت خفیف سی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دینے لگی..... ہم دونوں اُس کنڈے کو دیکھ رہے تھے۔ گرم ہوا کے جھونکے ہمارے چہروں سے ٹکرائی تو ہم دونوں نے بیک وقت سر اُٹھا کر دیکھا۔ سیڑھیوں کے نیچے ہمارے سامنے والی دیوار شق ہو رہی تھی اور گرم ہوا اسی خلا سے آ رہی تھی۔ اُس ہوا میں گیس جیسی بو تھی۔ میں جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور سیتا کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے باہر آ گیا۔

ہم دونوں اُس کمرے سے دُور جا کر کھڑے ہو گئے اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگے۔ سیتا بار بار اُس کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے وہاں سے کسی جن کے برآمد ہونے کی توقع ہو۔

''میرا خیال ہے ہندوستان کا کوئی مندر ایسا نہیں جس کے نیچے کوئی تہہ خانہ یا خفیہ راستہ نہ ہو۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی طرح مندروں کے پنڈت اور پجاری بھی روز اوّل ہی سے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے ہیں۔'' سیتا نے اس کمرے کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی ایک معقول وجہ سامنے بھی موجود ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سیڑھی کی وہ اینٹ جس کے نیچے وہ میکنزم ہے، بالکل دیوار کے ساتھ ہے۔ سیڑھیاں چڑھنے یا اُترنے والا کوئی بھی شخص دیوار کے ساتھ جڑ کر نہیں چلتا۔ عام طور پر سیڑھیوں کے درمیان میں ہی قدم رکھا جاتا ہے۔ اور میرا پیر تو اتفاق سے اس جگہ پر پڑ گیا تھا۔ اگر تمہارا دھکا لگنے سے میں لڑکھڑا نہ جاتا تو میرا پیر اس جگہ پر نہ پڑتا اور ہم بھی اس خفیہ راستے سے لاعلم رہتے اور پندرہ دن تک یہاں جھاڑو دیتے رہتے۔''

جھاڑو دینے والی بات پر سیتا مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

ہمیں اُس کمرے سے نکلے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ اس قسم کے تہہ خانے جو طویل عرصہ سے بند ہوں اُن میں زہریلی گیس بھر جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دیوار شق ہوتے ہی اندر سے خارج ہونے والی ہوا میں، میں نے وہ بو محسوس کر لی تھی اور ہم فوراً وہاں سے پیچھے ہٹ گئے تھے۔

''میکنزم اتنا جام نہیں تھا۔'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے بیس، تیس یا پچاس سال پہلے بھی کسی اور کو اس خفیہ راستے کا پتہ چل گیا ہو۔ بہرحال! ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس تہہ خانے میں ہمارے لئے کیا بچا ہے۔''

مزید آدھا گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد ہم اُس کمرے میں آ گئے..... اب اس خلا سے آنے والی ہوا گرم نہیں تھی اور اُس میں پہلے جیسی بو بھی نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ٹارچ کی روشنی میں اندر جھانکا۔ وہ خلا اتنا کشادہ تھا کہ دو آدمی پہلو بہ پہلو اندر داخل ہو سکتے تھے۔ آگے سیڑھیاں تھیں اور اُن سیڑھیوں پر بھی دو آدمی ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ میں اُس خلا کے اندر داخل ہو گیا..... میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ٹارچ کی روشنی اندر کی طرف سے دیوار اور سیڑھیوں کا جائزہ لیا۔ میں اندر سے اُس راستے کا میکنزم تلاش کرنا چاہتا تھا تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہمارے نیچے اُترنے کے بعد یہ راستہ بند ہو جائے اور یہ مندر ہمارا مقبرہ بن جائے۔

دائیں طرف ایک دیوار کے قریب سیڑھی کے ساتھ ایک آہنی کنڈا نظر آیا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اُس کنڈے کو اپنی طرف کھینچا۔ دیوار کا راستہ بند ہو گیا۔ میں نے کنڈے کو دوبارہ اپنی طرف کھینچا، دیوار دوبارہ شق ہو گئی۔ میں مطمئن ہو کر اُٹھ گیا۔

سیتا بھی اندر آ گئی۔ راستہ بند کرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ اندر کسی قدر گھٹن تھی۔ ہوا کی آمد و رفت کا راستہ بند ہو جانے سے ہمیں سانس لینے میں دُشواری پیش آ سکتی تھی۔

اس بند تہہ خانے میں سانپ اور بچھو وغیرہ بھی ہو سکتے تھے۔ ہم دونوں ننگے پیر تھے اور ٹارچ کی روشنی میں بہت محتاط ہو کر قدم اُٹھا رہے تھے۔

دس سیڑھیوں کے بعد کشادہ لینڈنگ تھی۔ وہاں سے سیڑھیاں دائیں طرف مُڑ گئی تھیں۔ اِس طرف بھی دس ہی سیڑھیاں تھیں جن کے اختتام پر بہت وسیع وعریض ہال تھا۔ یہ ہال مندر کے مرکزی ہال کے عین نیچے تھا اور چار بڑے بڑے ستون تھے جنہوں نے چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ اُس تہہ خانے کے اطراف میں کمرے بھی تھے۔ بعض کمروں کے دروازے غائب تھے اور بعض میں دروازے موجود تھے۔ میں ایک ایسے کمرے میں داخل ہو گیا جس کا دروازہ نہیں تھا۔ سیتا بھی میرے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ میں دروازے کے قریب ہی رُک کر ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحہ سیتا چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی......

وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا جو بائیں طرف والی دیوار کے قریب فرش پر پڑا ہوا تھا...... ڈھانچے پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ سیتا مارے خوف کے میرے ساتھ لپٹی جا رہی تھی۔

ہم اُس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کی طرف آ گئے...... بند دروازہ کھولنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی ہم ایک بار پھر اُچھل پڑے...... اس کمرے کا منظر پہلے کمرے سے کسی حد تک مختلف تھا۔ کمرے کے وسط میں لکڑی کا ایک صندوق پڑا ہوا تھا اور اُس کے قریب ہی فرش پر ایک انسانی ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ اُس انسانی ڈھانچے پر لباس موجود تھا اور وہ پنڈتوں یا پجاریوں والا لباس تھا۔

صندوق کا ڈھکنا چند اِنچ کے قریب کھلا ہوا تھا۔ میں نے پیر سے وہ ڈھکنا پوری طرح ہٹا دیا اور جیسے ہی ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی میں اُچھل پڑا...... صندوق کے اندر کچھ طلائی زیورات پڑے ہوئے تھے جن میں جڑے ہوئے ہیرے ٹارچ کی روشنی میں جگمگا اُٹھے تھے۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی۔ اُس نے جلدی سے جھک کر وہ زیور اُٹھا لئے۔ ایک نیکلس تھا، دو ہیرے کی انگوٹھیاں اور ایک تاج جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ سیتا نے نیکلس اور انگوٹھیاں پہن لیں اور تاج سر پر بالوں میں پھنسا لیا۔ اُس کا خوف زائل ہو گیا تھا اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

مجھے اس صندوق کی کہانی سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ کوئی اس صندوق میں بھرا ہوا خزانہ چرانے کی کوشش کر رہا تھا اور پنڈت اُسے بچانے کی کوشش میں مارا گیا تھا اور چور خزانہ لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس کی عجلت کی وجہ سے یہ چیزیں صندوق میں رہ گئی تھیں جن پر سیتا نے بلا تردّد قبضہ کر لیا تھا۔

تیسرے کمرے میں ایک الماری تھی جس کے پٹ بھڑے ہوئے تھے۔ میں نے پٹ کھولے تو ہم دونوں اُچھل پڑے...... تین خانے تھے اور تینوں میں زر و جواہر بھرے ہوئے تھے...... ایک خانے میں سونے کی دس بارہ مختلف سائز کی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سیتا آگے بڑھی تو میں نے اُسے روک لیا۔

''فی الحال ان چیزوں کو باہر لے جانا خطرناک ہو گا'' میں نے کہا۔ ''ابھی انہیں میں

چھیڑو! جب ہمیں جانا ہو گا تو یہ سب کچھ ساتھ لے جائیں گے۔''

بات سیتا کی سمجھ میں آ گئی۔ ہم اُس کمرے سے نکل کر دوسرے کمروں میں دیکھتے رہے۔ ایک کمرے میں ایک اور ڈھانچہ ملا تھا اور یہ بھی کسی عورت کا تھا۔ قریب ہی گرد میں دبے ہوئے اُس کے کپڑے بھی موجود تھے۔

ہم ایک اور دروازے کے سامنے آ گئے۔ یہ دراصل سرنگ نما راستہ تھا جس کے آگے جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میں جھاڑیاں ہٹا کر آگے بڑھ گیا اور جیسے ہی سیتا میرے پیچھے اندر آئی اُس کے منہ سے خوفناک چیخ سن کر میں اُچھل پڑا...... مُڑ کر دیکھا تو میرا دل ہی اُچھل کر حلق میں آ گیا......

ایک انسانی ڈھانچہ سیتا سے لپٹا ہوا تھا اور سیتا بری طرح چیخ رہی تھی......!

○○○

میں سیتا سے تقریباً پانچ گز آگے تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں جو کچھ دیکھا تھا اُس نے مجھے بھی بدحواس کر دیا تھا..... مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن میں نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا اور دوڑ کر سیتا کے قریب پہنچ گیا جو بری طرح چیخ رہی تھی۔

وہ انسانی ڈھانچہ سیتا کی پشت پر اس طرح لدا ہوا تھا کہ اُس کے دونوں بازو سیتا کے کندھوں پر سے ہوتے ہوئے اُس کے سینے پر جھول رہے تھے اور اُس کی کھوپڑی سیتا کی گردن سے لگی ہوئی تھی..... لگتا تھا جیسے اُس نے اپنے دانت سیتا کی گردن میں پیوست کر رکھے ہوں۔

یہ صورتحال دیکھ کر میں بھی کانپ اُٹھا..... سنسنی کی ایک لہر میرے پورے جسم میں دوڑتی چلی گئی اور دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس ڈھانچے کو سیتا کے اُوپر سے ہٹایا تو سیتا کی چادر اُس کے ایک ہاتھ کی استخوانی اُنگلیوں میں اُلجھ گئی اور اس طرح زرد رنگ کی وہ چادر بھی سیتا کے اُوپر سے ہٹ گئی..... اُس کے جسم کا بالائی حصہ برہنہ ہو گیا اور وہ چیختی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی..... وہ خوف سے مسلسل چیخ رہی تھی اور اُس کا بدن خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اُس نے مجھے سختی سے اپنی بانہوں کی گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں ایک ہاتھ سے اُس کی پشت تھپتھپانے لگا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کا رُخ نیچے کی طرف تھا اور اُس کی روشنی میں ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ نیچے گرنے سے ڈھانچے کے کچھ حصے ٹوٹ گئے تھے۔ سیتا کی چادر کا ایک کونا اب بھی اُس کے ہاتھ کی استخوانی اُنگلیوں میں پھنسا ہوا تھا۔

''ہوش میں آؤ سیتا.....'' میں نے ایک بار پھر اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تم تو ایک بہادر لڑکی ہو..... ہڈیوں کے ایک ڈھانچے سے ڈر گئیں۔ وہ دیکھو اُس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں۔''

''مم..... میری چادر اُس نے..... پپ..... پکڑ رکھی ہے۔'' سیتا گھگھیائی۔ ''وہ..... وہ مجھے کھینچ رہا ہے۔''

''پاگل ہو گئی ہو..... وہ بے جان ڈھانچہ تمہیں کیسے کھینچ سکتا ہے؟'' میں نے کہا اور چادر کو جھٹکا دے کر ڈھانچے کی اُنگلیوں سے چھڑا لیا۔ میں سیتا کو بزدلی کا طعنہ نہیں دے سکتا تھا۔ ایسی صورتحال سے کوئی بھی دوچار ہوتا تو اُس کی یہی حالت ہوتی۔ وہ ڈھانچہ اگر میرے اُوپر گرتا تو یقیناً میری بھی اسی طرح چیخیں نکل جاتیں۔

سیتا اب بھی میرے ساتھ لپٹی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اُسے اپنی حالت سنبھالنے میں چار پانچ منٹ لگ گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے اپنے آپ سے الگ ہٹا کر چادر اُس کے جسم پر لپیٹ دی اور اس کا پلو کندھے پر سے آگے لا کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُس کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے۔

''جو لڑکی موت کے منہ میں چھلانگ لگا کر مجھ جیسے موت کے فرشتے کو گرفتار کرنے نکلی ہو میں اُسے اتنا بزدل نہیں سمجھتا۔'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''انسانوں سے لڑنا اور بات ہے۔ اور یہ ڈھانچے.....'' وہ زمین پر پڑے ہوئے ڈھانچے کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

''یہ تو اور بھی بے ضرر ہیں.....'' میں نے کہا اور ٹارچ کی روشنی میں بکھرے ہوئے ڈھانچے کا جائزہ لینے لگا۔ ڈھانچے کے قریب ہی گرد آلود فرش پر وہ تاج بھی پڑا ہوا تھا جو سیتا کے سر سے گر گیا تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔

''کیا بات ہے..... اس طرح کیوں ہنس رہے ہو؟'' سیتا نے مجھے گھورا۔

''عورت کی جان پر بنی ہو لیکن زیور کے لئے وہ موت کے جبڑوں میں بھی ہاتھ ڈال سکتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرا مذاق اُڑا رہے ہو؟'' وہ چیخی۔

''نہیں..... یہ تاج تم پر اچھا لگ رہا ہے۔ نجانے کس بدقسمت راجکماری کا ہو گا جو تمہارے سر پر آ کر سج گیا ہے۔''

''تم یہ بھول رہے ہو کہ میرے پتا جی بھی ایک ریاست کے راجہ تھے۔ اور میں بھی راجکماری ہوں۔'' سیتا نے کہا۔

''اور اسی لئے تو یہ تاج تمہارے سر پر سج رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر روشنی کا رُخ اُوپر ہوتے ہی میں اُچھل پڑا..... سیتا بھی اُچھل کر دوبارہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے اُبھر آئے تھے۔

اُس دروازے کے اُوپر ایک تنگ سی دو چھتی تھی جس پر نیچے اُوپر کئی انسانی ڈھانچے پڑے ہوئے تھے..... اس راستے کو جھاڑیاں لگا کر بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جھاڑیوں کی کچھ لمبی ٹہنیاں اُوپر دو چھتی تک پہنچی ہوئی تھیں۔ مجھے صورتحال کی تہہ تک پہنچنے میں دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ سیتا جب اندر داخل ہوئی تھی تو جھاڑیوں کی شاخیں ہلنے سے اتفاق سے وہ ڈھانچہ نیچے آ گیا تھا اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ وہ ڈھانچہ سیتا پر اس طرح گرا تھا جیسے سیتا کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے ہی اُس پر چھلانگ لگائی ہو اور سیتا کا خوفزدہ ہو کر چیخنا کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔

''واپس چلو..... یہاں سے۔'' سیتا اُوپر رکھے ہوئے اُن ڈھانچوں کو دیکھ کر خوفزدہ لہجے

میں بولی۔ ''مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے۔''

''یہ ڈھانچے میرا یا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ حالانکہ میرا دل بھی اندر سے کانپ رہا تھا۔ ''لگتا ہے اس مندر کو قتل گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔''

''اسی لئے تو مجھے اپنے دھرم سے نفرت ہوگئی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''ہمارے یہ مندر عبادت گاہیں نہیں قتل گاہیں ہیں۔ کبھی دولت کے حصول کے لئے کسی کا گلا کاٹ دیا جاتا ہے اور کبھی دھرم کے نام پر پتھر کی مورتیوں کے سامنے جیتے جاگتے انسانوں کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ ڈھانچے دیکھ کر اس مندر کے بارے میں بہت سے اندازے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ چلو..... واپس چلیں یہاں سے۔''

''اب ڈرنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اب یہاں نہ پنڈت ہیں اور نہ مورتیاں۔ ذرا آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ یہ سرنگ کس طرف اور کہاں تک جاتی ہے؟ ممکن ہے یہ سرنگ ہمیں کھنڈروں کے شہر کے اندر تک لے جائے۔''

''یہ سرنگ یقیناً شہر کی کسی عمارت تک ہی جاتی ہوگی۔'' سیتا نے کہا۔ ''لیکن ہمیں تہہ خانے میں اُترے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے۔ اگر وہ جنگل کمبخت دوبارہ اس طرف آ گیا تو.....''

''ہم زیادہ آگے نہیں جائیں گے۔'' میں نے سیتا کی بات کاٹ دی۔

ہم ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھنے لگے۔ سرنگ اتنی کشادہ تھی کہ تین آدمی آسانی سے پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ جگہ جگہ مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ تقریباً بیس گز آگے جا کر سرنگ بائیں طرف مڑ گئی اور ہم وہیں رُک گئے۔

میں چند لمحے ٹارچ کی روشنی میں آگے کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا اور پھر واپسی کے لئے مُڑ گیا۔ سیتا نے میرا بایاں ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ میرے ساتھ جڑی ہوئی چل رہی تھی۔

واپس ہوتے ہوئے سیتا اُس کمرے میں رُک گئی جہاں الماری میں خزانہ بھرا ہوا دیکھا تھا۔ اُس نے سر پر سے سونے کا تاج، گلے سے نیکلس اور ہیرے کی انگوٹھی اُنگلی سے اُتار کر الماری میں دوسری چیزوں کے ساتھ رکھ دیئے اور ہم تہہ خانے سے باہر آ گئے۔ تہہ خانے کا راستہ بند کر کے میں نے فرش پر دوبارہ ریت پھیلا دی تاکہ صرف اتنی جگہ کو صاف ستھرا دیکھ کر کسی کو شبہ نہ ہو۔

اُس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ لو کے تھپیڑے چل رہے تھے اور اس وقت ہمیں بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ سیتا نے تھیلے میں سے مہر بند خوراک کا ایک ڈبہ نکال لیا اور کچن میں جا کر پانی گرم کرنے لگی تاکہ ڈبے کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈال کر اسے گرم کیا جا سکے۔

وہ بڑا ڈبہ تھا اور اُس میں چکن کی فرائی رانیں تھیں۔

کھانے کے بعد ہم مندر کے مرکزی ہال کے وسط میں مورتی والے چبوترے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ مندر بارہ دری کی طرح چاروں طرف سے

کھلا ہوا تھا۔ صحرا کی طرف سے آنے والی گرم ہوا ہمارے چہروں کو جھلسائے دے رہی تھی اور جسم پسینے میں شرابور تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی ہمیں دو ہفتے یہاں رہنا پڑا تو ہم گرمی کے ہاتھوں ہی خرچ ہو کر رہ جائیں گے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سیتا اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اُس نے مجھے بھی آواز دے کر بلا لیا۔

''یہاں زیادہ گرمی نہیں ہے۔'' سیتا نے کہا۔

میں اُس کے قریب ہی پیال پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں واقعی زیادہ گرمی نہیں تھی۔ دُھوپ کی تپش کو موٹی دیوار نے روک رکھا تھا اور سنگ مرمر کی جالیوں سے آنے والی ہوا بھی زیادہ گرم نہیں لگ رہی تھی۔

ہم دیر تک بیٹھے مندر کے تہہ خانے میں ڈھانچوں اور الماری میں بھرے ہوئے اُس خزانے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ سیتا کے خیال میں وہ خزانہ کروڑوں روپے کی مالیت کا تھا۔

باتیں کرتے کرتے سیتا اونگھنے لگی..... میری بھی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

چھ بجے کے قریب میں کمرے سے باہر آ گیا۔ سیتا بھی جاگ گئی تھی۔ وہ بھی میرے پیچھے چلی آئی تھی۔ اُس نے بالٹی سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھویا اور تھیلے میں سے چیزیں نکال کر کچن میں لے گئی اور چائے تیار کرنے لگی۔

اُس وقت اگرچہ چھ بج رہے تھے لیکن دُھوپ میں اب بھی تپش تھی اور ہوا بھی گرم تھی۔ لیکن جیسے جیسے سورج اُفق پر جھک رہا تھا دُھوپ کی حدت میں کمی آتی جا رہی تھی۔ اور پھر غروب آفتاب کا وہ منظر بہت ہی قیامت خیز تھا..... سورج اُفق پر جیسے اٹک کر رہ گیا تھا اور اُس کی سرخی نے ریگستان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ لگتا تھا جیسے ہمارے سامنے خون کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔

چائے پینے کے بعد سیتا نے تھیلے میں سے دال چاول نکال لئے اور اُنہیں صاف کر کے اکٹھا ہی ایک پتیلی میں بھگو دیا۔ ایک چھوٹی مشعل کچن کی دیوار میں بھی ٹنگی ہوئی تھی اور کچن ہی میں ایک طرف موم سے بھرا ہوا ایک کنستر بھی رکھا ہوا تھا۔ گرمی سے موم پگھلی ہوئی تھی اور یہی موم مشعلوں میں استعمال ہوتی تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد ہی سیتا نے مشعل بھی جلا دی اور چولہے میں آگ جلا کر دال چاول کی پتیلی چڑھا دی۔ اُس میں چٹکی بھر نمک بھی ڈال دیا تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ ہمارا کھانا اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد تیار ہوا تھا۔ سیتا نے سارے چاول ایک تھالی میں اُلٹ لئے اور ہم دونوں چبوترے کی سیڑھی پر ہی بیٹھ کر کھانے لگے۔

ابھی ہم کھانا کھا رہے تھے کہ جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہوا کے دوش پر انجن کی آواز کبھی قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتی اور کبھی بہت دُور سے۔

میں اُٹھ کر مندر کے سامنے والے حصے کی طرف چلا گیا۔ چبوترے کے کونے پر پہنچ کر میں کیمپ کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ پانچ سو گز دُور گیٹ پر تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا اور جیپ اُس وقت گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ اُس کے ہیڈ لیمپس روشن تھے۔ جیپ کچھ دُور تک سیدھی چلتی رہی اور پھر اُس کا رُخ مندر کی طرف مُڑ گیا۔

میں دوڑتا ہوا سیتا کے پاس آ گیا۔ ''جیپ اس طرف آ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے وہ جگل کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم نے اس چادر کے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا..... جلدی سے اندر چلی جاؤ اور اس کے نیچے کپڑے پہن لو! اُس کی آنکھوں میں سور کا بال ہے۔ بڑی خوفناک ہیں اُس کی نظریں۔''

''اگر اُس نے پھر تلاشی لینے کی کوشش کی تو؟'' سیتا اُٹھتے ہوئے بولی۔

''اب اگر اُس نے ایسی کوئی کوشش کی تو میں اُس کے ہاتھ توڑ دُوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور میرا خیال ہے تمہیں بھی اب اُسے کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے..... جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔'' سیتا کہتے ہوئے دوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔

میں مندر کے سامنے والے رُخ کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اُس طرف جیپ کے ہیڈ لیمپس کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ اور پھر تقریباً اُسی وقت سیتا بھی باہر آ گئی۔ اُس نے وہی صبح والا لباس پہن لیا تھا اور اُوپر زرد چادر اوڑھ لی تھی۔

جیپ مندر کے قریب رُک گئی تھی۔ جیپ کا رُخ اس طرح تھا کہ اُس کی روشنی مندر کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے دال چاول کھاتے رہے۔

جگل اس وقت اکیلا ہی آیا تھا۔ وہ جیپ کا انجن بند کر کے نیچے اُترا اور جب چبوترے پر چڑھ کر ہماری طرف آیا تو ہم دونوں اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور پرنام کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

''اوہو..... مجھے دیر ہو گئی۔'' وہ ہمارے قریب آ کر بولا۔ ''میں تو آپ لوگوں کے لئے کھانا لے کر آیا تھا۔'' اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹفن آگے کر دیا۔

''بھوجن تو ہم کھا چکے ہیں مہاراج! آپ نے تکلیف کیوں کی؟'' میں نے کہا۔ ٹفن کی طرف نہ میں نے ہاتھ بڑھایا تھا اور نہ سیتا نے۔

''اچھا چلو ٹفن رکھ لو! صبح ناشتے میں کام آئے گا۔'' اُس نے کہتے ہوئے ٹفن سیتا کی طرف بڑھا دیا۔

''یہاں تو گرمی میں خراب ہو جائے گا مہاراج!'' سیتا نے جواب دیا۔ ''آپ یہ واپس لے جائیے۔ کسی اور کے کام آ جائے گا۔''

بات جگل کی سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے اصرار نہیں کیا۔

''آپ بڑے دیالو ہیں مہاراج.....'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ ان پجاریوں کی بھی ایسے ہی سیوا کرتے تھے جو ہم سے پہلے یہاں آتے رہے ہیں؟''

''ہم تو مندر کا راستہ ہی بھولے ہوئے تھے پنڈت جی!'' جگل نے کہا۔ ''ہمارا خیال تھا کہ مندر صرف آپ جیسے مہاپرشوں کے لئے ہے۔ اب یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ ہمیں بھی مندر کی کوئی نہ کوئی سیوا کرنی چاہئے۔ ہم آپ کی سیوا کریں گے تو یہ مندر کی سیوا ہو گی۔ اگر آپ حکم دیں مہاراج تو میں رات کو یہاں دو سنتری بھیج دیا کروں؟''

''کس لئے.....؟'' میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''آپ کے ساتھ یہ جوان اور سندر دیوی ہیں۔ ان کی رکھشا کے لئے۔'' جگل نے جواب دیا۔

''بھگوان ہماری رکھشا کرے گا۔ آپ ایسی کوئی تکلیف نہ کریں مہاراج!'' میں نے کہا۔

وہ کمبخت تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں رہا۔ اس دوران اُس نے بہت سی باتیں کر ڈالیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اس مندر میں بجلی کی ضرورت ہے۔ کم از کم چار بلب تو ضرور ہونے چاہئیں۔ اُس نے وعدہ کیا کہ اس سلسلے میں وہ اپنے آفیسر سے بات کرے گا۔ ہم نے اُس سے کیمپ کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں پوچھی جس سے اُسے ہم پر کسی قسم کا شبہ کرنے کا موقع ملتا۔ بلکہ اُس نے خود ہی بتا دیا کہ یہاں سرکار ایک اہم اور خفیہ پراجیکٹ پر کام کر رہی ہے اور اس لئے اس مندر میں یاتریوں کی آمد پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

اس مرتبہ اُس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ البتہ اُس کی نظریں زیادہ تر سیتا ہی کا طواف کرتی رہی تھیں۔ اُس کے جانے کے بعد ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ اور سیتا نے پھر چاولوں کی تھالی نکال لی جسے اُس نے سنبھال کر رکھ دیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم چبوترے کی سیڑھیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اور اس وقت ہمارا موضوع جگل تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ آگے چل کر ہمارے لئے کوئی سنگین مسئلہ پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔

''کیوں نہ جگل کو استعمال کرنے کی کوشش کی جائے؟'' سیتا نے کہا۔

''اس میں شبہ نہیں کہ اُس کی نظریں تم پر ہیں..... آج صبح تمہیں دیکھتے ہی اُس کی نیت میں فتور آ گیا تھا۔ اس وقت وہ کھانا بھی لے کر آیا، ہمیں کچھ اور سہولتوں کی پیشکش بھی کی۔ کیا تمہارے خیال میں وہ ہمیں مندر اور اس کے سیوک سمجھ کر ہماری سیوا کر رہا ہے؟'' میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''یہ سب کچھ تمہارے لئے ہے۔ لیکن وہ اتنا سیدھا سادھا بھی نہیں کہ سنئے بڑے پراجیکٹ کی تباہی میں ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہو جائے۔''

''تم نہیں جانتے عورت میں کتنی طاقت ہوتی ہے.....'' سیتا مسکرائی۔

''جانتا ہوں..... بہت اچھی طرح جان چکا ہوں۔ تم مجھے کشمیر سے یہاں لے آئی ہو۔ عورت کی طاقت کے استعمال کا اس سے بڑا مظاہرہ اور کیا ہو گا؟ لیکن.....'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''جگل کی نیت سے تم واقف ہو چکی ہو۔ اندازہ لگا لو کہ تم

اُسے کہاں تک لے جاسکتی ہو۔''

''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔ لیکن آزما لینے میں کیا حرج ہے؟'' سیتا نے کہا۔

''یہ تجربہ مہنگا پڑے گا..... اور ہم یہاں تجربات کرنے نہیں آئے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر وہ ہماری آزمائش پر پورا نہ اُترا تو ہم یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکیں گے۔''

سیتا گہرا سانس لے کر خاموش ہوگئی۔

''مجھے تمہاری صلاحیتوں پر کوئی شبہ نہیں۔'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جگل ایک مختلف قسم کا آدمی ہے۔ اُس کی نظریں تمہارے حسن و شباب پر ہیں اور وہ کوشش کرے گا کہ اُس کا مقصد جلد سے جلد پورا ہو جائے۔ اس کے لئے وہ تمہارے ساتھ زبردستی بھی کرسکتا ہے۔ اور جب اُس کا مقصد پورا ہو جائے گا تو اس کے بعد جو کچھ بھی ہوگا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' سیتا نے ایک بار پھر گہرا سانس لیا۔

''اُس نے آج صبح جس انداز میں تمہاری تلاشی لی تھی اس سے تمہیں بھی اُس کی نیت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ ایسا کوئی دوسرا موقع آئے ہمیں اپنے کام کے لئے کوئی ذریعہ تلاش کر لینا چاہئے۔''

''ہمیں اس کیمپ کے اندر داخل ہونے کے لئے کسی نہ کسی جگل کی ضرورت تو پڑے گی۔'' سیتا نے کہا۔ ''اس لئے میرا خیال تھا کہ اسی جگل کو آزما لیا جائے۔ بلکہ اسے اس طرح شکنجے میں کس لیا جائے کہ وہ ہماری بات ماننے سے انکار نہ کرسکے۔''

اس مرتبہ میں سیتا کے خیال سے اختلاف نہیں کرسکا۔ ہم مندر میں بیٹھ کر کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ ہمیں کیمپ میں داخل ہونے کے لئے واقعی کسی آدمی کی ضرورت تھی۔ اور کیمپ کے کسی آدمی تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ اتفاق سے جگل یہاں آ گیا تھا اور سیتا کو دیکھ کر اُس کی رال ٹپک پڑی تھی۔ سیتا کا خیال غلط نہیں تھا۔ رسک ضرور تھا لیکن ایک کوشش کی جاسکتی تھی۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے کہا۔ ''اُسے آزمانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ لیکن پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ مندر کے تہہ خانے کی سرنگ ہمیں کہاں لے جاتی ہے۔ اگر اُس سرنگ کے ذریعے ہمیں کوئی محفوظ راستہ مل جاتا ہے تو ہمیں جنگ والا خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے..... پہلے ادھر قسمت آزما لیتے ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

''دراصل ہم نے یہاں آنے کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں چاہئے تھا کہ شہر میں رہتے ہوئے اس کیمپ سے تعلق رکھنے والے کسی آدمی کو تلاش کرتے اور اُس کے ذریعے کیمپ کے اندر پہنچنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح ہمیں کچھ کرنے کا موقع مل جاتا۔ لیکن ہم تو کسی پلاننگ کے بغیر اس مندر کی طرف دوڑ پڑے اور دو بندے بھی ہمارے

ہاتھوں مارے گئے۔

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' سیتا بولی۔ ''لیکن حماقتیں انسان ہی سے ہوتی ہیں اور ہم بھی انسان ہی ہیں۔''

ہم دیر تک بحث مباحثے میں اُلجھے رہے لیکن یہ بحث بھی لا حاصل ہی رہی۔ کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہوسکا۔

تقریباً دس بجے کے قریب ہم نے دوبارہ تہہ خانے میں اُترنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سے پہلے اُوپر جا کر کھنڈروں کے شہر کا جائزہ لیا۔ رات کے وقت کھنڈروں کا وہ شہر بہت ہی پراسرار قسم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بکھری ہوئی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اُن روشنیوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہاں ایک چھوٹا سا بجلی گھر ضرور بنایا گیا ہوگا۔

میں نے کمرے میں جلتی ہوئی مشعل اُٹھا لی۔ سیتا نے احتیاطاً ٹارچ بھی لے لی تھی۔ سیڑھیوں والے کمرے میں ایک بار پھر ریت صاف کرنی پڑی لیکن اس مرتبہ فرش کا وہ پتھر نکالنے میں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ شق ہونے والی دیوار سے اندر داخل ہونے کے بعد میں نے اندر لگا ہوا کنڈا کھینچ کر راستہ بند کر دیا۔ صبح ہم سے حماقت ہوگئی تھی لیکن اس وقت میں اس راستے کو کھلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

تہہ خانے میں اُتر کر ہم سیدھے اُس سرنگ کی طرف ہی آئے تھے۔ میں نے جھاڑیاں ایک طرف ہٹا دیں۔ سیتا نے میرا بازو پکڑ لیا اور میرے ساتھ چپک کر چلنے لگی۔

بیس گز آگے ہم بائیں طرف مُڑ گئے۔ مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے جن کی وجہ سے ہمیں چلنے میں خاصی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ سیتا نے یہ عقل مندی کی تھی کہ ایک لمبی سی لکڑی اُٹھالی تھی جس سے وہ جالے صاف کرتی جا رہی تھی۔

تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم رُک گئے۔ اُس جگہ سرنگ انگریزی کے حرف وائی (Y) کی طرح آگے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ''اس طرف چلو..... پہلے ادھر دیکھتے ہیں۔'' سیتا نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

''ایسا کیوں نہ کریں کہ تم اس طرف چلی جاؤ اور میں دوسری طرف.....''

''نہ بابا.....'' سیتا نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ ''میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔''

''تو پھر چلو..... اس طرف چلتے ہیں۔'' میں نے سیتا کی بتائی ہوئی سمت میں اشارہ کیا۔

ہم بائیں طرف والی سرنگ میں داخل ہوگئے۔ کسی قدر گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ گرمی تھی جس سے ہمارے کپڑے بھی پسینے میں تر ہو رہے تھے۔ سیتا نے چادر اُتار کر پٹکے کی طرح کمر سے باندھ لی تھی۔ لیکن ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے گھٹن کم ہو رہی تھی۔ اور کسی طرف سے تازہ ہوا کی آمد کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اُس سنگم سے روانہ ہو کر تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں رُک جانا پڑا۔ آگے سرنگ بند ہوگئی تھی اور ایک دیوار کے ساتھ اُوپر جانے

کے لئے چند سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ اینٹوں کی یہ سیڑھیاں اگرچہ ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں لیکن استعمال کے قابل تھیں۔ تازہ ہوا یہیں کہیں سے آ رہی تھی۔

میں مشعل کی روشنی میں سرنگ کی چھت اور دیواروں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک جگہ مشعل کا شعلہ حرکت کرنے لگا۔ میں مشعل کو دوبارہ اُسی جگہ لے آیا۔ چھت کے قریب دیوار میں غالباً کوئی چھوٹا سا سوراخ تھا جس سے آنے والی تازہ ہوا مشعل کے شعلے کو متحرک کئے ہوئے تھی۔ میں نے ہاتھ اُس جگہ پر رکھا تو پتہ چل گیا کہ یہاں پر واقعی کوئی سوراخ موجود ہے جس سے ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں اگر چاہتا تو کوئی اینٹ اُکھاڑ کر اُس سوراخ کو بڑا کر سکتا تھا لیکن یہ حماقت ہوتی۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم کھنڈروں والی آبادی کے کس حصے میں تھے؟ اگر باہر سے روشنی کو دیکھ لیا گیا تو ہمارے لئے صورتحال خطرناک ہو سکتی تھی۔

یہاں سرنگ ختم ہو رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ یہاں کوئی نہ کوئی خفیہ راستہ ضرور ہونا چاہئے۔ میں مشعل کی روشنی میں فرش اور دیواروں کا جائزہ لینے لگا۔ سیتا بھی ٹارچ کی روشنی میں کوئی ایسی ہی چیز تلاش کر رہی تھی۔

''یہ..... یہ دیکھو!'' سیتا کی آواز سن کر میں تیزی سے اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بائیں طرف کی دیوار سے ایک اُکھڑی ہوئی اینٹ نکال رہی تھی۔ میں نے مشعل ایک طرف رکھ دی اور دونوں ہاتھوں سے اینٹ کو پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ اینٹ کے پیچھے ایک طاقچہ سا تھا جس میں ایک آہنی کنڈا لگا ہوا تھا۔

''ٹارچ بجھا دو اور اسے اپنے ہاتھ میں ہی رکھو!'' میں نے کہا اور مشعل بجھا کر دیوار کے قریب رکھ دی۔ سیتا نے بھی ٹارچ بجھا دی۔ میں نے اُس کنڈے کو حرکت دی تو مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ کنڈے والی دیوار کا ایک حصہ سرک کر پیچھے ہٹ گیا اور اتنی خلا پیدا ہو گئی کہ ایک آدمی آسانی سے گزر سکتا تھا۔ تازہ ہوا ہمارے چہروں سے ٹکرائی تو جان میں جان آئی۔

ہم اُس خلا سے دوسری طرف نکل آئے۔ یہ اس کھنڈر کا تہہ خانہ تھا جس کی چھت گری ہوئی تھی اور اُس راستے کے سامنے بھی اینٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

میں نے سیتا کو وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھتا ہوا اُوپر آ گیا۔ یہ مکان بالکل کھنڈر بن چکا تھا۔ دو چار شکستہ دیواریں ہی کھڑی تھیں۔ میں بہت محتاط انداز میں چلتا ہوا اُوپر آ گیا اور کھنڈر سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تقریباً سو گز دائیں طرف سامنے والی لین میں ایک بنگلہ نما مکان میں روشنی ہو رہی تھی۔ دوسری روشنیاں اُس سے چند گز آگے تھیں۔ بائیں طرف بھی تقریباً اتنے ہی فاصلے پر اِکا دُکا روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ تاہم اُس کھنڈر کے آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جسے آباد کہا جا سکتا۔

میں تین چار منٹ تک وہاں کھڑا صورتحال کا جائزہ لیتا رہا۔ اور پھر اینٹوں کے ڈھیر پر چلتا ہوا نیچے آ گیا اور سیتا کو صورتحال سے آگاہ کرنے لگا۔

''اوہ!'' سیتا چونکنے والے انداز میں بولی۔ ''قریب قریب دو بنگلے یقیناً وہ بنگلے ہیں جہاں ''موساد'' کے ماہرین یا ''را'' کے آفیسر مقیم ہوں گے اور ہمارے لئے بہتر موقع ہے۔ ہمیں چھپ کر گزرنا چاہئے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونک گیا۔ اور سیتا مجھے سرگوشیوں میں اپنا مطلب سمجھانے لگی۔ اُس کا خیال برا نہیں تھا۔ ہمیں ایک موقع مل رہا تھا اور ہمیں اس سے فائدہ ضرور اُٹھانا چاہئے تھا۔

''لیکن ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے، جس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں چاقو ساتھ لے آئی تھی.....'' سیتا نے کہتے ہوئے اپنے لباس میں چھپا ہوا چاقو نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

''سب سے پہلے ہمیں اس خفیہ راستے کا باہر والا میکنزم تلاش کرنا پڑے گا۔ ہم اس راستے کو کھلا تو نہیں چھوڑ سکتے۔'' میں نے کہا۔

اور پھر ہم وہ میکنزم تلاش کرنے لگے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ میکنزم باہر کی طرف بھی اس جگہ ہونا چاہئے جہاں اندر کی طرف دیوار میں وہ کنڈا تھا۔ میں وہاں سے اینٹیں ہٹاتا رہا۔ ٹارچ روشن کرنا خطرناک تھا۔ اینٹوں کے نیچے کوئی زہریلا کیڑا یا سانپ، بچھو وغیرہ ہو سکتا تھا۔ لیکن میں اس خطرے سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہا اور مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ اُس طرف بھی ایک کنڈا ہی تھا جسے دو تین مرتبہ استعمال کر کے اطمینان کر لیا۔ سیتا نے اپنی چادر سرنگ کے اندر ڈال دی۔ میں نے بھی اپنا چوغہ اُتار کر اندر پھینک دیا اور کنڈا کھینچ کر راستہ بند کر دیا۔ چند اینٹیں کنڈے کے آگے اس طرح رکھ دیں کہ میں اُن کے پیچھے ہاتھ ڈال کر کنڈے کو استعمال کر سکتا تھا۔ لیکن ان اینٹوں کی وجہ سے دن کی روشنی میں بھی وہ کنڈا نظر نہیں آ سکتا تھا۔

ہم رات کی تاریکی میں کھنڈروں کے اُس شہر میں شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے..... ہماری منزل وہ بنگلے تھے جہاں روشنی ہو رہی تھی۔

چاقو میرے ہاتھ میں تھا اور ٹارچ سیتا کے پاس تھی۔ میں نے سیتا کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ کسی بھی موقع پر ٹارچ جلانے کی کوشش نہ کرے۔ چاندنی میں ہر طرف پھیلے ہوئے کھنڈر بڑا پُراسرار تاثر دے رہے تھے اور ان کھنڈرات میں کہیں جلتی ہوئی برقی روشنیاں اس پُراسراریت کو مزید گہرا کر رہی تھیں۔

ہم شکستہ دیواروں اور ملبے کے ڈھیروں کی آڑ لئے آگے بڑھتے رہے۔ ایک جگہ گلی پار کر کے ہم دوسری طرف آ گئے۔ اب ہم اُس لائن میں تھے جس لائن میں قریب قریب وہ دو بنگلے تھے جہاں بتیاں جل رہی تھیں۔

پہلا بنگلہ اب ہم سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا..... ہم دونوں ایک جگہ رُک گئے اور اینٹوں کے ڈھیر کی آڑ سے بنگلے کی طرف دیکھنے لگے۔ بنگلے کے سامنے کمپاؤنڈ وال پانچ فٹ سے زیادہ اُونچی نہیں تھی۔ گلی میں چلتے ہوئے اندر نہیں دیکھا جا سکتا تھا لیکن ہم اُونچی جگہ پر تھے

اس لئے ہمیں وہ لان بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ لان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ گھاس پر تین چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک کافی ٹیبل بھی تھی لیکن کسی ذی رُوح کا نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ہم محتاط انداز میں چلتے ہوئے بنگلے کے پچھلی طرف آ گئے۔ اُس طرف بھی بنگلے کے سامنے مختصر سا لان تھا مگر چار دیواری نہیں تھی۔ دو کھڑکیوں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ دونوں کھڑکیاں مختلف کمروں کی تھیں۔ ہم دبے قدموں ایک کھڑکی کی طرف بڑھتے رہے۔

کھڑکی کے سامنے اندر کی طرف بہت باریک سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے شیشے کے ساتھ آنکھیں لگا کر اندر جھانکا۔ یہ بیڈ رُوم تھا مگر یہاں بھی کوئی انسان نظر نہیں آیا۔ میں نے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم دبے قدموں چلتے ہوئے دوسری کھڑکی کی طرف آ گئے اور یہاں شیشے سے آنکھ لگاتے ہی میں اُچھل پڑا..... یہ نشست گاہ قسم کا کمرہ تھا جہاں تین افراد نظر آ رہے تھے۔ دو مرد تھے اور ایک عورت..... مرد غیر ملکی تھے۔ چٹی چمڑی والے اور عورت ہندوستانی تھی۔

اُس عورت کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اُس کا رنگ بھی اگرچہ گورا تھا مگر چٹی چمڑی والوں کے نقطہ نظر کے مطابق اُس کا تعلق رنگ دار نسل سے تھا۔ اُس کا لباس بہت مختصر سا تھا۔ گداز بدن، لانبا قد اور چہرے کے نقوش بڑے تیکھے تھے۔ یوں تو اُس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن سب سے زیادہ کشش اُس کے سینے میں تھی..... سینے کے اُبھاروں کو قابو میں رکھنے کے لئے چولی کا کپڑا کم پڑ رہا تھا۔

دونوں آدمی چٹی چمڑی والے تھے۔ بالفاظ دیگر اُن کا تعلق یورپی نسل سے تھا اور مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ دونوں اسرائیلی ''موساد'' کے ایجنٹ تھے۔ یہودیوں..... اور ان حرامیوں کی عیاشی کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ اُن دونوں کی عمریں چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوں گی۔ ایک دراز قامت تھا جبکہ دوسرا درمیانے قد اور قدرے بھاری بھرکم جسم کا مالک۔ اُس کا سر درمیان سے گنجا تھا جو بلب کی روشنی میں انڈے کے چھلکے کی طرح چمک رہا تھا۔ اُس نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ جسم کے بالائی حصے پر نہ بنیان تھی اور نہ کوئی اور کپڑا۔ جبکہ دراز قد والے نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔

وہ دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹی کافی ٹیبل تھی جس پر انگلش اسکاچ کی بوتلیں اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ دونوں گلاسوں میں شراب موجود تھی۔ وہ لڑکی کبھی ایک کی گود میں جا گرتی اور کبھی دوسرے کی گود میں..... وہ دونوں اُس سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ اُس کے جسم پر چٹکیاں لیتے تو لڑکی ہنس پڑتی۔ ظاہر ہے اُسے اُن کا دل بہلانے کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا۔ اُسے اپنے کام میں خاص مہارت حاصل تھی۔ اور وہ اُن کی دلجوئی اور اُن کے جذبات بھڑکانے کا ہر حربہ استعمال کر رہی تھی۔

دراز قد والے نے اپنا گلاس اُٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ کر

لڑکی کا بازو پکڑ لیا اور اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔ گنجا کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ دراز قد والا لڑکی کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ گنجا صوفے پر بیٹھا رہ گیا۔ اُس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ کندھے ڈھلک گئے تھے اور چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔ اُسے شاید اپنے ساتھی کی یہ حرکت بری لگی تھی کہ وہ اُس لڑکی کو لے کر چلا گیا تھا۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس نے بھی کمرے میں سب کچھ دیکھا تھا مگر اُس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ دراز قامت شخص اُس لڑکی کو لے کر بنگلے کے کسی دوسرے کمرے میں گیا ہوگا۔ لیکن چند سیکنڈ بعد ہی وہ دونوں کسی پہلو والے دروازے سے باہر آ گئے۔ ہم کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ باریک پردہ پڑا ہوا تھا لیکن مدھم سی روشنی میں بھی اُنہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم دونوں تیزی سے نیچے جھک گئے۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے دوسرے بنگلے کی طرف چلے گئے۔ اور وہ جیسے ہی نگاہوں سے اوجھل ہوئے میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک بار پھر اندر جھانکنے لگا۔ اور پھر ٹھیک اُسی وقت ایک پست قامت ہندوستانی آدمی اُس کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اُس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے گنجے یہودی سے کچھ کہا تو وہ ایک دم چیخ اُٹھا۔

''جاؤ..... بھاگ جاؤ..... مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اور صبح سے پہلے مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔'' اُس نے یہ الفاظ اُردو اور ہندی میں کہے تھے۔ ''اور اُس حرامی امرناتھ سے کہنا صبح سات بجے مجھے رپورٹ کر دے۔ اور دروازہ بھڑ جانا۔ کتے اندر آ جاتے ہیں۔''

اُس ہندوستانی نے کچھ کہا، دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کمرے سے نکل گیا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہندوستانی اُس کا خدمت گار تھا اور اُس کے جانے کے بعد یہ گنجا یہودی اب اس بنگلے میں اکیلا ہی رہ گیا تھا۔ ہم نے چند منٹ اور انتظار کیا۔ میں نے ایک بار پھر اندر جھانکا۔ وہ گنجا یہودی اس طرح اُداس بیٹھا ہوا تھا جیسے اُس کی ماں مر گئی ہو۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم دبے پاؤں دیوار کے ساتھ ساتھ سرکنے لگے۔ اُس بنگلے کے پہلو میں بھی ایک دروازہ تھا جس سے وہ دراز قامت یہودی اور اُس کی ساتھی لڑکی نکل کر دوسرے بنگلے میں گئے تھے۔ دوسرا بنگلہ تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھا اور درمیان میں اینٹیں وغیرہ بکھری ہوئی تھیں۔

دروازے میں داخل ہونے سے پہلے سیتا نے ٹارچ وہیں رکھ دی اور میری طرف دیکھتے ہوئے چولی کی سامنے والی ڈوری کھول کر چولی کو ذرا نیچے کھینچ لیا۔ اس طرح اُس کے سینے کا اوپر کا حصہ برہنہ ہو گیا..... ''نظریں دوسری طرف رکھو! یہ منظر تمہارے لئے نہیں ہے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔ میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

ہم دونوں دبے قدموں اندر داخل ہوئے۔ میرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اور سیتا اپنے

شباب کے ہتھیاروں سے لیس تھی۔ وہ مجھ سے دو قدم آگے چل رہی تھی۔ یہ وسیع و عریض کمرہ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ ان حرامی یہودیوں کے لئے ان کھنڈروں میں بھی ضرورت اور عیاشی کی ہر چیز مہیا کی گئی تھی۔

سیتا نے مجھے وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور خود کمرے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی جہاں وہ گنجا یہودی بیٹھا ہوا تھا۔ میں ایک صوفے کی آڑ میں دبک گیا تھا۔

''ہیلو سر.....!'' سیتا کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ آ گئی تھی۔

میں نے صوفے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ کمرے کے اندر صوفے پر بیٹھا ہوا وہ گنجا یہودی اُچھل پڑا۔ سیتا کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی..... وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ارے..... کون ہے تو؟'' اُس نے پوچھا۔

''مجھے امرناتھ نے بھیجا ہے.....'' سیتا نے بڑے اطمینان سے یہ نام لے دیا جو کچھ دیر پہلے اس یہودی کے منہ سے سنا تھا۔ ''تمہاری اُداسی دُور کرنے کے لئے۔''

''آؤ..... آگے آؤ!'' وہ بولا۔ ''میں واقعی اُداس تھا۔ وہ حرامی بشارہ اُس لڑکی کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ حالانکہ اُسے میں آج کی رات اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا مگر..... میرے صبر کا پھل مجھے مل گیا۔ تم اُس سے کہیں زیادہ حسین ہو۔ آج کی رات خوب گزرے گی۔''

وہ سیتا کے سامنے رُک گیا۔ پہلے سرتاپا اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر اُسے کندھوں کے قریب دونوں بانہوں سے پکڑ لیا۔ ''آؤ..... وہاں بیٹھو اور مجھے اپنے ہاتھ سے شراب پلاؤ۔ آج مجھے لیزا بہت یاد آ رہی ہے۔'' اُس کی آواز میں ہلکی سی لکنت تھی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اب تک پی جانے والی شراب اُس کے دماغ پر کسی حد تک اثر انداز ہو چکی تھی۔

''لیزا کون.....؟'' سیتا نے اس انداز میں کہا جیسے وہ لیزا کا نام سن کر جل گئی ہو۔

''اوہ..... وہ میری دوست ہے۔ اسرائیل میں ہے، یہاں نہیں ہے۔ تم فکر مت کرو! وہ ہماری تنہائی میں مخل نہیں ہو گی۔'' گنجے نے کہا۔ ''آؤ..... میرے پاس بیٹھو! کیا نام ہے تمہارا ڈارلنگ؟''

''میرا نام ڈارلنگ ہے.....'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اُس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

گنجے یہودی نے اپنا ایک ہاتھ اُس کی کمر میں حمائل کر دیا اور اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ سیتا اُس کی طرف جھکتی چلی گئی۔ گنجے یہودی نے سیتا کے لبوں پر کس کرنے کے لئے اپنا چہرہ جھکایا تو سیتا ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔

''صبر سے کام لو ڈیئر.....'' وہ اُنگلی سے اُن کے ہونٹوں کو چھوتے ہوئے بولی۔ ''ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔''

سیتا نے ایک گلاس میں شراب انڈیلی اور گلاس اُٹھا کر اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ گنجے یہودی نے ایک چسکی لی اور گلاس اپنے ہاتھ میں لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''بیڈ رُوم میں چلو..... میں یہاں بیٹھے بیٹھے بور ہو چکا ہوں۔''

سیتا نے اُٹھتے ہوئے میز پر سے شراب کی بوتل بھی اُٹھا لی۔ اُس گنجے نے ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس سنبھال رکھا تھا اور دوسرا سیتا کی کمر میں حمائل کر رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی بیڈ رُوم میں داخل ہوئے میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے کے قریب آ گیا۔

سیتا نے شراب کی بوتل بیڈ کے ساتھ ملی ہوئی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ ابھی سیدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ گنجے یہودی نے اُسے دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا اور شراب کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر سیتا پر چھلانگ لگا دی۔ اُس کی یہ حرکت سیتا کے لئے غیر متوقع تھی۔ سیتا اُس کے بوجھ کے نیچے دب گئی۔ وہ ایک لمحہ کو بدحواس ہوئی اور پھر ہنستے ہوئے اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑانے لگی۔

اُس گنجے یہودی پر شاید جنون طاری ہو گیا تھا۔ وہ سیتا کو بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا..... کھینچا تانی سے سیتا کی چولی کی ڈوری ایک کندھے پر سے ٹوٹ گئی اور چولی نیچے لٹک گئی۔ سیتا اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر سائیڈ ٹیبل سے شراب کی بوتل کو گردن سے پکڑ کر اُٹھایا اور اُس گنجے یہودی کے سر پر وار کیا..... لیکن بوتل سر کی بجائے اُس کے کندھے پر لگی۔ وہ کراہ اُٹھا۔ اُس نے سیتا کو چھوڑ دیا اور اُچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ دنیا کی خطرناک ترین انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' کا ایجنٹ تھا۔ اس قسم کی صورتحال سے پہلے بھی دوچار رہا ہو گا اور ان سے نمٹنا بھی جانتا ہو گا۔ اس وقت بھی اُس نے فوراً ہی صورتحال کو تاڑ لیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ اُس کے ساتھ کسی قسم کا دھوکہ ہوا ہے۔ اُس نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا۔

مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ایک لمحہ کو اُلجھن سی اُبھری۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ اُس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ سیتا نے بڑی پھرتی سے اُس کا ایک پیر پکڑ لیا۔ وہ منہ کے بل اس طرح گرا کہ اُس کا اُوپر کا آدھا دھڑ بیڈ سے نیچے لٹک گیا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر ٹانگ کو زوردار جھٹکا دے کر پیر کو سیتا کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اس دوران میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل سے اُس پر ایک اور حملہ کیا۔ یہ وار بھی اوچھا پڑا اور بوتل بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ شراب کے چھینٹے میرے اُوپر بھی پڑے تھے، اُس گنجے یہودی پر اور سیتا پر بھی۔

میں نے پہلے بوتل اُٹھانے کے لئے چاقو بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور یہی مجھ سے غلطی ہوئی

تھی۔ مجھے شروع ہی میں اُس پر چاقو سے حملہ کرنا چاہئے تھا۔

گنجا یہودی اُلٹی قلابازی کھاتا ہوا پلنگ سے گرا۔ اُس کا ایک پیر میرے سینے پر لگا اور میں لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی صوفہ نما سیٹی پر گرا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی یہودی نے میرے اُوپر چھلانگ لگا دی..... میں پھرتی سے ایک طرف ہٹا اور یہودی جیسے ہی سیٹی پر گرا میں نے سنبھل کر چاقو سے اُس پر حملہ کر دیا۔ چاقو اُس کے پہلو میں لگا، لیکن وار زیادہ کاری نہیں تھا۔ یہودی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ لیکن اُس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور پلٹ کر میری کھوپڑی پر زوردار گھونسہ رسید کر دیا..... میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی سی چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ دوسرا گھونسہ میرے سینے پر لگا اور میں کراہتا ہوا سیٹی سے نیچے گر گیا۔ اُس کمبخت میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اُس کے گھونسے لوہار کے ہتھوڑے کی طرح وزنی تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ تیسرا حملہ کرتا سیتا نے اُس پر چھلانگ لگا دی اور اُسے ساتھ لیتی ہوئی قالین پر گری..... سیتا نے پہلے سے اُسے بانہوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہودی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر سیتا کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا بھوتوں اور بدروحوں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا جبکہ انسانوں سے مقابلہ کرنا دوسری بات تھی۔ وہ بھی ''را'' کی تربیت یافتہ تھی۔ وہ بزدل نہیں تھی۔ اُس کی جرأت اور بہادری میں پہلے بھی مختلف موقعوں پر دیکھ چکا تھا اور اب بھی وہ اسی دلیری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

گنجے نے کہنیاں چلاتے ہوئے سیتا پر وار کئے۔ ایک کہنی کی ضرب سیتا کی پسلیوں پر لگی۔ وہ کراہ اُٹھی..... لیکن اُس نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ لیکن اس کے بعد لگنے والی ضربوں نے اُس کی گرفت کمزور کر دی۔ گنجا یہودی مچل کر اُس کی گرفت سے نکلا اور اُس نے سائیڈ ٹیبل کی طرف چھلانگ لگا دی۔ وہ ٹیبل کی دراز کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سیتا ہوا میں اُڑتی ہوئی اُس کے اُوپر جا گری اور اُسے ساتھ لیتی ہوئی بیڈ پر ڈھیر ہو گئی.....

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ گنجا یہودی بیڈ سائیڈ ٹیبل سے پستول یا ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔ سیتا نے اُسے وہاں سے تو ہٹا دیا تھا لیکن خود اُس کے نیچے دب گئی تھی۔ گنجا اُس کے گلے پر گرفت جمانے کی کوشش کر رہا تھا اور سیتا پوری طرح مزاحمت کر رہی تھی۔

میرے دماغ میں اب تک دھماکے ہو رہے تھے لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا..... چاقو بھی میرے ہاتھ سے نکل کر قالین پر گر گیا تھا۔ میں نے چاقو اُٹھانے کی بجائے اُس گنجے پر چھلانگ لگا دی اور بازو اُس کی گردن میں ڈال کر اُسے پیچھے کھینچنے لگا۔ سیتا مچل کر اُس کے نیچے سے نکل گئی۔

گنجے یہودی نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کسی قدر اُوپر اُٹھایا اور مجھے ایک طرف پٹخ دیا۔ میں قلابازی کھاتا ہوا بیڈ کے دوسری طرف گرا۔ لیکن اس سے پہلے کہ گنجا خود سنبھل سکتا سیتا نے

اُس پر چھلانگ لگا دی اور اُسے بیڈ ٹیبل سے دُور رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

میں اُٹھ کر اُن کی طرف لپکا ہی تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا.....

''اے..... یہ کیا ہو رہا ہے..... کون ہو تم لوگ؟''

میں نے آواز کی طرف دیکھا۔ دروازے میں اُس یہودی کا وہی ہندوستانی خادم کھڑا تھا جسے کچھ دیر پہلے اُس یہودی نے رخصت کیا تھا۔ وہ وحشت زدہ سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ مُڑ کر باہر کی طرف بھاگا۔ یہ ہمارے لئے خطرے کا الارم تھا..... وہ ہندوستانی اگر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو ہماری زندگیوں کی ضمانت بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔

میں نے پوری قوت سے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور دروازے کے قریب گرا۔ وہ ہندوستانی اس دوران دوسرے کمرے کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ میں ایک بار پھر اُچھلا اور اُسے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی جا لیا..... وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ اُس کے منہ پر رکھا اور دوسرا بازو اُس کی گردن پر لپیٹ دیا۔ وہ چھوٹے قد اور دُبلے پتلے جسم کا مالک تھا اس لئے اُس پر قابو پانے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔

بھاگتے ہوئے وہ بری طرح چیخ رہا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ اُس کی آواز قریب والے بنگلے یا کسی اور جگہ پر نہ سن لی گئی ہو۔ سناٹے میں تو آواز ویسے بھی دُور تک پھیلتی ہے اس لئے میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس سے نمٹ کر اُس گنجے یہودی کا بھی قصہ تمام کر دیا جائے۔ کیونکہ اگر کوئی اس طرف آ گیا تو ہمارا بچنا مشکل ہو جائے گا۔

میں اُس کی گردن کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا..... کڑک کڑک کی دو تین آوازیں اُبھریں۔ وہ میری گرفت میں بری طرح مچل رہا تھا۔ میں نے ایک اور زوردار جھٹکا دیا اور اُسی وقت بیڈ رُوم سے فائر کی آواز سن کر چونک گیا.....

میں نے اُس ہندوستانی کو چھوڑ دیا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اُس کے منہ سے خرخراہٹ کی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے بیڈ رُوم کی طرف چھلانگ لگا دی اور دروازے کے قریب ہی ٹھٹک کر رُک گیا..... گنجا یہودی قالین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اُس کے سر سے خون اُبل رہا تھا اور سیتا دو تین قدم دُور کھڑی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

''اس کمبخت نے دراز سے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میرا ہاتھ اس سے پہلے پستول پر پہنچ گیا۔'' سیتا نے کہا۔

''اب بھاگو یہاں سے.....'' میں نے کہا اور دوڑ کر اپنا چاقو اُٹھا لیا۔ سیتا کی چولی کندھے کا ایک سٹرٹوٹ جانے سے سینے پر لٹکی ہوئی تھی۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے چولی درست کرنے

کی کوشش کی اور دروازے کی طرف لپکی۔ دوسرے کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے پستہ قامت ہندوستانی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ ہوسکتا ہے اُس کی چیخوں کی آواز نہ سنی گئی ہو۔ اگر سنی گئی ہو تو اُس پر زیادہ توجہ نہ دی گئی ہو۔ لیکن گولی چلنے کی آواز نے تو یقیناً ساتھ والے بنگلے میں گنجے یہودی کے دوسرے ساتھی بشارہ اور اُس لڑکی کو چونکا دیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے آس پاس کچھ اور لوگوں نے بھی یہ آواز سن لی ہو.....

میں نے باہر نکلتے ہوئے ایک بار پھر پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ کمرے کی سامنے والی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی سوا بارہ کا وقت بتا رہی تھی۔ میں نے سیتا کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ سیتا باہر نکلتے ہوئے دروازے کے قریب رکھی ہوئی ٹارچ اُٹھانا نہیں بھولی تھی۔ اُس کے سیدھے ہاتھ میں پستول بھی موجود تھا۔

ہم اُس بنگلے سے نکل کر عقبی سمت میں بھاگ رہے تھے کہ ساتھ والے بنگلے کی طرف سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ارے..... کون ہے..... رُک جاؤ!''

اس کے ساتھ ہی فضا فائر کی آواز سے گونج اُٹھی..... گولی ہمارے سروں کے اُوپر سے گزر گئی۔ سیتا نے بھی مُڑ کر جوابی فائر کر دیا۔

ہم دونوں بکھری ہوئی اینٹوں میں تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ دفعتہً سیتا کو ایک اینٹ سے ٹھوکر لگی۔ وہ بری طرح لڑکھڑا گئی۔ اگر میں اُسے نہ سنبھال لیتا تو وہ منہ کے بل گرتی۔

اُس بنگلے کی طرف سے اب شور کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہم اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے پہنچ گئے اور ٹھیک اسی وقت فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اُٹھی.. اس مرتبہ آٹومیٹک رائفل استعمال کی گئی تھی لیکن ہم اینٹوں کے ڈھیر کی آڑ مل جانے سے گولیوں سے محفوظ ہی رہے تھے۔

ہم ملبے کے ڈھیر اور کھنڈروں کی شکستہ دیواروں کی آڑ لیتے ہوئے گلی پار کر کے اُس کھنڈر میں پہنچ گئے جہاں سرنگ کا راستہ تھا۔ یہاں سیتا ایک بار پھر پتھروں سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچی تھی۔ فائرنگ کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ وہ لوگ گلی کے دوسری طرف والے کھنڈروں میں اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ میں نے دیوار کے قریب اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے ہاتھ ڈال کر اُس کنڈے کو کھینچا مگر کچھ نہیں ہوا۔ دو تین زوردار جھٹکے دیئے مگر وہ دیوار ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میرے جسم کے مسام تیزی سے پسینہ اُگلنے لگے..... پورے بدن پر کینچوے سے رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگے اور دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

''کیا ہوا.....؟'' سیتا کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

''میکنزم کام نہیں کر رہا..... شاید جام ہو گیا ہے۔'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

''کوشش کرو.....'' سیتا نے کہا۔

آوازیں قریب آ رہی تھیں..... اور پھر اس کھنڈر کے عین سامنے گلی میں دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی.....

''اُس طرف کھنڈروں میں دیکھو.....'' وہ جو کوئی بھی تھا چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''جو بھی نظر آئے گولی مار دو اُسے..... بچ کر نہیں جانا چاہئے۔''

مجھے سینے میں سانس ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا..... موت ہمارے سروں پر پہنچ چکی تھی اور ہمارے فرار کا راستہ بظاہر مسدود ہو چکا تھا..... سیتا کے پاس پستول تھا اور مجھے نہیں معلوم اس میں کتنی گولیاں تھیں؟ اگر پستول کا میگزین بھرا ہوا بھی ہو تو ہم کتنی دیر تک اُن کا مقابلہ کر سکتے تھے؟ چند منٹ..... گویا ہماری زندگی کے چند منٹ رہ گئے تھے.....

سیتا بھی شاید میری ہی طرح سوچ رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

''کوشش کرو شمروز.....'' اُس نے میرے کان کے قریب بہت ہلکی سی سرگوشی کی۔ اُس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ ''وہ لوگ سامنے گلی میں موجود ہیں اور کسی بھی لمحہ کوئی اس طرف آ سکتا ہے۔''

میں نے جھنجھلا کر کنڈے کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس مرتبہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی..... دیوار کا ایک حصہ آواز پیدا کئے بغیر آہستہ آہستہ شق ہونے لگا۔ میں نے کنڈے کو چھوڑ دیا اور بڑی احتیاط سے چند اینٹیں دیوار کے ساتھ رکھ دیں تاکہ اگر کوئی اس طرف آ کر تلاش بھی کرے تو کنڈا نظر نہ آ سکے۔ میں نے پہلے سیتا کو اندر دھکیلا اور پھر خود اندر داخل ہو کر اندر والا کنڈا کھینچ لیا۔ دیوار آہستہ آہستہ اپنی جگہ پر آنے لگی۔ تقریباً ایک اِنچ خلا باقی رہ گئی تھی کہ اُوپر اینٹوں کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی اور پھر ایک انسانی ہیولہ دکھائی دیا..... میں نے سیتا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنا سانس روک لیا.....

دیوار کی ایک اِنچ کی خلا بھی غائب ہو گئی۔ باہر سے اینٹوں کے لڑھکنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور ہم دونوں سانس روکے بیٹھے رہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا واپس چلا گیا تھا۔ اگر اُس نے دیوار میں خلا دیکھ لی ہوتی تو اب تک ہنگامہ مچ چکا ہوتا اور ممکن ہے دیوار کو گولیوں سے چھلنی کیا جا چکا ہوتا۔ سامنے گلی سے آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ سیتا میرے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ میں نے اُسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ ابھی ٹارچ نہ جلائے۔ دیوار میں کسی سوراخ سے ہوا آ رہی تھی اور اُس سوراخ سے باہر روشنی بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

ہم تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔ اب سامنے گلی میں آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں تاہم وقفے وقفے سے فائرنگ کی آوازیں بدستور ہماری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں اور یہ آوازیں کبھی قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتیں اور کبھی دُور سے۔ میں نے سیتا کے ہاتھ سے ٹارچ لے کر اُسے ایک لمحہ کو روشن کیا اور زمین پر پڑی ہوئی مشعل اُٹھا کر ٹارچ بجھا دی۔ سیتا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم تاریکی میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

تقریباً پچیس گز آگے نکل آنے کے بعد میں نے ٹارچ جلا لی۔ ہم کافی دُور نکل آئے تھے۔ باہر سے روشنی دیکھ لئے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ہم ٹارچ کی روشنی میں تیز تیز قدم

اُٹھاتے ہوئے چلتے رہے اور سرنگ کے دوشاخے پر پہنچ کر رُک گئے۔

''اب اس طرف دیکھا جائے.....'' سیتا نے دوسری سرنگ کی طرف اشارہ کیا۔

''پاگل ہوگئی ہو کیا.....؟'' میں نے اُسے گھورا۔ ''اس وقت کھنڈروں کے اس پورے شہر میں ہنگامہ مچا ہوا ہوگا۔ وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شبے کی بناء پر جنگل بھی مندر کی طرف آ نکلے۔ ایسی صورت میں ہمارا مندر میں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ دوسری سرنگ کو کل یا ایک دو دن بعد دیکھیں گے۔ اس وقت تک یہ ہنگامہ کسی قدر ٹھنڈا پڑ چکا ہوگا۔''

''یہ ہنگامہ آسانی سے ٹھنڈا نہیں ہوگا.....'' سیتا نے کہا۔ ''اس کیمپ میں ایک اسرائیلی ایجنٹ مارا گیا ہے۔ قاتل کی تلاش میں وہ ان کھنڈروں کی ایک ایک اینٹ اُکھاڑ پھینکیں گے۔ ہوسکتا ہے زیر تربیت آدمیوں ہی میں سے کوئی اُن کے قابو آ جائے۔ بعض لوگ ذرا سرکش قسم کے ہوتے ہیں اور مشکل سے قابو میں آتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ شبے کی زد میں آئیں گے۔''

''ہمارے مشن کا پہلا مرحلہ کامیاب ہوگیا..... ہم نے کیمپ میں کھلبلی مچا دی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک دو دن ہمیں بھی سکون سے بیٹھنا چاہئے تاکہ جنگل جیسے شخص کو ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ ہونے پائے۔ اب چلتی رہو! یہاں رُک کر وقت ضائع مت کرو۔''

''ایک منٹ.....'' سیتا بولی۔ ''یہ ڈوری کندھے پر باندھ دو! مجھے بڑی اُلجھن ہو رہی ہے۔'' اُس نے چولی اپنے سینے پر درست کی اور میں نے اُس کے کندھے پر ڈوری کی گرہ لگا دی۔ سیتا نے وہاں سے آتے ہوئے اپنی چادر اور میرا چوغہ بھی اُٹھا لیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں اُس نے اپنے بازوؤں پر ڈال رکھی تھیں۔

ہمیں مندر کے تہہ خانے سے باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ باہر آنے سے پہلے سیتا نے پستول دیوار کے اندر کی طرف رکھ دیا تھا۔ ہمارے پاس اس پستول کی موجودگی ہمارے لئے موت کا پیغام ثابت ہوسکتی تھی۔ تہہ خانے سے باہر آتے ہی میں نے سیڑھیوں کے نیچے پورے فرش پر ریت پھیلا دی تھی تاکہ فرش صاف ستھرا دیکھ کر کسی کو شبہ نہ ہوسکے۔

میں نے کچن سے ماچس لی اور مشعل روشن کر کے کمرے میں اٹکا دی اور ٹارچ بجھا کر تھیلے میں ڈال دی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں اور سیتا مندر کی اُوپر والی بالکونی میں کھڑے کھنڈروں کے شہر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گاڑیوں کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں اِدھر اُدھر متحرک نظر آ رہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ کیمپ کے اندر ہنگامی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ حرکت کرتی ہوئی روشنیاں بہت دُور دُور تک نظر آ رہی تھیں۔ اور پھر ان متحرک روشنیوں کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ دو گاڑیاں تھیں جن کے اُوپر بھی ایک ایک سرچ لائٹ لگی ہوئی تھیں اور وہ گاڑیاں خاردار جنگلے کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔ جنگل کے ساتھ ساتھ طویل چکر کاٹ کر وہ گاڑیاں تقریباً چالیس منٹ بعد گیٹ کے قریب تھوڑی دیر کو رُکیں اور پھر آگے بڑھنے

لگیں..... اب اُن کا رُخ مندر کی طرف تھا۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا اور ہم کھلی جگہ سے ہٹ کر دیوار کی آڑ میں ہو گئے۔ وہ دونوں جیپیں تھیں جن کے اُوپر سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں جن کی روشنی خاردار تاروں کے جنگلے پر پڑ رہی تھی۔ مندر کے قریب اُن جیپوں کی رفتار کچھ اور سست ہوگئی۔ سرچ لائٹوں میں جنگلہ پوری طرح نظر آ رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ یہ دیکھ رہے تھے کہ کسی جگہ سے جنگلہ تو نہیں توڑا گیا تھا؟

وہ جیپیں تیز روشنی میں جنگلے کو چیک کرتی ہوئی آگے بڑھ گئیں، اور شہر کے اندرونی حصے کی طرف سے آنے والی ایک اور گاڑی کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اُس گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیوں کا رُخ گیٹ کی طرف تھا..... وہ گاڑی وہاں ایک لمحہ کو رُکی اور پھر آگے بڑھنے لگی۔

''وہ گاڑی اسی طرف آ رہی ہے.....'' سیتا نے میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ جنگل کے علاوہ کون ہوسکتا ہے.....'' میں نے جواب دیا۔ ''غنیمت ہے اُسے یہ خیال کافی دیر بعد آیا۔ بہرحال اب نیچے چلو!''

ہم دونوں نیچے اُتر کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ میں نے مشعل اُٹھا کر دروازے کے باہر دیوار میں لگے ہوئے ایک ہُک میں پھنسا دی اور اپنا پجاریوں والا چوغہ پہن لیا۔ سیتا نے بھی زرد چادر ساڑھی کی طرح لپیٹ لی اور پیال پر لیٹ گئی۔ میں بھی اُس سے کچھ فاصلے پر لیٹ گیا۔

میرے کان گاڑی کے انجن کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ تقریباً تین منٹ بعد قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ دو یا اُس سے زیادہ آدمیوں کے قدموں کی آواز تھی..... میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ ٹانگیں سمیٹے کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔ قدموں کی آواز کمرے کے سامنے آ کر رُک گئی۔ اور پھر ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''جگاؤ اِن کو.....!''

دوسرے ہی لمحہ میرے پیر پر ٹھوکر لگی اور اس کے ساتھ ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''پنڈت جی..... اُٹھو.....! ضروری کام ہے تم سے۔''

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں..... اُن میں سے کسی نے ٹارچ جلا رکھی تھی جس کی تیز روشنی میں میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''کک..... کون ہے..... کیا بات ہے..... کون ہو تم لوگ؟'' میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے چہرے سے بدحواسی عیاں تھی۔

ٹارچ کی روشنی میرے چہرے سے ہٹی تو میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوسکا۔ وہ چار آدمی تھے

جن میں سے تین نے رائفلیں ہماری طرف تان رکھی تھیں اور چوتھے کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ جگل اُن میں نہیں تھا۔

مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا..... کیا ان لوگوں کو ہمارے بارے میں پتہ چل گیا تھا.....؟

میں نے سیتا کو بھی جگا دیا۔ اُس نے مجھ سے بھی زیادہ بدحواسی کا مظاہرہ کیا اور ہم دونوں خوفزدہ سی نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگے.....

صورتحال خاصی سنگین ہوگئی تھی.....!

○○○

وہ چاروں اگرچہ سادہ لباس میں تھے لیکن اُن کا تعلق آرمی یا کسی اور سکیورٹی ایجنسی سے تھا۔ ریوالور والا غالباً اُن کا آفیسر تھا۔ کیونکہ وہی احکامات جاری کر رہا تھا اور ہم سے سوالات کرنے والا بھی وہی تھی۔ اُس کی جگہ اگر جگل ہوتا تو بات مختلف ہوتی۔ میں سمجھ لیتا کہ وہ چیکنگ کے بہانے سیتا کے رُوپ سے نظریں سینکنے کے لئے آیا ہے۔ لیکن وہ جگل نہیں تھا۔ اُس شخص کے چہرے پر جگل سے زیادہ کرختگی تھی اور لگتا تھا کہ وہ کسی بات پر ہمارا لحاظ نہیں کرے گا۔ میں پنڈت تھا اور سیتا گوپی۔ ہم اس مندر کی سیوا کے لئے یہاں آئے تھے۔ پنڈتوں اور پجاریوں کو دیکھ کر تو لوگ ویسے بھی نمسکار کے لئے ہاتھ اُٹھا دیتے تھے۔ مگر اس شخص نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سرد مہری نظر آ رہی تھی۔

''تم لوگ کب سے یہاں ہو؟'' اُس نے باری باری ہم دونوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''چند روز ہوئے مہاراج!'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم مندر کی سیوا کیلئے یہاں آئے ہیں۔''

''مندر کی سیوا کے لئے کسی پنڈت یا پجاری والی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر شہر سے میلوں دُور اس ویرانے میں ایک ناری کا کیا کام؟'' اُس کی نظریں سیتا کی طرف اُٹھ گئیں۔

''یہ کوئی عام ناری نہیں مہاراج، گوپی ہے۔ دھرم کی سیوک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دھرم کی سیوا تو کوئی بھی کر سکتا ہے، شہر کی آبادی ہو یا ویرانہ۔ یہ مندر ہے تو بھگوان کا استھان۔ اگر ایک گوپی سیوا کی لگن لے کر یہاں آ گئی ہے تو.....''

''یہاں تمہارے پاس کوئی اور بھی آتا ہے؟'' اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''اس ویرانے میں کون آئے گا مہاراج؟'' میں نے جواب دیا۔ ''پر ہاں..... شری جگل ایک بار یہاں ضرور آئے تھے۔ اُنہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اپنے افسروں سے بات کر کے مندر کے لئے بتی کا بندوبست کر دیں گے۔''

''شری جگل.....'' اُس نے نام دُہرایا۔ ''تمہارا مطلب ہے اس کیمپ کا سکیورٹی انچارج شری جگل ناتھ؟''

''اُنہوں نے یہی بتایا تھا مہاراج!'' میں نے جواب دیا۔ ''اب کے آویں گے تو میں اُنہیں کہوں گا کہ مندر میں بتی کا بندوبست ذرا جلدی کر دیں۔''

''کچھ دیر پہلے..... میرا مطلب ہے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے تم لوگوں نے کیمپ کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں مہاراج..... ہم تو سو رہے تھے۔ آپ لوگوں نے جگایا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کوئی اس طرف بھاگ کر تو نہیں آیا..... میرا مطلب ہے کیمپ کی طرف سے۔ دیوار یا جنگلہ پھاند کر؟'' اُس نے کہتے ہوئے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''ہم سو رہے تھے مہاراج.....'' میں نے اپنا جواب دُہرایا۔ ''ہم نے نہ گولیاں چلن کی آواز سنی نہ کسی کے دیوار پھاندنے کی۔''

وہ خاموش ہو کر دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اُس نے اپنے ایک ماتحت کو اشارہ کیا، اُس نے اپنی رائفل دوسرے کو تھما دی اور آگے بڑھ کر ہمارے بیگ کی تلاشی لینے لگا۔ دو منٹ بعد ہی اُس نے اُٹھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم دونوں ادھر آ جاؤ.....'' پارٹی انچارج نے اشارہ کیا۔

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ کمرے میں حالانکہ مشعل جل رہی تھی لیکن اُن سب نے اپنی ٹارچیں بھی روشن کر رکھی تھیں۔ آفیسر نے ٹارچ اپنے ایک ماتحت کو تھما دی، ریوالور جیب میں ڈال لیا اور میری جامہ تلاشی لینے لگا۔ اُس نے میرے جسم کو اُوپر سے نیچے تک ٹٹول کر دیکھا اور پھر سیتا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سیتا نے اپنے بدن پر اوڑھی ہوئی چادر زمین پر پھینک دی اور چولی بھی اُتار دی۔

''یہ..... یہ کیا کر رہی ہو تم.....؟'' آفیسر بدحواس سا ہو گیا۔

''تم میری بھی تلاشی لینا چاہو گے۔'' سیتا بولی۔ ''میں تمہیں اپنے شریر کو ہاتھ نہیں لگانے دُوں گی۔ کپڑے اُتار کر پھینک رہی ہوں..... انہیں اچھی طرح چیک کر لو۔ اور چاہو تو نظروں سے میرے شریر کو بھی ٹٹول لو۔ پر میں تمہیں ہاتھ نہیں لگانے دُوں گی۔''

''شما کر دو دیوی جی!'' آفیسر نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے، پھر زمین پر پڑی ہوئی چولی اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی۔ ''آپ کپڑے پہن لیجئے دیوی جی! میں آپ کے شریر کو چھونے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔'' یہ شخص جنگل کے مقابلے میں شریف ثابت ہوا تھا۔ اُس نے نظریں بھی جھکا رکھی تھیں۔ سیتا نے چولی پہنی اور پھر چادر بھی اُٹھا کر اوڑھ لی۔

''اگر آ گیا ہو تو ہم مندر کی تلاشی لے لیں مہاراج؟'' اُس نے پہلی مرتبہ مجھے مہاراج کہہ کر مخاطب کیا۔ اس مرتبہ اُس کے لہجے میں نرمی تھی۔

''میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ مگر مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے کیمپ میں ایک درگھٹنا ہو گئی ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''یہاں سرکار کی طرف سے ایک اہم منصوبے پر کام ہو رہا ہے جس پر کچھ بدیشی ماہرین سے بھی مدد لی جا رہی ہے۔'' ڈھائی گھنٹے پہلے کسی نے ایک بدیشی کے بنگلے میں گھس کر اُس کی ہتھیا کر دی ہے۔ اُس کا پستول بھی چوری ہو گیا ہے..... بلکہ اُسے اُس کے پستول سے گولی ماری گئی تھی۔ ایک مقامی آفیسر بھی مارا گیا ہے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ہو سکتا ہے یہ

کارروائی اندر ہی کے کسی آدمی نے کی ہو..... مگر باہر کا بھی کوئی آدمی ہو سکتا ہے جو کسی طرح اندر گھس گیا ہو۔ یہاں کی سکیورٹی کا انتظام فول پروف ہے مگر.....''

''مجھے یہ سن کر دُکھ ہوا مہاراج!'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''تم یہاں تلاشی لے لو..... اپنی تسلی کر لو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ یہ بھگوان کا استھان ہے۔ یہاں شانتی ملتی ہے۔ من کا سکھ ملتا ہے، ہتیاروں کو یہاں شرن (پناہ) نہیں مل سکتا۔''

آفیسر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ اطراف میں پھیل گئے۔ ہمارے کمرے کی تلاشی وہ لے چکے تھے۔ اُنہوں نے باقی تینوں کمروں کو بھی چیک کر لیا۔ دو آدمی اُوپر چلے گئے اور ایک باورچی خانے کی طرف۔ آفیسر بھی اُس کمرے میں آ گیا جہاں اُوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی اُوپر جائے گا مگر وہ وہیں رُک کر ٹارچ کی روشنی میں اُس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں بھی اُس کے ساتھ تھا۔ ٹارچ کی روشنی سیڑھیوں کے پیچھے دیوار پر رینگتی ہوئی نرش پر اُس جگہ رُک گئی جہاں کنکریٹ کا وہ بلاک کسی قدر نمایاں تھا.....

''یہ اینٹ.....''

''سارا فرش اُکھڑ رہا ہے مہاراج!'' میں نے جلدی سے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''یہ صدیوں پرانا ہے۔ اس کی اینٹیں جگہ جگہ سے اُکھڑ رہی ہیں۔ اُوپر چھت کو دیکھو مہاراج..... اور اُدھر.....'' میں اُسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آیا اور چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ دیکھو مہاراج..... چھت کا سارا پلستر اُدھڑ گیا ہے۔ دیواروں کی اینٹیں بھی اُکھڑ رہی ہیں۔ ہم شہر واپس جا کر پربندھک کمیٹی سے کہیں گے کہ اس مندر کی مرمت کا وچار کیا جائے ورنہ چند برسوں میں یہ چھت گر جائے گی۔''

آفیسر ٹارچ کی روشنی میں چھت اور دیواروں کا جائزہ لیتا رہا۔ چھت کا پلستر واقعی کئی جگہوں سے اُدھڑا ہوا تھا اور دیواروں پر بھی کئی جگہوں سے اینٹیں اُکھڑی ہوئی تھیں۔

''یہ کام تو سرکار کا ہے مہاراج!'' میں نے کہا۔ ''مندروں کی مرمت تو سرکار کو کروانی چاہئے۔''

''سرکار مندروں کی مرمت اس لئے نہیں کروا سکتی کہ مندروں کا پیسہ سرکار کے خزانے میں نہیں جاتا۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''یہ تو پربندھک کمیٹی کا کام ہے، اُنہیں مرمت کروانی چاہئے۔''

''پر مہاراج.....'' میں نے کہا۔ ''کچھ روز پہلے جانکاری ہوئی تھی کہ سرکار نے مسلمانوں کی کئی مسیتوں (مسجدوں) کو آثارِ قدیمہ قرار دے کر اوقاف کی تحویل میں دے دیا ہے اور اب سرکار کے خرچے پر اُن مسیتوں کی مرمت ہو گی۔ اگر سرکار کے خرچ پر مسیتوں کی مرمت ہو سکتی ہے تو مندر کی کیوں نہیں؟''

''بڑے بے وقوف ہو.....'' اُس نے مجھے گھورا۔ ''وہ سرکار کی ایک الگ پالیسی ہے۔ مسیتوں کو سرکاری تحویل میں لے کر بند کیا جا رہا ہے۔ تم تو پنڈت ہو..... تمہیں مجھ سے زیادہ جانکاری ہونی چاہئے۔''

''سرکار کی پالیسیوں کو ہم کیا سمجھیں سرکار.....'' میں نے بے بسی سے کہا۔ اُس کے تینوں ماتحتوں کے واپس آ جانے سے بات ادھوری رہ گئی۔

''کچھ نہیں سر.....!'' اُن میں سے ایک آفیسر سے کہا۔ ''سب جگہوں پر دیکھ لیا..... بالکل کلیئر ہے۔''

''ٹھیک ہے.....'' آفیسر نے کہا اور پھر میری طرف مُڑ گیا۔ ''شما کیجئے مہاراج۔ اور دیوی جی! آپ سے بھی شما چاہتا ہوں، آپ کی نیند خراب کی۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہم تو سیوک ہیں، دھرم کے بھی اور دیش کے بھی۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ چاروں مندر سے نکل کر جیپ کی طرف چل پڑے۔ میں اور سیتا سیڑھیوں پر رُک گئے۔ وہ چاروں جیپ میں بیٹھ گئے۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور جیپ یوٹرن لیتی ہوئی واپس چلی گئی۔ ہم اُس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک جیپ کیمپ میں داخل نہیں ہو گئی۔

''بچ گئے.....'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا، اور واپس جانے کے لئے مُڑ گئے۔

''تمہاری ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے۔'' سیتا میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''جب اُس کمبخت نے سیڑھیوں کے پیچھے فرش پر اُس اینٹ کے بارے میں پوچھا تھا تو میں تو کانپ اُٹھی تھی۔ لیکن تم بڑی عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اُسے باہر نکال لائے اور اُس کا دھیان ہٹ گیا۔''

''اگر میں عقلمندی سے کام نہ لیتا تو شاید اُس اُکھڑی ہوئی اینٹ پر اُسے شک ہو جاتا۔ تہہ خانے کا راز کھل جاتا اور موت ہمارا مقدر بنتی..... ہمارے بچاؤ کا کوئی راستہ نہ رہتا۔''

ہم کمرے میں جانے کی بجائے اُوپر چلے گئے اور کیمپ کی طرف دیکھنے لگے۔ متحرک روشنیاں ثابت کر رہی تھیں کہ وہاں یہودی کے قاتلوں کی تلاش کے سلسلے میں سرگرمیاں اب بھی جاری تھیں۔

''اور تم نے وہ کیا حرکت کی تھی؟'' میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی حرکت.....؟'' سیتا نے پوچھا۔

''اُن کے سامنے کپڑے کیوں اُتارنے لگی تھیں؟'' میں نے کہا۔

''میں ایسا نہ کرتی تو وہ بھی اُس حرامی جگل کی طرح میری تلاشی لیتا۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''وہ میرے شریر کو ٹٹولتا، نوچتا۔ اس سے بچنے کے لئے ہی میں نے یہ نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا جو کامیاب رہا۔''

''اگر اس قسم کا کوئی نفسیاتی حربہ ناکام ہو گیا تو سر پکڑ کر روتی رہو گی۔'' میں نے کہا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک اُوپر کھڑے کیمپ کی طرف دیکھتے رہے اور پھر نیچے اپنے کمرے میں آ گئے۔ ہم ایک سنگین صورتحال سے دوچار ہوتے ہوتے بچے تھے۔ دراصل ہم دونوں کی ذہانت کام کر گئی تھی۔ تہہ خانے سے باہر نکلتے ہوئے سیتا نے پستول اندر ہی چھوڑ دیا تھا، اور اگر وہ پستول ساتھ لے آتی اور تلاشی کے دوران برآمد ہو جاتا تو اُسے شناخت بھی کر لیا جاتا اور پھر

ہماری زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ میں نے پہلی عقلمندی یہ کی تھی کہ سیڑھیوں کے نیچے فرش پر ریت پھیلا دی تھی۔ اگر وہ جگہ صاف ستھری ہوتی تو اُکھڑی ہوئی اینٹ کو دیکھ کر اُسے یقیناً شک ہوتا۔ اُکھڑی ہوئی اینٹ پر اُس کی نظر پڑ گئی تھی لیکن میں نے مندر کی خستہ حالی کا رونا رو کر اُس کی توجہ ہٹا دی تھی۔

مسجدوں کا ذکر میں نے جان بوجھ کر چھیڑا تھا، لیکن اس سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ ہندوستان کی اقلیتوں کے حوالے سے ہند سرکار کس قسم کی پالیسیوں پر عمل پیرا تھی۔ کشمیر میں پچھلے 54 برسوں سے جو کچھ ہو رہا تھا وہ میں دیکھ رہا تھا۔ ہندوستان میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ آئے دن نسلی فسادات ہند سرکار کی انہی پالیسیوں کی عکاسی کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ بابری مسجد اور رام مندر کا مسئلہ اُٹھا تھا تو انتہا پسند ہندو تنظیموں نے پوری طرح حکومت پر دباؤ ڈالا تھا۔ پاکستان کی سرزمین پر جنم لینے والا لال کشن ایڈوانی مسلمانوں اور بابری مسجد کے خلاف چلائی جانے والی تحریکوں میں پیش پیش تھا اور وہی ایڈوانی آج کل ہندوستان کا وزیر داخلہ بنا ہوا تھا۔ اُس جیسے انتہا پسند اور متعصب اور کٹر ہندوؤں کے ہوتے ہوئے ہندوستان میں آباد اقلیتیں سکھ کا سانس نہیں لے سکتیں۔ مسلمانوں کے ساتھ تو 54، 55 سال سے پنگے بازی ہو رہی تھی، اب اُنہوں نے عیسائیوں کا جینا بھی حرام کر دیا تھا۔ گرجا گھروں کو نذر آتش کیا جا رہا تھا، پادریوں کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔ یسوع مسیح کے ماننے والوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اور اب متعصب ہندوؤں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا تھا۔ ہندوستان کی سینکڑوں قدیم مسجدوں کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ یہ مسجدیں مندروں کی جگہ بنائی گئی ہیں اور اب انہیں توڑ کر دوبارہ مندر بنایا جائے گا۔ ہند سرکار اُن کٹر اور متعصب ہندوؤں کا پوری طرح ساتھ دے رہی تھی۔ انتہا پسند ہندو تنظیموں نے جن سینکڑوں مسجدوں کی نشاندہی کی تھی ہند سرکار نے اُنہیں آثارِ قدیمہ قرار دے کر اُنہیں اوقاف کی تحویل میں دے دیا تھا اور اُن پر تالے ڈال دیئے گئے تھے۔

''یہی تو سرکار کی پالیسی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''لڑاؤ اور حکومت کرو۔ سیاسی شر انگیزیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں مگر ہندو حکمرانوں کو زیادہ فائدہ نسلی فسادات سے ہوتا ہے۔''

''سکھوں کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا ہے.....'' میں نے جواب دیا۔ ''اُن پر غداری کے الزامات لگا کر اُن کے حقوق سلب کئے گئے۔ یہاں تو کوئی بھی اقلیت محفوظ نہیں ہے۔''

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نیند آنے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور ہمیں یہ رات باتوں ہی میں گزارنی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور سیتا میرے گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور ہم باتیں کرتے رہے۔ ایک کے بعد دوسرا موضوع چھڑ جاتا۔

رات آنکھوں میں بیت گئی۔ رات کا اندھیرا رخصت ہونے لگا تھا۔ بس یہ شائبہ تھا کہ دن کا اُجالا جنم لینے والا ہے۔ بیٹھے بیٹھے میری کمر دُکھنے لگی تھی۔ سیتا اُس وقت اونگھ رہی تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اُسے اپنے سے الگ ہٹایا اور لیٹنا ہی چاہتا تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا.....

پہلے تو میں نے اُسے اپنا واہمہ سمجھا لیکن پھڑ پھڑاہٹ کی وہ آواز بتدریج واضح ہوتی چلی گئی.....

''ہیلی کاپٹر.....!''

ہاں وہ ہیلی کاپٹر ہی تھا جس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سیتا کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

''کیا ہے.....؟'' وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''یہ آواز سن رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''کیسی آواز.....؟'' وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُس کے دماغ پر غالباً نیند کا خمار طاری تھا اور وہ بدحواس سی نظروں سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''ہیلی کاپٹر.....'' میں نے کہا۔ ''فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز سن رہی ہو؟''

سیتا نے سر کو ایک دو جھٹکے دیئے اور پھر وہ بھی چونک گئی اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اب اُس کے حواس قابو میں آ چکے تھے۔

''تم یہیں بیٹھو..... میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔'' میں اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

''میں بھی چلتی ہوں۔'' سیتا بھی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ ہیلی کاپٹر کی آواز دائیں طرف سے آ رہی تھی لیکن وہ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے مندر کے باہر کھلی جگہ پر نکلنا مناسب نہیں سمجھا اور سیڑھیوں والے کمرے میں گھس گیا۔ سیتا بھی میرے پیچھے ہی تھی۔

ہیلی کاپٹر کی آواز ہمارے سروں کے عین اُوپر سنائی دے رہی تھی۔ ہم دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ فضا میں ابھی اندھیرا سا تھا۔ زیادہ دُور تک کوئی چیز واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ہیلی کاپٹر مندر کے اُوپر سے گزر کر کیمپ کی طرف آ گیا۔ اُس کی بتیاں جل رہی تھیں اور نیچے کی ایک سرچ لائٹ بھی روشن تھی۔ کاپٹر کا رُخ کیمپ کے مشرقی حصے کی طرف تھا جبکہ وہ بنگلہ مغرب کی طرف تھا جہاں رات کو ہم نے ایک یہودی ایجنٹ اور اُس کے ہندوستانی خدمتگار کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔

ہیلی کاپٹر زمین پر اُتر گیا..... مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہاں کوئی ہیلی پیڈ تھا اور کاپٹر یقیناً پہلے بھی آتے رہتے ہوں گے۔ اُس کاپٹر کے لینڈ کرنے کے تقریباً دس منٹ بعد کھنڈروں کے مغربی حصے سے تین گاڑیوں کی روشنیاں نظر آنے لگیں..... وہ روشنیاں کھنڈروں میں چکر کھاتی ہوئی مشرق کی طرف جا رہی تھیں۔ اور بالآخر کاپٹر کے قریب پہنچ کر رُک گئیں۔

کاپٹر کی ساری سرچ لائٹیں روشن تھیں۔ آس پاس کا وسیع علاقہ بھی روشنی کی زد میں تھا۔ اور اب ویسے بھی تاریکی چھٹ گئی تھی اور دن کا اُجالا پھیلنے لگا تھا اور ہیلی کاپٹر اور گاڑیوں کے آس پاس کچھ لوگوں کی نقل و حرکت بھی دکھائی دینے لگی تھی۔

دو اسٹریچر اُن گاڑیوں سے اُتار کر ہیلی کاپٹر میں منتقل کر دیئے گئے۔ ان کے ساتھ دو آدمی بھی ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کاپٹر آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہونے لگا۔ کاپٹر نے دوسری طرف کا ایک چکر لگایا اور فضا میں بتدریج بلند ہوتا ہوا ہماری طرف آنے لگا۔ ہم دیوار کی آڑ میں اس طرح کھڑے ہو گئے کہ اُوپر سے ہمیں نہ دیکھا جا سکے۔

اب دن کی روشنی پھیل رہی تھی اور ہر چیز واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ وہ فوجی ہیلی کاپٹر تھا جو مندر کے اُوپر سے گزر کر جیسلمیر کی طرف چلا گیا تھا۔ میں مُڑ کر سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔

''اُن دونوں کی لاشیں بھیجی گئی ہیں۔'' سیتا نے کہا۔

''اُن کے ساتھ دو آدمی بھی گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا ایسا ممکن ہے کہ اپنے ایک ساتھی کی ہلاکت کے بعد اسرائیلی ایجنٹ واپس چلے گئے ہوں؟''

''صرف دو آدمی گئے ہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''اگر وہ دونوں یہودی بھی تھے تو کم سے کم پانچ اسرائیلی ایجنٹوں کو یہاں موجود ہونا چاہئے۔ کیونکہ میری معلومات کے مطابق اس کیمپ میں ٹریننگ کے لئے آٹھ یہودی ایجنٹوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ایک مر گیا۔ اگر دو چلے گئے تو پانچ کو اب بھی کیمپ میں موجود ہونا چاہئے۔''

کیمپ میں اب زندگی بیدار ہو رہی تھی۔ لوگوں کی نقل و حرکت دکھائی دینے لگی۔ ہم نیچے آ گئے۔ میں مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور سیتا چائے بنانے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں رات کو اگرچہ ایک لمحہ کو بھی سو نہیں سکا تھا لیکن اُس وقت بھی نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ میں اُس یہودی کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے گزشتہ رات ہم نے موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اُس کے قتل کی اطلاع نہ صرف دہلی بلکہ اسرائیل بھی پہنچ چکی ہوگی۔ دہلی اور تل ابیب میں تو کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ یہ یہودی ایجنٹ ایک باقاعدہ معاہدے کے تحت یہاں آئے تھے اور اُن کی حفاظت کی ذمہ داری ہندسرکار پر عائد ہوتی تھی۔ ہوسکتا ہے اس ایک یہودی کے قتل سے اسرائیل یہ معاہدہ منسوخ کر کے اپنے آدمیوں کو واپس بلا لے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ مسلمانوں کے خلاف یہود و ہنود کے عزائم سے پوری دنیا واقف تھی۔ اُنہیں تو ہر ملک میں اور ہر سطح پر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔ یہ دونوں شیطانی قوتیں دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرے سے تعاون کرنے کو تیار تھیں۔ پاکستان کے ایٹمی قوت بننے سے کئی سال پہلے بھی یہودیوں اور ہندوؤں نے پاکستان کے خلاف ایک نہایت گھناؤنی سازش تیار کی تھی۔ اسرائیلیوں اور ہندوؤں کا وہ منصوبہ بڑا خوفناک تھا۔

وہ منصوبہ اسلام آباد سے چند میل دُور کہوٹہ پر حملہ کر کے اٹامک لیبارٹری کو تباہ کرنے کا تھا۔ انڈین ایئر فورس کے جیگوار طیارے سرینگر ایئر پورٹ پر تیار کھڑے تھے۔ اُن طیاروں کے پائلٹ اسرائیلی تھے جو پرواز کے لئے اشارے کے منتظر تھے لیکن پاکستان کو بروقت اس سازش کی اطلاع مل گئی اور آن واحد میں کسی بھی صورتحال سے نمٹنے کی تیاری مکمل کر لی گئی..... پاک

فضائیہ کے شاہین شکار کی تلاش میں فضا میں پہنچ چکے تھے۔ مگر بھارتی حکمرانوں کو بھی پاکستان کی طرف سے اس تیاری کی اطلاع مل گئی اور اس طرح اُن کی یہ سازش ناکام ہوگئی۔

اور اب ان دونوں شیطانی قوتوں نے پاکستان اور کشمیر کے خلاف جو منصوبہ بنایا تھا وہ بہت خطرناک تھا اور اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسرائیلی انٹیلی جنس ''موساد'' کے چند خطرناک ایجنٹ یہاں آئے ہوئے تھے جن میں سے ایک گزشتہ رات ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایک یہودی کے مارے جانے سے یہ منصوبہ ختم کر دیا جائے گا۔

چائے پینے کے دوران بھی میں اور سیتا اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ سورج طلوع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد موسم میں تبدیلی آنے لگی۔ پہلے ہوا کے جھونکے بڑے خوشگوار اور فرحت بخش لگ رہے تھے۔ لیکن اب آہستہ آہستہ ہوا میں ریگستان کی گرمی شامل ہوتی جا رہی تھی۔

آٹھ بجے کے قریب ایک جیپ کو مندر کی طرف آتے دیکھ کر ہم محتاط ہو گئے۔ جیپ مندر کے سامنے آ کر رُکی اور جگل نفن اُٹھائے جیپ سے اُتر کر ہماری طرف آنے لگا۔ میں نے معنی خیز نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا۔ سیتا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی اور وہ اپنے جسم پر چادر درست کرنے لگی۔

جگل ہمارے لئے ناشتہ لے کر آیا تھا۔ نفن کے ایک ڈبے میں اُبلے ہوئے چار انڈے تھے، ایک میں آلو میتھی کی بھاجی اور تیسرے ڈبے میں چار پراٹھے تھے۔ سیتا نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور ہم بے تکلفی سے یہ دعوت اُڑانے لگے۔ اگر جگل کسی لالچ میں ہمیں ترمال کھلانے پر تلا ہوا تھا تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

ناشتے کے دوران زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ ہم نے گزشتہ رات کیمپ میں ہونے والی گڑبڑ کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ تاہم میں نے رات کو یہاں آنے والے سکیورٹی آفیسروں اور مندر کی چیکنگ کا ذکر کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''وہ کشوری لال ہوگا..... میرا ایک ڈپٹی ہے۔'' جگل نے کہا۔ ''اُس پر بھی بہت ساری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ رات کو کیمپ میں جو درگھٹنا ہوئی تھی اس کے پیش نظر اُس نے مندر کو چیک کرنا ضروری سمجھا ہوگا۔ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی اُس نے؟'' جگل نے کہتے ہوئے معنی خیز نظروں سے سیتا کی طرف دیکھا۔

''نہیں سرکار..... اُنہوں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ پر درگھٹنا کیا ہوئی تھی کیمپ میں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''کسی نے دو آدمیوں کی ہتیا کر دی۔ اُن میں ایک بدیشی مہمان بھی تھا۔'' جگل نے کہا اور پھر خود ہی رات کو کیمپ میں ہونے والی گڑبڑ کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

''اُن دونوں کی لاشیں آج صبح ہیلی کاپٹر سے جے پور بھیج دی گئی ہیں۔ وجے کی لاش اُس کے وارثوں کے حوالے کر دی جائے گی اور بدیشی کی ڈیڈ باڈی ایک خصوصی طیارے سے تل ابیب

روانہ کر دی جائے گی۔''

میں نے تل ابیب کے حوالے سے کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

''ہتیارے پکڑے گئے یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''رات کو دو آدمیوں کو حراست میں لیا گیا تھا.....'' جگل نے بتایا۔ ''وہ دونوں ٹربل میکر سمجھے جاتے تھے۔ اُن سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ اُن پر سختی کی جائے گی تو وہ اس درگھٹنا کی ذمہ داری قبول کر لیں گے۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اصل ہتیارے ہماری گرفت میں آ سکیں گے۔''

''کیوں.....؟'' میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''یہ کوئی گہری سازش ہے.....'' جگل نے جواب دیا۔ ''اس قسم کی سازش تیار کرنے والے لوگ آسانی سے بے نقاب نہیں ہوتے۔''

جگل تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھا رہا۔ سیتا نے نفن دھوئے بغیر اُس کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ جب جانے لگا تو سیتا نے جان بوجھ کر اپنے ایک کندھے پر سے چادر ڈھلکا دی۔ جگل کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی۔ اور پھر جیپ پر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا تھا کہ وہ ہمارے لئے رات کا کھانا لے کر آئے گا۔

''تمہاری یہ ''آ بیل مجھے مار'' والی حرکتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔'' جگل کے جانے کے بعد میں نے سیتا کو گھورتے ہوئے کہا۔

''کبھی کبھی تو تم بہت بیوقوفی کی باتیں کرنے لگتے ہو۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں یہ سب کچھ پیش بندی کے طور پر کرنا چاہتی ہوں۔ تہہ خانے کا راستہ ہی تلاش کر لینا کافی نہیں۔ ہمیں کچھ اور معلومات بھی درکار ہیں اور اس سلسلے میں جگل ہی ہمارے کام آئے گا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔ اس لئے میں اُس کی آتش شوق کو اس حد تک بھڑکا دینا چاہتی ہوں کہ جب وقت آئے تو وہ میرے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار نہ کرے۔''

''تم ''را'' میں رہ چکی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم جانتی ہو کہ سیکرٹ ایجنٹوں سے تعلق رکھنے والے آسانی سے زبان نہیں کھولتے۔''

''اور میں زبان کھلوانے کے طریقے جانتی ہوں۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے چادر اُتار دی۔

''مجھ سے دُور رہنا!'' میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔

سیتا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کمرے کی طرف چل پڑی۔

''دُھوپ تیز ہو رہی ہے..... مجھے تو گرمی لگ رہی ہے اور نیند بھی آنے لگی ہے۔'' سیتا کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

میں سیڑھیوں پر بیٹھا کچھ دیر تک سامنے پھیلے ہوئے ریگزار کو گھورتا رہا پھر اُٹھ کر کمرے میں آیا۔ سیتا سو چکی تھی۔ میں بھی اُس سے کچھ فاصلے پر لیٹ گیا۔ اب میری آنکھیں بوجھل ہو رہی

تھیں۔ لیٹنے کے کچھ ہی دیر بعد میں بھی نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

دو دن اور گزر گئے.....!

جگل ہمارے لئے صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا لے کر آتا رہا۔ سیتا اُسے جھلکیاں دکھا کر اُس کے جذبات کو بھڑکا رہی تھی۔ اور میرے خیال میں یہ ایک خطرناک حرکت تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ سرنگ کا راستہ مل جانے کے بعد ہمیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لیکن سیتا نجانے اُس سے کیا اُگلوانا چاہتی تھی؟

وہ تیسرا دن تھا..... جگل حسب معمول ہمارے لئے رات کا کھانا لے کر آیا تھا۔ کھانے کے بعد میں ہاتھ دھونے کے لئے کچن میں لگے ہوئے نلکے کی طرف چلا گیا۔ ابھی میں کچن ہی میں تھا کہ سیتا کی ہلکی سی چیخ سن کر چونک گیا اور تیزی سے کچن سے باہر آ گیا۔ اور پھر وہ منظر دیکھ کر میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی.....

جگل نے سیتا کو اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور سیتا اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر جگل نے سیتا کو چھوڑ دیا اور جب میں قریب آیا تو وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔

''دیوی جی کا پیر رپٹ گیا تھا..... اگر میں تھام نہ لیتا تو گر پڑتیں۔''

''ہاں..... انہوں نے مجھے بچا لیا۔'' سیتا نے بھی کھسیانے انداز میں کہا۔

ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ جگل کے سامنے کسی قسم کا جھگڑا مول لے سکتے۔ البتہ اُس کے جانے کے بعد میں سیتا پر پھٹ پڑا۔

''یہ موقع میں نے خود ہی اُسے فراہم کیا تھا.....'' سیتا نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب.....؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''دیکھتے جاؤ..... آگے آگے ہوتا ہے کیا۔'' وہ ایک بار پھر مسکرا دی۔

''ہو گا یہ کہ تمہاری نچی کچی لاش ریگستان میں کہیں پڑی ہوئی ملے گی۔'' میں نے غصے میں جواب دیا۔

''ایسا نہیں ہو گا مہابیر جی!'' سیتا مجھ سے لپٹ گئی۔ ''سیتا مصری کی ڈلی نہیں جسے اُٹھا کر منہ میں ڈال لیا جائے۔ تم کیوں گھبراتے ہو؟ مجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اور ویسے کیا خیال ہے آج رات کھنڈروں کا ایک چکر لگا لیا جائے؟ میں نے جگل سے کام کی ایک دو باتیں معلوم کر لی ہیں۔''

''مثلاً؟'' میں نے اُسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تمام یہودی کیمپ میں موجود ہیں۔ اور کیمپ کی سرگرمیاں معمول کے مطابق جاری ہیں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''ان یہودی ایجنٹوں کا کیپٹن توشے دایان ہیلی پیڈ کے قریب ایک

بنگلے میں مقیم ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اُس بنگلے کے آس پاس کوئی رہائشی مکان نہیں ہے۔ اُس کے پاس صرف ایک خدمت گار ہے۔ جگل کے کہنے کے مطابق پہلے یہودی کے قتل کے بعد دوسرے یہودیوں کی رہائش گاہوں پر سکیورٹی گارڈز تعینات کر دیئے گئے تھے مگر اُنہوں نے گارڈز کو ہٹا دیا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتے ہیں۔ بہرحال کیوں نہ آج کیپٹن توشے دایان سے ملاقات کی جائے؟''

''ہم جس جگہ سرنگ سے باہر نکلے تھے وہ مغرب کی طرف ہے۔ اور ہیلی پیڈ مشرق میں وہاں سے بہت دُور ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا ہم دوسروں کی نظروں سے بچ کر وہاں تک پہنچ سکیں گے؟''

''آج ہم دوسری سرنگ کو آزمائیں گے۔'' سیتا نے کہا۔ ''اُس سرنگ کا رُخ مشرق کی طرف ہے اور مجھے اُمید ہے کہ ہم اپنی مطلوبہ جگہ کے آس پاس ہی کہیں نکلیں گے۔''

''ٹھیک ہے..... آزما لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ظاہر ہے ہم یہاں مندر کی سیوا کے لئے یا آرام کرنے نہیں آئے تھے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ بیکار بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ہم دس بجے کے قریب مندر کے تہہ خانے میں اُتر گئے اس مرتبہ ڈھانچوں کے قریب سے گزرتے ہوئے سیتا کو کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے میں وہ پستول جو تین دن پہلے اُس یہودی کو قتل کر کے سیتا نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ سیتا نے ایک لمبی سی لکڑی اُٹھائی تھی جو آگے سے غلیل کی طرح دو شاخوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ سرنگوں کے سنگم پر پہنچ کر ہم کچھ دیر کو رُکے اور پھر دوسری سرنگ میں داخل ہو گئے۔ سیتا لکڑی سے سرنگ میں تنے ہوئے جالے صاف کرتی جا رہی تھی۔

یہ سرنگ دوسری سرنگ کی نسبت زیادہ طویل ثابت ہوئی۔ اس کے اختتام پر ایک کشادہ کمرہ سا بنا ہوا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ پوری سرنگ میں کہیں بھی گھٹن کا احساس نہیں ہوا تھا اور اس جگہ پر بھی لگتا تھا جیسے کسی طرف سے تازہ ہوا آ رہی ہو..... وہ ہوا اگرچہ ناکافی تھی لیکن گھٹن نہیں ہو رہی تھی۔ صدیوں پہلے جب یہ خفیہ سرنگیں تعمیر کی گئی تھیں اُس وقت بھی اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ ہوا کی آمد و رفت جاری رہے۔

میں نے ٹارچ کی روشنی میں کمرے کی دیواروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ مایوسی نہیں ہوئی۔ چند منٹ کی جستجو کے بعد ہی میکنزم میری نظروں میں آ گیا..... میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ آج کی اس مہم کے لئے پوری طرح تیار ہو کر آئی تھی۔ چولی بہت مختصر تھی اور گھاگھرا بھی گھٹنوں سے بہت اُوپر تھا۔ اُس کی دائیں کلائی میں چاندی کا کڑا تھا جسے اُس نے اُتارنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو.....؟'' سیتا نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تمہارے جال میں پھنس جانے کے بعد شکار زندہ بچ جانے کے کتنے فیصد امکانات ہیں۔'' میں نے کہا۔

''صفر.....!'' سیتا نے جواب دیا۔ ''میرے جال میں پھنس کر کوئی زندہ نہیں بچ سکتا۔

میں نے میکنزم پر ہاتھ رکھ کر ٹارچ بجھا دی..... دو تین مرتبہ حرکت دینے سے میکنزم نے کام شروع کر دیا اور سامنے والی دیوار شق ہو گئی۔

دوسری طرف بھی ایک کمرہ تھا اور میرے خیال میں یہ تہہ خانہ تھا جس کی آدھی چھت ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف سیڑھیاں تھیں جو ٹوٹی ہوئی تھیں۔ سب سے نیچے والی دو سیڑھیاں سلامت تھیں۔ بیچ کی دو سیڑھیاں اس طرح ٹوٹی ہوئی تھیں کہ کنارے پر صرف ایک پیر رکھنے کی گنجائش تھی۔ کھلی ہوئی چھت سے آسمان نظر آ رہا تھا اور تاروں کی بہت مدھم سی روشنی اگرچہ زمین تک پہنچ رہی تھی لیکن تہہ خانے میں اندھیرا تھا۔ میں نے سیتا کو ٹارچ تھما دی۔ وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور احتیاط سے سیڑھیوں پر چڑھ کر اُوپر آ گیا۔

اُوپر چاروں طرف شکستہ دیواریں تھیں۔ ایک دیوار تقریباً آٹھ فٹ اُونچی تھی جبکہ باقی دیواروں میں سے کوئی دیوار تین فٹ تک تھی اور کوئی پانچ فٹ تک۔ میں اُن دیواروں سے باہر آ گیا اور محتاط انداز میں آگے بڑھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی..... ہم بالکل ٹھیک جگہ پر سرنگ سے باہر آئے تھے۔ اُس کمین میں تقریباً سو گز آگے وہ چھوٹا سا بنگلہ تھا جس کی کئی کھڑکیوں میں روشنی نظر آ رہی تھی اور اُس سے تقریباً تین سو گز آگے ہیلی پیڈ تھا جہاں ایک پول پر سرخ بتی جل رہی تھی۔ سیتا کو جنگل سے ملنے والی یہ اطلاع بالکل درست تھی کہ اُس بنگلے کے آس پاس کوئی اور رہائشی مکان نہیں تھا۔ آس پاس بالکل سناٹا تھا اور کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

میں شکستہ تہہ خانے میں واپس آ گیا اور سیتا کو صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے سرنگ کے باہر کی طرف میکنزم تلاش کرنے لگا۔ اس میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے اُس میکنزم کو چار پانچ مرتبہ چیک کر کے دیکھا تاکہ پہلے کی طرح عین وقت پر کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ اور پھر ہم تہہ خانے سے نکل کر محتاط انداز میں اُن کھنڈروں میں چلتے ہوئے اُس بنگلے کی طرف بڑھنے لگے۔ اُس بنگلے کے اطراف میں بھی کچھ فاصلے پر کھنڈر تھے۔ ہم مکان کے سامنے والے رُخ پر واقع ایک کھنڈر میں رُک کر دُور سے اُس کا جائزہ لینے لگا۔ اُس بنگلے کے سامنے کوئی کمپاؤنڈ وغیرہ نہیں تھا۔ اس طرف بھی کھڑکیوں میں روشنی تھی جن کے سامنے باریک پردے پڑے ہوئے تھے۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک کھڑکی کے اندر ایک آدمی کا سایہ نظر آیا۔ وہ شخص ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور کچھ دیر بعد وہ برآمدے میں نمودار ہوا۔ وہ ہندوستانی تھا۔ وہ چند لمحے برآمدے میں رُکا رہا پھر اندر چلا گیا۔

''کیا خیال ہے.....؟'' سیتا نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

''جاؤ.....!'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں یہاں سے کور دُوں گا۔ اور اگر کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو وہاں سے بھاگنے میں دیر مت لگانا۔''

سیتا کھنڈر سے نکل کر محتاط انداز میں بنگلے کی طرف بڑھنے لگی۔ بنگلے کے سامنے تین چار درخت تھے۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ میں پستول لئے تیار بیٹھا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ گزر گئے..... اور یہ دس منٹ دس صدیوں پر بھاری ثابت ہوئے تھے۔

وہ آدمی ایک بار پھر برآمدے میں نمودار ہوا..... اُس کے ہاتھ میں شراب کی خالی بوتل تھی۔ برآمدے سے نکل کر چند گز آگے بڑھا اور بوتل ایک طرف اُچھال دی۔ اور جیسے ہی واپس مُڑا درختوں کی طرف سے 'شی' کی آواز سن کر رُک گیا اور مُڑ کر اس طرف دیکھنے لگا۔

پستول پر میری گرفت مضبوط ہو گئی اور اُنگلی ٹرائیگر پر پہنچ گئی۔ یہ سیتا کے لئے سنگین ترین لمحات تھے۔ اُسے اگرچہ اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا لیکن اُس شخص کو اگر ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو سیتا کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

سیتا درخت کے سائے سے نکل کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ اُس نے دونوں ہاتھ پشت پر رکھے ہوئے تھے اور سینہ تان کر مٹک مٹک کر چل رہی تھی۔ وہ شخص چند لمحے متحیر سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا پھر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔

''اے..... کون ہو تم؟''

میرا فاصلہ بیس گز سے کم نہیں تھا۔ اُس شخص کی آواز بہت صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ سیتا نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ سرگوشیانہ لہجے میں کچھ کہا اور پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے درختوں کے سائے میں لے آئی۔ برآمدے میں جلنے والی مدھم سی روشنی یہاں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ سیتا اُس آدمی سے چپکی کھڑی تھی۔ اور پھر اُس شخص نے ایک ہاتھ سیتا کی کمر میں حمائل کر دیا..... میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ سیتا کا جادو کام کر گیا تھا۔ اُس شخص کی زندگی کی مہلت کی اُلٹی گنتی شروع ہو چکی تھی۔ اُس نے سیتا کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اپنا چہرہ اُس پر جھکانے لگا۔ وہ سیتا کے ہونٹوں پر بوسہ دینا چاہتا تھا مگر سیتا نے بڑی ہوشیاری سے اُسے پیچھے ہٹا دیا اور کچھ کہتے ہوئے اُس کھنڈر کی طرف اشارہ کیا جس میں چھپا ہوا تھا۔

وہ دونوں اسی طرف آ رہے تھے۔ میں نے پستول جیب میں ڈال لیا..... اب مجھے جو کچھ کرنا تھا خالی ہاتھوں سے کرنا تھا۔ سیتا اُس شخص کو لے کر ایک شکستہ دیوار کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ خاصا بے چین نظر آ رہا تھا۔

''جلدی کیا ہے..... اطمینان سے بیٹھو!'' سیتا کی سرگوشی سنائی دی۔

''سالا توشے دایان بڑا حرامی ہے.....'' اُس شخص نے کہا۔ ''زیادہ دیر ہو گئی تو چھڑی سے

میری کھال ادھیڑ دے گا۔ یہ سالے یہودی پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔''

'ڈرو نہیں..... دایان مجھے تمہارے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے دیکھے گا تو سارا غصہ بھول جائے گا۔'' سیتا نے جواب دیا۔

''ویسے تم ہو کون..... پہلی مرتبہ تمہیں دیکھ رہا ہوں۔'' وہ شخص بولا۔

''تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے؟'' سیتا نے کہا۔ ''ویسے تم جانتے ہو ان یہودیوں کو خوش رکھنے کے لئے ہم جیسی حسین ناریوں کو یہاں لایا جاتا ہے۔ مجھے شری جگل لے کر آیا تھا۔ اُس یہودی کے پاس جانے سے پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں بھی خوش کر دیا جائے۔''

''بڑی کرپا ہے تمہاری..... بڑی دیالو ہو تم۔'' وہ شخص کہتے ہوئے سیتا کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔

اور ٹھیک اُسی وقت میں نے دیوار پر چڑھ کر اُس پر چھلانگ لگا دی..... میں نے اُسے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا موقع نہیں دیا۔ میرا ایک ہاتھ اُس کے منہ پر تھا اور دوسرا بازو اُس کی گردن پر لپٹ گیا۔ سیتا اُچھل کر دُور ہٹ گئی۔ وہ شخص بری طرح مچل رہا تھا۔ لیکن اُس کی گردن پر میری گرفت آہنی شکنجے کی طرح تھی۔ میں نے اُس کی گردن کو لگاتار کئی جھٹکے دیئے۔ وہ آخری مرتبہ بری طرح مچلا۔ وہ کچھ دیر تک زمین پر ایڑیاں رگڑتا رہا، پھر اُس کے جسم کو آخری جھٹکا لگا اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا..... میں نے اُسے چھوڑ دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اُس کی گردن توڑنے میں مجھے دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔

''چلو..... اب زیادہ دیر مت کرو!'' میں نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں اُس کھنڈر سے نکل کر بنگلے کے سامنے درختوں کے نیچے آ گئے۔ میں نے پستول جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میں وہیں رُک گیا اور سیتا تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی برآمدے میں پہنچ گئی اور بتی بجھا دی۔ میں بھی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا اور ٹھیک اُسی لمحہ اندر سے ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''رنجیت.....! کہاں مر گیا تم؟''

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ اندر کسی کمرے سے توشے دایان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ رنجیت کو پکار رہا تھا اور رنجیب اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

میں بھی سیتا کے قریب پہنچ گیا اور دوسرے دروازے سے جھانک کر اندر دیکھنے لگا۔ وہ سٹنگ رُوم تھا۔ رنگین ٹی وی چل رہا تھا۔ سکرین پر عبرانی زبان کا کوئی پروگرام آ رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ اسرائیل کا کوئی چینل تھا۔ یہاں کھنڈروں میں بھی اُن یہودیوں کو ہر سہولت فراہم کی گئی تھی۔ دائیں طرف صوفے پر توشے دایان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ قدرے بھاری بھرکم اور درمیانے قد کا آدمی تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اور دونوں پیر اُس نے سامنے کافی ٹیبل پر

رکھے تھے جس پر ایک طرف شراب کی بوتل بھی رکھی ہوئی تھی۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ اُس نے کھلے ہوئے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی..... توشے دایان نے مُڑ کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔ اُس نے شراب کا گلاس میز پر رکھ دیا۔

''مجھے شری جگل نے آپ کی سیوا کے لئے بھیجا ہے..... اور رنجیت کو آج کی رات کے لئے کہیں بلا لیا ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

توشے دایان گہری نظروں سے سیتا کو گھور رہا تھا۔ سیتا کے حسن و شباب نے اُسے زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ جب سیدھا ہوا تو اُس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مجھے سینے میں سانس ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا.....

''ٹھیک ہے..... اس طرف کھڑی ہو جاؤ!'' اُس نے سیتا کو پستول سے اشارہ کیا اور اُٹھ کر فون کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ اُس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ جگل سے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے جیسے ہی ریسیور پر ہاتھ رکھا میں اُچھل کر سامنے آ گیا..... اُس وقت میں نے پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ آواز سن کر دایان میری طرف دیکھا اور پستول والا ہاتھ اُوپر اُٹھا دیا۔ لیکن میں نے اُسے فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔

میں یکے بعد دیگرے پستول کا ٹرائیگر دباتا چلا گیا..... میں نے تین فائر کئے اور تینوں گولیاں نشانے پر بیٹھی تھیں..... ایک گولی اُس کی کھوپڑی میں اور دو سینے میں لگی تھیں..... وہ ٹیلی فون پر گرا اور میز سمیت دوسری طرف اُلٹ گیا..... پستول اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

سیتا نے لپک کر اُس کا پستول اُٹھا لیا اور ہم باہر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے..... بنگلے سے نکل کر چند ہی گز دُور پہنچے تھے کہ اچانک ہی ایک آدمی نے کسی طرف سے نکل کر ہمارا راستہ روک لیا۔

''کون ہو تم لوگ.....؟ رُک جاؤ!'' وہ چیخا۔

اُس کے ہاتھ میں پستول تھا اور میرے اور اُس کے درمیان تقریباً پانچ گز کا فاصلہ تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے اُچھلا اور ہوا میں اُڑتا ہوا اُس کے اُوپر جا گرا۔ اُس کے لئے شاید میری یہ حرکت غیر متوقع تھی۔ اُس نے بدحواسی میں ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی لیکن میں اُسے لپیٹ میں لئے ہوا زمین پر گر گیا۔ زمین پر گرتے ہوئے اُس شخص نے ٹرائیگر دبا دیا تھا..... گولی زناٹے سے میرے سر کے قریب سے گزر گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی کھوپڑی پر وار کیا..... اُس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ پستول اُس کے ہاتھ سے نکل گیا..... وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

''بھاگو کرشمروز!'' سیتا چیخی۔ ''اس طرف کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔''

میں نے سیدھا ہو کر اُس شخص کی کھوپڑی کی طرف پستول تان لیا اور ٹرائیگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ ایک اور خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا..... میں نے بڑی پھرتی سے جھک کر اُسے بے ہوش شخص کو کندھے پر اُٹھایا اور سیتا کے پیچھے دوڑنے لگا.....

اُس کھنڈر میں پہنچ کر سیتا نے وہاں چھپائی ہوئی ٹارچ اُٹھائی اور ٹوٹی ہوئی چھت سے لگا دی۔ اُس نے ایک لمحہ کو ٹارچ روشن کر کے بجھا دی۔ میں نے کندھے پر لدے ہوئے شخص کو نیچے لٹکا کر چھوڑ دیا۔ سیتا نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھد سے زمین پر گرا۔ میں نے بھی اُوپر سے چھلانگ لگا دی اور دوڑ کر اُس دیوار کے قریب پہنچ گیا جہاں میکنزم تھا۔ اندھیرے میں بھی وہ میکنزم تلاش کرنے اور اُسے استعمال کرنے میں مجھے کوئی دُشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے اور سیتا نے بے ہوش آدمی کو اُٹھا کر اندر ڈال دیا اور اندر سے میکنزم دبا دیا..... دیوار آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی اپنی جگہ پر آ گئی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ یہ تہہ خانہ تھا اور وہ آواز بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ گاڑی اس کھنڈر کے سامنے سے گزری تھی۔ میں نے جھک کر اُس شخص کو کندھے پر لاد لیا۔ سیتا ٹارچ روشن کر کے آگے آگے چلنے لگی اور میں اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ میرے کندھے پر لدا ہوا وہ شخص کسمسانے لگا..... میں نے سیتا کو رُکنے کا اشارہ کیا اور اُس شخص کو زمین پر ڈال دیا۔

''میں نہیں سمجھ سکی کہ تم اس شخص کو اُٹھا کر کیوں لے آئے ہو..... اسے وہیں پر گولی مار دی ہوتی۔'' سیتا نے ٹارچ کی روشنی میں اُس شخص کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور پھر چونک کر بولی۔ ''ارے... یہ تو اُن چار محافظوں میں سے ایک ہے جو اُس رات مندر کی تلاشی لینے آئے تھے۔''

اُس شخص کا چہرہ دیکھ کر میں بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

دو تین منٹ بعد وہ ہوش میں آ گیا اور اُسے اپنے حواس بحال کرنے میں مزید دو منٹ لگ گئے۔ ہماری شکلیں دیکھ کر وہ اُچھل پڑا.....

''اوہ..... تم دونوں.....'' وہ بولا۔ ''کشوری لال جی کا شبہ درست تھا..... جیمز کو تم ہی لوگوں نے قتل کیا تھا۔''

''ہاں.....'' میں نے جواب دیا۔ ''اور آج ہم نے تو شے دایان کا پتہ بھی کاٹ دیا ہے..... وہ بھی جہنم میں پہنچ چکا ہے۔''

''تم لوگ بچ کر نہیں جا سکو گے۔ کشوری لال.....''

''اپنی بکواس بند کرو اور میری بات غور سے سنو...'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میری بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا! اگر تم نے غلط بیانی سے کام لیا تو ہڈیوں کا سرمہ بناؤں گا۔''

''ہڈیوں کا سرمہ تو تمہارا بنے گا جب تم پکڑے جاؤ گے۔'' اُس نے کہا۔

''جب ہم پکڑے جائیں گے تب نا!'' میں نے کہا۔ پھر اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''اس کیمپ کا ایمونیشن سٹور کہاں ہے؟''

''کیا.....؟'' وہ اُچھل پڑا۔ ''نہیں..... میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔''

سیتا بھی میرا سوال سن کر اُچھل پڑی تھی اور اب یہ بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ میں اس شخص کو اُٹھا کر کیوں لایا تھا۔

''میں تمہیں صرف تیس سیکنڈ دے رہا ہوں.....'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے جواب نہ دیا تو گولی مار دُوں گا۔''

میری بجائے سیتا نے اُس پر پستول تان لیا اور تیس سے اُلٹی گنتی شروع کر دی۔ اُس شخص کا چہرہ دُھواں ہو گیا۔ وہ خوفزدہ تھا لیکن زبان کھولنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ سیتا نے ایک کہتے ہی ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اُس شخص کی ٹانگ میں لگی اور وہ بری طرح چیخنے لگا۔

''خاموش.....! تمہارے منہ سے آواز نہیں نکلنی چاہئے۔'' میں نے اُس کے جبڑے پر زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ ہم اگرچہ تقریباً پچیس فٹ زمین کی گہرائی میں تھے لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ گولی اور اس کی چیخوں کی آواز باہر کسی جگہ پر نہ سن لی گئی ہو۔

''اب میں تمہیں صرف پندرہ سیکنڈ دے رہی ہوں.....'' اس مرتبہ سیتا نے غراتے ہوئے کہا۔ ''اور اس مرتبہ گولی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔''

سیتا نے پندرہ سے اُلٹی گنتی شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی پستول کا رُخ اُس کی پیشانی کی طرف کر دیا۔ سیتا نے دو کہا تو وہ چیخ اُٹھا.....

''ب..... بتاتا ہوں..... یہ پپ..... پستول ہٹاؤ.....!''

سیتا نے پستول ہٹا لیا۔ ''جلدی بتاؤ..... ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ غرائی۔ ''ایمونیشن ڈپو کس طرف ہے؟''

وہ سمجھ گیا تھا کہ اُس کا اب کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ فرفر بتاتا چلا گیا۔ میں اُس سے مختلف سوالات کرتا رہا اور اُس نے ہر سوال کا جواب دیا تھا۔

میں نے سیتا کو اشارہ کیا..... اُس نے ایک بار پھر پستول کی نال اُس کی پیشانی کی طرف کر دی۔

''مم..... مجھے مت مارو.....'' وہ شخص پیچھے کی طرف گھسٹتا ہوا ہکلایا۔ خوف سے اُس کا چہرہ بھیانک ہو رہا تھا۔ ''تت..... تم لوگوں نے جو کچھ پوچھا میں نے بتا دیا۔ اب مجھے کیوں مارتے ہو؟''

''تمہیں زندہ چھوڑ کر ہم اپنی موت کے پروانے پر دستخط نہیں کریں گے۔'' سیتا نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ٹرائیگر دبا دیا..... گولی اُس شخص کی پیشانی میں لگی۔ خون کی دھار بہہ نکلی اور وہ اُچھل کر تڑپنے لگا۔

ہم دونوں اُسے تڑپتا چھوڑ کر تیزی سے آگے دوڑنے لگے۔ ہمیں مندر کے نیچے پہنچنے میں

چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ہم نے اپنے پستول وہیں اندر کی طرف رکھ دیئے اور باہر نکلنے سے پہلے میں نے جھانک کر اطمینان کر لیا تھا کہ مندر میں کوئی موجود نہیں ہے۔

ہم کمرے میں آ کر بیٹھ گئے...... سیتا کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ وہ کچھ دیر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہی پھر اپنا سر میری گود میں رکھ دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

OOO

اُس رات مندر کو چیک کرنے کے لئے کوئی نہیں آیا۔ اگلا دن بھی خیریت سے گزر گیا۔ ایک اور لاش اسرائیل بھیج دی گئی تھی۔ ہم نے دن میں دو تین مرتبہ اُوپر جا کر کیمپ کی طرف دیکھا تھا۔ سرگرمیوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہاں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

اُس روز جگل بھی نہیں آیا تھا۔ البتہ اُس سے اگلے روز صبح سویرے ہی وہ ہمارے لئے ناشتہ لے کر آ گیا۔ سیتا اُس وقت باورچی خانے کے سامنے رکھی ہوئی بالٹی سے منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ اس وقت اُس کے جسم پر لباس مختصر تھا۔ گھاگھرا اور چولی...... جگل سیڑھیوں پر میرے قریب کھڑا تھا مگر اُس کی نظریں سیتا کی طرف تھیں۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد سیتا نے چادر لپیٹ لی اور ہم سیڑھیوں پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ مفت میں تگڑا ناشتہ اور مرغن کھانا مل رہا تھا تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

’’آپ کچھ نراش نظر آ رہے ہیں مہاراج...... کوئی مسئلہ ہے کیا؟‘‘ میں نے جگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پریشانی اُس کے چہرے سے متوحش تھی۔

’’مسئلہ ہی مسئلہ......‘‘ جگل بولا۔ ’’چند روز پہلے ہمارے ایک بدیشی مہمان کی ہتیا ہو گئی تھی۔ ہم قاتل کا سراغ نہیں لگا سکے تھے کہ پرسوں رات ایک اور بدیشی مہمان اور اُس کے خدمت گار کو مار ڈالا گیا۔ ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ قاتل کون ہے...... تاہم ہمارا ایک گارڈ بھی لاپتہ ہے اور شبہ ہے کہ ان دونوں درگھٹناؤں میں اُس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ وہ کھنڈروں ہی میں کہیں چھپا ہوا ہے اور اُسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ اُس کے ملنے کے بعد ہی کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکے گا۔‘‘

’’ہتیارہ کوئی اندر ہی کا آدمی ہے مہاراج!‘‘ میں نے کہا۔ ’’آپ نے یہاں جو حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں اُنہیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ باہر کا کوئی آدمی اندر داخل نہیں ہو سکتا۔‘‘

’’ہاں...... ہمارا بھی یہی خیال ہے۔‘‘ جگل بولا۔ ’’ہم اُسے تلاش کر رہے ہیں اور اُمید ہے کہ جلد ہی اُس کا سراغ لگا لیں گے۔‘‘

جگل ایک گھنٹے بعد چلا گیا۔ وہ اس کیمپ کا سکیورٹی انچارج تھا۔ اُس پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ اُسے تو بہت مصروف ہونا چاہئے تھا اور وہ یقیناً بہت مصروف تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے لئے ناشتہ اور کھانا لے کر آتا تھا۔ ہم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ دھرم سیوکوں کی سیوا نہیں کر رہا تھا بلکہ سیتا کو دانہ ڈال رہا تھا اور میرا خیال ہے کہ اگر ہم نے کیمپ میں گڑبڑ نہ پھیلا رکھی ہوتی تو وہ اب تک کچھ کر گزرا ہوتا۔

دو دن اور گزر گئے......

اب ہمارے پاس صرف چار دن رہ گئے تھے۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا تھا ان چار دنوں ہی میں کرنا تھا۔ جس سکیورٹی گارڈ کو ہم نے سرنگ میں ہلاک کیا تھا اُس سے بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ اس کیمپ کو تباہ کرنے کے لئے ہمیں بارود کی ضرورت تھی اور سکیورٹی گارڈ سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ایمونیشن ڈپو مغرب میں اُس طرف واقع تھا جہاں سب سے پہلے ہم نے ایک اسرائیلی کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ جس کھنڈر میں وہ سرنگ نکلتی تھی اُس سے تقریباً ڈیڑھ سو گز بائیں طرف ایمونیشن ڈپو تھا جہاں صرف دو آدمی ڈیوٹی دیتے تھے۔

اور پھر اُسی رات ہم اس نئے اور پہلے سے زیادہ خطرناک مشن پر روانہ ہو گئے...... میرے پاس پستول تھا اور سیتا حسبِ معمول حسن و شباب کے ہتھیاروں سے لیس تھی۔

اندر کے تہہ خانے میں اُتر کر سرنگ کے مغربی دہانے تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ٹارچ ہم نے وہیں دیوار کے قریب اینٹوں کے پیچھے چھوڑ دی اور اُس کھنڈر سے باہر نکل گئے۔ دائیں طرف دو سو گز دُور وہ بنگلہ تھا جہاں پہلی رات ہم نے پہلے یہودی کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ ہم بائیں طرف چل دیئے۔ عقب سے کسی گاڑی کی آواز سن کر ہم جلدی سے اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے دبک گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی اس طرف مڑی۔ وہ بغیر چھت کی جیپ تھی۔ دو محافظ آٹومیٹک رائفلیں سنبھالے سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ حفاظتی انتظامات سخت کر دیئے گئے تھے۔ یہودی ایجنٹوں کی رہائش گاہوں پر مسلح محافظ تعینات کر دیئے گئے تھے اور گشت بھی شروع کر دیا گیا تھا۔

ایمونیشن ڈپو زیادہ دُور نہیں تھا۔ ایک پرانے کھنڈر پر نئی دیواریں تعمیر کر کے مکان بنا لیا گیا تھا جہاں اسلحے کا ڈپو قائم کر دیا گیا تھا۔ اُس ڈپو کا انتخاب میں نے اس لئے کیا تھا کہ یہاں سے ضرورت کی چیزیں مل سکتی تھیں۔

مکان کے قریب پہنچ کر ہم ایک آڑ میں کھڑے رہے۔ مکان کے سامنے پانچ فٹ اُونچی دیواری بھی تھی جس کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ کمپاؤنڈ کا باہر والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اُس پر بھی مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا اور ایک مسلح محافظ دروازے کے سامنے کرسی پر بیٹھا سگریٹ یا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

میں سامنے والے کھنڈر میں اینٹوں کے ڈھیر میں دبک گیا۔ سیتا آگے نکل گئی۔ دو منٹ بعد مسلح محافظ کے سامنے موجود تھی جو اُسے دیکھ کر ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

پھر سیکنڈ...... صرف چند سیکنڈ اور سیتا اُسے پٹا کر اپنے ساتھ لے آئی۔

’’شری جگل کو تم لوگوں کا کتنا خیال ہے......‘‘ سیتا کھنڈر میں داخل ہوتے ہوئے محافظ سے کہہ رہی تھی۔ ’’اُس نے خاص طور پر مجھے تم لوگوں کو خوش کرنے کے لئے یہاں بھیجا ہے۔ تاکہ تم ذمہ داری سے اپنی ڈیوٹی انجام دے سکو۔‘‘

''ہاں..... ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے۔ شری جگل واقعی بہت اچھے.....''

وہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ میں نے عقب سے اُچھل کر اُس کا گلا اپنے بازو کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ بری طرح مچلا لیکن میری یہ گرفت آہنی شکنجے سے زیادہ سخت تھی۔ دو تین جھٹکوں میں اُس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں نے اُسے دیوار کے پیچھے زمین پر ڈال دیا۔

سیتا اگلی مہم پر روانہ ہوگئی..... اس مرتبہ میں بھی اُس کے پیچھے ہی تھا۔ میں نے پستول جیب میں ڈال کر محافظ کی رائفل اُٹھالی تھی۔ میں اُس مکان کے دروازے کے باہر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ سڑک پر سے گزرنے والا کوئی شخص میرا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ گشت کرنے والی جیپ کے علاوہ کسی اور کے اس طرف آنے کی توقع ہی نہیں تھی۔

سیتا دروازے کے اندر جا چکی تھی۔ کمپاؤنڈ زیادہ بڑا نہیں تھا۔

''شری جگل ناتھ جی..... کہاں ہیں آپ؟ میں آ گئی ہوں شری جگل ناتھ جی!''

سیتا کی آواز سن کر میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ خود جگل ناتھ سے تو ہم کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکے تھے سوائے اس کے کہ وہ ہمیں تگڑے ناشتے اور مرغن کھانے کھلا رہا تھا۔ البتہ اُس کے نام سے ہم خوب فائدہ اُٹھا رہے تھے۔

''اے..... کون ہو تم.....؟'' ایک گن مین اچانک ہی کہیں سے نکل کر سامنے آ گیا۔

''مجھے شری جگل ناتھ جی نے یہاں بلایا تھا..... کہاں ہے وہ؟'' سیتا بولی۔

''جگل ناتھ جی تو یہاں نہیں آئے سندری..... ہم یہاں موجود ہیں۔ کہو تو ہم تمہاری سیوا کر دیں؟'' محافظ بولا۔

''سیوا کرنے تو میں آئی ہوں.....'' سیتا نے کہا۔ ''کیا سیوا کروں تمہاری؟''

''ادھر کو آؤ..... ہم بتاتے ہیں۔'' محافظ نے کہا اور سیتا کا بازو پکڑ کر مکان کے پہلو میں ایک تنگ سی راہداری میں لے گیا۔

میں اُٹھ کر کمپاؤنڈ میں آ گیا اور دروازہ بند کر کے تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُس راہداری میں پہنچ گیا..... مجھے دیکھ کر محافظ اُچھل پڑا لیکن میں نے اُسے ہلنے کا موقع نہیں دیا۔ سیتا نے اُس کی ٹانگیں پکڑ لیں اور میں نے اُس کا گلا دبوچ لیا..... اُسے جہنم کے سفر پر روانہ کرنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔

''تم باہر کے دروازے پر جاؤ!'' میں نے سیتا سے کہا اور خود برآمدے کی طرف دوڑ گیا۔

سیتا رائفل اُٹھا کر باہر والے دروازے کی طرف چلی گئی۔ لیکن وہ دروازے سے باہر نہیں نکلی۔ رائفل سنبھالے اندر کی طرف کھڑی رہی۔

سٹور کا دروازہ بند تھا۔ موٹا سا تالا لٹکا ہوا تھا۔ میں نے رائفل کی نال تالے میں پھنسا کر زوردار جھٹکا دیا۔ پہلے ہی جھٹکے میں تالا لٹک گیا۔ میں نے تالا نکال کر نیچے پھینک دیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر کی دیوار ٹٹول کر بتی جلائی اور دروازہ بھیڑ دیا۔

یہ بھی بڑا کمرہ تھا..... اُس سے آگے دو کمرے تھے۔ اسلحہ کی پیٹیاں بھی تھیں اور دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے شیلفوں میں مختلف چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کرنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ میں نے مطلوبہ چیزیں ایک بیگ میں بھر لیں اور کمرے میں سے نکل کر بتی بجھا دی۔ بیگ خاصا وزنی ہو گیا تھا۔ جیسے ہی میں بیرونی دروازے کے قریب پہنچا سیتا نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور مجھے اشارہ کر دیا۔ ہم دوڑتے ہوئے سڑک پار کر کے کھنڈروں میں پہنچ گئے اور پھر کھنڈروں ہی میں ہوتے ہوئے تہہ خانے والے کھنڈر میں پہنچ گئے۔

اگلے دن کے ہنگامے بھی قابلِ دید تھے..... اُس شام جگل بھی آیا تھا۔ اُس نے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ کیمپ میں دو اور آدمی قتل ہو گئے ہیں۔ لیکن پوری بات نہیں بتائی۔

اُس رات میں اور سیتا مندر کے تہہ خانے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ کشمیر میں مختلف اسلحہ کی تربیت میرے کام آ گئی تھی۔ ٹائم بم بنانے کی مہارت میں نے کشمیر میں کمانڈر عبدالرشید سے حاصل کی تھی۔ اُس رات ہم نے دس ٹائم بم تیار کئے..... ایک اور تھیلے میں، میں نے وہ سارا خزانہ بھر لیا جو بہت دنوں سے ہمارا منتظر تھا۔

اگلی رات ہم پھر کیمپ میں گھس گئے..... پہلے ایک سرنگ سے نکل کر مختلف جگہوں پر ٹائم بم فٹ کئے اور پھر دوسری سرنگ میں گھس گئے۔ اُس سرنگ میں اُس محافظ کی لاش سڑ رہی تھی۔ شدید تعفن پھیلا ہوا تھا۔ ہم تیزی سے دوڑتے ہوئے وہاں سے گزر گئے۔

سرنگ سے نکل کر ہمارے لئے قدم قدم پر خطرہ تھا۔ لیکن ہم خطرات کی پرواہ کئے بغیر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ باقی پانچ ٹائم بم مختلف جگہوں پر فٹ کر کے ہم واپس آ رہے تھے کہ اچانک ہی ایک محافظ نے ہمیں للکارا۔ ہم ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے..... وہ محافظ ہم سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ اُس نے پہلے فائرنگ کی اور پھر ہمارے پیچھے لپکا۔

سیتا ٹھوکر کھا کر گری..... محافظ نے اُس پر چھلانگ لگا دی۔ سیتا نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تو محافظ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ میں دوڑ کر قریب پہنچ گیا اور محافظ کی کھوپڑی پر گولی چلا دی..... سیتا اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگی۔

فائرنگ کی آوازوں کے بعد مختلف سمتوں سے سیٹیوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں لیکن کسی اور ناخوشگوار واقعہ سے دوچار ہوئے بغیر سرنگ میں پہنچ گئے اور پھر ہم نے مندر میں پہنچ کر ہی سانس لیا تھا۔

اور پھر سیتا بیٹھے بیٹھے اچانک ہی اُچھل پڑی..... وہ اپنی ایک کلائی سہلا رہی تھی۔

''کیا ہوا.....؟'' میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''میرا کڑا.....'' سیتا بولی۔ ''اُس محافظ نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ کھینچا تانی میں شاید کڑا اُس کی جگہ گر گیا۔''

میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ لیکن یہ سوچ کر سیتا کو بھی تسلی دینے لگا کہ اگر وہ

کڑا کسی کی نظروں میں آ بھی گیا تو ضروری نہیں کہ اس کا تعلق ہم سے جوڑنے کی کوشش کی جائے۔

ہم رات بھر جاگتے رہے۔ اور پھر ٹھیک چار بجے کیمپ میں پہلا دھماکہ ہوا..... ہم دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو چکا تھا..... ہر پانچ منٹ بعد کیمپ میں کسی نہ کسی جگہ دھماکہ ہو رہا تھا.....

ہم مندر کے اُوپر والے حصے میں آ کر کھڑے ہو گئے اور اس طرح کیمپ کی طرف دیکھنے لگے جیسے آتش بازی کا نظارہ کر رہے ہوں۔

صبح پانچ بجے ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ صورتحال نہایت سنگین ہونے کے باوجود مجھے نیند آ گئی.....

صبح دس بجے سیتا نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا.....

''ایک جیپ اِدھر آ رہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''ایک ہی آدمی ہے اور میرا خیال ہے وہ جگل ہے۔''

سیتا کا خیال غلط نہیں تھا..... وہ جگل ہی تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جگل دروازے کے سامنے نمودار ہوا۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو..... بیٹھے رہو!'' جگل کے لہجے میں کرختگی تھی اور ہاتھ میں ریوالور..... سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ میں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا مہاراج..... کیا بات ہے..... رات کو یہ دھماکے کیسے تھے؟'' میں نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اور آپ کے ہاتھ میں یہ پستول.....''

''تفصیل تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔'' جگل بولا۔ ''ویسے تمہارا یہ کڑا رات کو ایک محافظ کے ہاتھ میں رہ گیا تھا دیوی جی!'' اُس نے جیب سے کڑا نکال کر دکھایا۔

سیتا کا چہرہ دُھواں ہو گیا..... اور مجھے بھی اپنی آنکھوں کے سامنے موت ناچتی ہوئی نظر آنے لگی.....!

○○○

''یہ..... یہ کڑا.....'' سیتا ہکلائی۔ ''شاید یہاں کہیں گر گیا تھا۔ میں تو دو دن سے اسے ڈھونڈ رہی تھی۔''

''یہاں نہیں..... یہ کڑا ہمیں کیمپ سے ملا ہے۔'' جگل نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''کل شام کو جب میں یہاں آیا تھا تو یہ کڑا تمہاری کلائی میں تھا اور آج صبح کیمپ کے اندر ایک سکیورٹی گارڈ کے ہاتھ میں ملا ہے جسے سر میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج.....'' میں نے کہا۔ ''ہمارا کیمپ کے کسی گارڈ سے کیا سمبند؟ ہم تو اس مندر سے باہر کبھی نہیں گئے۔ کیمپ میں ہم کیسے جا سکتے ہیں؟''

''یہ بات مجھے اُسی وقت سمجھ لینی چاہئے تھی جب کیمپ کے اندر اُس بنگلے میں یہودی آفیسر اور اُس کے خدمتگار کی ہتیا کی گئی تھی۔ کیمپ میں پے در پے قتل کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ دو دن پہلے ایمونیشن ڈپو کے دو محافظوں کو قتل کر کے ڈپو سے بہت سی چیزیں چرا لی گئیں لیکن ہم چور یا ہتیاروں کا سراغ نہیں لگا سکے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اس کیمپ کا سکیورٹی انچارج ہوں۔ یہاں میں نے سکیورٹی کے ایسے کڑے انتظامات کر رکھے ہیں کہ بلی کا بچہ بھی نظروں میں آئے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن پے در پے قتل کی وارداتیں ہوتی رہیں اور ہم قاتل کا سراغ نہیں لگا سکے۔ پھر ایمونیشن ڈپو میں چوری کی واردات ہوئی اور آج صبح چار بجے بموں کے پے در پے دھماکے ہوئے جن سے آدھے سے زیادہ کیمپ تباہ ہو گیا اور کئی لوگ مارے گئے۔ ممکن ہے ہم یہی سمجھتے رہتے کہ یہ اندر کے کسی آدمی کا کام ہے۔ لیکن ایک کھنڈر کے قریب اپنے ایک گن مین کی لاش دیکھی تو اُس کے ہاتھ میں یہ کڑا نظر آ گیا۔ اور اب کہانی کچھ اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ اُس محافظ نے تمہیں پکڑ لیا تھا۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش میں تمہارا یہ کڑا کلائی سے اُتر کر اُس کے ہاتھ میں رہ گیا اور تم اُسے گولی مار کر بھاگ نکلیں۔ میں واقعی بیوقوف تھا جو پہلے صورتحال کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ یہ مندر.....'' اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ان قدیم مندروں میں تہہ خانے اور خفیہ راستے ہوتے ہیں۔ اور تم لوگوں کو ان راستوں کا علم تھا۔ تم لوگ ان خفیہ راستوں سے کیمپ میں داخل ہوتے اور اپنا کام کر کے واپس آ جاتے اور ہم مجرموں کی تلاش میں ٹاپتے رہ جاتے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

لیکن ان نازک ترین لمحات میں بھی اُس نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ سے اس طرح حرکت کی کہ چادر کا پلو اُس کے کندھے سے ڈھلک کر نیچے گر گیا۔

جگل کی آنکھوں میں ایک لمحہ کو چمک سی اُبھری لیکن دوسرے ہی لمحہ سرد مہری لوٹ آئی۔ میں گہری نظروں سے اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے اور اُس کے درمیان آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ ریوالور اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اگر میں اُس پر چھلانگ لگاتا تو وہ ٹرائیگر دبا دیتا اور گولی مجھے اُس تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر کر دیتی۔

''اب صورتحال یہ ہے.....'' جگل باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے علاوہ کسی اور کو اس کڑے کے بارے میں علم نہیں ہے۔ گارڈ کی لاش کے ہاتھ میں یہ کڑا دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا تھا اور کسی کو بتائے بغیر اس طرف چلا آیا۔ تم لوگ کون ہو یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن سادھوؤں کے بھیس میں یہاں کس مقصد سے آئے تھے وہ اب سمجھ چکا ہوں۔ اب تم لوگ میرے رحم و کرم پر ہو۔ میں اگر چاہوں تو ابھی تم دونوں کے بھیجے اُڑا دوں یا تمہیں کیمپ میں لے جاؤں۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ لیکن.....''

وہ خاموش ہو کر سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔

''لیکن کیا.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ ویسے میں اُس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''ہم جس پیشے سے وابستہ ہیں اس میں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔'' جگل نے کہا۔ اُس کی نظریں بدستور سیتا پر مرکوز تھیں جس نے اپنی چادر کچھ اور نیچے گرا دی تھی۔ ''اس کیمپ میں اگرچہ چند لاشیں گر گئی ہیں یا بموں کے چند دھماکے ہوئے ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف میں جانتا ہوں کہ ان درگھٹناؤں کا ذمہ دار کون ہے۔ اور میں یہ سب کچھ نظر انداز کرنے کو تیار ہوں لیکن.....''

''لیکن کیا مہاراج؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اگر یہ دیوی جی چاہیں تو.....'' اُس کا لہجہ معنی خیز تھا اور اُس کا مطلب ہماری سمجھ میں آ گیا تھا۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''لیکن.....''

''اگر تم لیکن ویکن کے چکر میں پڑ گئیں تو بہت کشٹ اُٹھاؤ گی۔'' جگل نے سیتا کی بات کاٹ دی۔ ''تم جانتی ہو تم لوگوں سے کتنا سنگین جرم ہوا ہے۔ کئی لوگ تم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ آدھا کیمپ تباہ ہو گیا ہے۔ تین اسرائیلی تم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ اسرائیل سے بھارت سرکار کے تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ تم دونوں کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔'' وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ''لیکن مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہاں

کیا ہو رہا ہے۔ سکیورٹی انچارج کی حیثیت سے میری نوکری بلکہ زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے لیکن میں یہ سب کچھ بھولنے کے لئے تیار ہوں..... میں صرف دو باتیں چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ مجھے مندر سے کیمپ تک کا خفیہ راستہ بتا دیا جائے اور دوسرے یہ لڑکی میرے ساتھ کچھ وقت گزارے۔''

''مہاراج.....''

''ایک منٹ!'' اُس نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش کر دیا۔ ''میں نہیں جانتا تم لوگ کون ہو۔ لیکن وہ نہیں ہو جو اپنے آپ کو ظاہر کر رہے ہو۔ تم لوگوں کی وجہ سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے اسرائیلی دوست آج واپس جا رہے ہیں۔ کیمپ کو دوبارہ سیٹ کرنے میں مہینوں لگ جائیں گے۔ لیکن میں یہ سب کچھ نظر انداز کرنے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے مسٹر جگل!'' مجھ سے پہلے سیتا بول پڑی۔ ''میں تمہاری خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اُس نے اپنے اُوپر سے چادر اُتار کر ایک طرف پھینک دی۔ ''مہابیر! اسے تہہ خانے کا راستہ بتا دو۔ اور اب جو کچھ بھی ہوگا تہہ خانے ہی میں ہوگا۔''

جگل کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ یہ تھی ہندو ذہنیت..... ہمارے ہاتھوں ان کے کئی آدمی مارے گئے تھے۔ کیمپ تباہ ہو گیا تھا، اسرائیل سے سمجھوتہ خطرے میں پڑ گیا تھا اور جگل اپنی ہوس کی پیاس بجھانے کی خاطر یہ سب کچھ بھول جانے کو تیار تھا۔ قوم پرستی نے ہوس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ اگر ان میں حب الوطنی کا جذبہ ہوتا تو اب تک کشمیر کا بھی فیصلہ کر چکے ہوتے۔ لیکن 54 سال سے اپنی اس گندی ذہنیت کی بدولت یہ کشمیر میں بھی مار کھا رہے تھے۔ اور مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن کشمیر اُن کے چنگل سے ضرور آزاد ہوگا۔

''چلو مہاراج!'' میں نے ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ سیتا نے اُس کی آتش شوق بھڑکانے کے لئے ایک کندھے پر سے چولی کی ڈوری سرکا دی تھی۔ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے جگل کی آنکھوں کی چمک کچھ اور گہری ہو گئی۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے ٹارچ لے لی تھی۔ سیڑھیوں والے کمرے میں آ کر میں نے ریت صاف کر کے فرش پر کنکریٹ کا بلاک ہٹا کر گڑھے کے اندر وہ ہک کھینچ لیا۔ جگل بڑی دلچسپ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

دیوار شق ہو گئی۔ میں اُٹھ کر جلدی سے اندر داخل ہو کر دیوار کے ساتھ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ جگل اندر داخل ہو تو دیوار کے ساتھ سیڑھیوں پر پڑے ہوئے پستول کو نہ دیکھ سکے۔ میرے بعد جگل اندر داخل ہوا۔ ریوالور اب بھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس کے پیچھے سیتا تھی۔

''خیال سے مہاراج..... آگے سیڑھیاں ہیں۔'' میں نے سیڑھیوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

جگل محتاط انداز میں دو سیڑھیاں نیچے اُتر گیا۔ سیتا اُس کے پیچھے تھی۔ اُس نے اچانک ہی جگل کے کولہوں پر زوردار لات رسید کر دی..... جگل چیختا ہوا سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے گرا۔ سیتا نے بڑی پھرتی سے مُڑ کر دیوار کے قریب رکھا ہوا پستول اُٹھایا اور پے در پے ٹرائیگر دباتی چلی گئی..... تہہ خانہ فائرنگ اور جگل کی چیخوں سے گونج اُٹھا۔ میں جگل کو ٹارچ کی روشنی کے حلقے میں لئے ہوئے تھا۔ جگل مرا نہیں زخمی ہوا تھا اور وہ اُٹھ کر ایک طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیتا نے ایک بار پھر ٹرائیگر دبا دیا۔ اس مرتبہ اتفاق سے گولی جگل کی کھوپڑی میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

''تم یہیں رُکو..... میں دیکھتا ہوں۔'' میں کہتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ سیتا وہاں رُکنے کی بجائے میرے پیچھے آ گئی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں جگل کا جائزہ لیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے ٹارچ کا رُخ سیتا کی طرف کر دیا۔ اُس کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔

''سالا حرامی.....'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میرے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔''

اُس نے لاش پر تھوک دیا اور ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... جلدی سے میرے ساتھ آؤ!'' میں نے کہا۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے اُس کمرے میں پہنچ گئے۔ ایک تھیلے میں خزانہ بھر کر رکھا گیا تھا۔ میں نے تھیلا اُٹھایا اور ہم دونوں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

اُوپر آ کر میں نے تہہ خانے کا راستہ بند کیا اور کمرے میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''رہنے دو سب کچھ...'' سیتا چیخی۔ ''اگر کوئی اس طرف آ گیا تو ہمارا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔''

میں نے سیتا کی چادر اُٹھا لی اور باہر کی طرف دوڑا۔ سیتا مجھ سے پہلے ہی جیپ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ اچک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور انجن اسٹارٹ کرنے لگی۔ میں اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تھیلا اپنے پیروں کے قریب رکھ لیا۔

جیپ ایک مختصر سا چکر لگا کر اُس راستے پر نکل آئی جو شہر کی طرف چلا گیا تھا۔ یہ راستہ بھی ریتلا ہی تھا مگر ریت سخت اور جمی ہوئی تھی۔ سیتا ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھاتی چلی گئی۔ جیپ ریت کے بادل اُڑاتی ہوئی طوفانی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پیچھے مُڑ کر دیکھا لیکن گرد و غبار کے بادلوں کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

ہمیں شہر کے نواح میں پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ سیتا نے ایک ویران سی جگہ پر جیپ روک کر انجن بند کر دیا۔ میں نے چادر اُس کی طرف بڑھا دی۔ سیتا نے ویران سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور چادر جسم پر ڈال لی۔

''یہ تھیلا بھی چادر کے اندر چھپا لو!'' میں نے تھیلا اُس کی طرف بڑھا دیا۔ سیتا نے تھیلا کندھے پر لٹکا کر چادر میں چھپا لیا اور ہم تیز تیز قدموں سے ایک طرف چلنے لگے۔ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں ایک آٹو رکشہ مل گیا۔ رکشے میں بیٹھتے ہی سیتا نے شہر

کے ایک علاقے کا نام لے دیا اور رکشہ حرکت میں آ گیا۔

تین رکشے بدل کر ہم سلاوٹ پاڑہ کے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ آخری رکشہ ہم نے دُرگا کی حویلی سے تقریباً نصف میل دُور پچھلی والی سڑک پر رُکوایا تھا کیونکہ ہم حویلی کے سامنے سے جانے کی بجائے عقبی گلی سے جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

رکشے سے اُتر کر ہم نے چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ہی ایک بھاری بھرکم پنڈت نے ہمارا راستہ روک لیا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے ہمارے سامنے کھڑا تھا.....

''آگے مت جائیے مہاراج!'' وہ بولا تو اُس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

''کیوں کیا بات ہے.....؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''میری بات کو سمجھو مہابیر جی.....!''

''کون ہو تم.....؟'' میں اُس کے منہ سے اپنا نام سن کر اُچھل پڑا اور ذرا غور سے اُس کی طرف دیکھا تو میں نے اُسے پہچان لیا..... وہ دُرگا کا ملازم راجیو تھا۔ اُس کمبخت نے ایسا زبردست حلیہ بدلا تھا کہ اگر وہ میرا نام نہ لیتا تو میں اُسے نہ پہچان سکتا۔ سیتا کی آنکھوں میں بھی اُلجھن تیر رہی تھی۔ مجھے کسی گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے راجیو کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''حویلی کے حالات اچھے نہیں ہیں.....'' راجیو نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پہلے سے بھی مدھم لہجے میں کہا۔ لوگ ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ ''یہاں بات کرنے کا موقع نہیں ہے۔ میرے ساتھ آ جائیے!'' راجیو نے کہا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا اور ہم اُس کے پیچھے چل پڑے۔ اگلے موڑ پر راجیو نے ایک آٹو رکشہ رُکوا لیا اور ہم تینوں اُس میں ٹھنس کر بیٹھ گئے۔

شہر کے مشرقی علاقے میں پہنچ رکشہ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بھی ہمیں تقریباً ایک میل تک پیدل چلنا پڑا۔ یہ شہر کا وہ علاقہ تھا جہاں ایک نئی آبادی پھیل رہی تھی۔ لوگوں نے جگہوں پر قبضے کر کے تاروں کی باڑیں کھینچ رکھی تھیں۔ جس کے پاس زیادہ پیسے تھے اُس نے اپنے پلاٹ کے گرد اینٹوں کی چار دیواری کھڑی کر دی تھی۔ کہیں کہیں کچے مکان بھی بنے ہوئے تھے۔ اس طرف ناریل اور تاڑ کے درختوں کی بھی بہتات تھی۔ بعض مکان تو ایسے تھے جن میں تاڑ کے درختوں کے جھنڈ تھے۔

ہم ایک مکان کے سامنے سے گزرے تو درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے آدمی اور دو عورتوں نے اُٹھ کر ہمیں پرنام کیا۔ جواب میں ہم نے بھی ہاتھ جوڑ دیئے اور راجیو کے ساتھ چلتے رہے۔

وہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو گز آگے ناریل اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈ میں ایک کچا مکان تھا۔ اُس کے اطراف میں کچی اینٹوں کی چار دیواری بھی تھی۔ چار دیواری کے اندر داخل ہونے کے راستے پر بوری کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔

راجیو بلند آواز میں ہری اوم ہری اوم کی گردان کرتا ہوا پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ میں اور سیتا باہر ہی رُک کر اُلجھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ چند سیکنڈ بعد ہی راجیو واپس آ گیا۔

''ارے پدھاریئے ناں..... آپ لوگ رُک کیوں گئے؟'' وہ بولا۔

''یہ کس کا گھر ہے؟'' سیتا نے پوچھا۔

''ارے اپنا ہی ہے..... آپ پدھاریئے تو سہی!'' راجیو نے کہا۔

ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ صحن خاصا وسیع و عریض تھا اور ناریل اور تاڑ کے کئی درخت چار دیواری کے اندر بھی نظر آ رہے تھے۔

وہ مکان تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ ایک طرف اور دو ایل (L) شیپ کی صورت میں دوسری طرف۔ چند گز کے فاصلے پر ٹین کی چادر کا ایک شیڈ بنا ہوا تھا جسے کچن کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔

''کلپنا..... شوبھا..... دیکھو کون آیا ہے۔'' راجیو ایک کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ہم درختوں کے نیچے ہی رُک گئے تھے۔ لیکن راجیو کے منہ سے کلپنا اور شوبھا کے نام سن کر چونک گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہی راجیو کی بیوی شوبھا اور کلپنا ایک کمرے سے باہر آ گئیں۔ کلپنا دوڑ کر سیتا سے لپٹ گئی۔ اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔

''کیا ہوا کلپنا..... خیریت تو ہے؟ دُرگا کہاں ہے..... اور تم لوگ یہاں''

''آؤ..... آؤ! اندر آؤ.....'' راجیو نے سیتا کی بات کاٹ دی۔ ''اندر آؤ..... آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔''

ہم لوگ گرمی میں کافی دُور سے پیدل چل کر آئے تھے اور پسینے میں گرمی سے شرابور ہو رہے تھے۔ باہر ہوا بھی گرم چل رہی تھی۔ اندر قدرے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ سیتا نے چادر اُتار کر ایک طرف پھینک دی اور کندھے پر اٹکا ہوا تھیلا بھی ایک طرف رکھ کر کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اُس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا اور میں نے بھی چوغہ اُتار کر ایک طرف پھینک دیا گیا۔

''شوبھا!'' راجیو بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مہابیر جی اور سیتا دیوی کو جل پلاؤ۔ دُھوپ سے آئے ہیں۔''

شوبھا فوراً ہی باہر نکل گئی۔ کلپنا سیتا کے گھٹنے سے لگی بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں مسلسل بھیگ ہوئی تھیں۔ سیتا بھی سمجھ گئی تھی کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ راجیو نے جب راستے میں ہمیں روک کر کہا تھا کہ حویلی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں تو میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ دُرگا کی بھی اب تک کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سیتا نے کلپنا سے دُرگا کے بارے میں پوچھنا چاہا تو راجیو نے بات کو ٹال دیا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد شوبھا جل زیرہ سے بھرے ہوئے دو گلاس لے آئی۔ ایلومینیم کے

گلاس خاصے بڑے بڑے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں پورا گلاس نہیں پی سکوں گا۔

جل زیرہ..... بھنا ہوا زیرہ پوڈر اور ابلس میں لیموں کی کھٹائی جس میں چٹکی بھر نمک ملا دیا گیا تھا۔ یہ راجستھان جیسے گرم علاقے کی خاص شراب تھی۔ یہ نہ صرف گرمی اور لو سے بچاتا تھا بلکہ اس سے پیاس بھی بجھ جاتی تھی۔ اس میں اگرچہ برف نہیں تھی لیکن مٹکے کا پانی بھی خاصا خوشگوار تھا اور یہ جل زیرہ پینے سے واقعی لطف آ گیا تھا۔

''ہم نے سانس بھی لے لیا اور جل زیرہ بھی پی لیا.....'' سیتا نے خالی گلاس کھاٹ پر رکھ دیا۔ اُس کی نظریں راجیو کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ''اب بتاؤ..... کیا معاملات ہیں، حویلی میں کیا گڑبڑ ہے اور دُرگا کہاں ہے؟''

''حالات حویلی کے تو کیا پورے شہر کے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔'' راجیو نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''پولیس تم دونوں کو تلاش کر رہی ہے۔''

''اور دُرگا کہاں ہے؟'' سیتا نے جلدی سے پوچھا۔

''اُسے پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ اور اُس پر اتنا تشدد کیا کہ وہ بیچاری.....''

''کیا ہوا اُسے.....؟'' اس مرتبہ میں بول پڑا۔

''دُرگا اب ہم میں نہیں رہی مہابیر جی.....!'' راجیو کے منہ سے یہ الفاظ بڑی مشکل سے نکلے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''اوہ.....'' میرے منہ سے بھی سسکی سی نکل گئی۔ ''مگر یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

راجیو کئی منٹ تک ہچکیاں بھرتا رہا اور پھر اُس نے جو کہانی سنائی وہ واقعی بڑی سنسنی خیز تھی۔ وہی سب کچھ ہوا تھا جس کا مجھے کئی روز سے اندیشہ تھا.....

راجیو کے کہنے کے مطابق میگزین میں شائع ہونے والی میری اور دُرگا کی وہ تصویر کشمیر میں پولیس کی نظروں میں آ گئی تھی۔ کشمیر کی خفیہ پولیس نے مجھے شموز کی حیثیت سے شناخت کر لیا تھا۔ وہ تصویر ایک رپورٹ کے ساتھ دہلی کی خفیہ پولیس کو بھیجی گئی۔ دہلی پولیس نے میگزین کے دفتر میں رابطہ کر کے اُس فوٹو گرافر کے بارے میں معلومات حاصل کیں جس نے یہ تصویر کھینچی تھی۔ جلد ہی اُس فوٹو گرافر کو بھی تلاش کر لیا گیا جس نے بتایا کہ یہ تصویر اُس نے جیسلمیر کے پتوؤں کی حویلی میں کھینچی تھی۔

خفیہ پولیس کے وہ ایجنٹ وہ تصویر لے کر جیسلمیر پہنچ گئے اور جب اُنہوں نے یہاں کی پولیس سے رابطہ کیا تو اُنہوں نے دُرگا کی تصویر پہچان لی۔ پولیس میں اچھے برے سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی پولیس والے نے دُرگا جی کو فون کر کے بتا دیا کہ دہلی کی خفیہ پولیس اُسے گرفتار کرنے کے لئے آ رہی ہے۔ دُرگا، کلپنا کو لے کر فوراً ہی پچھلے مکان میں پہنچ گئی اور کلپنا کو نوکر کے حوالے کر کے اُسے ہدایت کی کہ وہ کلپنا اور اپنی بیوی کو لے کر فوراً یہاں سے بھاگ جائے۔ راجیو اُن دونوں کو لے کر اس مکان میں آ گیا۔ یہ اُس کے دوست کا مکان تھا جو چابی

اُسے دے کر ہردوار گیا ہوا تھا۔

دُرگا نے حویلی سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی مگر اُسے موقع نہیں مل سکا۔ پولیس اُسے پکڑ کر لے گئی اور تین دن تک تشدد کرتی رہی۔ پولیس کے کہنے کے مطابق رسالے میں شائع ہونے والی تصویر میں نظر آنے والا وہ آدمی کشمیری مجاہد شمروز تھا جس نے کشمیر میں طویل عرصے تک تباہی پھیلا رکھی تھی اور بھارتی فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ بھارتی انٹیلی جنس ''را'' نے اپنی ایک حسین ترین اور ذہین ایجنٹ کو شمروز کی گرفتاری کے لئے کشمیر بھیجا تھا لیکن یہ ایجنٹ سیتا بھی اپنا دھرم اور قومیت سب کچھ بھول کر شمروز کے ساتھ مل گئی اور جموں میں مانسر جھیل پر اعلیٰ فوجی افسروں کے قتل عام کی کارروائی میں سیتا بھی اُس کے ساتھ شریک تھی۔ اس کے بعد وہ دونوں غائب ہو گئے تھے۔

شمروز کی تصویر دُرگا کے ساتھ جیسلمیر میں پتوؤں کی حویلی میں پہنچ گئی تھی جس سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ شمروز اور سیتا جیسلمیر میں موجود تھے اور دُرگا نے اُنہیں پناہ دے رکھی تھی۔ بعض اور ذرائع سے بھی پولیس نے اس امر کی تصدیق کر لی تھی کو دُرگا کو کئی مرتبہ شہر کے مختلف ہوٹلوں اور کلبوں میں دیکھا گیا تھا۔ پولیس کو سیتا کے بارے میں کچھ اس لئے بھی یقین تھا کہ دُرگا مہارانا دھرمیش سنگھ کی رکھیل تھی اور سیتا مہارانا کی بیٹی۔ دُرگا پہلے تو شمروز سے کسی تعلق کے بارے میں انکار کرتی رہی لیکن پھر اُس نے اعتراف کر لیا کہ اُس نے اُن دونوں کو پناہ دے رکھی تھی لیکن بروقت پولیس کارروائی کی اطلاع مل جانے سے اُس نے ان دونوں کو بھگا دیا۔ وہ اس وقت تک بمبئی پہنچ چکے ہوں گے۔ لیکن وہ پولیس کو ان کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ جبکہ پولیس کو یقین تھا کہ وہ دونوں جیسلمیر ہی میں موجود ہیں۔ اُن کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے پولیس نے دُرگا پر اس قدر تشدد کیا کہ وہ ختم ہو گئی۔ مہارانا دھرمیش سنگھ کو بھی حراست میں لے رکھا تھا۔ سیتا اُس کی بیٹی تھی اور اُس سے بھی سیتا کے بارے میں پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔

پولیس نے کیپٹن گوپال کے قتل کو بھی سیتا سے جوڑ دیا تھا...... پولیس نے کسی طرح یہ معلوم کر لیا تھا کہ کئی سال پہلے کیپٹن گوپال نے جب وہ لیفٹیننٹ ہوا کرتا تھا سیتا کے ساتھ بلادکار کیا تھا۔ اور سیتا نے بدلہ لینے کے لئے بالآخر اُسے قتل کر دیا تھا۔ پولیس نے وہ حویلی بھی اپنے قبضے میں لے لی تھی جہاں پہلے کیپٹن گوپال اور بعد میں ایک اور قتل ہوا تھا۔ یہاں سے پولیس کو سیتا کی اُنگلیوں کے نشان مل گئے تھے جن کے بارے میں تصدیق کر لی گئی تھی۔ پولیس کو شبہ ہی نہیں یقین تھا کہ کشمیری مجاہد شمروز بھی سیتا کے ساتھ اسی حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا اور بعد میں وہ دُرگا والی حویلی میں منتقل ہو گئے تھے۔ پولیس نے حویلی کے ملازم چیتون سنگھ کو بھی پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر وہ فرار ہو گیا تھا اور پولیس ابھی تک اُس کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔

''میں بہت عرصہ سے دُرگا دیوی کی سیوا کر رہا ہوں۔'' راجیو کہہ رہا تھا۔ ''لیکن پولیس کو شاید ابھی تک میرا خیال نہیں آیا یا میرے بارے میں ابھی تک پولیس کو معلوم نہیں ہو سکا۔ میں

نے پولیس سے چھپنے کے لئے یہ بہروپ دھار لیا۔ اس بہروپ میں میرے بہت سے جاننے والے بھی مجھے نہیں پہچان سکے اور آپ دونوں بھی دھوکہ کھا گئے۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا تھا آپ لوگ آج واپس آنے والے ہیں۔ اگرچہ واپسی کی اُمید شام کے سمے تھی مگر میں صبح ہی سے اس علاقے میں گھوم رہا تھا۔ بھگوان کی دیا سے آپ دونوں میری نظروں میں آ گئے۔ اگر آپ حویلی کی طرف چلے جاتے تو بڑے آرام سے دھر لئے جاتے۔''

''یہ جگہ کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ جگہ محفوظ ہے...... یہاں سب لوگ مجھے پنڈت سمجھتے ہیں اور کسی کو مجھ پر شبہ نہیں ہے۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟'' سیتا نے پوچھا۔

''سب کچھ پتروں میں لکھا ہے سیتا جی......'' راجیو نے جواب دیا۔ ''میں نے وہ سارے پتر سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔'' راجیو نے دوسری کھاٹ کے نیچے رکھا ہوا ایک ٹرنک باہر کھینچ لیا اور اُس میں سے اخبارات کا ایک پلندہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

ان میں پہلا اخبار جس میں دُرگا کی گرفتاری کی خبر چھپی تھی، ہمارے جانے کے چار دن بعد کا تھا۔ اور اس کے بعد کے گزشتہ روز کی تاریخ تک کے تمام اخبارات اُس نے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ آج کا اخبار اُس نے اپنے تھیلے میں سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

میں اور سیتا وہ اخبارات دیکھتے رہے۔ اُن میں وہ تمام تفصیلات موجود تھیں جو راجیو نے مختصراً بتا دی تھیں۔ ہمارے جیسلمیر آنے کے بعد یہاں جو کچھ بھی ہوا تھا وہ تمام اخبارات میں موجود تھا۔ رپورٹروں نے کھوج کھوج کر خبریں تلاش کی تھیں لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ پچھلے ڈیڑھ ہفتے کے دوران یہاں سے صرف گیارہ کلومیٹر دُور لودروا کیمپ میں جو کچھ ہوا تھا اس حوالے سے ایک لفظ تک کسی اخبار میں شائع نہیں ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ کیمپ کی کوئی بات باہر نہیں نکلنے دی گئی تھی۔ اور اسرائیلی ایجنٹوں کی ہلاکتوں کو بھی راز ہی میں رکھا گیا تھا۔

میں نے اخبارات ایک طرف رکھ دیئے اور سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر بے پناہ افسردگی تھی اور آنکھیں نم تھیں۔ مجھے بھی دُرگا کی موت کا بہت دُکھ ہوا تھا۔ اُس نے کٹھن ترین حالات میں ہمیں پناہ دی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ میں کون ہوں...... مجھے پناہ دینا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ دوسری طرف سیتا بھی منحرف ہو چکی تھی۔ وہ بھی موسٹ وانٹڈ تھی۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی دُرگا نے اپنے گھر کے دروازے ہمارے لئے کھول دیئے تھے۔ ہمیں نہ صرف ہر آسائش مہیا کی تھی بلکہ ہماری حفاظت کے لئے بھی نہایت معقول بندوبست کر لیا تھا۔

میگزین میں شائع ہونے والی اس تصویر کے بارے میں مجھے پہلے ہی شبہ تھا اور میں جانتا تھا وہ تصویر کسی نہ کسی وقت رنگ ضرور لائے گی، اور وہی ہوا تھا...... اور اتفاق سے میں اور سیتا

اُس روز وہاں موجود نہیں تھے۔ دُرگا کو ہمارے ساتھ کلپنا اور راجیو وغیرہ کا بھی خیال تھا۔ اُس نے بروقت اطلاع ملنے پر ان تینوں کو وہاں سے بھگا دیا تھا لیکن خود پکڑی گئی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو اپنی جان بچانے کے لئے ہمارے بارے میں بتا دیتی لیکن اُس نے جان دے دی پر ہمارے بارے میں ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا۔

سیتا کو اپنے باپ کا بھی افسوس تھا۔ وہ بے گناہ پکڑا گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے ہم اس پوزیشن میں اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ہم دیر تک بیٹھے دُرگا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ دوپہر کو گرمی ہوگئی۔ یہاں بجلی تو نہیں تھی، دستی پنکھے ہی استعمال کرتے رہے۔

کلپنا اور شوبھا اُٹھ کر باہر چلی گئی تھیں۔ میں اور سیتا دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر سیتا بھی اُٹھ کر باہر چلی گئی تو میں کھاٹ پر لیٹ گیا۔ ہم رات بھر جاگے تھے اور پورا وقت بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ میں بری طرح تھک گیا تھا۔ چارپائی پر لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر مجھے اتنا غافل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی.....!

○

صورتحال ہمارے لئے بہت سنگین ہوگئی تھی.....

اگلے روز کے اخبارات کی ہیڈ لائن لودروا کیمپ میں ہونے والے دھماکوں اور ہنگاموں سے متعلق تھی۔ اخبارات نے پہلی مرتبہ انکشاف کیا کہ شہر سے گیارہ کلومیٹر دُور ان قدیم کھنڈروں میں دہشت گردوں کو تربیت دینے کا کیمپ قائم ہے۔ اور اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی ''موساد'' کے ایجنٹ یہاں جدید ترین تکنیکس کے تحت دہشت گردی کی تربیت دیتے تھے۔

اخبارات نے گزشتہ روز ہونے والے دھماکوں سے پہلے کیمپ کے اندر قتل کی پراسرار وارداتوں کا تذکرہ بھی کیا تھا جن میں کئی مقامی ماہرین کے علاوہ تین اسرائیلی ایجنٹوں کو بھی ہلاک کر دیا گیا تھا۔

ایک دلچسپ خبر یہ تھی کہ کیمپ سکیورٹی کا انچارج جگل ناتھ لاپتہ تھا۔ کیمپ کے گیٹ پر متعین گارڈز کے بیان کے مطابق دھماکوں کے بعد صبح دس بجے جگل کو مندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اور پھر اُس کی جیپ شہر کی طرف جاتے ہوئے دیکھی گئی تھی۔ گارڈز نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ جگل ناتھ روزانہ مندر کے پجاریوں کے لئے ناشتہ اور کھانا لے کر جایا کرتا تھا۔ آخری مرتبہ وہ مندر کی طرف گیا تو واپس نہیں آیا۔ اُس کے ایک گھنٹے بعد اُسے کیمپ میں نہیں دیکھا گیا تھا اور اُسے بھی بڑی سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا تھا۔ اُس کی جیپ شہر کے نواحی علاقے میں کھڑی پائی گئی تھی اس لئے اُس کی تلاش میں شہر میں مختلف لوگوں سے رابطہ کیا جا رہا تھا۔

ایک دلچسپ خبر مندر کے حوالے سے بھی تھی۔ کیمپ سکیورٹی انچارج کے نائب کشوری لال کے بیان کے مطابق مندر کی سیوا کے لئے جو دو سادھو وہاں موجود تھے اُن میں ایک خوبصورت

لڑکی تھی۔ اور رات کو جب شہر میں جین مندروں کی پربندھک کمیٹی سے رابطہ کر کے اُن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ انکشاف ہوا کہ کسی عورت کو اس مندر میں نہیں بھیجا گیا تھا۔ دو ہفتے پہلے جو دو پنڈت وہاں بھیجے گئے تھے وہ دونوں ادھیڑ عمر مرد تھے۔ انہیں کل شام واپس آنا چاہئے تھا لیکن وہ واپس نہیں پہنچے تھے۔ لہٰذا پولیس کو اُن دو ادھیڑ عمر پنڈتوں کے علاوہ اُس نوجوان، خوبصورت عورت اور اُس کے ساتھی کی تلاش تھی جو مندر کے سیوکوں کے بہروپ میں دو ہفتے وہاں مقیم رہے تھے۔

ہمارے لئے اب چند روز تک باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ راجیو ہی ہمیں باہر کے حالات سے آگاہ کرتا رہا تھا۔ وہ پنڈت ہی کے بھیس میں دن میں ایک دو مرتبہ باہر جاتا۔ بازار سے ضرورت کی چیزیں بھی لے آتا اور حالات کے بارے میں تازہ ترین معلومات بھی۔

اور پھر ایک روز راجیو نے یہ دل خوش کن خبر سنائی کہ سیتا کے باپ کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ اُس کے بارے میں تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ سیتا کا اُس سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ پولیس سے چھٹکارا ملتے ہی مہاراناجے پور چلا گیا تھا۔

ہم ایک طرح سے اس مکان میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ یہاں ہمارے لئے دلچسپی کی کوئی چیز نہیں تھی سوائے اس کے کہ پڑے پڑے اینٹھتے رہتے۔ ہم اپنی چارپائیاں اُٹھا کر کبھی درختوں کے نیچے لے آتے اور کبھی کمرے میں۔

اسی شہر میں سیتا کے باپ کی ایک اور چھوٹی سی حویلی بھی تھی جو عرصہ سے بند پڑی تھی۔ سیتا کا خیال تھا کہ ہمیں اس حویلی میں منتقل ہو جانا چاہئے لیکن میں نے اس تجویز کی مخالفت کی تھی۔ پولیس کو سیتا کی تلاش تھی اور یقیناً ہر اُس عمارت کی نگرانی ہو رہی تھی جس کو کبھی سیتا یا اُس کے باپ سے کوئی تعلق رہا ہو۔

دو ہفتوں میں معاملات کچھ ٹھنڈے پڑ گئے اور ہم نے یہ دو ہفتے بڑی اذیت میں گزارے تھے۔ اس دوران میں نے اپنی داڑھی مونچھیں بڑھانا شروع کر دی تھیں تاکہ حلیے میں کسی قدر تبدیلی آ سکے۔ ہم نے وہ تھیلا ابھی تک نہیں کھولا تھا جو مندر سے لے کر آئے تھے۔ سیتا نے تھیلا اپنی کھاٹ پر تکیے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اُس روز دوپہر کو جبکہ راجیو بھی موجود تھا سیتا نے کھاٹ پر چادر بچھا کر وہ تھیلا پلٹ دیا اور اُن تینوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں.....

''یہ..... یہ سب کہاں سے آیا سیتا جی؟'' راجیو کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔ اُس نے ایک مورتی اُٹھا لی۔ چند لمحے اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''خالص سونے کی ہے۔ کہاں سے ملا یہ سب کچھ؟''

''لودروا کے مندر سے.....'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم سے پہلے بھی بہت سے پنڈت اور پجاری وہاں جاتے رہے ہیں لیکن یہ خزانہ ہماری ہی قسمت میں تھا۔''

''بہت قیمتی خزانہ ہے یہ.....'' راجیو بولا۔ وہ ایک ایک چیز اُٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ کلپنا اور شوبھا

بھی مختلف چیزیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگیں۔ کلپنا نے وہ تاج سر پر اُٹھا لیا جو مندر کے تہہ خانے میں سیتا نے بھی پسند کیا تھا۔

''کیسی لگ رہی ہوں مہابیر جی؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''راجکماری۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہائے رے مرد کی ذات.....'' سیتا گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''مندر میں جب یہ مُکٹ میں نے اپنے سر پر رکھا تھا تو اس وقت بھی تم نے یہی الفاظ کہے تھے۔ اور اب کلپنا کو بھی گولی دے رہے ہو..... نہیں کلپنا! تم اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا۔ یہ مُکٹ تم پر بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ لاؤ..... یہ مجھے دے دو!'' اور پھر اُس نے خود ہی وہ تاج کلپنا کے سر سے اُتار کر اپنے سر پر سجا لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں کیسی لگ رہی ہوں مہابیر جی؟''

''راجکماری۔'' میں نے کہا۔ اور پھر وہ سب ہی قہقہے لگانے لگے۔

میرے خیال میں وہ خزانہ کروڑوں روپے مالیت کا تھا۔ بہت سے زیورات ایسے تھے جن کے ڈیزائن بہت قدیم تھے اور بعض چیزیں تو ایسی تھیں جنہیں قدیم تاریخی ورثہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ سیتا نے ان میں سے کچھ چیزیں الگ کر لیں۔ اُن میں عام لاکٹ، چوڑیاں، کڑے اور انگوٹھیاں وغیرہ شامل تھیں۔ یہ ڈیزائن نہایت معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی مروّج تھے اور اُنہیں بازار میں فروخت کرنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جبکہ قدیم ڈیزائن کی کوئی چیز دیکھ کر کسی کو شبہ ہو سکتا تھا۔ باقی چیزیں سیتا نے دوبارہ تھیلے میں ڈال لی تھیں۔

''اب صورتحال یہ ہے راجیو!'' سیتا اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس جگہ رہنا ہم سب کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ گرمی تو ہے ہی لیکن پانی کا بھی مسئلہ ہے۔ تمہیں کتنی دُور سے پانی لانا پڑتا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم رہائش کے لئے کوئی اور بندوبست کر لیں۔''

''لیکن یہ جگہ بہت محفوظ ہے سیتا دیوی!'' راجیو نے کہا۔

''ہم کسی محفوظ جگہ کا ہی بندوبست کریں گے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''تم یہ چار چوڑیاں اور یہ ہار لے جا کر فروخت کر دو! ہمارے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں۔ ان چیزوں کے بیچنے سے اچھی خاصی رقم مل جائے گی۔ ہم کرائے پر کوئی مکان لے لیں گے۔''

''میں جس کے پاس بھی یہ زیور بیچنے جاؤں گا وہ اس کی رسید مانگیں گے سیتا جی!'' راجیو نے کہا۔ ''اگر کسی کو مجھ پر شک ہو گیا تو پکڑ لیں گے مجھے۔''

''راجیو ٹھیک کہہ رہا ہے.....'' میں نے کہا۔ ''یہ ٹھیک سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ اگر شبہ ہو گیا تو اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔''

''تو پھر.....؟'' سیتا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''میں اور تم چلتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ظاہر ہے ہم ہمیشہ کے لئے اس چار دیواری میں بند ہو کر نہیں رہ سکتے۔ اور ویسے بھی اب معاملات کچھ ٹھنڈے پڑ گئے ہیں..... وہ سرکاری

نہیں رہی۔''

''ہاں..... رسک تو لینا ہی پڑے گا۔'' سیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر اُس روز شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہم بازار جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ کلپنا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ سیتا نے شوبھا کے کپڑے پہن لئے تھے۔ گھاگھرا، چولی اور چنری۔ کلپنا نے بھی ایسا ہی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ چنری سے گھونگھٹ نکال کر چہرہ چھپایا جا سکتا تھا۔ میں نے بھی راجیو کا لباس پہنا تھا۔ دھوتی، خاص تراش کا کرتہ اور سر پر ست رنگے چنری جیسے کپڑے کی بل کھاتی ہوئی پگڑی۔ میری داڑھی اور مونچھیں بے ترتیب تھیں۔ ماتھے پر سیتا نے ٹیکا بھی لگا دیا تھا۔ میں نے اپنے لباس میں پستول بھی چھپا لیا تھا تاکہ کسی ہنگامی صورتحال میں اپنا بچاؤ کیا جا سکے۔

ہمیں بہت دُور تک پیدل چلنا پڑا تھا۔ آبادی میں جا کر بھی ہم نے کوئی رکشہ وغیرہ نہیں لیا اور پیدل ہی چلتے ہوئے مین بازار میں آ گئے۔ یہی شہر کا سب سے بڑا کاروباری اور تجارتی مرکز تھا۔ یہاں ہر قسم کی دُکانیں تھیں۔ یوں تو مین روڈ پر بھی جوہریوں کی بڑی بڑی دُکانیں تھیں۔ ایک طویل گلی پر مشتمل صرافہ بازار بھی تھا۔

شہر میں بڑی رونق تھی۔ ہم بازار میں چلتے ہوئے صرافہ والی گلی میں گھس گئے اور جگمگاتی ہوئی دُکانوں کو دیکھتے ہوئے چلتے رہے اور بالآخر ایک دُکان میں داخل ہو گئے۔ یہاں دو سیلز مین تھے اور سیٹھ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سیلز مین دو عورتوں کو انگوٹھیاں دکھا رہا تھا۔ دوسرا سیلز مین فوراً ہی ہماری طرف متوجہ ہو گیا لیکن ہم اُس طرف بڑھ گئے جہاں سیٹھ بیٹھا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اُٹھ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''فرمایئے مہاراج..... کیا سیوا کی جائے آپ کی؟'' وہ باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہم کچھ خریدنے نہیں آئے مہاراج!'' میں نے بھی ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجبوری ہمیں یہاں لے آئی ہے۔''

''کچھ بیچنا چاہتے ہیں؟'' سیٹھ بولا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے غایت شرمندگی ہو رہی ہو۔

''کوئی بات نہیں مہاراج! جیون میں اُونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ کبھی ایسا سمہ بھی آتا ہے۔ دکھایئے! آپ کیا چیز لائے ہیں؟''

میں نے سیتا کو اشارہ کیا۔ اُس نے اپنے لباس میں سے ایک پوٹلی نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔ میں نے وہ پوٹلی سیٹھ کی طرف سرکا دی۔ اُس نے پوٹلی کھولی اور ایک ایک چیز اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی۔

''ان زیوروں کی رسید ہو گی آپ کے پاس مہاراج؟'' بالآخر اُس نے میری طرف دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

''تم ہم کا چور سمجھو سیٹھ؟'' مجھ سے پہلے سیتا بول اُٹھی۔ ''یہ ہمار نانی کا جیور ہے جو ماتا جی نے ہم کا بیاہ پر دیا تھا۔ اس کی رسید کون سنبھال رکھت ہے؟ لینا ہے تو لو، نئی تو واپس کر دو یہ سب چیزاں۔ ہم کوئی اور دُکان دیکھت ہیں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا دیوی جی! کہ یہ زیور آپ نے کہیں سے چرائے ہیں۔'' سیٹھ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی ہم سے پوچھے کہ یہ گہنے ہم نے کہاں سے خریدے ہیں تو ہمیں کچھ تو بتانا پڑے گا نا۔''

''ہم سب سمجھت ہیں.....'' سیتا نے کہا۔ ''ہم انگوٹھا لگاوت دیں گے ناکورے کاغج پر۔''

اس مرتبہ سیٹھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اُن زیوروں کو ایک ایک کر کے کانٹے پر تولنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کچھ حساب کتاب بھی کرتا جا رہا تھا۔ اور پھر اُس نے جو قیمت بتائی وہ چوتھائی سے بھی کم تھی۔

''نہ بھایا.....'' سیتا بولی۔ ''اس سے دوگنا تو ہمار گاڑی کا مہاجن پنڈت دولت رام دیوت کو تیار ہے۔ نہ جی..... ہم نہ بیچت ہیں۔''

''بات یہ ہے دیوی جی.....'' سیٹھ بولا۔ ''یہ ڈیزائن بہت پرانے ہو گئے ہیں۔ میں نے تو ٹانکے کی قیمت کاٹی ہے۔ ہم انہیں گلا کر نئے ڈیزائن تیار کریں گے تب ان کی کچھ قیمت وصول ہو گی۔''

''ہمار سب سمجھت ہیں سیٹھ جی.....'' سیتا نے کہا۔ ''ان کو دھو کر تم یہاں سجا دیو گے اپنے شو کیس ما..... ہمار گہنے ہم کا واپس کر دیو۔''

''تو پھر آپ کیا لیں گی دیوی جی؟'' سیٹھ نے کہا۔ وہ اب زیادہ تک سیتا ہی سے مخاطب تھا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ میں تو محض اُلو کا پٹھا ہوں۔ جو بھی فیصلہ کرنا ہے اس دیوی جی نے ہی کرنا ہے۔ کلپنا بھی میری طرح خاموش کھڑی شو کیسوں میں سجے ہوئے جگمگاتے ہوئے زیورات کو دیکھ رہی تھی۔

سیتا نے میری طرف دیکھا، میرے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ سکا تھا کہ اُس نے کیا کہا تھا۔ میں نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے جو قیمت بتائی وہ سیٹھ کی پیشکش سے بھی دُگنی تھی۔ لیکن بہر حال معاملہ آدھی قیمت پر طے ہو گیا۔ ہمیں ان زیورات کی اس سے زیادہ قیمت بھی مل سکتی تھی لیکن اُنہیں لے کر دُکان دُکان لئے پھرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کسی کو ہم پر شبہ بھی ہو سکتا تھا اس لئے پہلی دُکان پر ہی ہم نے قصہ ختم کر دیا۔

سیٹھ نے ایک سادے کاغذ پر رسید لکھوا لی۔ اُس نے جب پتہ پوچھا تو سیتا نے بڑے اطمینان سے دُرگا کی حویلی کا پتہ لکھوایا۔ ظاہر ہے وہ نمبر لکھوایا گیا تھا جو میونسپلٹی کی طرف سے اس

حویلی کو الاٹ کیا گیا تھا اور محض نمبر پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رسید پر دستخط میں نے ہی پریم چند کے نام سے کئے تھے اور نوٹ سیتا نے وصول کئے۔ چند نوٹ میری طرف بڑھا کر باقی نوٹ اُس نے اُسی پوٹلی میں باندھ لئے جس میں زیورات لائے گئے تھے اور وہ پوٹلی وہیں کھڑے کھڑے چولی کے گریبان میں ڈال لی۔

واپس جاتے ہوئے ہم مختلف بازاروں میں گھومتے رہے۔ ضرورت کی کچھ چیزیں بھی خریدی گئیں۔ ایک جگہ فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک خوانچہ فروش سے امرود خریدنے کے لئے رُک گئے۔ امرود خریدنے کے بعد ہم جیسے ہی آگے بڑھے کلپنا کی چنری کا نیچے لٹکا ہوا پلو خوانچے میں اٹک گیا۔ چنری اُس کے سر سے اُتر گئی اور کلپنا بدحواس سی ہو کر چنری کا پلو خوانچے سے چھڑانے لگی۔ اور جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو ایک آدمی ہمارے پیچھے لگ چکا تھا.....

وہ دراز قامت آدمی اُس وقت ہمارے قریب سے گزر رہا تھا۔ اور جب کلپنا کا آنچل گرا تھا تو وہ اُس کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا اور چند گز آگے جا کر رُک گیا تھا۔ میں نے بھی سرسری سے انداز میں اُس کی طرف دیکھا تھا اور نجانے کیوں مجھے اُس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا تھا لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کب اور کہاں دیکھا تھا؟ میرے ذہن میں ایک لمحہ کو یہ شبہ بھی اُبھرا تھا کہ شاید اُس شخص نے ہمیں زیورات فروخت کرتے اور رقم وصول کرتے دیکھ لیا ہو اور وہ اس رقم کے چکر میں ہمارے پیچھے لگ گیا ہو۔ ہم دیہاتیوں کے حلیے میں تھے اور دیہاتیوں کو شہر میں آسانی سے بیوقوف بنایا جا سکتا تھا یا اُنہیں ڈرا دھمکا کر لوٹا جا سکتا تھا۔ بہر حال میں نے کلپنا اور سیتا کو نہیں بتایا۔

وہ شخص تقریباً بیس قدم کے فاصلے پر ہمارے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہمارے ہی چکر میں ہے..... میں ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ کون ہے اور اُسے کہاں دیکھا تھا.....؟ ہم گنجان آبادی سے دُور نکل آئے۔ آگے شہر کا وہ علاقہ شروع ہو رہا تھا جہاں حویلی نما بڑے بڑے مکان تھے۔ سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا، اور روشنی کا انتظام بھی مناسب نہیں تھا۔ اگر کسی ایک کھمبے پر بلب جل رہا تھا تو آگے کے تین چار کھمبوں کے بلب یا تو فیوز تھے یا سرے سے تھے ہی نہیں۔

''ایک آدمی ہمارے تعاقب میں لگا ہوا ہے۔'' سیتا نے میرے ساتھ لگتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''کیا ایسی صورت میں سیدھا گھر کی طرف جانا ہمارے لئے مناسب ہو گا؟''

میں سیتا کی بات سن کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کا مطلب تھا کہ اُس نے بھی تعاقب کرنے والے کو بہت پہلے سے دیکھ لیا تھا۔

''میں بھی اُسے دیکھ چکا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''فی الحال تو اپنے راستے پر چلتی رہو۔ کوئی مناسب جگہ دیکھ کر اُس سے نمٹنے کی کوشش کی جائے گی۔''

ہم ایک گلی میں مُڑ گئے۔ میں ایک دم دیوار کی آڑ میں ہو گیا اور پیچھے مُڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ

دراز قامت آدمی سفاری سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ باریک مونچھیں اور فرنچ کٹ داڑھی، سر کے بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت ایک کھمبے پر جلنے والے بلب کی روشنی میں تھا اس لئے اُس کا چہرہ بھی مجھے نظر آ گیا تھا۔ میں مُڑ کر سیتا اور کلپنا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ دونوں بڑے اطمینان سے امرود کھاتی ہوئی چل رہی تھیں۔ سیتا نے کلپنا کو تعاقب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

اُس گلی سے نکل کر ہم کھلی جگہ پر نکل آئے۔ آگے ایک دوسرے سے فاصلے پر اِکا دُکا مکان تھے۔ کہیں کہیں ناریل اور تاڑ کے درخت بھی تھے اور اُنہی مکانوں اور درختوں میں وہ راستہ بھی تھا جو راجیو کے مکان کی طرف چلا گیا تھا۔ ہم اُس راستے پر ابھی چند ہی گز آگے بڑھے تھے کہ وہ شخص تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ میں نے سیتا کو کہنی سے ٹہوکا دے کر اشارہ کیا اور ہم نے جان بوجھ کر اپنی رفتار سست کر دی۔

''اے شریمان جی..... ذرا رُک جاؤ! تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔'' اُس شخص کی آواز سن کر ہم رُک گئے۔ آواز کے ساتھ ہی میرے دماغ میں دھماکہ سا ہوا۔ میں نے بیٹھی بیٹھی اور بھاری آواز سے اُس شخص کو پہچان لیا تھا۔ وہ گنگو تھا.....

میری یہ داستان پڑھنے والے اُن دو بدمعاشوں کو نہیں بھولے ہوں گے جنہوں نے ایک رات سیتا کے پتا جی کی حویلی میں گھس کر کلپنا کو اغواء کرنے کی کوشش کی تھی اور میری اور سیتا کی بروقت مداخلت سے ہم نے کلپنا کو بچا لیا تھا۔ ایک بدمعاش نے میرے سینے میں خنجر اُتارنے کی کوشش کی تھی۔ میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا تھا اور خنجر اُس بدمعاش کے دوسرے ساتھی کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا اور قاتل کھڑکی سے چھلانگ لگا کر فرار ہو گیا تھا۔ اور اُسی رات ہمیں وہ حویلی چھوڑنی پڑی تھی۔ فرار ہونے والا وہ بدمعاش گنگو تھا جسے ہم بھی تلاش کرتے رہے تھے اور پولیس بھی۔ لیکن اُس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ ہم دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے اور گنگو کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا تھا اور اب وہی گنگو ہمارے تعاقب میں تھا.....

لباس بھی شخصیت کو کس طرح بدل دیتا ہے۔ اگر یہ اپنے اصل حلیے میں ہوتا تو بازار میں پہلی نظر دیکھتے ہی میں اُسے پہچان لیتا۔ لیکن اس شریفانہ لباس نے تو اُس کی شخصیت ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ اور پھر اُس نے گردن تک لمبے بال کٹوا دیئے تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں پنسل ٹائپ میں تبدیل ہو گئی تھیں اور ٹھوڑی پر فرنچ کٹ داڑھی نے بھی اُس کی شخصیت کو تبدیل کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔ وہ بدمعاش کی بجائے اب ایک شریف آدمی ہی لگتا تھا لیکن اُس کی آواز نے اس کا راز فاش کر دیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ بازار میں ہمیں دیکھ کر محض شک کی بنا پر ہمارے پیچھے لگا تھا اور جب اتفاق سے کلپنا کے سر سے چنری اُتر گئی تھی تو اُس کا چہرہ دیکھ کر گنگو ہمارے تعاقب میں یہاں تک چلا آیا تھا۔ لباس اور حلیے سے اُس کی شخصیت بدل گئی تھی تو کیا ہوا؟ اُس کی فطرت تو نہیں

بدلی تھی۔ اُس کی رگوں میں تو وہی گندا خون دوڑ رہا تھا۔

میں سیتا اور کلپنا سے دو تین قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا تا کہ گنگو اگر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو ہم تینوں بیک وقت اُس کی زد میں نہ آ سکیں۔ وہ ہمارے قریب آ کر رُک گیا۔ اُس جگہ اندھیرا تھا۔ ہم اگرچہ ایک دوسرے کی شکل واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن بہرحال ایک دوسرے کو جان چکے تھے.....

''کیا بات ہے.....'' میں نے کہا۔ ''تم کون ہو اور کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''میں تم سے ایک سودا کرنے آیا ہوں شریمان جی!'' اُس نے کہا۔ ''میں اگر چاہتا تو تم لوگوں کو بازار ہی میں کسی جگہ روک سکتا تھا۔ لیکن میں کوئی ہنگامہ نہیں کرنا چاہتا اس لئے تمہارے پیچھے یہاں تک چلا آیا ہوں۔''

''حیرت ہے.....'' میں نے کہا۔ ''ہماری کوئی جان پہچان نہیں اور تم.....''

''میں تم لوگوں کو پہچان گیا ہوں.....'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''تم وہی ہو جو مہارانا دھرمیش سنگھ کی حویلی میں چھپے ہوئے تھے۔ میں اس لونڈیا کو اُٹھانے گیا تھا لیکن گڑبڑ ہو گئی۔ میرا ساتھی میرے ہی ہاتھوں مارا گیا اور مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا..... میں پولیس سے بچنے کے لئے اجمیر کی طرف بھاگ گیا تھا۔ چند روز پہلے ہی واپس آیا ہوں۔ پولیس کو اب بھی میری تلاش ہے لیکن پولیس اب تک میرا سراغ نہیں لگا سکی۔''

''کیا چاہتے ہو گنگو؟'' میں نے اُسے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تو تم نے مجھے پہچان لیا۔'' گنگو بولا۔

''میں نے تمہیں اُسی وقت دیکھ لیا تھا جب امرود والے خوانچے کے قریب تم نے ہمارا تعاقب شروع کیا تھا۔ اور جب تم نے یہاں ہمیں رُکنے کو کہا تھا تو میں نے آواز سے تمہیں پہچان لیا تھا۔ کیا چاہتے ہو تم؟''

''چند روز پہلے مجھے پتہ چلا تھا کہ یہ دوسری لونڈیا مہارانا دھرمیش سنگھ کی بیٹی ہے۔ اور تم وہ کشمیری مجاہد ہو جسے ''را'' اور یہاں کی پولیس تلاش کر رہی ہے۔ میری طرح تم لوگ بھی اب تک پولیس کو دھوکہ دینے میں کامیاب رہے ہو۔ اگر اس لونڈیا کے سر سے چنری نہ ہٹتی تو شاید میں بھی اجنبیوں کی طرح تمہارے قریب سے گزر جاتا۔ لیکن اس کی صورت دیکھ کر میں ٹھٹک گیا اور اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ تم سے کوئی سودا کر سکوں۔''

گنگو سے جب پہلی مرتبہ آمنا سامنا ہوا تھا تو وہ خالص راجستھانی لہجے میں بات کر رہا تھا۔ لیکن اب وہ بڑی صاف اُردو بول رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اُس کی اصلیت کچھ اور تھی۔

''تم پڑھے لکھے لگتے ہو لیکن.....''

''میں نے جے پور یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔'' گنگو نے میری بات کاٹ دی۔ ''لیکن میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ اتنا علم حاصل کرنے کے بعد بھی میں اندھیرے میں کیوں بھٹک گیا تھا؟

اس وقت میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لونڈیا میرے حوالے کردو! میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ مجھے یاد بھی نہیں رہے گا کہ تم لوگ کون ہو..... اور ویسے بھی اس لونڈیا سے تمہارا کوئی تعلق تو ہے نہیں۔ اس سے کہو یہ خاموشی سے میرے ساتھ چلی چلے۔'' اُس نے بات ختم کرتے ہی جیب سے چاقو نکال لیا.....

کلپنا خوفزدہ ہو کر سیتا کے ساتھ جڑ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ سیتا بھی دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے گنگو!'' میں نے کہا۔ ''اگر تم ہمارے بارے میں ایسی باتوں کا انکشاف نہ کرتے تو شاید میں تمہیں یہاں سے زندہ جانے کا موقع دے دیتا۔ لیکن اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''بہت سورما ہو.....'' گنگو غرایا۔ ''اُس رات میں کسی وجہ سے بھاگ گیا تھا۔ میرا ساتھی میرے ہی ہاتھوں مارا گیا تھا۔ لیکن آج یہاں کھلا میدان ہے۔ میں ہوں..... تم ہو اور یہ لونڈیا ہے۔ ویسے میں ایک بار پھر تمہیں یہ آفر دے رہا ہوں کہ اسے میرے حوالے کردو اور اپنی سیتا کو لے کر چلے جاؤ! ہم دونوں ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔''

''اس بات کو ذہن سے نکال دو کہ میں اس لونڈیا کو تمہارے حوالے کردُوں گا۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر تیار ہو جاؤ!'' گنگو غرایا۔ ''یہ سمجھ لو کہ آج اس لونڈیا کے لئے سوئمبر ہوگا۔ جو جیت گیا وہ اس لونڈیا کو لے جائے گا اور دوسرا یہاں خاک وخون میں لوٹتا رہ جائے گا۔''

میرے دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھے جنہیں میں نے نیچے پھینک دیا۔ میرے لباس میں اگرچہ پستول موجود تھا اور میں چاہتا تو ایک ہی گولی سے اُس کی کھوپڑی میں سوراخ کر سکتا تھا۔ لیکن میں پستول استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فائر کی آواز سناٹے میں دُور تک پھیل جاتی اور ویسے بھی میں گنگو کو دو دو ہاتھ کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

گنگو چاقو والا ہاتھ بلند کر کے دھاڑتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی بجائے اُس کا وار روکا، اُس کی کلائی دونوں ہاتھوں میں تھام کر نیچے جھکتے ہوئے اُسے زوردار جھٹکا دیا..... وہ منہ کے بل آگے کو جھکا میں نے اُس کی کلائی چھوڑ دی اور بڑی پھرتی سے سیدھا ہوتے ہوئے اُس کے کولہے پر لات رسید کر دی۔ وہ منہ کے بل نیچے گر پڑا۔ اُس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ لیکن وہ حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُٹھ گیا اور اس نے بھی زیادہ پھرتی سے دوبارہ حملہ کر دیا..... اس مرتبہ میں نے اُس کے وار کو ہاتھ سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اُس کا ہاتھ جیسے ہی نیچے آیا میں نے پیر سے زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ چاقو گنگو کے ہاتھوں سے نکل کر دُور جا گرا۔ اُس نے سنبھلنے کی کوشش کی تو میں نے ایک اور ٹھوکر لگا دی۔ یہ ٹھوکر اُس کے گھٹنے پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔

گنگو کو سنبھلنے کا موقع دینا خطرناک تھا۔ میری اگلی ٹھوکر پر وہ نیچے گر چکا تھا لیکن میں پے در پے اُس پر ٹھوکریں ہی برساتا رہا۔ لیکن ایک مرتبہ اُس کا بھی داؤ چل گیا۔ اُس نے میرا پیر پکڑ

کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا..... لیکن میں نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ گنگو بھی اُٹھ کر مقابلے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

سیتا اور کلپنا ایک طرف کھڑی تھیں۔ سیتا تو خاموش تھی البتہ کلپنا چیخ چیخ کر میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

گنگو نے اُچھل کر حملہ کیا تو میں اپنے آپ کو بچا گیا۔ وہ دوسری مرتبہ سنبھل کر پھر میری طرف لپکا۔ اس مرتبہ وہ میرے پیٹ پر سر سے ٹکر مارنا چاہتا تھا۔ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی گردن پر زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ وہ کراہتا ہوا منہ کے بل گرا تو میں نے ایک بار پھر اُس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ گنگو مجھ سے زیادہ قد آور اور زیادہ طاقتور تھا اور میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ اگر میں اُس کی گرفت میں آ گیا تو وہ میری ہڈیوں کا سرمہ بنا دے گا۔ اس لئے میں اُسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن میں زیادہ دیر تک اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں رہ سکا۔ ایک ایسا موقع آیا کہ گنگو مجھ سے لپٹ گیا۔

گنگو کا انداز ایسا تھا جیسے بڑی مدت کے بعد اپنے کسی بچھڑے ہوئے دوست سے بغل گیر ہو رہا ہو۔ وہ مجھے دونوں بانہوں کے حصار میں لے کر سینے سے بھینچ رہا تھا۔ اُس کی بانہوں کا شکنجہ گزرنے والے ہر لمحہ کے ساتھ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا..... میرا سانس گھٹنے لگا۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرے پاؤں خود بخود زمین سے اُٹھتے چلے گئے۔ میری حالت غیر ہوتی چلی گئی..... چند سیکنڈ اور گزرتے تو میں بے جان ہو کر اُس کی بانہوں میں جھول جاتا..... لیکن مجھے ایک موقع مل گیا۔ میں اپنا ایک ہاتھ آگے لانے میں کامیاب ہو گیا۔

میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال اُبھرا تھا۔ اب یا کبھی نہیں..... میں نے ہتھیلی پھیلا کر اُس کی ناک پر ضرب لگائی۔ کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ البتہ دوسری ضرب سے وہ اپنی جگہ سے ہل گیا..... میں نے اُس کی ناک پر ایک اور ضرب لگائی اور پھر میرا ہاتھ مسلسل حرکت کرتا رہا۔ سینے میں دم گھٹنے کے باوجود مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری ساری قوت میرے اُس ہاتھ میں سمٹ آئی ہو۔ میں ہتھیلی سے پے در پے اُس کی ناک پر ضربیں لگاتا رہا..... گنگو کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ اُس کی بانہوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑایا اور سینہ سہلاتے ہوئے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ گنگو بھی دُہرا ہو گیا تھا اُس کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔

اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہی میں نے گنگو پر حملہ کر دیا..... میری ٹھوکر اُس کے پیٹ پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا منہ کے بل زمین پر گرا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں چاقو تھا..... وہ زمین پر گرا تھا تو اتفاق سے چاقو اُس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

گنگو زخمی بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا..... میں نے بچنے کی کوشش کی تو میرا

پیر رپٹ گیا اور میں سنبھلنے کی کوشش میں لڑکھڑا کر رہ گیا اور چاقو کی نوک میری بائیں آستین کو چیر کر بازو کی کھال پر چرکہ لگاتے ہوئے گزر گئی۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گیا..... گنگو نے دھاڑتے ہوئے چھلانگ لگا دی۔ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو چاقو میرے سینے میں پیوست ہوتا۔

گنگو پے در پے حملے کرتا رہا اور میں بچتا رہا۔ اور بالآخر میں نے اُس کے تھوبڑے پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی..... وہ چیختا ہوا پیچھے اُلٹ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے سنبھل کر پھر حملہ آور ہوا مگر اس مرتبہ اُسے میرے قریب پہنچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سیتا نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا دی تھی اور کلپنا بھی حرکت میں آ گئی تھی۔ اُس نے ایک بڑا سا پتھر دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر دے مارا۔ گنگو لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ اگر یہ پتھر اُس کے سر پر لگ جاتا تو بھیجہ باہر نکل آتا۔

میں نے بھی اُٹھ کر گنگو کو ٹھوکروں پر رکھ لیا..... ایک مرتبہ گنگو کو اُٹھنے کا موقع مل گیا..... میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر یا کلپنا اور سیتا میں سے کسی پر حملہ کرے گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس نے ایک طرف دوڑ لگا دی تو میں چونک گیا..... گنگو کا زندہ بچ نکلنا ہمارے لئے موت کا سندیسہ بن سکتا تھا۔ میں نے اپنے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال لیا اور گنگو کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اب پستول کا استعمال ناگزیر ہو گیا تھا۔ گنگو مجھ سے تقریباً بیس قدم آگے تھا۔ میں نے فائر کر دیا..... گولی گنگو کی پشت پر لگی۔ وہ چیختا ہوا لڑکھڑا کر گرا..... میں دوڑتا ہوا اُس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تو میں نے اُس کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر جما دی۔ وہ پھر پشت کے بل گر گیا۔ میں نے اُس کے سینے پر پیر رکھ دیا۔

''تم سومبر کی بازی ہار گئے گنگو!'' میں نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ جو جیت جائے گا وہ لونڈیا کو لے جائے گا اور جو ہار جائے گا وہ خاک و خون میں لوٹ جائے گا۔ اور اب تم خاک و خون میں لوٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ.....!''

''مجھے معاف کر دو.....'' گنگو گڑگڑایا۔ ''میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں..... تم واقعی بڑے سورما ہو۔ مجھے شما کر دو! تم جو کہو گے میں کرنے کو تیار ہوں۔''

''تمہیں زندہ چھوڑ کر ہم اپنے آپ کو موت کے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔'' میں نے کہتے ہوئے پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اُس کے چہرے کی طرف تان لیا..... گنگو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اُس کی پیشانی پر لگی اور خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ میں اُچھل کر دُور ہٹ گیا۔ گنگو زمین پر اس طرح لوٹ رہا تھا جیسے بکرے کو گلے پر چھری چلا کر چھوڑ دیا گیا ہو۔

میں گنگو کو تڑپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اچانک ہی وہ آواز سن کر چونک گیا..... وہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔ میں دوڑ کر سیتا اور کلپنا کے قریب پہنچ گیا۔ زمین پر پڑے ہوئے

شاپنگ بیگز اُٹھائے اور اُن دونوں کے ساتھ ایک طرف دوڑنے لگا..... گاڑی کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ ایک موقع پر مکانوں کی طرف سے اُس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی بھی چمکتی ہوئی نظر آئی تھی۔

میں نے کلپنا کا ہاتھ پکڑ لیا اور تاڑ کے درختوں میں دوڑتا چلا گیا۔ سیتا بھی ہمارے پیچھے دوڑی آ رہی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ اب اُس گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ گاڑی اُس طرف آ رہی تھی جہاں گنگو کی لاش پڑی تھی..... اور پھر وہ گاڑی رُک گئی۔

ہم تینوں تاڑ کے گنجان درختوں میں گھستے چلے گئے.....!

○○○

درختوں اور کچے مکانوں میں ہوتے ہوئے ہم وہاں سے بہت دور نکل آئے۔ مسلسل دوڑتے رہنے سے کلپنا ہانپنے لگی تھی۔ سیتا کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ اُن کی وجہ سے مجھے رُک جانا پڑا۔ میں جانتا تھا ہم خطرے سے باہر نہیں ہوئے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس گاڑی میں کون لوگ تھے۔ پولیس کی گاڑی وہ بہرحال نہیں تھی لیکن وہ جو کوئی بھی تھے اگر اُنہوں نے لاش دیکھنے کے بعد گاڑی سے اُتر کر ہمارا پیچھا شروع کر دیا تو وہ ہمارے گھر تک بھی پہنچ سکتے تھے۔

دو منٹ بعد میں پھر اُنہیں ساتھ لے کر تیز تیز چلنے لگا۔ کلپنا کا ہاتھ میں نے اب بھی پکڑ رکھا تھا۔ ہم اُس کچے مکان کی پچھلی طرف سے گزرے جہاں پہلے روز دو عورتوں نے ہمیں دیکھ کر پرنام کیا تھا۔ اُس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ یہاں بجلی بھی نہیں تھی اور اس وقت کسی کے مکان کے باہر موجود ہونے کا امکان بھی نہیں تھا جو ہمیں دیکھ لیتا۔ لیکن میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

درختوں کے جھنڈ سے نکلنے کے تقریباً پانچ منٹ بعد ہم اپنے مکان پر پہنچ گئے۔ دروازے پر باہر کی طرف بوری کا پردہ پڑا ہوا تھا اور اندرنین کی چادر کا دروازہ تھا جو دن میں عام طور پر کھلا رہتا تھا مگر رات کو بند کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سیتا اور کلپنا کے اندر داخل ہونے کے بعد میں نے وہ دروازہ بھی بند کر دیا اور اُس میں لوہے کا کنڈا پھنسا دیا۔

راجیو اور شوبھا آنگن ہی میں تھے۔ شوبھا چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ پتیلی میں شاید چاول چڑھے ہوئے تھے۔ چاولوں کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ راجیو چارپائی پر بیٹھا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

''بہت دیر کر دی تم لوگوں نے..... ہم تو پریشان ہو رہے تھے۔'' راجیو نے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بازار میں دیر ہو گئی..... اور پھر راستے میں ایک سمسیا میں اُلجھ گئے تھے۔'' میں نے اُس کے قریب کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا اور دونوں شاپنگ بیگز سیتا کے حوالے کر دیئے جنہیں لے کر سیتا اندر چلی گئی۔

شوبھا چولہے کے سامنے سے اُٹھ کر جلدی سے دوسری چارپائی اُٹھا لائی اور پہلی چارپائی کے قریب بچھا دی۔ کلپنا کے ہاتھ میں اب بھی امرودوں والا تھیلا تھا۔ اُس نے وہ تھیلا شوبھا کے

والے کر دیا اور کھاٹ پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ ایک کیراسین لیمپ چولہے والے کے قریب رکھا ہوا تھا اور دوسرا کمرے میں تھا۔ باہر والے لیمپ کی روشنی کلپنا کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اُس کے چہرے پر خوف کے تاثرات بھی نظر آ رہے تھے۔

''کیسی سمسیا پڑ گئی تھی مہابیر جی؟'' راجیو نے پوچھا۔

''ایک پرانے پاپی سے آمنا سامنا ہو گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا اور پھر میں اُسے اُس واقعہ کے بارے میں بتانے لگا۔

''یہ تو بہت برا ہوا مہابیر جی!'' راجیو کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ہمیں بہرحال محتاط رہنا پڑے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

سیتا کمرے سے نکل کر شوبھا کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اور شوبھا مل کر پلیٹوں میں چاول نکال کر دینے لگیں۔ ہندوستان کے عام باشندوں کی خوراک دال چاول ہی تھی۔ غریب طبقے میں تو زیادہ تر دال چاول ہی کھائے جاتے تھے کہ پیٹ بھرنے کے لئے سب سے سستی خوراک یہی تھی۔

ہم ابھی کھانا کھا رہے تھے کہ باہر کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا..... سیتا، شوبھا اور کلپنا ایک چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں اور راجیو دوسری کھاٹ پر تھے۔ راجیو نے صرف دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اُس نے قریب پڑی ہوئی میلی چادر اُٹھا کر کندھے پر ڈال لی اور اُٹھ کر دروازے کی طرف چل دیا اور اس دوران دروازہ دوسری مرتبہ کھٹکھٹایا گیا تھا.....

''کون ہے بھایا..... آ رہا ہوں۔ ہری رام..... ہری اوم.....''

میں محتاط ہو کر بیٹھ گیا..... پستول نکال کر چاولوں کی پلیٹ کے ساتھ رکھ لیا۔ اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو پستول استعمال کرنے میں دریغ نہیں کروں گا۔

''نمسکار تھانیدار جی..... خیریت، کوئی چور بھاگ گیا کیا؟'' راجیو کی آواز سنائی دی۔

''چور نہیں پنڈت جی! ہمیں ایک ہتیارے کی تلاش ہے۔'' دوسری آواز سنائی دی۔ وہ غالباً تھانیدار پولیس والا تھا جسے راجیو نے تھانیدار کہا تھا۔ ''ایک گھنٹہ پہلے یہاں سے آگے ایک آدمی کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ قاتل شاید اب بھی اسی علاقے میں ہے۔ ہمیں اُس کی تلاش ہے۔ آپ نے کوئی مشتبہ آدمی نہیں دیکھا اس طرف؟''

''نہیں مہاراج!'' راجیو نے جواب دیا۔ ''میرے تو مہمان آئے ہوئے ہیں۔ بھوجن کر رہے ہیں اس وقت۔ آپ بھی پدھاریئے! کوئی جل پان.....''

''شکریہ پنڈت جی! پر آپ کے یہ مہمان کون ہیں؟'' وہی آواز سنائی دی۔

''وہ دیکھئے..... وہ بیٹھے بھوجن کر رہے ہیں۔'' راجیو نے دروازے کا بوری کا پردہ پوری طرح ہٹا دیا۔ ''وہ میری دیدی ہے اور وہ میرے جیجا جی۔ اور وہ میری دوسری بہن ہے اور اُس کے ساتھ میری پتنی بیٹھی ہوئی ہے۔ شوبھا نام ہے اُس کا، دال بھات بہت اچھی بناتی ہے۔ آپ

بھی.....''

''دھنے باد پنڈت جی!'' پولیس والے نے پھر اُس کی بات کاٹ دی۔ ''ویسے آپ لوگ محتاط رہئے! وہ ہتیارا ابھی اسی علاقے میں موجود ہے۔''

''آپ فکر نہ کرو مہاراج!'' راجیو نے جواب دیا۔ ''ہمیں مل گیا تو اُسے رسیوں سے باندھ کر آپ کو اطلاع دے دیں گے۔ جی اچھا..... جے رام جی کی۔''

راجیو دروازہ بند کر کے اندر آ گیا اور میرے سامنے بیٹھ کر دوبارہ پلیٹ میں ہاتھ ڈال دیا۔

''پولیس کو اُس قتل کی اطلاع ہو چکی ہے اور اُن کا خیال ہے کہ قاتل ابھی تک اسی علاقے میں موجود ہے۔'' وہ نوالہ منہ میں ڈالنے سے پہلے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''وہ غلط نہیں کہتا۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہم تو ابھی تک واقعی یہیں موجود ہیں۔''

''احمق کہیں کے.....'' سیتا ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو قاتل کو اس طرح تلاش کر رہے ہیں جیسے وہ اُن کے انتظار میں بیٹھا ہو۔''

کھانے کے بعد بھی ہم آنگن میں بیٹھے رہے۔ یہاں مچھر بڑے ظالم قسم کے تھے۔ بڑی بے رحمی سے ہمارا خون چوس رہے تھے اور ہم اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ کلپنا کی طرف سے اب میری پریشانی کچھ کم ہو گئی تھی۔ اُسے پہچاننے والوں میں ایک کے سوا سب مارے جا چکے تھے۔ رام چند دھوبی اور اُس کا ایک ساتھی کئی روز پہلے ہی میرے اور کلپنا کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ گنگو آج اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اب صرف وہ بوڑھا ٹھاکر رہ گیا تھا جو اس سارے فساد کی اصل جڑ تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ جب وہ گنگو کے بارے میں سنے گا تو سامنے آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ کلپنا کو اب منہ چھپانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

ہمارا اس مکان میں رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ابھی تک کسی کو شبہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن شبہ ہو جانے کی صورت میں یہ مکان محفوظ نہ ہوتا۔ اُسے چار آدمی بھی اگر چاروں طرف سے گھیر لیتے تو ہمارے فرار کا کوئی راستہ نہ رہتا۔ ہم آسانی سے مارے جا سکتے تھے۔ ہمارے پاس اتنی رقم آ چکی تھی کہ ہم کچھ عرصہ کے لئے کرائے کا کوئی مکان لے سکتے تھے۔

صبح راجیو اور شوبھا مکان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کلپنا بھی اُن کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میں اور سیتا اُس مکان میں اکیلے رہ گئے۔ میں آنگن میں درختوں کے نیچے کھاٹ پر لیٹا صورتحال پر غور کرتا رہا۔ لودروا والے کیمپ کو ہم تباہ کر چکے تھے۔ اسرائیلی ایجنٹ واپس جا چکے تھے۔ کیمپ اس طرح تباہ ہوا تھا کہ اُسے دوبارہ قابل عمل بنانے کے لئے کئی مہینے درکار تھے۔ اس طرح وقتی طور پر بھارتی حکمرانوں کا یہ منصوبہ التوا میں پڑ گیا تھا۔

دہشت گردوں کو تربیت دینے کا ایک کیمپ جیسلمیر چھاؤنی میں بھی تھا لیکن وہاں ہمارا داخلہ ممکن نہیں تھا۔ سیتا فوراً ہی پہچان لی جاتی۔ اور ویسے ہمارا یہ خیال بھی غلط تھا کہ ہماری تلاش کی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ لودروا کیمپ کی تباہی کے بعد ہم پہلی مرتبہ گزشتہ رات باہر نکلے تھے

اور میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ شہر کی تمام اہم سڑکوں پر چیکنگ ہو رہی تھی۔ گاڑیوں کو روک کر پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ بعض گاڑیوں کی تلاشی بھی لی جا رہی تھی۔

پولیس کو ایک مرد اور ایک عورت کی تلاش تھی۔ ایسے جوڑوں کو روک کر اُن سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ میں اور سیتا یا میں اور کلپنا اکیلے ہوتے تو یقیناً ہمیں بھی کہیں نہ کہیں روکا جاتا۔ لیکن وہ چونکہ تین تھے، ایک مرد اور دو عورتیں، اس لئے ہم بچے رہے تھے۔ لیکن جس طرح چیکنگ ہو رہی تھی اُس کے پیش نظر میں جانتا تھا کہ ہم زیادہ عرصہ تک چھپے نہیں رہ سکیں گے۔ اور ظاہر ہے ہم گھر میں بھی بند ہو کر نہیں رہ سکتے تھے۔

سیتا کے پاس بھی کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔ وہ بھی میرے قریب دوسری کھاٹ پر لیٹ گئی۔ باتوں ہی باتوں میں دُرگا کا ذکر بھی آ گیا۔ دُرگا کے نام پر سیتا کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔

''میں اُس شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گی جس نے دُرگا پر تشدد کیا تھا۔'' سیتا نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو پولیس کی تحویل میں تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اور جب کوئی ملزم پولیس کی تحویل میں ہوتا ہے تو آنے جانے والا ہر پولیس اہلکار حسب توفیق ملزم کو ایک دو ہاتھ ضرور لگا دیتا ہے۔ ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ دُرگا پر تشدد کس نے کیا تھا؟''

''میں اُن پولیس اہلکاروں کی بات نہیں کر رہی۔'' سیتا بولی۔ ''یہ کوئی معمولی چوری یا دھوکہ دہی کا کیس نہیں تھا کہ دُرگا کو تھانے میں اس طرح رکھا گیا ہوگا کہ ہر آنے جانے والا ایک آدھ ہاتھ لگا دیتا۔ یہ بہت حساس اور اہم معاملہ تھا۔ دُرگا کو تو کسی ایسے جلاد قسم کے پولیس آفیسر کے حوالے کیا گیا ہوگا جس کو اپنے آپ پر بہت گھمنڈ ہو۔ اور میں اُس کا پتہ چلا لوں گی۔''

''میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں دُرگا کے قاتل کا گلا گھونٹ دُوں..... لیکن یہ نیا پنگا لے کر کیا اپنے لئے نئی مشکلات پیدا نہیں کر لیں گے؟'' میں نے کہا۔

''کیا دُرگا کی ہتیا ایسی بات ہے کہ اُسے فراموش کر دیا جائے؟'' سیتا نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''بالکل نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر تمہیں قاتل کو انجام تک پہنچانے میں میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' سیتا نے کہا۔ ''وہ کون اور کہاں ہے؟ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو! میں اُسے تلاش کر لوں گی۔''

''میں تمہارا ساتھ دُوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دُرگا نے ہمارے لئے اپنی جان دے دی وہ چاہتی تو پولیس کو بتا دیتی کہ ہم کہاں ہیں..... لیکن اُس نے اپنا جیون تو دان کر دیا پر ہم کو آنچ نہیں آنے دی..... میں اتنا احسان فراموش بھی نہیں ہوں کہ اس طرف سے آنکھیں بند کر لوں۔''

''ٹھیک ہے.....'' سیتا نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ''تو یہ وعدہ رہا کہ ہم دُرگا کے قتل کا

انتقام لئے بغیر اس شہر سے نہیں جائیں گے۔''

''وعدہ رہا.....'' میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

دوپہر ہوگئی تھی۔ راجیو وغیرہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ سیتا اُٹھ کر چائے بنا لائی۔ اتنی گرمی میں چائے..... لیکن چائے تو بہرحال ایسی چیز تھی جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

راجیو وغیرہ کی واپسی چار بجے کے قریب ہوئی تھی۔ مکان مل جانے کی نوید کے علاوہ وہ ہمارے لئے کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لے کر آئے تھے۔ میں اور سیتا صبح سے بھوکے بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے فوراً ہی اُن چیزوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

راجیو نے دھوبی پاڑے میں ایک مکان کرائے پر حاصل کر لیا تھا اور اگلے ہی روز ہم اُس مکان میں منتقل ہو گئے..... دھوبی پاڑہ اگرچہ گنجان آبادی کا علاقہ تھا لیکن وہ مکان میری منشا کے عین مطابق تھا۔ پرانی طرز کا یہ مکان چار کمروں پر مشتمل تھا اور وسیع پختہ صحن تھا جس میں مختلف فاصلوں پر چار درخت لگے ہوئے تھے۔ تین درخت ناریل کے تھے اور ایک نیم کا قد آور اور سایہ دار درخت۔ اُن درختوں کے اردگرد کچی زمین تھی اور اینٹوں کی منڈیر سے دائرے بنے ہوئے تھے۔ برآمدے کے سامنے اسی طرح تلسی کا ایک پودا بھی لگا ہوا تھا۔ ہندوؤں میں تلسی کے پودے کو بہت مقدس سمجھا جاتا ہے اور بعض طبقے تو اُس کی پرستش بھی کرتے ہیں۔

یہ مکان میری منشا کے مطابق تھا۔ اُس کے دونوں طرف گلیاں تھیں اور دونوں طرف دروازے تھے۔ ایک طرف کا دروازہ تو بہت ہی تنگ سی گلی میں کھلتا تھا۔ البتہ دوسری طرف کشادہ گلی تھی۔

یہ مکان ایک دولت مند ہندو بیوہ کا تھا۔ چند روز پہلے تک وہ خود یہاں رہتی تھی۔ اُس کا ایک بنگلہ بھی تھا جو اُس نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ وہ بنگلہ خالی ہوا تو خود وہاں منتقل ہو گئی۔ یہاں فرنیچر وغیرہ موجود تھا البتہ ہمیں کچھ برتن اور ضرورت کی چیزیں لانی پڑی تھیں۔

تین چار دن تو ہم اُس مکان سے باہر نہیں نکلے۔ راجیو ہی سارے کام کر رہا تھا۔ کبھی کلپنا بھی اُس کے ساتھ چلی جاتی۔ گنگو کی موت کے بعد کلپنا کا خوف اب دُور ہو چکا تھا۔ ٹھاکر کے سوا اب کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو اُسے شناخت کر سکتا اور ٹھاکر سے کہیں آمنا سامنا ہونے کی توقع نہیں تھی۔

اور پھر سیتا نے بھی مکان سے باہر آمد و رفت شروع کر دی..... پہلے تو اُس نے ملبوسات کے علاوہ ضرورت کی چند ایسی چیزیں خریدیں جن سے وہ اپنا حلیہ بدل سکتی تھی۔ اُس کی آنکھیں ہرنی کی طرح موٹی اور سیاہ تھیں۔ اُس نے ہلکے نیلے رنگ کے کنٹیکٹ لینز لگوا لئے۔ ان کنٹیکٹ لینز سے اُس کی آنکھوں کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن اُس میں کچھ تبدیلی ضرور آ گئی تھی۔ اُس نے بالوں کا سٹائل بھی بدل لیا اور میک اپ سے اُس کے چہرے میں بھی بڑی تبدیلی آ گئی۔ اُسے گہری نظروں سے دیکھے بغیر سیتا کی حیثیت سے شناخت کر لینا آسان نہیں تھا۔

میں نے بھی داڑھی مونچھوں کو مخصوص انداز میں تراش کر چہرے میں بڑی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ آنکھوں کی رنگت تبدیل کرنے کے لئے مجھے بھی کنٹیکٹ لینز کا سہارا لینا پڑا تھا۔ میری آنکھیں بھی اگرچہ سیاہ تھیں لیکن میں نے اپنے لئے براؤن رنگت کے لینز پسند کئے تھے۔ دھوتی، مخصوص تراش کا کرتہ اور سر پر بل دار پگڑی۔ اس حلیے میں، میں کوئی ٹھاکر ہی لگتا تھا۔ اُس روز میں اور سیتا کئی روز بعد اکٹھے باہر نکلے تھے۔ سیتا نے گولڈن بارڈر والی سرمئی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس لباس میں وہ قیامت ہی لگ رہی تھی۔ میں مخصوص راجستھانی لباس میں تھا۔

ہم کشادہ گلی کی طرف مکان سے نکلے تھے۔ چند گز دائیں طرف جا کر یہ گلی بازار سے جا ملتی تھی۔ ہم اُس بازار میں کچھ دُور تک پیدل چلتے رہے پھر سیتا نے رکشہ رُکوا لیا۔ جب ہم گھر سے نکلے تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ رکشے نے بیس منٹ میں ہمیں مہاراجہ ہوٹل پہنچا دیا۔ اُس ہوٹل کا کلب سرکاری آفیسرز کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتا تھا۔ یہاں فوجی آفیسرز بھی آتے تھے، سرکاری محکموں کے کلیدی عہدوں پر فائز آفیسرز بھی اور پولیس کے آفیسرز بھی۔

''اسے تم گھوس خوروں کا اڈہ بھی کہہ سکتے ہو۔'' سیتا نے رکشے سے اُتر کر ہوٹل کے مرکزی گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سرکاری آفیسرز بھی آتے ہیں اور ٹھیکیدار اور کاروباری قسم کے لوگ بھی۔ یہ لوگ دفتروں میں جو بات نہیں کر سکتے یہاں کسی خوف کے بغیر اس پر تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ بریف کیس بھی ہاتھ بدلتے ہیں۔ اور جو کام دفتروں میں افسروں کی منت سماجت سے نہیں ہو پاتا یہاں چٹکی بجاتے میں ہو جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں نوٹوں کی گڈیاں ایک جیب سے نکل کر دوسری جیب میں منتقل ہو جاتی ہیں۔''

''تم یہاں کس لئے آئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس ہوٹل کے کلب کو تم اطلاعات کا مرکز بھی کہہ سکتے ہو۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایک گھنٹہ یہاں بیٹھو گے تو شہر کی بہت سی تازہ ترین معلومات حاصل ہو جائیں گی۔''

ہم برآمدے میں پہنچے تو دربان نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ وسیع و عریض لابی میں بھی خاصی رونق تھی۔ ہم ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ ایک ویٹر نے بڑے احترام سے ہمیں ایک خالی میز پر پہنچا دیا۔ اُس ہال میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ بہت سی نظریں سیتا کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔

''ہم بھوجن کریں گے۔'' سیتا نے ویٹر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

ویٹر نے فوراً ہی دو خوبصورت مینو کارڈ پیش کر دیئے۔ میں نے اپنے لئے پنیر اور پالک کے کوفتے پسند کئے اور سیتا نے فرائی فش کا آرڈر نوٹ کروا دیا۔ بیس منٹ میں ہمارے سامنے کھانا لا کر دیا گیا۔ میں نے کئی روز بعد ڈھنگ کا کھانا کھایا تھا۔ پنیر اور پالک کے کوفتے میری پسندیدہ ڈش تھی۔ کھانا کھانے کا لطف آ گیا تھا۔ کھانے کے بعد ہم کلب ہال میں آ گئے۔

بہت وسیع و عریض ہال تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ بہت لمبا چوڑا بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے سامنے گول ریوالونگ اسٹولز پر بیٹھے ہوئے گاہک مے نوشی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے دیوار کے ساتھ شیشے کے شیلفوں پر رنگ برنگی شراب کی لاتعداد بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ ہال میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درجنوں میزیں ابھی خالی تھیں۔ گاہکوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ایسی جگہیں ظاہر ہے حسین عورتوں ہی کے دم سے آباد ہوتی تھیں۔

سامنے ایک وسیع خوبصورت سٹیج تھا جس کے سامنے جھلملاتا ہوا رنگ برنگی پردہ کھنچا ہوا تھا۔ موسیقی کی ہلکی آواز گویا دیواروں سے پھوٹ کر ہال کی فضا میں بکھر رہی تھی۔ ہم سٹیج سے ذرا ہٹ کر ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ٹھیک دس بجے سٹیج کا پردہ ہٹ گیا اور ایک رقاصہ کے درشن ہوئے۔ سٹیج کے ایک طرف پیچھے آرکسٹرا بھی موجود تھا۔ آرکسٹرا کی دُھنوں پر رقاصہ تھرکنے لگی.....

رقاصہ کا رقص شروع ہوا تو اُس کے جسم پر شریفانہ لباس تھا۔ لیکن ہیجان خیز موسیقی کی لہروں پر تھرکتے ہوئے وہ ایک ایک کر کے اپنے لباس سے بھی نجات حاصل کرتی جا رہی تھی۔ اور آخر کار اُس کے بدن پر دو چیتھڑے رہ گئے اور وہ سٹیج سے اُتر کر میزوں کے درمیان تھرکنے لگی۔

آہستہ آہستہ ہال کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ دو آدمی ہماری میز پر بھی آ کر بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے ہم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اور ہم نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ہمیں اعتراض کا کوئی حق بھی نہیں تھا کیونکہ ہم نے یہ میز ریزرو نہیں کرائی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ویٹر نے اُن دونوں کے سامنے شراب سے لبریز گلاس سرو کر دیئے۔ سیتا نے بھی سوفٹ ڈرنکس منگوا لئے۔

وہ دونوں آدمی شراب کی چسکیاں لیتے ہوئے باتیں بھی کرتے رہے اور بار بار کن انکھیوں سے سیتا کی طرف بھی دیکھتے رہے۔ پہلے تو میں نے اُن کی باتوں پر توجہ نہیں دی تھی لیکن پھر ایک جملہ سنتے ہی چونک گیا..... ایک آدمی کہہ رہا تھا۔

''حیرت ہے..... اُنہیں اتنے روز بعد مندر میں کسی تہہ خانے کا خیال آیا۔ حالانکہ سب سے پہلے اُنہیں اس طرف توجہ دینی چاہئے تھی۔''

''اور میرا خیال ہے کہ لودروا کے اُس مندر کے تہہ خانے سے کوئی خزانہ تو برآمد نہیں ہوا ہو گا۔'' دوسرے نے کہا۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا، لگتا تھا وہ بھی اُن کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی۔ پہلا آدمی کہہ رہا تھا۔ ''خزانہ تو نہیں ملا البتہ کیمپ کے سکیورٹی انچارج جگل ناتھ کی گلی سڑی لاش اور درجنوں انسانی ڈھانچے ملے ہیں۔ تہہ خانے کے اندر سے وہ طویل سرنگیں کیمپ کے اندر تک چلی گئی ہیں۔ اُن سرنگوں کے دریافت ہونے کے بعد کہانی کچھ بدل گئی ہے۔''

''کیا مطلب.....؟'' دوسرے آدمی نے پوچھا۔

''پہلے تو یہ سمجھا جا رہا تھا کہ کیمپ کے اندر ہی کا کوئی آدمی ہے جس نے قتل و غارت مچا رکھی

تھی اور دھماکے بھی اُسی نے کئے تھے۔ سرنگ کے اندر بھی ایک گارڈ کی گلی سڑی لاش ملی ہے۔ جگل ناتھ اور اُس گارڈ کو گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ان سرنگوں کو لاشوں کی دریافت کے بعد نظریہ بدل گیا ہے۔''

''اور اب نیا نظریہ کیا ہے؟'' دوسرے آدمی نے پوچھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مہاراج! آپ ہماری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے؟''

''نہیں شریمان جی!'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ لوگ غالباً اُس لودروا کیمپ کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں جس کے بارے میں پچھلے دنوں بڑا چرچا رہا ہے۔''

''ہاں..... وہی لودروا کیمپ..... اُس کے بارے میں نئے نئے اور سنسنی خیز انکشافات ہو رہے ہیں۔ اور شریمتی جی! آپ تو ان باتوں سے بور نہیں ہو رہیں؟'' یہ بات پہلے آدمی نے کہی تھی جو مندر کے بارے میں انکشاف کر رہا تھا۔

''نہیں شریمان جی!'' سیتا مسکرا دی۔ اور اس طرح ہم بھی اُن کی طرف متوجہ ہو گئے اور اُن کی باتیں دلچسپی سے سننے لگے۔

''ہاں..... تو دوسرا نظریہ کیا ہے راؤ جی؟'' دوسرے آدمی نے پوچھا۔

''دوسرا نظریہ یہ ہے ٹھاکر پریم چند جی!'' پہلا آدمی گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''سرنگیں دریافت ہونے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ کارروائیاں کسی اندر کے آدمی کی نہیں، باہر کے آدمیوں کی تھیں اور باہر کے آدمیوں میں مندر کے پنڈت اور اُس کی خوبصورت ساتھی لڑکی کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ اس کے بارے میں فی الحال یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ لڑکی ''را'' کی سابق ایجنٹ سیتا اور وہ پنڈت کشمیری مجاہد شمروز تھا جس کے بارے میں پولیس اور انٹیلی جنس کو یہ جانکاری ہوئی ہے کہ وہ دونوں جیسلمیر میں موجود ہیں۔ کچھ دن پہلے تک وہ دونوں مہاراجا ہریش سنگھ کی رکھیل دُرگا کی حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دُرگا کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ کی گئی مگر اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ اور خیال ہے کہ اُن دنوں وہ دونوں سادھوؤں کے بھیس میں اُس مندر میں موجود تھے۔ کیمپ کے سکیورٹی انچارج جگل ناتھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کیمپ سے اُن دونوں کے لئے ناشتہ اور کھانا لے کر آتا تھا۔ پہلے تو یہی سوچا گیا کہ وہ اُس دُرگو پی کے چکر میں ہے مگر دھماکوں کے بعد جب وہ بھی لاپتہ ہو گیا تو یہ سمجھا گیا کہ دھماکوں میں اُس کا ہاتھ تھا اور وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے غائب ہو گیا ہے۔ لیکن مندر کے تہہ خانے سے اُس کی لاش ملنے کے بعد سوچنے والوں کی سوچوں کا رُخ بھی بدل گیا ہے۔'' راؤ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اب اس نظریئے پر غور کیا جا رہا ہے کہ جگل ناتھ بھی اُن دونوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ وہ تہہ خانے کی سرنگوں کے ذریعے کیمپ میں داخل ہوتے اور لاشیں گرا کر غائب ہو جاتے۔ لاشوں کے لئے گولہ بارود بھی اُنہیں جگل ناتھ ہی نے فراہم کیا تھا۔ اور وہ گارڈ بھی ان کے

ساتھ شامل تھا جس کی لاش سرنگ کے اندر پائی گئی ہے۔ اور جب اُن لوگوں کا مطلب پورا ہو گیا تو وہ اُس گارڈ اور جگل ناتھ کو بھی قتل کر کے فرار ہو گئے۔ انٹیلی جنس کو پورا یقین ہے کہ وہ سیتا اور شمروز ہی تھے جو اب بھی جیسلمیر میں موجود ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اُن کی گرفتاری اور نشاندہی کے لئے لاکھوں روپے کے انعام کا اعلان کیا جانے والا ہے۔ کل یا پرسوں کے پیپرز میں شمروز کی وہ تصویر بھی شائع کی جائے گی جو ایک میگزین میں چھپی تھی اور اُس سے اُسے شناخت کیا گیا تھا۔''

''ایک بات بتاؤ راؤ جی!'' پریم چند شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟ ابھی تک تو کسی پیپر میں ایسی کوئی بات نہیں چھپی۔''

''تم بھول گئے ہو کہ میرا بھانجا بابو راؤ انٹیلی جنس میں ہے۔'' راؤ نے جواب دیا۔ ''میں گھر سے نکلنے والا تھا کہ وہ ملنے کے لئے آ گیا۔ سب کچھ اُس سے معلوم ہوا ہے۔ اور مندر کے نیچے تہہ خانے کا انکشاف بھی آج دوپہر کے وقت ہی ہوا ہے۔ اگر بابو راؤ انٹیلی جنس میں نہ ہوتا تو میں بھی دوسروں کی طرح ان باتوں سے بے خبر ہی رہتا۔ بہت سی باتیں تو اخباروں میں بھی نہیں چھپتیں۔ ایک بات اور.....'' راؤ جی نے شراب کا آخری گھونٹ پی کر ویٹر کو مزید شراب لانے کا اشارہ کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''وہ دونوں درگا نامی اُس عورت کے پاس جس حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے اُسے سیل کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب کل کسی وقت وہ حویلی کھولی جائے گی اور انسپکٹر وشوا ناتھ حویلی کی تلاشی لے گا۔ ہو سکتا ہے حویلی سے اُن دونوں کا کوئی سراغ مل جائے۔''

''انسپکٹر وشوا ناتھ کوئی توپ قسم کی چیز لگتا ہے۔ میں نے پہلے بھی اہم معاملات میں اُس کا نام سنا ہے۔'' پریم چند نے کہا۔

''وہ واقعی توپ چیز ہے..... اپنے محکمہ میں وہ جلاد کے نام سے مشہور ہے۔ درگا نامی عورت سے تفتیش کی ذمہ داری بھی اُسی کو سونپی گئی تھی۔ اُس نے ایسے ایسے ہاتھ دکھائے کہ درگا کی آتما بھی بیاکل رہے گی۔ اُس نے درگا کی ٹانگیں چیر دیں۔ مگر درگا بھی بڑی سخت جان عورت تھی اُس نے جان دے دی مگر زبان نہیں کھولی۔''

میں نے سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور جھرجھری لے کر رہ گئی۔ راؤ جی نے بھی اُس کی اس کیفیت کو نوٹ کر لیا اور جلدی سے بولا۔

''معاف کرنا دیوی جی! ہم بس آپ کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئے تھیں۔''

''کیا ایسے ظالم لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں؟'' سیتا نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''

''کسی کی زبان کھلوانے کے لئے پولیس کے اپنے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ اور پھر آپ یہ بھی تو سوچئے وہ عورت کسی ہمدردی کی مستحق نہیں تھی۔ اُس نے ایسے دو آتنگ وادیوں کو پناہ دے

رکھی تھی جنہوں نے سینکڑوں لوگوں کو بے دردی سے.....''

''معاف کیجئے شریمان جی!'' سیتا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میں ایسی باتیں نہیں سن سکتی۔ چلئے سوامی جی! میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''شما چاہتا ہوں دیوی جی!'' راؤ جی نے اُٹھ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میری باتوں سے آپ کو.....''

''کوئی بات نہیں.....'' سیتا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میں کمزور دل عورت ہوں..... اور آپ کو عورتوں کے سامنے ایسی خوفناک باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

''آئندہ خیال رکھوں گا۔'' راؤ جی نے ایک بار پھر معذرت کی۔

ہم میزوں کے گرد گھومتے ہوئے دروازے کی طرف چلنے لگے۔ وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور ہال بھر چکا تھا۔ ایک نئی رقاصہ میزوں کے درمیان تھرکتے ہوئے مختلف زاویوں سے اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھی۔

ہم لابی سے گزرتے ہوئے باہر آ گئے۔ سیتا رُک کر تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لیتی رہی پھر میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔ اس وقت لان میں بھی خاصی رونق تھی۔ یہاں بھی لاتعداد گاہک موجود تھے۔ دائیں طرف کہیں بار بی کیو اسٹینڈ لگا تھا اور اُس طرف سے بڑی اشتہا آمیز خوشبو آ رہی تھی۔

''ہاں..... میں ٹھیک ہوں۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''سنا تم نے..... اُس راکھشس نے درگا کو کس طرح ہلاک کیا تھا؟''

''خاموش رہو..... گھر جا کر بات کریں گے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''اُس کا نام معلوم ہو گیا ہے۔ میں اُس درندے کو چھوڑوں گی نہیں۔ اُسے بھی اسی طرح ٹانگیں چیر کر.....''

''پلیز سیتا.....!'' میں نے اُس کا ہاتھ دبا دیا۔ ''ہمارے آس پاس لوگ موجود ہیں۔ بہتر ہے اپنی زبان بند رکھو!''

ہم گیٹ سے باہر آ گئے۔ سڑک کے ساتھ کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ سفر کے لئے میں نے وہی پرانی پالیسی اپنائی تھی۔ نصف فاصلہ طے ہونے کے بعد ہم نے ایک پارونق چوک پر وہ ٹیکسی چھوڑ دی۔ کچھ دُور تک پیدل چلتے رہے، پھر ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ گئے۔ گھر پہنچتے ہی سیتا پلنگ پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی.....

''کیا ہوا..... سیتا دیوی کو کیا ہوا؟'' راجو جلدی سے بولا۔ وہ تینوں ایک دم پریشان ہو گئے تھے اور کلینا کے چہرے پر تو ہوائیاں سی اُڑنے لگی تھیں۔

''کچھ نہیں..... درگا کے بارے میں کچھ باتیں سن کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی۔''

میں نے کہا۔

شوبھا دوڑ کر پانی کا گلاس لے آئی۔ کلپنا اُس کے قریب بیٹھ کر اُسے تسلی دینے لگی۔ سیتا اُس سے لپٹ کر پہلے سے بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کلپنا بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔

میں نے مداخلت نہیں کی۔ دل کا غبار نکل جائے تو اچھا ہے۔ تقریباً دس منٹ بعد سیتا اپنی حالت پر قابو پا سکی تھی۔ اور تب میں نے راجیو وغیرہ کو بتایا کہ سیتا کے جذبات کیوں بے قابو ہو گئے تھے۔

میں اب سیتا کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے جذبات کا یہ طوفان دیکھ کر مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ دُرگا کو کتنا چاہتی تھی۔

○

قد ساڑھے پانچ فٹ، کسرتی جسم، مضبوط ہاتھ پیر، تانبے جیسی رنگت، ٹوتھ برش ٹائپ کی بھاری مونچھیں، دائیں رُخسار پر تقریباً ڈیڑھ انچ لمبے زخم کا نشان، دانت میلے تھے جیسے کبھی منجن نہ کیا گیا ہو۔ تاہم سامنے اُوپر والے ایک دانت پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ بائیں کان میں سونے کی بالی تھی اور سر کے بال بے تحاشہ لمبے تھے جنہیں گردن پر الاسٹک ہیئر بینڈ میں چٹیا کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ اُس نے ڈارک براؤن رنگ کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور دلچسپی کی بات یہ تھی کہ بش شرٹ کے آستین نہیں تھے۔ یہ شاید کوئی نیا فیشن ایجاد ہوا تھا۔ اور یہ لباس اُس پر بالکل نہیں جچ رہا تھا۔

شکل وصورت اور لباس سے وہ کوئی تھرڈ ریٹ سڑک چھاپ غنڈہ ہی لگتا تھا جسے اُس شاندار ہوٹل میں دیکھ کر حیرت بھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ کوئی غنڈہ نہیں تھا۔ پولیس انسپکٹر وشوانا تھ تھا جو اپنے محکمہ میں جلاد کے نام سے مشہور تھا اور یہ نام غلط نہیں دیا گیا تھا۔ وہ واقعی جلاد تھا اور دُرگا کا قاتل...!

اُس رات مہاراجہ ہوٹل کے کلب میں راؤ جی اور پریم چند نامی آدمیوں کی باتیں سننے کے بعد سیتا نے یہ عہد کر لیا تھا کہ اب وہ وشوانا تھ کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس کلب کے بارے میں سیتا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہاں شہر کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوتے تھے۔ فوج، پولیس اور سرکاری دفتروں کے اعلیٰ افسران نے بھی اس کلب کو اپنا اڈہ بنا رکھا تھا۔ اور یہاں صرف ایک گھنٹہ بیٹھ کر شہر کے بارے میں بہت سی تازہ ترین معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔ ہم اُس رات تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں رہے تھے اور ہمیں جو سنسنی خیز معلومات حاصل ہوئی تھیں اُس پر واقعی مجھے حیرت ہوتی تھی۔

مندر تہہ خانے اور جنگل ناتھ اور دوسرے گارڈ کی لاشوں کی دریافت کے بارے میں وہ خبر تیسرے روز اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ اخبارات نے اور بھی بہت سے سنسنی خیز انکشافات کئے تھے اور اُن کا بہرحال ہم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایک انکشاف یہ بھی تھا کہ ایک غیر ملکی

سیکرٹ ایجنٹ بھی انٹیلی جنس آفیسر کے بھیس میں اُس کیمپ میں تھا۔ جو کیمپ کے تمام پروگرام اور سرگرمیوں کو خفیہ کیمروں کے ذریعے مائیکرو فلم میں محفوظ کرتا رہا تھا۔ اُس انٹیلی جنس آفیسر کو شہر میں ایک ایسے آدمی کے ساتھ دیکھا گیا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حکومتوں کو بلیک میل کرنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اُس کا طریقہ کار بڑا دلچسپ تھا۔ وہ کروڑوں روپیہ خرچ کر کے حکومت ہی کے آدمیوں کے ذریعے حکومت کے اہم ترین راز حاصل کرتا اور اُن کی بنیاد پر حکومت کو بلیک میل کر کے اربوں روپے کماتا۔ اور اب تک تیسری دنیا کی کئی حکومتوں کو اس طرح بلیک میل کر چکا تھا۔ اخبار نے تو یہاں تک لکھا تھا کہ یہ انٹرنیشنل بلیک میلر کئی سال پہلے بھی چین کے حوالے سے ایک اہم راز کے سلسلے میں ہندسرکار کو بلیک میل کر کے تین ارب روپے وصول کر چکا تھا اور اب پھر جیسلمیر جیسی اہم ترین چھاؤنی میں اُس کی موجودگی اور ایک انٹیلی جنس آفیسر سے اُس کا میل ملاپ خطرے کی علامت سمجھا جا رہا تھا۔

اس سارے ڈرامے سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہرحال ہم بروقت آگاہ ہو گئے تھے اور ہم نے محتاط رویہ اختیار کر لیا تھا۔ شہر میں ایک بار پھر ہلچل سی مچ گئی تھی اور مشتبہ لوگوں کو چیک کیا جا رہا تھا۔ میں نے سیتا کو مشورہ دیا تھا کہ دو چار روز تک ہمیں بھی اپنی پناہ گاہ میں دبک رہنا چاہئے لیکن دُرگا کے قاتل کے بارے میں آگاہ ہو جانے کے بعد سیتا کے لئے آرام سے بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا۔

اور پھر تیسرے ہی روز سیتا نے انسپکٹر وشوانا تھ کو کھوج نکالا تھا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ وشوانا تھ بھی اُس وقت مہاراجہ ہوٹل کے کلب میں موجود تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص پولیس آفیسر ہو سکتا ہے۔ اُس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی جس نے اپنے آپ کو جوان اور حسین بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ وہ دونوں اُس وقت ڈانس فلور پر تھے۔ تقریباً درجن بھر جوڑے موسیقی کی مدھ بھری تانوں پر ڈانس فلور پر تھرک رہے تھے۔

ایک راؤنڈ ختم ہوا تو انسپکٹر وشوانا تھ ہمارے ساتھ والی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ پانچ منٹ کے وقفے سے رقص کا دوسرا راؤنڈ شروع ہوا تو سیتا اُٹھ کر دوسری میز کی طرف چلی گئی اور کچھ کہے بغیر وشوانا تھ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اُسے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اُس جیسی حسین لڑکی کے سامنے کون کافر انکار کر سکتا تھا؟

وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ڈانس فلور پر پہنچ گئے۔ کئی اور جوڑے بھی اُٹھ اُٹھ کر تھرکنے لگے تھے۔ وشوانا تھ نے سیتا کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ سیتا کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا ہاتھ اُس نے سیتا کی کمر پر حمائل کر رکھا تھا۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اُس کے ہاتھ سے سیتا کو اپنے ساتھ دبا رکھا تھا۔ سیتا کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی اور وہ دونوں سرگوشیوں میں کچھ باتیں بھی کر رہے تھے۔

وہ راؤنڈ بھی ختم ہوا۔ انسپکٹر وشوانا تھ اس مرتبہ سیتا کے ساتھ ہی ہماری میز پر آ گیا تھا۔

"یہ میرے پتی ہیں...... مہابیر سنگھ۔" سیتا نے اُس سے میرا تعارف کرایا۔ "چھ مہینے پہلے ہتھمور میں اپنی زمینیں بیچ کر کاروبار کی نیت سے یہاں آئے تھے۔ ان کے ایک دوست نے وعدہ کیا تھا کہ آرمی میں فوڈ سپلائی یا کسی اور چیز کا ٹھیکہ دلوا دے گا۔ لیکن اب تک وہ انہیں ٹھینگا ہی دکھاتا رہا ہے۔"

ٹھیکہ اور ٹھینگے والی بات پر انسپکٹر وشوا ناتھ ہنس دیا۔ اور میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"اب یہ اس قسم کا ہوٹل یا کلب کھولنے کی سوچ رہے ہیں۔" سیتا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مہابیر جی اگرچہ شرمیلے واقع ہوئے ہیں لیکن جوان اور حسین عورتوں میں رہ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے ان کے لئے ایسا ہی کاروبار مناسب رہے گا۔"

اس مرتبہ بھی وشوا ناتھ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"مہابیر جی...." وہ میرا نام لیتے ہوئے کچھ چونک سا گیا، پھر بولا۔ "ہاں تو مہابیر جی! آپ کی پتنی اتنی سندر ہے...... آپ کو دوسری عورتوں کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"دل کو ذرا تقویت ملتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے سیتا دیوی! تم نے شریمان جی کا تعارف نہیں کرایا۔"

میرے منہ سے سیتا کا نام سن کر بھی وہ چونک گیا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے تھے...... لیکن اُس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ وہ ایک ایسے کیس پر کام کر رہا تھا جس میں سیتا کا نام اُس کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ ہو سکتا ہے سیتا کے ساتھ اُس نے مہابیر کا نام بھی سن رکھا ہو۔ اور اس وقت یہ دونوں نام سن کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"یہ وشوا ناتھ جی ہیں پولیس آفیسر۔" سیتا نے اُس کا تعارف کرایا۔ "تمہیں یاد ہے مہابیر جی! اُس رات مہاراجہ کلب میں کوئی بات ہو رہی تھی تو کسی نے کہا تھا کہ انسپکٹر وشوا ناتھ جلاد ہے۔ اب دیکھو! یہ ہمارے سامنے بیٹھے ہیں، ان میں ایسی کوئی بات نظر آتی ہے؟ خوش گفتار، نرم اور ہمدردانہ لہجہ، پُر وقار شخصیت۔ مجھے تو یہ بہت اچھے انسان لگے۔"

"ہاں واقعی.... مجھے تو ان میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔" میں نے مسکرا کر کہا تو وشوا ناتھ بھی مسکرا دیا۔

اس دوران ایک ویٹر ٹرالی لے کر قریب سے گزرا تو وشوا ناتھ نے اُسے روک لیا۔ ٹرالی پر شراب سے لبریز گلاس اور چند بوتلیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ وشوا ناتھ نے شمپئن کے دو گلاس اُٹھا کر میز پر رکھ لئے۔ تیسرا گلاس اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اُسے روک دیا۔

"ہم دارو نہیں پیتے وشوا ناتھ جی...... آپ زحمت نہ کریں۔"

وشوا ناتھ نے تیسرا گلاس نہیں اُٹھایا۔ میز پر رکھے ہوئے دو گلاسوں میں سے ایک گلاس اُٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

رقص کا ایک اور راؤنڈ شروع ہو چکا تھا۔ وشوا ناتھ سیتا سے باتیں کر رہا تھا۔ میں اگرچہ

ہونقوں کی طرح رقص کرتی ہوئی عورتوں کو گھورتا رہا لیکن میری تمام تر توجہ اُن کی باتوں پر مرکوز تھی۔ سیتا واقعی بہت ذہانت کا ثبوت دے رہی تھی۔ اُس نے باتوں ہی باتوں میں یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ انسپکٹر وشوا ناتھ کی کار کلب کے باہر سڑک کے کنارے پر کھڑی تھی۔ سیتا نے اُس کار کا ماڈل اور نمبر بھی اُس کے منہ سے اُگلوا لیا۔

وشوا ناتھ دوسرا گلاس بھی خالی کر چکا تھا۔ وہ آخری گھونٹ لے کر خالی گلاس میز پر پٹختے ہوئے سیتا کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "ایک راؤنڈ ہو جائے......؟"

"ضرور......!" سیتا نے کہتے ہوئے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں اُن سے پہلے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں چلتا ہوں سیتا!" میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کلپنا پریشان ہو رہی ہو گی...... تم فارغ ہو کر جلدی آ جانا۔"

"ٹھیک ہے ڈیئر...... میں جلدی آ جاؤں گی۔" سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

انسپکٹر وشوا ناتھ نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ کباب سے ہڈی نکل جانے پر وہ خوش ہو رہا ہو گا۔

عمارت سے باہر آ کر میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کلب کا اپنا پارکنگ پلاٹ تھا جو بھرا ہوا تھا۔ بہت سی گاڑیاں دائیں بائیں دُور دُور تک سڑک کے ساتھ کھڑی تھیں۔ وشوا ناتھ کی نیلی کار تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ وہ کار کلب کے گیٹ سے تقریباً سو گز آگے فٹ پاتھ کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ وہاں فٹ پاتھ پر ایک قد آور گنجان شاخوں والا درخت بھی تھا جس کی شاخیں سڑک کے اُوپر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اُس درخت کی وجہ سے یہاں کسی قدر تاریکی تھی۔

مجھے کار کی ڈگی کھولنے میں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ڈگی میں گھس گیا...... ڈگی کافی کشادہ تھی اور اُس میں کوئی سامان بھی نہیں تھا۔ ٹٹولتے ہوئے مجھے ربڑ کا ایک ٹکڑا مل گیا جسے میں نے ڈگی کے ڈھکنے میں پھنسا دیا تا کہ ڈھکنا پوری طرح بند نہ ہو سکے۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی سیتا اور انسپکٹر وشوا ناتھ پہنچ گئے...... دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ انجن سٹارٹ ہوا اور کار حرکت میں آ گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک کار مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی اور پھر اس طرح جھٹکے لگنے لگے جیسے کار کسی کچے راستے پر پہنچ گئی ہو۔ میں نے ڈگی کی جھری سے جھانک کر باہر دیکھا۔ یہ شاید شہر کا کوئی نواحی علاقہ تھا۔ اور پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ کہیں کہیں بنگلے تھے جن میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

پندرہ منٹ مزید چلتے رہنے کے بعد بالآخر کار رُک گئی...... اُن دونوں کے اُتر جانے کے تقریباً پانچ منٹ بعد میں بھی ڈگی سے نکل آیا اور گہرے گہرے سانس لیتا ہوا چاروں طرف

دیکھنے لگا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں یہ علاقہ ابھی آباد ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں بنگلے بن چکے تھے۔ جو آباد تھے وہاں روشنیاں ہو رہی تھیں۔

یہ بھی ایک بنگلہ ہی تھا..... اُس کی چار دیواری تو تھی لیکن گیٹ ابھی نہیں لگا تھا۔ قریب ترین آباد بنگلہ تقریباً سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ یہ بنگلہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وشوانا تھ نے اندر داخل ہو کر تمام بتیاں جلا دی تھیں۔ میں محتاط انداز میں قدم اُٹھاتا ہوا عمارت کے پہلو کی طرف نکل گیا اور ایک کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے لگا..... اندر کہیں سے سیتا کے ہنسنے کی آواز تو سنائی دے رہی تھی مگر اُن دونوں میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس بنگلے میں اس وقت ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اور میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ انسپکٹر وشوانا تھ سیتا کو اس ویران بنگلے میں کیوں لایا تھا..... سیتا جیسی حسین لڑکی ہو تو کوئی بھی مرد اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اور میں سمجھتا تھا کہ وشوانا تھ کی موت ہی اُسے یہاں لے آئی تھی۔

اُن دونوں کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں دوسری طرف چلا گیا۔ ایک کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں چوکھٹ پر چڑھ کر بڑی آہستگی سے دوسری طرف کود گیا۔ اُس بنگلے میں فرنیچر وغیرہ کچھ نہیں تھا اور میرے خیال میں یہ بنگلہ ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوا تھا اس لئے یہاں کوئی سامان بھی نہیں لایا گیا تھا۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا اُس کونے کی طرف بڑھ گیا جہاں سے سیتا کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا..... اُس کمرے میں بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک میز بھی تھی جس پر شراب کی دو بوتلیں اور تین گلاس رکھے ہوئے تھے۔ دو کرسیاں اور ایک صوفہ بھی تھا۔ وشوانا تھ نے پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پہلے بھی یہاں عورتوں کو لاتا رہا ہے۔

میرے لئے وہ سنسنی خیز منظر تھا جو میں دیکھ رہا تھا۔ سیتا بیڈ پر پشت کے بل پڑی ہوئی تھی۔ اُس کی دونوں ٹانگیں نیچے لٹکی ہوئی تھیں..... ساڑھی کا پلو بھی اُس پر سے ہٹا ہوا تھا اور وشوانا تھ اس طرح اُس کے اُوپر جھکا ہوا تھا کہ اُس نے سیتا کے دونوں بازو اپنے ہاتھوں سے دبا رکھے تھے اور سیتا کا بوسہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیتا ہنستے ہوئے سر کو اِدھر اُدھر حرکت دیتے ہوئے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نہایت دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو گیا اور آگے جھک کر انسپکٹر وشوانا تھ کا کندھا تھپتھپایا..... پہلی مرتبہ شاید اُس نے توجہ نہیں دی۔ میں نے دوبارہ ذرا زور سے ہاتھ مارا۔

''شریمان جی..... ہم بھی یہاں موجود ہیں۔''

وشوانا تھ اُچھل پڑا..... وہ جیسے ہی سیدھا ہوا میں نے زوردار گھونسہ اُس کے جبڑے پر جما دیا..... وہ کراہتا ہوا پلنگ پر اُلٹ گیا۔

''کک..... کون ہو..... تم.....؟'' اُس نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔ میری صورت دیکھ کر اُسے

پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ میں کون ہوں۔

''میرے سامنے میری پتنی پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہو انسپکٹر! شرم آنی چاہئے تمہیں۔'' میں نے کہا۔

''تت..... تم یہاں کیسے آئے؟'' وشوانا تھ ہکلایا۔

''تمہاری کار کی ڈگی میں بیٹھ کر۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''تکلیف تو مجھے بہت ہوئی تھی مگر کوئی بڑا مقصد حاصل کرنے کے لئے کشٹ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''بڑا مقصد..... کیا مطلب؟'' وشوانا تھ نے مجھے گھورا۔

''تمہاری بہت تعریفیں سنی تھیں مگر تم تو بڑے چغد نکلے۔'' میں نے کہا۔ اسی دوران سیتا بیڈ سے اُٹھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ ''تم ایک نہایت اہم کیس پر کام کر رہے ہو۔ تمہیں تو اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا چاہئے۔ لیکن اس حسین لونڈیا کو دیکھ کر تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی۔ تم یہ بھی بھول گئے کہ تمہیں کسی سیتا کی تلاش تھی اور وہ سیتا کلب میں تمہارے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔ اور سیتا اس طرح آسانی سے تمہارے ساتھ آ گئی تو تم سمجھے کہ وہ پھنس گئی اور تمہاری رات عیش میں گزرے گی۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو.....؟'' اُس کے حواس شاید اب بھی قابو میں نہیں تھے۔

''تم واقعی بہت بیوقوف ہو.....'' میں نے کہا۔ ''تم جلاد مشہور ہو۔ لیکن تم صرف اُن لوگوں پر ظلم کر سکتے ہو جنہیں پکڑ کر تمہارے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔ تمہاری اپنی کھوپڑی میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں جس سے تم کام کر سکو۔ تم نے ایک عورت کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اُس کی ٹانگیں چیر ڈالیں..... لیکن اب یہ دیکھنا ہے کہ تمہاری بانہوں میں کتنی شکتی ہے۔''

وشوانا تھ کے چہرے پر وحشت سی طاری ہو گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا..... اُس نے بڑی پھرتی سے پتلون کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے اُچھل کر اُس کے ہاتھ پر بھرپور ٹھوکر مار دی۔ ٹھوکر سے اُس کی اُنگلیاں مُڑ گئیں اور وہ زور زور سے ہاتھ جھٹکنے لگا۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر دوسری ٹھوکر اُس کے گھٹنے پر لگائی۔ وہ ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔ اگلی ٹھوکر اُس کی دوسری ٹانگ پر لگی۔ وہ اپنی جگہ پر اُچھلا اور کولہوں کے بل زمین پر گرا۔ میں وشوانا تھ کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے زمین پر پڑے پڑے ایک بار پھر ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف بڑھایا۔ اس مرتبہ میرے پیر کی ٹھوکر اُس کی کنپٹی پر لگی اور وہ بلبلا کر رہ گیا۔ دوسری ٹھوکر میں نے اُس کے کندھے پر لگائی، وہ ایک بار پھر چیخ اُٹھا۔

''تم نے اپنے لئے خود ہی اس جگہ کا انتخاب کیا تھا.....'' میں نے اُسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''اس ویرانے میں تمہاری آواز کوئی نہیں سنے گا..... یہی بنگلہ تمہاری سمادھی بنے گا۔''

وشوانا تھ اپنا سیدھا ہاتھ جھٹک رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ اور اچانک ہی اُس نے میری طرف چھلانگ لگا دی..... میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر اُس

کی زد میں آنے سے بچ گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں لڑکھڑاتا ہوا مجھ سے آگے نکلا تو میں نے اُس کے کولہوں پر لات رسید کر دی۔ اُس کا سر دیوار سے ٹکرایا..... میں نے لپک کر اُسے شرٹ کے کالر سے پکڑ لیا اور ذرا سا پیچھے کھینچ کر اُس کا سر پوری قوت سے دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ چیخ اُٹھا... اُس کا سر پھٹا تو نہیں لیکن چوٹ اچھی خاصی لگی تھی۔

وہ ایک بار پھر ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جیب سے پستول نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے اُس کا کالر چھوڑ کر اُس کی کلائی کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا اور اُسے پوری قوت سے موڑتا چلا گیا۔

سیتا اب تک ایک طرف کھڑی تھی۔ اور پھر اچانک ہی اُس نے آگے بڑھ کر وشوانا تھ کی ٹانگوں کے بیچ میں زوردار ٹھوکر مار دی۔ وشوانا تھ بلبلا اُٹھا..... بازو میری گرفت میں ہونے کے باوجود وہ جھکتا چلا گیا۔ سیتا نے اُس کی ٹھوڑی پر نیچے کی طرف سے گھٹنے سے ضرب لگائی۔ وہ ایک بار پھر چیخ اُٹھا۔

''تم جیون کا مزہ لوٹنے کے لئے مجھے اپنے ساتھ یہاں لائے تھے نا... میں تمہیں بتاتی ہوں جیون کا مزہ کیا ہوتا ہے۔'' سیتا کہتے ہوئے کمر پر لپٹی ہوئی ساڑھی کھولنے لگی۔ ساڑھی کی نال کو قابو میں رکھنے کے لئے دو بکل لگے ہوئے تھے اُس نے دونوں بکل کھول کر ساڑھی اُتار دی..... اب اُس کے جسم پر بلاؤز اور پیٹی کوٹ رہ گیا تھا.....

''لو دیکھو..... اور اچھی طرح دیکھ لو کہ میں تمہاری زندگی میں آنے والی آخری عورت ہوں۔'' سیتا تن کر وشوانا تھ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ''تم بہت بہادر ہو نا..... جلاد ہو۔ لوگ تمہارا نام سن کر تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ لیکن اب میں جان گئی ہوں تم میں کتنی شکتی ہے۔ تمہاری اصل شکتی تو اُن سپاہیوں میں ہے جو شکار کر کے تمہارے سامنے ڈال دیتے ہیں اور تم درندہ بن کر اُسے ادھیڑ دیتے ہو۔ لیکن جو اپنا شکار خود نہ کر سکے وہ تو درندہ بھی نہیں کہلا سکتا۔ مردار خور ہوتا ہے وہ..... اور تم مردار خور ہو۔'' وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی اور پھر اُسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے چیخی۔ ''چند روز پہلے تم نے ایک عورت پر بہادری کے جوہر دکھائے تھے..... وہ تمہارے سامنے بے بس پڑی تھی۔ ہاتھ پیر نہیں ہلا سکتی تھی اور تم نے اُس کی ٹانگیں چیر دی تھیں۔ آج بھی تمہارے سامنے ایک عورت کھڑی ہے۔ آؤ..... آزماؤ اپنی شکتی اور.....''

وشوانا تھ نے اچانک ہی جھٹکا دے کر اپنا بازو میری گرفت سے چھڑایا اور سیتا پر چھلانگ لگا دی۔ سیتا غافل نہیں تھی وہ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئی اور وشوانا تھ کی گردن پر اُس کے بالوں کی چٹیا پکڑ لی۔ بال اتنے لمبے تھے کہ سیتا نے اُنہیں ہاتھ پر ایک بل دے کر گرفت میں لیا اور زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔ وشوانا تھ چیخ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بال چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیتا نے اُس کے ایک گھٹنے کے پیچھے ٹھوکر ماری۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ سیتا اُس کے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے فرش پر گھسیٹتی رہی۔ پھر اُسے چھوڑ کر اچانک ہی

اوپر اُچھلی اور پیروں کے بل اُس کے پیٹ پر گری۔

وشوانا تھ کے پاس اب سوائے چیخنے کے کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ سیتا نے دوڑ کر میز پر سے شراب کی بوتل اُٹھا لی اور اُسے گردن سے پکڑ کر وشوانا تھ کی طرف لپکی۔ وشوانا تھ اُس وقت اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیتا نے بوتل اُس کے سر پر دے ماری..... وشوانا تھ کے منہ سے نکلنے والی یہ چیخ سب سے زیادہ زوردار اور خوفناک تھی۔ اُس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ نکلا تھا۔ زخم پر شراب پڑنے سے وہ اور بھی ناچ اُٹھا تھا۔

ٹوٹی ہوئی بوتل اب بھی سیتا کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا، اُس کے چہرے پر بے پناہ درندگی نظر آ رہی تھی۔ وشوانا تھ کے دونوں ہاتھ سر پر تھے۔ اُس کا چہرہ خون سے تر تھا۔ وہ پشت پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

سیتا کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی بوتل ایک خطرناک ہتھیار بن گئی تھی۔ اُس کے ٹوٹے ہوئے کونے بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اُس نے ٹوٹی ہوئی بوتل کو خنجر کی طرح سر سے اُوپر اُٹھا کر اُس کے پیٹ پر وار کیا..... بوتل کے کونے وشوانا تھ کے پیٹ میں پیوست ہو گئے..... وہ زمین سے تقریباً ایک فٹ اُوپر اُچھلا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ سیتا نے بوتل باہر کھینچی تو خون کے فوارے اُبل پڑے۔ وہ اُچھل کر ایک طرف ہٹ گئی۔

''میں تمہیں اس طرح ماروں گی جس طرح تم نے دُرگا کو مارا تھا.....'' وہ بوتل ایک طرف پھینکتے ہوئے غرائی۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شمروز! اس کی ٹانگ پکڑو سختی سے... چھوڑنا نہیں۔''

وشوانا تھ تڑپ رہا تھا۔ میں نے ٹخنے کے قریب سے اُس کی ایک ٹانگ گرفت میں لے لی۔ سیتا دوسری ٹانگ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ وشوانا تھ کی چیخیں بڑی خوفناک تھیں..... لیکن سیتا پر بھی دیوانگی سوار تھی۔ وہ وشوانا تھ کی ٹانگ کو کھینچتی چلی گئی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے کڑک کڑک کی دو ہولناک آوازیں اُبھریں..... سیتا نے ایک جھٹکے سے اُس کی ٹانگ چھوڑ دی اور بوتل اُٹھا کر اُس کی ٹانگوں کے بیچ میں زوردار وار کیا..... پھر بوتل چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ وہ پسینے میں تر ہو رہی تھی۔

میں نے وشوانا تھ کی طرف دیکھا وہ اب بھی بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہ نڈھال ہوتا چلا گیا..... وہ بے ہوش ہو گیا تھا یا مر گیا تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اگر اُس کی کچھ سانس باقی بھی تھے تو میرے خیال میں وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔

سیتا کی حالت بھی بتدریج معمول پر آتی چلی گئی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ میں نے زمین پر پڑی ہوئی ساڑھی اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

''اب یہ پہن لو اور یہاں سے چلنے کا وچار کرو.....'' میں نے کہا۔ ''زیادہ دیر رُکنا مناسب نہیں ہوگا۔''

سیتا نے میری طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے ساڑھی کو لے کر پہلے اُسے جھاڑا، پھر اُس کے بکل الگ کئے اور اُسے کمر پر لپیٹ کر نال لگانے لگی۔ اُس نے ساڑھی پہننے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگائے۔ اس دھینگا مشتی میں اُس کے بال بکھر گئے تھے اور چہرے کا میک اپ بھی خراب ہو گیا تھا۔ اُس نے دیوار کے ساتھ ٹنگے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھوں سے بالوں کو درست کیا اور بیڈ پر سے اپنا پرس اُٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اُس نے مُڑ کر ایک لمحہ کو وشوانا تھ کی لاش کی طرف دیکھا اور باہر نکل گئی۔

باہر نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ہمارا استقبال کیا اور برآمدے سے اُتر کر کار کے قریب آ گئے۔ میں نے ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر دیکھا چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ میں نے اندر بیٹھ کر دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ سیتا پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے انجن سٹارٹ کر کے کار کو ریورس گیئر میں ڈال کر گیٹ سے باہر نکلتے ہی اُسے بائیں طرف موڑ دیا اور رفتار بڑھا دی۔

''اس طرف آتے ہوئے میں ڈگی میں بند تھا.....'' میں نے کہا۔ ''مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ ہم کس طرف سے آئے تھے۔ تم راستہ بتاتی رہنا!''

''ابھی تو سیدھے چلتے رہو!'' سیتا نے اشارہ کیا۔

میں نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ سیتا خاموش بیٹھی سامنے دیکھتی رہی۔ وہ اُس وقت بولتی جب اُسے راستہ بتانا ہوتا۔ میں نے بھی اُسے مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

○

ہم تین چار دن تک مکان سے باہر نہیں نکلے۔ راجیو اور اخبارات کے ذریعے ہمیں صورتحال کا پتہ چلتا رہا۔ انسپکٹر وشوانا تھ کے قتل نے ایک بار پھر شہر میں ہلچل مچا دی تھی۔ اُس کی کار ہم نے ایک ویران سڑک پر چھوڑ دی تھی اور وشوانا تھ کی لاش بھی اگلے روز صبح ہی دریافت ہوئی تھی۔

ٹوٹی ہوئی بوتل اور کار کے اسٹیئرنگ سے اُنگلیوں کے نشانات ملے تھے۔ سیتا کے نشانات شناخت کر لئے گئے تھے جبکہ کار کے اسٹیئرنگ سے ملنے والے میری اُنگلیوں کے نشانات کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ کشمیری مجاہد شمروز کی اُنگلیوں کے نشان ہو سکتے ہیں۔ اور اخبارات نے ایک بار پھر اس خطرے کی نشاندہی کی تھی کہ ان دونوں کی جیسلمیر میں موجودگی ثابت کرتی ہے کہ وہ اپنے کسی اور منصوبے پر بھی عمل کرنا چاہتے ہیں۔

جیسلمیر بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ یہاں بہت سی اہم تنصیبات بھی تھیں۔ انسپکٹر وشوانا تھ کے قتل کے بعد تمام تنصیبات پر کڑا پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ پولیس ایک بار پھر چوکس ہو گئی تھی اور شہر

میں چیکنگ شروع کر دی گئی تھی۔ کئی مشتبہ لوگوں کو پکڑ کر حوالات میں بھی بند کر دیا گیا تھا۔

انسپکٹر وشوانا تھ کے قتل کے حوالے سے یہ خبریں اخبارات میں شائع ہوئی تھیں کہ پچھلی رات اُسے مہاراجہ کلب میں ایک حسین لڑکی کے ساتھ رقص کرتے ہوئے اور بعد میں اُس کے ساتھ کلب سے جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ مختلف لوگوں نے اُس کا جو حلیہ بتایا تھا اُس میں بڑا تضاد تھا۔ ہر شخص نے مختلف حلیہ بتایا تھا۔

ہم بہرحال محتاط ہو گئے تھے۔ میں اور سیتا تو تین چار روز تک باہر ہی نہیں نکلے۔ اور پھر ہم نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ہم اکیلے نہیں نکلے۔ کلپنا، شوبھا اور راجیو ہمارے ساتھ تھے۔ جب ہم گھر سے نکلے تو پانچ بج رہے تھے اس لئے ہم نے کسی ہوٹل کا رُخ کرنے کی بجائے گریسر ساگر اور سم جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ دونوں پکنک پوائنٹس تھے۔ گریسر ساگر دراصل ایک بہت بڑی مصنوعی جھیل تھی جو جیسلمیر شہر کے بانی راجہ جیسل نے بنوائی تھی۔ پورے شہر کی پانی کی ضرورت اسی جھیل سے پوری کی جاتی تھی۔ 1965ء میں جب شہر میں پانی کی سپلائی کا باقاعدہ نظام قائم ہوا تو یہ تاریخی جھیل محض تفریح گاہ بن کر رہ گئی۔ اس جھیل کے وسط میں ایک خوبصورت بارہ دری بھی تھی۔ جھیل میں پانی زیادہ ہو تو اُس بارہ دری تک کشتیاں بھی چلتی ہیں۔ جھیل گریسر کے کنارے سے ذرا پہلے پیلے پتھروں کا ایک خوبصورت منقش دروازہ ہے جسے تیلون کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ اس دروازے کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی سننے میں آئی ہے۔

تیلون ایک خوبصورت رقاصہ تھی جو سندھ سے جیسلمیر آئی تھی۔ بہت جلد اُس کی خوبصورتی کے چرچے پورے راجستھان میں پھیل گئے۔ بڑے بڑے راجے مہاراجے اُس کی چوکھٹ پر سر نیاز خم کرنے لگے۔ راجستھانی زبان میں تیلون کی حسن پر بہت شاعری کی گئی۔ تیلون کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اُسے سماجی کاموں کا بھی شوق تھا۔ اُس نے 1909ء میں جھیل کے قریب پیلے پتھروں کا ایک خوبصورت دروازہ تعمیر کروا دیا۔ جھیل کی طرف جانے والے لوگ اُس دروازے سے گزرتے تھے۔

جیسلمیر میں اگر تیلون کے چاہنے والے بڑی تعداد میں موجود تھے تو اُس کے حاسدوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ کچھ لوگوں نے راجہ لبا ہن سنگھ کے کان بھر دیئے کہ معصوم لوگ ایک طوائف کے بنائے ہوئے دروازے سے گزریں گے تو بڑا پاپ ہوگا۔ مہاراجہ نے دروازہ مسمار کرنے کا حکم دے دیا۔ تیلون کو مہاراجہ کے اس حکم کا علم ہوا تو اُس نے چند پنڈتوں کو اپنے ساتھ ملا کر اُس دروازے کے اُوپر وشنو بھگوان کا مندر تعمیر کروا دیا اور اس میں مورتیاں رکھوا دیں۔ مہاراجہ اس دروازے کو مسمار نہیں کرا سکا۔ یہ خوبصورت دروازہ آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔

جھیل کے کنارے کچھ وقت گزار کر ہم کرائے کی گاڑی میں سم کی طرف روانہ ہو گئے۔ سم جیسلمیر سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں کوئی جھیل یا

تاریخی عمارت نہیں۔ اُونچے نیچے ٹیلے ہیں اور اُن کے پرے اُفق تک سنہری ریت کا صحرا ہے۔ یہاں لوگ صرف غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔

اس وقت ہزاروں کی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ اُن میں غیر ملکی سیاح بھی تھے جو یوگا کے سٹائل میں ٹیلوں پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک باقاعدہ میلے کا سماں تھا۔ لوگ اونٹوں کی سواری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں کے لاتعداد سٹالز بھی موجود تھے۔

اُفق پر آہستہ آہستہ ڈھلتا ہوا سورج سرخ گولے کی طرح جیسے فضا میں معلق ہو کر رہ گیا تھا اور یوں گ رہا تھا جیسے تا حد نگاہ پھیلا ہوا صحرا لہو کی لہریں لئے ہوئے سمندر میں تبدیل ہو گیا ہو۔ غروب آفتاب کے تھوڑی دیر بعد تک یہ سرخی برقرار رہی اور پھر سرمئی دھندلکا پھیلنے لگا۔ لوگوں کی واپسی شروع ہو گئی تھی۔

ہم بھی ٹیلے سے اُتر کر اُس طرف چلنے لگے جہاں ہماری کرائے کی گاڑی کھڑی تھی۔ ابھی ہم نے چند گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک کار ہمارے قریب آ کر رُکی، دروازہ کھلا اور ایک آدمی اُتر کر ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا..... وہ چند لمحے باری باری ہمیں دیکھتا رہا، پھر سیتا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''میرا نام بابو راؤ ہے سیتا دیوی..... انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ۔''

یہ نام سن کر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... میں نے متوحش نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر سیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر بھی ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں.....!

○○○

''انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ۔'' اُس شخص نے اپنا نام دُہرایا۔ میں نے سیتا کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہمارے آس پاس ہزاروں لوگ تھے۔ اس ہجوم میں اگر صرف ایک فائر کی آواز گونج اُٹھے تو اس طرح بھگدڑ مچ جائے گی کہ کسی کو دوسروں کا تو کیا اپنا بھی ہوش نہیں رہے گا۔ اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کہاں کوئی لاش گری ہے اور لاش گرانے والا کون تھا؟ کھوپڑی میں بھیجہ رکھنے والے لوگ ایسے ہی موقعوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نے دھوتی کے بل میں چھپایا گیا پستول نکالنے کے لئے کرتے کے نیچے ہاتھ ڈالنا چاہا تو وہ شخص بولا۔

''نہیں مسٹر شمروز.....'' اُس کا لہجہ معقول تھا۔ نہ تو میں نے سختی محسوس کی تھی اور نہ ہی ایسی زی کہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوا جا سکتا۔ ''کوئی غلط حرکت تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہو گی۔ اس کے برعکس اگر تم چاہو تو میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتا ہوں۔''

''دوستی.....؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اُس کے منہ سے اپنا نام سن کر تو میں سانس لینا بھول گیا تھا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اپنے آپ کو ایک انٹیلی جنس آفیسر کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہم سے دوستی کی بات کر رہا تھا۔ اُسے تو چاہئے تھا کہ وہ ہم پر گن تان لیتا اور چیخ چیخ کر لوگوں کو بتاتا کہ ہم وہ دہشت گرد ہیں جن کے ہاتھوں اب تک سینکڑوں لوگ مارے جا چکے ہیں۔ لیکن وہ ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ ''دوستی.....'' میں نے ایک بار پھر کہا۔ ''اگر تم واقعی انٹیلی جنس آفیسر ہو تو ہمارے لئے تمہارے منہ سے دوستی کا لفظ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اگر تم بلی چوہے کے کھیل سے دل بہلانا چاہتے ہو تو تمہیں یہ کھیل مہنگا پڑے گا۔ بہتر ہے کہ جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو براہِ راست کر ڈالو۔''

''اگر مجھے کچھ کرنا ہوتا تو اسی روز کر ڈالتا جب میں نے تم دونوں کو مہاراجہ کلب میں انسپکٹر وشوا ناتھ کے ساتھ دیکھا تھا۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''لیکن اُس وقت مجھے کچھ شبہ تھا۔ سیتا دیوی کی آنکھوں کی رنگت نے مجھے شش و پنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ لیکن اگلی صبح انسپکٹر وشوا ناتھ کی لاش ملی تو مجھے یقین ہو گیا کہ رات کو اُس کے ساتھ مہاراجہ کلب میں رقص کرنے والی سیتا دیوی ہی تھی اور یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی مشکل نہیں تھا کہ اُس کے ساتھ دوسرا آدمی شمروز کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔'' وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اس کے بعد تم لوگ غائب ہو گئے۔ میں تم لوگوں کی تلاش میں سرگرداں رہا اور آج سہ

پھر اتفاق سے میں دھوبی پاڑے سے گزر رہا تھا کہ تم لوگ نظر آ گئے..... میں تم لوگوں کو وہیں روک سکتا تھا لیکن ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پیچھا شروع کر دیا۔ گریسر سا گر پر بھی تمہارے قریب نہیں آیا۔ ملاقات کے لئے یہ بہترین جگہ تھی اس لئے میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا یا ایسا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

میں چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری باتیں اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکیں۔ تم انٹیلی جنس آفیسر ہو اور ہم ہندوستان کی پولیس، انٹیلی جنس، آرمی اور ہر ادارے کو سب سے زیادہ مطلوب دہشت گرد۔ لیکن دوستی کی باتیں.....''

''اسے میری غرض سمجھ لو!'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''ہند سرکار ہمیں چند ہزار روپے مہینہ پگار دیتی ہے اور ہم اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ کئی بیوقوف مارے بھی جاتے ہیں۔ وہ کسی موقع سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے اپنی جان دے دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن میں اسے کرانتی (قربانی) یا آتما ہتیا سمجھتا ہوں۔ اور میں ایسے لوگوں میں سے نہیں ہوں کہ جیون میں آنے والے کسی سنہری موقع کو ضائع کر دوں۔ قسمت زندگی میں صرف ایک بار مہربان ہوتی ہے۔ وہ بار بار ایسے مواقع نہیں دیتی۔''

''تو گویا یہ تمہارے لئے ایک سنہری موقع ہے جس سے تم فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''ہاں.....'' وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں کسی جگہ پر بیٹھ کر اطمینان سے بات کرنی چاہئے۔ آؤ! وہاں بیٹھتے ہیں۔'' اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے سیتا کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں اُلجھن تیر رہی تھی۔ ہم بابو راؤ کے ساتھ ایک ٹیلے کی طرف چل دیئے جس کے دامن میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بھیل پوری، فروٹ، چنے، حلیم اور اسی قسم کی چیزوں کے ٹھیلے کھڑے تھے۔ بعض ٹھیلے والوں نے پیٹرومیکس جلا لئے تھے اور بعض ٹھیلوں پر ٹیوب لائٹس لگی ہوئی تھیں جنہیں جلانے کے لئے جنریٹر موجود تھے۔ یہ ٹھیلے مستقل طور پر یہیں رہتے تھے اور ان کے مالکوں نے اپنے لئے بوریا بستر کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، بہت سے لوگ غروب آفتاب کے دلفریب نظارے کے بعد واپس جا رہے تھے اور بہت سے لوگ اُن ٹھیلوں کے آس پاس بینچوں پر بیٹھے ناؤ نوش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا۔ انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ میٹھا بن کر ہمارے گرد کوئی جال تو نہیں بن رہا؟ ایسا تو نہیں کہ اُس کے کچھ اور ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں اور بابو راؤ اس بات کا منتظر ہو کہ تفریح کے لئے آئے ہوئے لوگ واپس چلے جائیں اور یہ لوگ ہمیں گھیر لیں۔ لق و دق صحرا میں وہ ہمیں آسانی سے گولیوں کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ لیکن

بہر حال اگر ایسی کوئی کارروائی ہوئی تو کم از کم بابو راؤ تو زندہ نہیں بچ سکے گا۔

ہم بھیل پوری والے ایک ٹھیلے کے قریب آ گئے۔ ایک بینچ پر ایک جوان عورت اور ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اُن کے ساتھ چھ سات برس کی عمر کا بچہ بھی تھا۔ راجیو، شوبھا اور کلپنا ہمارے ساتھ ساتھ تھیں۔ اُن کے چہروں پر ہلکا سا خوف نمایاں تھا۔

بابو راؤ بینچ اُٹھا کر ٹھیلے سے کچھ دُور لے گیا۔ اُس نے راجیو وغیرہ کو ٹھیلے کے قریب ہی بیٹھنے کو کہا اور مجھے اور سیتا کو اُن بینچوں پر الگ لے گیا۔ اُس نے سب کے لئے بھیل پوری کا آرڈر بھی دے دیا تھا۔

بینچ پر بیٹھنے سے پہلے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وسیع و عریض علاقے میں جگہ جگہ کھڑے ہوئے ٹھیلوں پر پیٹرومیکس جل رہے تھے۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ ٹھیلے والا ہمارے ہاتھوں میں بھیل پوری کی پلیٹیں تھما کر چلا گیا۔ میں اور سیتا ایک بینچ پر بیٹھے تھے اور بابو راؤ ہمارے سامنے دوسرے بینچ پر۔ اُس کا چہرہ روشنی کی طرف تھا۔

''کیا میں اسے بلی چوہے کا کھیل سمجھوں یا.....''

''نہیں مسٹر شمروز!'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ قسمت کی دیوی زندگی میں صرف ایک بار مہربان ہوتی ہے۔ مجھے بھی ایک بار موقع مل رہا ہے اور میں اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں۔''

''فائدہ تو تمہیں اس طرح بھی پہنچ سکتا ہے کہ ہمیں پکڑ کر قانون کے حوالے کر دو۔'' میں نے کہا۔

''اس سے کیا ہوگا.....؟'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے عہدے میں ترقی ہو جائے گی اور تنخواہ میں چند سو کا اضافہ ہو جائے گا اور اس کے ساتھ بہادری کا ایک سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔ لیکن یہ سرٹیفکیٹ مجھے زندگی کی وہ آسائشیں مہیا نہیں کر سکتا جن کی ایک انسان تمنا کر سکتا ہے۔''

''لیکن تم ایک ذمہ دار آفیسر ہو۔ تمہارے فرائض.....''

''یہ کتھا رہنے دو مسٹر شمروز!'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''وہ لوگ بیوقوف ہوتے ہیں جو فرض کی ادائیگی کے لئے اپنی ہتیا کر لیتے ہیں۔''

بابو راؤ کا یہ جواب میرے لئے انوکھا نہیں تھا۔ اس سے پہلے میں لودروا کیمپ کے سکیورٹی انچارج جگل ناتھ سے بھی ایسی باتیں سن چکا تھا۔ وہ سیتا کے حسن و شباب پر مرمٹا تھا اور محض ایک رات اُس کے ساتھ گزارنے کے لئے ہمارے ہاتھوں کیمپ کی تباہی بھول جانے کو تیار تھا۔ اُس سے پہلے بھی ایسے بہت سے لوگ میری نظروں میں آ چکے تھے۔ ہنومان گڑھ میں ''را'' کے اُس ایجنٹ کو تو میں کبھی نہیں بھول سکوں گا جس نے گیسٹ ہاؤس میں چوری چھپے سیتا سے ملاقات کی تھی اور اگلے روز صبح گیسٹ ہاؤس کے عقب میں ایک ہٹ میں اُس کی لاش ملی تھی۔

وہ بھی سیتا کے ساتھ ایک رات گزارنے کا خواہش مند تھا۔ اور اب انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ..... یہ بھی کسی موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا جس کے لئے وہ ہمیں نظر انداز کرنے کو تیار تھا بلکہ ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بازی اُونچی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ جو لوگ قومی مفادات پر ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں اُن کا کردار کیا ہوگا۔

''اُس رات مہاراجہ کلب میں ہمیں دیکھ کر تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں سیتا ہوں.....؟'' سیتا نے بابو راؤ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ باتوں کے ساتھ ساتھ ہم بھیل پوری بھی کھاتے جا رہے تھے۔

''میں انٹیلی جنس میں ہوں۔ اور تم بھی انٹیلی جنس میں رہ چکی ہو۔'' بابو راؤ نے جواب دیا۔ ''تمہاری فائل میں تمہاری تصویر بھی موجود ہے جس کی کاپیاں بنا کر ایجنسی کے فیلڈ آفیسروں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ میرے پاس بھی تمہاری ایک تصویر موجود ہے۔ اُس رات میں نے تمہیں دیکھا تو چونک گیا تھا۔ تمہارا حلیہ اگرچہ بدلا ہوا تھا۔ آنکھوں کی رنگت مختلف تھی لیکن مجھے شبہ ہو گیا تھا۔ اور اگلے روز جب انسپکٹر وشوانا تھ کی لاش ملی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ تم ہی تھیں اور تمہارے ساتھ شمروز تھا۔''

''جس رات تم نے ہمیں مہاراجہ کلب میں دیکھا تھا اس سے ایک رات پہلے ہمیں بھی تمہارے بارے میں کچھ بھنک مل گئی تھی۔ یا یوں کہو کہ ہمیں تمہارا نام معلوم ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اوہ..... وہ کیسے؟'' اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''اُس روز لودروا کے مندر میں تہہ خانے اور خفیہ سرنگوں کا انکشاف ہوا تھا اور جنگل ناتھ اور دوسرے سکیورٹی گارڈز کی لاشیں ملی تھیں۔ اور تم نے اپنے ماما مسٹر راؤ کو اس بارے میں بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اوہ.. تو تم میرے ماما کو جانتے ہو؟'' اُس نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''تمہارے ماما سے میری دوستی اُسی روز ہو گئی تھی جب ہم جیسلمیر پہنچے تھے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ اس طرح میں اُسے کسی اور چکر میں ڈالنا چاہتا تھا۔

''بہرحال.....'' میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ ہمارے ہاتھوں ہونے والی تباہیوں کو نظر انداز کر کے تم کیا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو..... لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ ہم سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟''

''میں تم لوگوں کو اس ملک سے فرار ہونے کا موقع دینا چاہتا ہوں۔'' اُس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ ''پولیس اور تمام ایجنسیوں کے تمام ایجنٹ شکاری کتوں کی طرح تم لوگوں کو تلاش کر رہے ہیں۔ تم لوگ زیادہ عرصہ تک چھپے نہیں رہ سکو گے۔ جیسلمیر اور جے پور میں تمہارے تمام رشتے داروں کے گھروں کی نگرانی ہو رہی ہے۔'' یہ آخری جملہ اُس نے سیتا کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''ایسی صورتحال میں تم لوگوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ..... اور میں تمہیں موقع دے رہا ہوں۔''

''تم ہماری محبت میں تو یہ سب کچھ نہیں کر رہے۔'' میں نے ایک بار پھر اُس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ ''مطلب کی بات کرو..... کیا چاہتے ہو؟''

بابو راؤ چند لمحے میری اور سیتا کی طرف دیکھتا رہا..... پھر بولا۔ ''میری گاڑی پوکھران پہنچانی ہے۔''

''پوکھران.....؟'' میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ''ابھی تم ہمیں سرحد پار بھجوانے کی بات کر رہے تھے۔ اور پوکھران تو سرحد کی طرف نہیں ہے۔ یہ تو مخالف سمت میں ہے..... ہم تو اور اندر کی طرف چلے جائیں گے۔''

''شبہ ہے کہ تم لوگ اُس طرف سے سرحد پار کر کے سندھ میں داخل ہونے کی کوشش کرو گے۔ اس لئے تھر کی سرحد پر کڑی نگرانی شروع کر دی گئی ہے۔'' بابو راؤ نے جواب دیا۔ ''پوکھران سے میرا ایک آدمی تم لوگوں کو انوپ گڑھ یا چندی گڑھ تک پہنچا دے گا۔ وہاں سے تم لوگ آسانی سے پنجاب کی طرف نکل سکتے ہو۔ پنجاب سے سرحد پار کرنا تم لوگوں کے لئے مشکل نہیں ہوگا۔''

''پوکھران تو یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک سو بیس کلومیٹر ہوگا..... تم اپنی گاڑی خود کیوں نہیں لے جا سکتے؟ اور پھر اس گاڑی میں ایسی کیا بات.....''

''تمہارے لئے یہ جاننا ضروری نہیں کہ اس گاڑی میں کیا خاص بات ہے۔'' بابو راؤ نے میری بات کاٹ دی۔ ''اور گاڑی میں خود کیوں نہیں لے جانا چاہتا؟ تمہیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن بہرحال! یہ تمہارے لئے ایک بہت اچھا چانس ہے۔ اور تم لوگ اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں ہوگا؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''ضمانت تو اس بات کی بھی نہیں کہ یہاں سے اُٹھنے کے بعد تم لوگ اپنے گھر تک پہنچ سکو گے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہمیں تمہاری یہ پیشکش منظور ہے۔ ہمیں کب جانا ہوگا؟''

''میں کل شام تک تمہیں بتاؤں گا۔'' بابو راؤ نے جواب دیا۔ ''شہر سے باہر جانے والوں کو بھی بڑی سختی سے چیک کیا جا رہا ہے۔ جو شخص اپنی شناخت پیش نہیں کر سکتا اُسے روک لیا جاتا ہے۔ اور اُس کے بارے میں تصدیق ہونے کے بعد ہی جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ بسوں اور ٹرینوں سے سفر کرنے والے مسافروں کو بھی بڑی سختی سے چیک کیا جاتا ہے۔ میں تم

لوگوں کو کاغذات بنوا دُوں گا اور تم لوگوں کو یہاں سے نکلنے میں پریشانی نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے کہا۔ ''کل کہاں ملاقات ہوگی؟''

''دھوبی پاڑے کی مین سٹریٹ پر بمبئی ہوٹل کے نام سے ایک مارواڑی کا ریسٹورنٹ ہے۔'' بابوراؤ نے کہا۔ ''مارواڑیوں کے ریسٹورنٹ عام طور پر نہایت تھرڈ کلاس اور گھٹیا قسم کے ہوتے ہیں۔ ان ریستورانوں میں چرسیوں اور موالیوں کی بھرمار ہوتی ہے اور ہم جیسا کوئی شریف آدمی وہاں قدم رکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن بمبئی ہوٹل ایئر کنڈیشنڈ اور بڑا اچھا ریسٹورنٹ ہے۔ میں کل شام ٹھیک سات بجے تمہیں وہاں ملوں گا۔ اور تم اکیلے آؤ گے۔''

''ڈن.....!'' میں نے اُس سے ہاتھ ملایا۔ ''لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا ہم تو اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھر رہے ہیں، موت سے نہیں ڈرتے۔ لیکن اگر ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا تو تم بھی زندہ نہیں بچ سکو گے۔''

''مجھے اپنا جیون بہت پیارا ہے۔'' بابوراؤ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں بھی کچھ لے کر یہاں سے بہت دُور نکل جانا چاہتا ہوں، تاکہ باقی زندگی آرام اور سکون سے گزار سکوں۔''

میں جواب دینے کی بجائے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ ویرانہ اب ویرانہ لگنے لگا تھا۔ تقریباً سب ہی لوگ جا چکے تھے۔ بہت سارے ٹھیلوں کی بتیاں بھی بجھ چکی تھیں۔ اِکا دُکا لوگ ہی رہ گئے تھے۔ میں بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے مسٹر بابوراؤ!'' میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں کل شام سات بجے بمبئی ہوٹل میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

راجیو وغیرہ ٹھیلے کے قریب بینچوں پر پریشان بیٹھے تھے۔ بابوراؤ ٹھیلے والے کو پیسے دے کر دوسری طرف چلا گیا اور ہم راجیو وغیرہ کو لے کر اُس طرف چل دیئے جہاں ہماری کرائے کی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور ہمارا منتظر تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے تو اُس نے انجن سٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہاں چند گاڑیاں ابھی تک کھڑی تھیں۔ میں نے ویرانے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ بابوراؤ نظر نہیں آیا۔ وہ اندھیرے میں مدغم ہو چکا تھا۔

جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو ابھی صرف نو ہی بجے تھے۔ ہم نے ایک موڑ پر کرائے کی گاڑی چھوڑ دی اور مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے دھوبی پاڑے کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا؟

ہم راستے بھر خاموش رہے۔ لیکن گھر پہنچتے ہی سب اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ میں نے اور سیتا نے راجیو وغیرہ کو اصل بات نہیں بتائی تھی لیکن اس بات پر سب ہی کو حیرت تھی کہ ایک انٹیلی جنس آفیسر نے ہمیں کیسے چھوڑ دیا تھا؟

شوبھا اُٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے بنا کر لے آئی تو میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہم اُس وقت واقعی چائے جیسی کسی چیز کی طلب محسوس کر رہے تھے۔

بھوک کسی کو نہیں تھی۔ بھیل پوری سے ہی پیٹ بھر گیا تھا اس لئے کسی نے کھانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ چائے کے بعد ہم لوگ ایک ہی کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

بارہ بجے کے قریب شوبھا اور راجیو اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سیتا اور کلپنا دونوں ایک کمرے میں سوتی تھیں اور میں الگ کمرے میں سوتا تھا۔ جس کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے وہ اُن دونوں کا تھا اور کلپنا چارپائی پر لیٹی اونگھ رہی تھی۔

ایک بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں آیا تو سیتا بھی میرے پیچھے ہی چلی آئی۔ میں چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور ہم انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

''میرا خیال ہے ادھر بھی کوئی بہت اُونچا کھیل کھیلا جا رہا ہے.....'' سیتا کہہ رہی تھی۔ ''اور بابوراؤ کچھ لے کر اس کھیل سے نکلنا چاہتا ہے۔''

''اور وہ 'کچھ' بھی اتنا کچھ ہوگا کہ وہ پوری زندگی عیش و آرام سے گزار سکے گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ اس کھیل سے نکلنا چاہتا ہے تو ہمارا سہارا کیوں لے رہا ہے؟ اور وہ اپنی کار ہمارے ذریعے یہاں سے پوکھران کیوں بھیجنا چاہتا ہے؟ کیا وہ سب کچھ اس کار میں ہوگا جس کے لئے وہ یہاں سے فرار ہونا چاہتا ہے؟ نوٹوں سے بھری ہوئی بوریاں، سونا یا کوئی اور ایسی چیز.....؟''

''وہ اتنا بیوقوف نہیں ہے۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کہ نوٹوں سے بھری ہوئی بوریاں اور سونا ہمارے ذریعے یہاں سے باہر بھیجے۔ کار میں یقیناً کوئی ایسی چیز ہوگی جس کے عوض وہ بعد میں کسی اور جگہ نوٹوں کی بوریاں یا سونا وصول کر سکے گا۔''

''اوہ.....!'' میں چونک گیا۔ ''کار میں یقیناً کوئی ایسی چیز ہوگی جسے وہ خود نہیں لے جانا چاہتا۔ مثلاً کوئی بہت ہی اہم راز..... وہ کار ہمارے ذریعے بھجوانا چاہتا ہے تاکہ ہم پکڑے جائیں تو سارا الزام ہم پر گرے کہ ہم سرکاری راز لے کر بھاگ رہے تھے۔ مطلوب تو ہم پہلے ہی ہیں۔ اس بات پر بڑی آسانی سے یقین کر لیا جائے گا۔''

''یقیناً ایسی ہی بات ہوگی۔'' سیتا نے کہا۔ ''اور ہمارا جیسلمیر سے پوکھران کا سفر ہمارے جیون کا آخری سفر بھی ثابت ہو سکتا ہے۔''

''اور میں نہیں چاہتا کہ کلپنا اور راجیو وغیرہ اس سفر میں ہمارے ساتھ ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''راجیو تو اپنا کوئی بندوبست کر سکتا ہے لیکن کلپنا کے لئے پریشان ہوں۔ وہ بہت معصوم لڑکی ہے، اس دنیا میں اُس کا کوئی نہیں ہے۔ اگر وہ اکیلی رہ گئی تو خونخوار بھیڑیئے اُسے کھا جائیں گے۔''

''کلپنا کو میں بھی اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتی۔ لیکن صورتحال اب تبدیل ہو چکی ہے۔'' سیتا نے کہا۔ ''ہم زمینی حقائق سے منہ نہیں موڑ سکتے اور نہ ہی ہم کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بابوراؤ نے ٹھیک ہی

کہا تھا۔ ہمارے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم جیون بھر ایک مکان کی چار دیواری میں محصور رہیں۔ اور اس بات کی بھی ضمانت نہیں ہے کہ ہم کسی ایک جگہ پر مقید رہ کر بھی محفوظ رہیں گے۔ ہم ہند سرکار کو یہاں ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ تین اسرائیلی ایجنٹ ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں اور تم ان یہودیوں کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہو۔ دنیا میں کہیں ان کا ایک آدمی بھی مارا جائے تو جب تک وہ کم از کم سو بے گناہوں کو موت کے گھاٹ نہ اُتار دیں چین سے نہیں بیٹھتے۔ فلسطین اور لبنان میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ بھارت سے اسرائیل کے دوستانہ تعلقات ہیں...... یہاں تو اسرائیل اپنی اس پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا لیکن اپنے آدمیوں کے قاتلوں کی گرفتاری کے لئے وہ بھارت سرکار پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالے گا۔ کیمپ کی تباہی کے سلسلے میں تمہارا نام سامنے آ چکا ہے۔ تمہاری تلاش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جائے گی۔ اس لئے یہاں رہنا اب ہمارے لئے ممکن نہیں...... بابو راؤ نے ٹھیک کہا تھا۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ وہ اپنے کسی بڑے مقصد کے حصول کے لئے ہمیں استعمال کرنا چاہتا ہے اور ہمیں فرار کا ایک راستہ بھی دکھا رہا ہے۔ لیکن ہم اُس کے منصوبے پر عمل نہیں کریں گے۔''

''کیا مطلب......؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ہم پوکھران ضرور جائیں گے۔'' سیتا نے جواب دیا۔ ''گاڑی اُس کے آدمی کے حوالے کر کے ہم اپنا راستہ الگ کر لیں گے۔''

''لیکن...... ان لوگوں کا کیا ہوگا؟'' میرا اشارہ کلپنا اور راجیو وغیرہ کی طرف تھا۔

''میں ایک اور رُخ پر سوچ رہی ہوں۔'' سیتا نے کہا۔ میں سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ سیتا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میری ماتا جی کے ایک کزن باڑمیر میں رہتے ہیں۔ وہاں اُن کی کھیتی باڑی ہے۔ ہم راجیو اور کلپنا وغیرہ کو باڑمیر بھیج دیتے ہیں، بعد میں ہم بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ پاکستان کی سرحد وہاں سے زیادہ دُور نہیں۔ ہم راجیو اور شوبھا کو ہندوستان ہی کے کسی شہر کی طرف بھیج دیں گے اور کلپنا کو لے کر پاکستان کی طرف نکل جائیں گے۔ تم ایک کشمیری مجاہد ہو۔ پاکستان میں تمہارا بڑا نام ہے...... وہاں تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔''

''لیکن تم نے شاید بابو راؤ کی باتوں پر توجہ نہیں دی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اُس نے بتایا تھا کہ تھر کی سرحد کی کڑی نگرانی ہو رہی ہے۔''

''سرحد بند ہی کیوں نہ کر دی جائے...... اسمگلروں کے لئے ہمیشہ راستے کھلے رہتے ہیں۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ماما راجندر ناتھ کی ساری زندگی باڑمیر میں گزری ہے۔ وہ خود اسمگلر تو نہیں لیکن ایسے لوگوں سے اُس کے تعلقات ضرور ہوں گے۔ وہ یقیناً ہماری مدد کریں گے۔''

''تمہاری داستان تو وہاں تک بھی پہنچ چکی ہوگی......'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے باڑمیر میں

بھی انٹیلی جنس کے آدمی موجود ہوں۔ اور وہاں آنے جانے والے لوگوں پر نگاہ رکھی جا رہی ہو۔ یا ممکن ہے تمہارا ماما دیش بھگت ثابت ہو اور خود ہی ہمیں پولیس کے حوالے کر دے۔''

''ماما راجندر ناتھ ایسا نہیں کر سکتا۔'' سیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اُس کی ایک بیٹی میرے چاچا کے بیٹے سے بیاہی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کر کے وہ اپنی بیٹی کے جیون میں کانٹے نہیں بچھائے گا۔''

''تو پھر......؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا

''کل صبح ہی اُنہیں باڑمیر بھیج دیا جائے۔'' سیتا نے کہا۔

''اور اس دولت کا کیا کرو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ زیور ہم راجیو کو دے دیتے ہیں، باقی اپنے پاس رکھ لیں گے۔ سونا تو سرحد پار بھی ہمارے کام آ سکتا ہے۔'' سیتا نے جواب دیا۔

ہم کچھ دیر تک پروگرام بناتے رہے۔ پھر سیتا، راجیو اور کلپنا کو جگا کر لے آئی اور اُنہیں اپنا منصوبہ سمجھانے لگی۔

○

راجیو، کلپنا اور شوبھا صبح سویرے ہی گھر سے رخصت ہو گئے۔ اُنہیں جو زیورات دیئے گئے تھے وہ کلپنا اور شوبھا نے پہن لئے تھے اور اُن پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بابو راؤ نے بتایا تھا کہ شہر سے باہر جانے والوں کو بھی چیک کیا جا رہا تھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس کو سیتا اور شمروز کی تلاش تھی۔ دونوں جوان اور حسین و خوبرو تھے۔ اُن کے حلیے بھی پولیس اور انٹیلی جنس کو کسی حد تک معلوم ہو چکے تھے۔ لیکن کلپنا، شوبھا اور راجیو میں سے کوئی بھی ان حلیوں یا معیار پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ اس لئے توقع تھی کہ اُنہیں شہر سے نکلنے میں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئے گی۔ لیکن بہرحال ہماری بے چینی دوپہر تک برقرار رہی۔ اور دوپہر کے بعد ہم نے اپنے طور پر یقین کر لیا کہ وہ خیریت کے ساتھ شہر سے نکل چکے ہوں گے۔

شام ساڑھے چھ بجے میں باہر جانے کے لئے تیار ہوا تو سیتا بھی ضد پر آ گئی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے گی۔

''دونوں کا جانا مناسب نہیں ہوگا......'' میں نے سیتا کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی دھوکہ بھی ہوا تو ہم میں سے کم از کم ایک تو بچ جائے گا۔''

سیتا بڑی مشکل سے پیچھے رہ جانے پر تیار ہوئی تھی لیکن اُس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ میرے فیصلے سے خوش نہیں ہے۔ اُس نے مجھے اس طرح رخصت کیا جیسے یہ ہماری زندگی کی آخری ملاقات ہو۔

مین بازار زیادہ دُور نہیں تھا اور مجھے بمبئی ہوٹل تلاش کرنے میں بھی زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ یہ ریسٹورنٹ ایک بارونق سائیڈ اسٹریٹ کے کارنر پر واقع تھا۔ اس کا ایک دروازہ سائیڈ

اسٹریٹ کی طرف بھی تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی میری نظریں سامنے لگی ہوئی کھڑکی کی طرف اُٹھ گئیں۔ ٹھیک سات بج رہے تھے۔ صاف ستھرا ریسٹورنٹ تھا۔ گاہکوں میں جوان اور خوبصورت لڑکیاں بھی شامل تھیں جو اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ ریسٹورنٹ خاصا بڑا تھا اور سائیڈ اسٹریٹ والے دروازے سے ذرا آگے کیبن بھی تھے اور ہر کیبن کے سامنے پردہ کھنچا ہوا تھا۔

بابوراؤ مجھے نظر نہیں آیا۔ میں سائیڈ اسٹریٹ کے دروازے کے قریب ایک ایسی میز پر بیٹھ گیا جہاں سے دونوں طرف نگاہ رکھ سکتا تھا۔ میرے بیٹھنے کے فوراً ہی بعد ویٹر بھی نازل ہو گیا اور میں نے اُسے چائے کا آرڈر دے دیا۔

ابھی میں چائے پی رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر عورت سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اُس نے عقابی نظروں سے ہال کا جائزہ لیا اور نپے تلے قدم اُٹھاتی ہوئی میرے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ صورت ہی سے فاحشہ لگتی تھی اور اُس نے لباس بھی کچھ ایسا پہن رکھا تھا کہ کسی شریف آدمی کو اُس کی طرف نگاہ اُٹھاتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

''تم اکیلے بیٹھے بور نہیں ہو رہے شریمان جی.....؟'' اُس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے اکیلا ہی رہنے دیں شریمتی جی!'' میں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''میرا ایک دوست یہاں آنے والا ہے اور اُس کا تعلق پولیس سے ہے۔ ایسا نہ ہو تمہارے لئے کوئی سمسیا پیدا ہو جائے۔''

اُس کا چہرہ ہونق سا ہو گیا..... وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ گئی اور پھر وہ ریسٹورنٹ میں بھی نہیں رُکی۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

اور پھر وقت گزرتا رہا اور میری بے چینی بڑھنے لگی..... بابوراؤ نے ٹھیک سات بجے کا کہا تھا اور سات بج کر پچیس منٹ ہو چکے تھے۔ میرے ساتھ کہیں دھوکہ تو نہیں ہو رہا.....؟ بابوراؤ نے میرے ساتھ کوئی چال تو نہیں چلی.....؟ کل جب اُس نے ہمیں دیکھا تھا تو وہ اکیلا تھا اور ہم پانچ تھے۔ ظاہر ہے وہ اکیلا ہم پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ وہ ہمارے قریب آ گیا اور اپنے بارے میں ایک فرضی کہانی سنا ڈالی۔ اور میں دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف تھا کہ اُس کہانی پر یقین کر لیا۔

میرے پاس پستول موجود تھا اور مرنے سے پہلے دو چار کو تو گرا ہی سکتا تھا۔ سات بج کر تیس منٹ پر میں اُٹھ گیا۔ بل ادا کر کے ریسٹورنٹ سے نکلا تو مجھے آس پاس کوئی غیر معمولی سرگرمی دکھائی نہیں دی۔ ویسے انٹیلی جنس والے اتنے بیوقوف نہیں ہوتے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کو دوسروں کی نظروں میں آنے دیں۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا واپس چل پڑا۔ میں نے اگرچہ اپنے تعاقب کا خیال رکھا تھا لیکن یہ شام کا وقت تھا۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت تھی اور یہ اندازہ لگانا دُشوار تھا کہ ان میں کوئی میرا

پیچھا کر رہا ہے یا نہیں؟

مکان کے سامنے پہنچ کر میں ٹھٹھک گیا..... دروازے پر تالا لگا ہوا تھا..... میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔ میں مُڑ کر گلی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک طرف سے ایک آدمی اور دو عورتیں آ رہی تھیں۔ قریب پہنچ کر اُن میں سے ایک عورت میری طرف آ گئی۔

''چابی میرے پاس ہے.....''

سیتا کی آواز سن کر میں اُچھل پڑا۔ اُس کا چہرہ چنری سے ڈھکا ہوا تھا اس لئے میں اُس کی صورت نہیں دیکھ سکا۔ اُس نے تالا کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ سیتا نے فوراً دروازہ بند کر کیا اور مجھ سے لپٹ گئی۔

''یہ کیا حرکت تھی..... کہاں گئی تھیں تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہیں اکیلے کیسے چھوڑ دیتی؟'' سیتا نے چہرے پر سے چنری ہٹاتے ہوئے کہا۔

ہم کمرے میں آ گئے۔ سیتا نے پھولدار کپڑے کا گھاگھرا اور چولی پہن رکھی تھی اور سر پر چنری اوڑھ رکھی تھی۔ اور پھر اُس نے بتایا کہ میرے جانے کے چند منٹ بعد ہی وہ لباس پہن کر میرے پیچھے نکل کھڑی ہوئی تھی اور بمبئی ریسٹورنٹ کے قریب سائیڈ سٹریٹ میں کھڑی ہو کر میری نگرانی کرتی رہی تھی۔ اُس کے کہنے کے مطابق میں ایک لمحہ کو بھی اُس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اُس فاحشہ عورت کو بھی دیکھا تھا جو میری میز پر آئی تھی اور جسے میں نے بھگا دیا تھا۔

''اگر کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو تم کیا کر لیتیں؟'' میں نے کہا۔

''دو چار کو تو گرا ہی دیتی۔'' اُس نے کہتے ہوئے چولی میں چھپا ہوا پستول نکال لیا۔ یہ جگل ناتھ کا پستول تھا۔ میرے پاس جو پستول تھا وہ بھی لودرا کیمپ ہی سے مارا گیا تھا۔

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر کے دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سن کر اُچھل پڑے..... ''یہ کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں بابوراؤ کا خیال اُبھرا تھا۔ دستک دینے کا انداز دوستانہ تھا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو اس طرح ہلکی دستک نہ دی جاتی۔

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ سیتا پستول سنبھال کر صحن کے ایک تاریک گوشے میں دبک گئی۔ میں نے بھی اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ اس دوران دستک کی آواز دوبارہ اُبھری تھی۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھول دیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا..... میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ بابوراؤ ہی تھا اور خالی ہاتھ تھا۔ اُس نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ میں اُس کے سامنے آ گیا۔

''معاف کرنا دوست.....'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تم سے ملاقات کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا، جس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں۔''

مجھے صورتحال کا اندازہ لگانے میں دُشواری پیش نہیں آئی۔ وہ مجھ سے ملاقات کے لئے ریسٹورنٹ میں نہیں آیا تھا بلکہ دُور کھڑے رہ کر ریسٹورنٹ کی نگرانی کرتا رہا تھا اور پھر میرا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔

''میں نے ریسٹورنٹ میں تم سے ملاقات کرنا مناسب نہیں سمجھا.....'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''اگر میں کل تم سے ملاقات کے لئے اس مکان کا پتہ پوچھتا تو تم کبھی نہ بتاتے۔ اور کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر بات کرنا مناسب نہیں تھا اس لئے مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔''

''آؤ..... اندر کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم کمرے میں آئے تو سیتا بھی آ گئی۔ اُس نے پستول دوبارہ چولی میں چھپا لیا تھا۔

''یہ تم دونوں کے کاغذات ہیں.....'' بابو راؤ نے جیب سے دو کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیئے۔ یہ وحید الدین اور رضیہ بیگم کے نام کے کاغذات تھے۔ اور اس امر کی تصدیق کی گئی تھی کہ یہ دونوں جیسلمیر کے شہری ہیں۔ دونوں کاغذوں پر کوتوال کی مُہر اور کوتوال کے دستخط بھی ثبت تھے۔

''یہ کاغذات مسلم ناموں سے اس لئے بنوائے گئے ہیں کہ اس شہر میں مسلمان بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ اور پوکھران میں تم جس شخص کو ملو گے وہ بھی مسلمان ہے۔ میں تمہیں اُس کے بارے میں تفصیل سے بتا دُوں گا۔ ویسے راجستھان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ کسی قسم کی چیکنگ کے وقت مسلمان عورتوں کو زیادہ پریشان نہیں کیا جاتا۔''

بابو راؤ کے خاموش ہونے پر میں نے اور سیتا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سیتا اُس سے مختلف سوالات کرنے لگی۔

''ہمیں کب جانا ہوگا..... اور گاڑی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گاڑی صبح تمہیں اپنے مکان کے دروازے پر کھڑی ملے گی۔ اُس میں چابی بھی لگی ہو گی۔ نیلے رنگ کی سیڈان ہے۔ تم لوگ صبح ٹھیک سات بجے یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔'' بابو راؤ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے.....'' میں نے سر ہلا دیا۔ اس دوران سیتا کمرے سے چلی گئی تھی۔ اور تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ اب ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ بابو راؤ نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ درست تھا..... وہ واقعی کسی بہت خطرناک کھیل میں پھنسا ہوا تھا اور اپنے آپ کو اس سے نکالنا چاہتا تھا۔ اگر ہمیں پھانسنے کے لئے کوئی چکر چلایا ہوتا تو اب تک ہمارا قصہ تمام ہو چکا ہوتا۔ لیکن بابو راؤ کے بارے میں ہمارے شبہات بے بنیاد نکلے اور معاملہ جوں کا توں چلتا رہا۔

''پوکھران میں تم جس شخص سے رابطہ کرو گے اُس کا نام سلامت علی ہے۔'' بابو راؤ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہیں پوکھران کے مین بازار میں واقع کالی بھون ریسٹورنٹ

میں ملے گا۔ اُس سے رابطہ کرنے کے بعد تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر سلامت علی کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

گیارہ بجے کے قریب بابو راؤ چلا گیا..... میں اُسے رخصت کرنے کے بعد دروازہ بند کر کے واپس آیا تو سیتا والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔

''سارے سنگھٹ دُور ہو گئے.....'' وہ بولی۔ ''اب آخری مرحلہ رہ گیا ہے۔ جیسلمیر سے نکلنے کے بعد کوئی ہمارا راستہ نہیں روک سکے گا۔''

میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن سیتا مجھے لے کر چارپائی پر گر گئی.....!

ہم اگرچہ رات کو دیر تک جاگتے رہے تھے لیکن صبح ساڑھے پانچ بجے آنکھ کھل گئی۔ سیتا فوراً ہی کمرے سے نکل گئی اور میں کچھ دیر بستر پر پڑا اینٹھتا رہا۔ اور پھر اُٹھ کر میں نے بھی تیاری شروع کر دی۔ مندر کے تہہ خانے سے ملنے والے زیورات، سونے کی مورتیاں وغیرہ ایک سوٹ کیس میں ڈال کر اُوپر کپڑے ڈال دیئے۔ ناشتہ کرنے کے بعد سیتا بھی تیار ہو گئی۔ لباس کے حوالے سے اس وقت اُس نے ساڑھی کا انتخاب کیا تھا اور اُس کا پلو سر پر ڈال رکھا تھا۔

ٹھیک سات بجے میں نے بیرونی دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ گلی میں لوگ آ جا رہے تھے اور دروازے سے چند گز آگے نیلے رنگ کی ایک خوبصورت سیڈان کھڑی تھی۔ میں اندر آ گیا اور سیتا کو کار کے بارے میں بتایا۔

چند منٹ بعد ہم مکان سے نکل آئے..... دروازہ بھیڑ کر باہر سے کنڈا لگا دیا اور کار کی طرف آ گئے۔ کار کے دروازے لاک نہیں تھے۔ اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ سیتا ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے ڈیش بورڈ کا جائزہ لیا۔ فیول بتانے والا میٹر بتا رہا تھا کہ ٹینکی بھری ہوئی تھی۔ سیتا نے سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر ڈال دیا تھا۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، پچھلی سیٹ پر پانی سے بھرا ہوا ایک مشکیزہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کرنے کے لئے اگنیشن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو فوراً ہی ایک خیال ذہن میں اُبھرا اور میں نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔

''کیا ہوا.....؟'' سیتا نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''چابی گھماتے ہی اگر کار دھماکے سے اُڑ گئی تو؟'' میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''ایسی کوئی بات ہونی ہوتی تو بہت پہلے ہو چکی ہوتی۔'' سیتا نے کہا۔ ''تم اللہ کا نام لے کر انجن اسٹارٹ کرو!''

میں نے اُنگلی اور انگوٹھے کی چٹکی میں چابی پکڑ کر اللہ کا نام لیتے ہوئے اُسے گھما دیا..... پہلی کوشش میں انجن جاگ اُٹھا۔ کوئی دھماکہ نہیں ہوا۔ میں انجن کو گیئر میں ڈال کر گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ سیتا مجھے راستہ بتاتی رہی اور میں کار کو مختلف گلیوں اور سڑکوں پر گھماتا ہوا بالآخر اُس سڑک پر نکل آیا جو شہر کے نواحی علاقے سے ہوتی ہوئی پوکھران کی طرف چلی گئی تھی۔

شہر سے تقریباً ایک میل باہر چیک پوسٹ پر مجھے گاڑی روک دینی پڑی۔ ہم سے آگے ایک بس اور دو کاریں تھیں۔ یہ چوکی عارضی طور پر قائم کی گئی تھی۔ سڑک پر بیریئر لگا دیا گیا تھا جس کے دونوں طرف مسلح پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک طرف سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک خیمہ بھی لگا ہوا تھا۔ سیتا نے ساڑھی کا پلو سر پر دوپٹے کی طرح درست کر لیا۔ اُس نے حلیہ بدلنے میں کچھ محنت کی تھی۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں والا چشمہ بھی لگا ہوا تھا۔

اگلی گاڑیوں سے فارغ ہو کر ایک انسپکٹر میری طرف آ گیا اور مجھ سے مختلف سوالات کرنے لگا۔ میں نے وہ کاغذات اُس کی طرف بڑھا دیئے۔

''آپ دونوں نیچے اُتر آیئے..... گاڑی چیک کی جائے گی۔'' انسپکٹر نے کہا۔ میں نیچے اُتر آیا۔ سیتا اپنی طرف کا دروازہ کھول رہی تھی کہ خیمے سے ایک آدمی کو برآمد ہوتے دیکھ کر میں چونک گیا..... وہ انٹیلی جنس آفیسر بابوراؤ تھا۔

''ارے نارائن..... ان دیوی جی کو کیوں پریشان کرتے ہو؟ جانے دو انہیں۔ گاڑی چیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اُس نے قریب آ کر انسپکٹر سے کہا۔

''یس سر.....'' انسپکٹر نے کہا۔

میں شکریہ ادا کرتا ہوا دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کر دیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ سڑک پختہ اور بہت شاندار تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن بھی تھی جو پوکھران، رام ڈیوڑی اور پھالوری ہوتی ہوئی جودھ پور کی طرف چلی گئی تھی۔

آٹھ بج چکے تھے۔ دُھوپ میں ابھی سے تیزی آ گئی تھی اور تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے کار کی رفتار بڑھا دی اور اطراف میں دیکھنے لگا۔ تا حد نگاہ لق و دق صحرا پھیلا ہوا تھا جہاں کہیں کہیں چھوٹی پہاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن کہیں معمولی سا سبزہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شروع میں چند میل تک تو سڑک بے حد صاف اور ہموار تھی۔ لیکن آگے خاصی ٹوٹ پھوٹ نظر آ رہی تھی۔ کار کو مسلسل ہلکے ہلکے دھچکے لگ رہے تھے۔ سیتا سامنے دیکھتے ہوئے بتا رہی تھی کہ تقریباً پینتالیس میل آگے چندن نام کا ایک قصبہ ہے جو ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ چندن سے پینسٹھ کلومیٹر آگے پوکھران ہے۔ لیکن ہمیں پوکھران پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے کی کوئی منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔

کافی دیر خاموشی رہی۔ میں نے گردن گھما کر سیتا کی طرف دیکھا۔ اُس کی پیشانی پسینے سے تر تھی اور چہرے پر وحشت بھی نمایاں تھی۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگا جو صحرا میں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد سامنے سے ایک بس کو آتے دیکھ کر میں نے کار سڑک سے ہٹا لی اور ایک اُونچے ٹیلے کے پیچھے لیتا چلا گیا۔ مجھے بابوراؤ کی اس کار کے بارے میں کچھ شبہ تھا اور میں فی الحال کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اگرچہ کوئی ایسی بات ابھی تک

سامنے نہیں آئی تھی لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ سڑک پر بھی پیٹرولنگ نہ ہو رہی ہو۔ اس لئے میں نے سوچا تھا کہ کچھ دیر سڑک سے ہٹ کر سفر کرنے کے بعد دوبارہ سڑک پر آ جاؤں گا۔

میں اُونچے ٹیلوں کے پیچھے ہی پیچھے ڈرائیو کرتا رہا۔ ریت اگرچہ جمی ہوئی تھی اور سخت تھی لیکن کہیں کہیں کار کو آگے بڑھنے میں خاصی دُشواری پیش آ رہی تھی۔ ٹائر کہیں نرم ریت میں دھنستے تو کار کو آگے بڑھانے میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ٹائر ایک بار پھر ریت میں دھنس گئے۔

میں نے نیچے اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھا اور دوسرے ہی لمحہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... آدھا گھنٹہ پہلے تک میں سڑک کو نگاہ میں رکھے ہوئے تھا لیکن اب سڑک غائب تھی..... ہم نجانے کس طرف نکل آئے تھے۔ کسی صحرا میں بھٹکنے کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ تپتے ہوئے ریگزاروں میں ایڑیاں رگڑتے ہوئے مرنے کے تصور ہی سے میں کانپ اُٹھا.....

سیتا بھی کار سے اُتر آئی۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی اور چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ گرمی کی شدت نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔

''کیا ہوا.....؟'' اُس نے مُردہ لہجے میں پوچھا۔

''ٹائر ریت میں دھنس گئے ہیں..... کار تو ذرا سی کوشش سے نکل آئے گی لیکن.....'' میں نے جان بوجھ کر جملہ مکمل نہیں کیا۔

''لیکن کیا.....؟''

''ہم راستہ بھٹک گئے ہیں اور کسی ریگستان میں راستہ بھٹکنے کا مطلب سمجھتی ہو؟'' میں نے کہا۔

سیتا کانپ اُٹھی۔ میں دل ہی دل میں اُس وقت پر لعنت بھیجنے لگا جب بابوراؤ کی پیشکش قبول کی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بابوراؤ کو تو گزشتہ رات ہی گلا گھونٹ کر ہلاک کر دینا چاہئے تھا۔ لیکن اب ایسی باتیں سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ ہم یونہی کھڑے ویران سی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے رہے۔ دائیں طرف بہت دُور ایک پہاڑی نظر آ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے اگر ہم اُس پہاڑی تک پہنچ جائیں تو راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔ لیکن پہلے کار کو نکالنے میں میری مدد کرو!'' میں نے کہا اور کار کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔ سیتا بھی میرے ساتھ تھی۔ چند منٹ کی کوشش سے ہم کار کو دھکیل کر تقریباً دو فٹ آگے لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اتنی سی محنت سے ہی ہم دونوں بری طرح ہانپ گئے تھے۔ سیتا کے لئے گرمی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ اُس نے ساڑھی اُتار کر کار میں پھینک دی۔ اب اُس کے جسم پر بلاؤز اور پیٹی کوٹ تھا۔ پسینے میں بھیگا ہوا بلاؤز بدن سے چپکا ہوا تھا۔ میں نے بھی ٹی شرٹ اُتار کر کار میں ڈال دی۔

کار اسٹارٹ کر کے میں اُسے آہستہ آہستہ آگے بڑھانے لگا۔ اُس چٹان تک پہنچنے میں تقریباً ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ سورج سر پر چمک رہا تھا۔ دماغ پلپلے ہو رہے تھے۔ آسمان سے جیسے آگ

برس رہی تھی اور ریت بھی انگاروں کی طرح تپ رہی تھی۔ کار میں رکھا ہوا پانی کا مشکیزہ ہمارے بہت کام آیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کار میں بابو راؤ نے پانی کا یہ مشکیزہ نہ رکھا ہوتا تو ہم پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اب تک ختم ہو چکے ہوتے۔ اس مشکیزے میں بھی اب صرف چند گھونٹ پانی رہ گیا تھا۔ سیتا نے ایک گھونٹ بھر کر مشکیزہ میری طرف ڈال دیا اور نڈھال سی ہو کر سیٹ پر ڈھیر ہو گئی۔

وہ چٹان تقریباً دو سو گز دُور تھی۔ کار کے پہیے ایک بار پھر ریت میں دھنس گئے..... میں نے انجن بند کر دیا اور دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا۔

''اس چٹان پر شاید سائے کی کوئی جگہ مل جائے۔ نیچے اُتر آؤ! ہم کار کو یہیں چھوڑ دیں گے۔'' میں نے کہتے ہوئے سیتا کی طرف والا دروازہ کھول دیا۔

''میں نہیں اُٹھ سکتی..... ایک قدم بھی نہیں چل سکوں گی۔'' سیتا کراہی۔

''ہمت سے کام لو سیتا! صرف چند گز کا فاصلہ ہے۔ وہاں ہمیں یقیناً کوئی سایہ دار جگہ مل جائے گی۔'' میں نے کہتے ہوئے اُسے سہارا دے کر نیچے اُتار لیا۔ سیتا نے دوسرے ہاتھ میں پانی کا مشکیزہ بھی اُٹھا لیا تھا۔ اُس نے سارا بوجھ میرے اُوپر ڈال رکھا تھا اور میں اُسے تقریباً گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔

ہم بمشکل پچاس گز کا فاصلہ طے کر پائے تھے۔ میں نے سیتا کو چھوڑ دیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح لہرا کر نیچے گر گئی..... میں نے متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اُوپر کی طرف نظریں اُٹھتے ہی میں کانپ گیا..... آسمان پر بہت بلندی پر دو گدھ فضا میں چکر کاٹ رہے تھے۔ میں اس مردار خور پرندے کی فطرت سے واقف تھا۔ یہ شکار کو تاڑ لیتا ہے اور اُس کے مرنے کے انتظار میں منڈلاتا رہتا ہے۔

''سیتا.....!'' میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آسمان پر گدھ منڈلانے لگے ہیں۔ انہیں شاید ہمارے مرنے کا انتظار ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ وہ ہمارے مرنے کا انتظار کئے بغیر ہم پر حملہ کر دیں۔ ہمیں ان سے بچنے کے لئے جلد سے جلد اُس چٹان تک پہنچ جانا چاہئے۔'' میں سیتا کو بمشکل گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ اس دوران میں نے ایک بار پھر اُوپر دیکھا۔ گدھوں کی تعداد اب چار ہو گئی تھی اور وہ فضا میں چکر کاٹتے ہوئے نیچے آ رہے تھے.....

تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیتا پھر گر گئی۔ میں نے ایک بار پھر اُوپر دیکھا، گدھوں کی تعداد پانچ ہو گئی تھی..... میں سیتا کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا رہا۔ پہاڑی تقریباً پچاس گز دُور رہ گئی تھی۔ سیتا ایک بار پھر گر گئی۔ میری اپنی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ دماغ جیسے پگھلا جا رہا تھا اور پنڈا جیسے تیز دُھوپ میں جھلسا جا رہا تھا۔

پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن کر میں نے اُوپر دیکھا اور کانپ اُٹھا..... وہ دس بارہ گدھ تھے جو ہمارے سروں سے تیس چالیس فٹ اُوپر فضا میں منڈلا رہے تھے۔ اور پھر ایک گدھ غوطہ لگاتا ہوا

ہم سے پچیس تیس فٹ کے فاصلے پر ریت پر بیٹھ گیا..... وہ چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

''سیتا اُٹھو.....!'' میں چیخا۔ ''یہ گدھ ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔''

''مم..... میں نہیں اُٹھ سکتی۔'' سیتا کراہی۔ ''مم..... مجھے یہیں چھوڑ دو! تم جاؤ..... اپنے آپ کو بچا لو ان گدھوں سے۔''

میں نے اپنے اُوپر منڈلاتے ہوئے ان گدھوں کو دیکھا، جھک کر سیتا کو کندھے پر اُٹھایا اور چٹان کی طرف دوڑ لگا دی۔ پچاس گز کا فاصلہ میرے لئے پچاس میل بن گیا تھا۔ میرے پیر ریت میں دھنس رہے تھے۔ میں بار بار لڑکھڑا رہا تھا لیکن سر پر پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز مجھے مسلسل دوڑتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ بالآخر میں چٹان کے قدموں میں پہنچ گیا اور سیتا کو ایک بہت بڑے پتھر کے قریب زمین پر لٹا دیا اور ایک پتھر اُٹھا کر گدھوں کی طرف دے مارا۔

شکار کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر شاید گدھ مایوس ہو گئے تھے۔ وہ بتدریج بلندی کی طرف پرواز کرتے ہوئے فضا میں بکھرتے چلے گئے۔ میں بھی سیتا کے قریب زمین پر گر گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پانی کا مشکیزہ اب بھی سیتا کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے مشکیزہ لیا۔ پانی کے ایک دو گھونٹ سیتا کے حلق میں ٹپکائے، ایک گھونٹ خود پیا اور اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

چند منٹ بعد میں اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور بالآخر پہاڑی پر چڑھنے کا ایک راستہ نظر آ گیا۔ میں نے سیتا کی طرف دیکھا جس کے پسینے میں تر عریاں جسم پر چپکی ہوئی ریت چمک رہی تھی۔ اُس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھا دیا۔

''مجھے چھوڑ دو شمروز..... میں نہیں چل سکوں گی۔'' وہ کراہی۔

میں نے پانی کا مشکیزہ اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اُسے ایک گھونٹ پانی پلانے کے بعد میں نے مشکیزہ کندھے پر لٹکا لیا اور سیتا کو تقریباً گھسیٹتا ہوا چٹان پر چڑھنے لگا۔ تقریباً سو فٹ اُوپر دائیں طرف چٹان کا ایک بہت بڑا پتھر سائبان کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔ اُس تک پہنچنے کا راستہ بہت تنگ اور مخدوش تھا۔ لیکن صرف وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں چلچلاتی ہوئی دُھوپ سے کچھ دیر کے لئے نجات مل سکتی تھی۔

میں نے سیتا کو کندھے پر لاد لیا اور آہستہ آہستہ اُس تنگ سے راستے پر چڑھنے لگا۔ وہ راستہ تین فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف گہرا کھڈ۔ میرے قدموں کی معمولی سی لغزش ہم دونوں کو موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ میں بہت احتیاط سے قدم اُٹھاتا ہوا سائبان نما پتھر کے نیچے پہنچ گیا۔ وہاں کافی کشادہ جگہ تھی۔ میں نے سیتا کو نیچے لٹا دیا اور خود بھی گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ گرم ہوا کے تھپیڑے ہمارے چہروں سے ٹکرا

رہے تھے مگر سائبان کا سایہ غنیمت تھا۔ حواس پر قابو پانے کے بعد میں صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔ یہ جگہ تقریباً آٹھ فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی تھی۔ پیچھے چٹان تھی اور آگے عمودی ڈھلان جو تقریباً اسّی فٹ تک چلی گئی تھی۔ دُور کھڑی ہوئی کار کسی کھلونے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس سے آگے تا حد نگاہ ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ تیز دُھوپ میں صحرا میں آگ کے الاؤ سے دہکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں مُڑ کر سیتا کی طرف دیکھنے لگا جو نڈھال سی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے ایک گھونٹ اور پانی پلایا۔ اپنے ہونٹ بھی تر کیے اور سیتا کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

"میں تمہیں ایک بہادر لڑکی سمجھتا تھا لیکن تم تو......" میں خاموش ہو کر اُس کے بالوں سے ریت جھاڑنے لگا۔

سیتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے چہرے پر مردنی سی تھی اور آنکھوں سے ویرانی جھانک رہی تھی۔ وہ پلک جھپکے بغیر میری طرف دیکھتی رہی۔ میری نظریں اُس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی بلاؤز پر ٹک گئیں...... سیاہ بلاؤز سے جھانکتی ہوئی گھاٹیاں بڑا دلفریب منظر پیش کر رہی تھیں۔

سیتا نے دونوں ہاتھ میری گردن میں حمائل کر دیئے۔ اُس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی تھی اور ہونٹوں پر بڑی خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ میرا چہرہ آہستہ آہستہ نیچے جھکنے لگا اور پھر دونوں کے تپتے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے سے مل گئے...... سیتا میرے ساتھ لپٹی جا رہی تھی جیسے مجھے اپنے اندر سما لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور پھر میں بھی اپنے حواس کھو بیٹھا......!

ہمیں اس سائبان کے نیچے لیٹے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ میں ایک بار پھر اُٹھ کر سامنے دیکھنے لگا۔ "ہمیں اس چٹان کے اُوپر چڑھ کر دیکھنا چاہیے۔ ممکن ہے دوسری طرف کسی بستی یا راستے کے آثار نظر آ جائیں۔" میں نے کہا۔

سیتا لباس درست کرتی ہوئی اُٹھ گئی۔ ہم دونوں سائبان سے نکل کر اُس راستے پر چلنے لگے جس سے یہاں تک پہنچے تھے۔ میں آگے تھا اور ایک ہاتھ سے چٹانی دیوار کا سہارا لے رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے سیتا کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ ابھی ہم نے تقریباً پندرہ فٹ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سیتا کے پیر کے نیچے سے ایک پتھر نے جگہ چھوڑ دی۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ سنبھلنے کی کوشش میں اُس نے مجھے بھی اپنی طرف کھینچ لیا...... میرا پیر بھی پھسل گیا اور دوسرے ہی لمحہ ہم دونوں بڑی تیزی سے اسّی فٹ گہری اُس عمودی ڈھلان پر قلابازیاں کھا رہے تھے...... میرا سر کسی پتھر سے ٹکرایا...... آنکھوں کے سامنے ایک لمحہ کو نیلی پیلی سی چنگاریاں چمکیں اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا......!!

○○○

آنکھ کھلی تو میرے دماغ پر غنودگی سی طاری تھی۔ گرمی کی شدت اور جسم کے مختلف حصوں سے اُٹھنے والی درد کی لہروں کے سوا کوئی احساس نہیں تھا۔ میں بے حس و حرکت لیٹا بے مقصد نگاہوں سے سامنے گھور رہا تھا۔ میری نگاہوں کا کوئی مرکز نہیں تھا۔ کوئی چیز واضح نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دُھند نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو۔ ملی جلی آوازوں کی بھنبھناہٹ میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ آوازیں کسی کنویں کی گہرائی سے آ رہی ہوں۔ ایک مترنم سی آواز ان تمام آوازوں پر غالب آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اپنی تمام تر توجہ اُس آواز پر مرکوز کر دی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز واضح ہوتی چلی گئی......

"اب تم ہوش میں آ رہے ہو...... چند سیکنڈ اسی طرح بے حرکت لیٹے رہو! میں تمہارے خون کا نمونہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

اسی لمحہ مجھے اپنے دائیں بازو پر نازک سی اُنگلیوں کے لمس کا احساس ہوا۔ میں ابھی اُنگلیوں کے اُس لمس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ منہ سے بے اختیار سسکاری سی نکل گئی۔ بازو میں پیوست ہونے والی سوئی کی چبھن خاصی تکلیف دہ تھی۔

"بس چند سیکنڈ! تمہیں زیادہ تکلیف نہیں ہو گی۔ ٹیسٹ کے لئے خون کے چند ہی قطرے کافی ہوں گے۔" وہ نرم نسوانی آواز اس مرتبہ میرے کان کے بہت قریب سے اُبھری تھی۔

سوئی بازو سے نکل گئی۔ اب درد کا ہلکا سا احساس باقی رہ گیا تھا۔ لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ خون کے چند قطرے نکلنے سے میرے سر کا درد ہلکا ہو گیا تھا اور میں بڑی حد تک بہتری محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے سر کو دائیں طرف گھمایا۔

درمیانے قد کی ایک دُبلی پتلی سی عورت میرے سامنے کھڑی تھی۔ آنکھوں پر نازک سی اسٹیل فریم کی عینک، کانوں میں ننھے سے ٹاپس، ناک میں چھوٹی سی نتھنی جس میں بہت ننھا سا نگینہ جگمگا رہا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور کمر تک جھولتے ہوئے سیاہ بال۔ اُس نے گلابی رنگ کی سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی...... مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس کے اس طرح مسکرانے سے چہرے پر باریک سی لکیریں اُبھر آئیں جس سے وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی نظر آنے لگی تھی۔ لیکن چہرے پر نمودار ہونے والی یہ باریک سی لکیریں بھی اُس کے حسن کو متاثر نہ کر سکیں۔ گردن گھمانے سے میرے سر کے پچھلے حصے میں ایک بار پھر درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اُٹھنے لگیں لیکن میں اُس حسین چہرے کو دیکھتا رہا۔

''کیا تم ڈاکٹر ہو.....؟'' میں نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں.....'' اُس کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ ''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا لیکن اُس وقت تم پر نیم مدہوشی طاری تھی۔ میں تمہاری طرف سے بہت فکر مند رہی ہوں۔ تم جب سے یہاں آئے ہو تھوڑی دیر کو ہوش میں آنے کے بعد پھر بے ہوش ہو جاتے ہو۔ بہر حال! اب میں تمہاری حالت سے قدرے مطمئن ہوں۔''

''جب سے یہاں آیا ہوں.....!'' میں بڑبڑایا۔ میری آنکھیں بھینچ گئیں۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں کب، کیوں اور کیسے آیا تھا..... اور مجھے کیا ہوا تھا؟ ذہن پر زور دینے سے سر کا درد شدت اختیار کرنے لگا۔ دماغ میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ میں نے بے بسی سے سر جھٹک دیا۔

''پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں..... فی الحال دماغ پر بوجھ مت ڈالو! یہ کیفیت وقتی ہے۔ ویسے تم لوگ خوش قسمت ہو کہ جب یہ حادثہ پیش آیا تو اُس کے کچھ دیر بعد ایک شتر سوار اُس طرف سے گزرا جس نے تم لوگوں کو دیکھ لیا۔ جلتے ہوئے اُس صحرا میں بیسیوں میل تک ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں کسی قسم کی طبّی امداد مہیا ہو سکے۔ چندن میں ہمارا یہ ہسپتال اگرچہ بہت چھوٹا ہے لیکن میں کوشش کرتی ہوں کہ یہاں مریضوں کو ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہوں۔ میں یہاں کی واحد ڈاکٹر ہوں۔ گھبراؤ نہیں..... میں تمہاری مناسب دیکھ بھال کروں گی۔ سر میں درد کی تکلیف بھی جلد ہی دُور ہو جائے گی۔ رضیہ کے بارے میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ بس معمولی سی چوٹیں آئی ہیں۔''

''رضیہ..... یہ کون ہے؟ اور یہ کون سی جگہ ہے؟'' میں نے وحشت زدہ سی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تمہاری دوست رضیہ..... جس کے ساتھ تم سفر کر رہے تھے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''تمہاری گاڑی شاید خراب ہو گئی تھی اور تم دونوں صحرا میں بھٹکتے ہوئے اُس چٹان تک پہنچ گئے تھے جہاں تم دونوں کو یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ شتر سوار تم دونوں کے لئے فرشتہ ثابت ہوا تھا۔ وہ سفر کے دوران کچھ دیر ستانے کے لئے چٹان کے سائے میں رُکا تھا۔ اُس نے تم دونوں کو وہاں بے ہوش پڑے ہوئے دیکھ لیا اور اُونٹ پر لاد کر یہاں چھوڑ گیا۔ کیا تمہیں یاد نہیں؟''

''صحرا میں سفر..... حادثہ.....'' مجھے اپنے پیٹ میں گرہیں سی پڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

''نہیں ڈاکٹر! مجھے کچھ یاد نہیں..... مجھے تو اپنا نام تک یاد نہیں ہے۔''

''تمہارا نام وحید الدین ہے۔'' رضیہ نے بتایا تھا۔'' ڈاکٹر آگے جھک کر میرے سر اور اندھے پر بندھی ہوئی پٹیوں کا جائزہ لینے لگی۔

بڑی شدت کی گرمی تھی۔ ہر چیز دہک رہی تھی۔ یہ لمبا چوڑا کمرہ تندور کی طرح تپ رہا تھا۔ میرے سر میں ایک بار پھر درد کی شدید لہریں اُٹھنے لگیں۔ میرے دانت خود بخود بھنچ گئے اور میں

نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے کندھے اور سر کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے پٹیاں دوبارہ باندھ دیں اور میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''اب تم آرام کرو..... ذہن پر بوجھ مت ڈالو! اس وقت کچھ دیر کی نیند تمہارے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔''

''لیکن میں کہاں ہوں..... یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا میری یادداشت.....'' کسی نامعلوم خوف کے تحت میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

''تم چندن میں ہو..... یہ چھوٹا سا قصبہ جیسلمیر شہر سے چالیس میل کی دُوری پر واقع ہے۔ آس پاس میلوں دُور تک کوئی آبادی نہیں۔ تمہارا نام وحید الدین ہے۔ اب تم آرام کرو!'' ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور نجانے اُن نگاہوں میں کیا سحر تھا کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں.....!

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو ماحول نیم تاریک تھا..... وارڈ کے آخری سرے پر چھت سے لٹکا ہوا مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اُس بلب کی بیمار سی روشنی اتنے بڑے کمرے کی تاریکی دُور کرنے کے لئے قطعی ناکافی تھی۔ میں ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہوئے یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کون ہوں اور راجستھان کے دُور دراز قصبے چندن کے اس ہسپتال میں کس طرح پہنچا؟ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ صحرا میں سفر کے دوران ہماری کار خراب ہو گئی تھی اور ہم بھٹکتے ہوئے اس چٹان تک پہنچ گئے تھے جہاں سے گر کر ہم دونوں زخمی ہو گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ رضیہ کون تھی اور میں اُس کے ساتھ صحرا میں کہاں جا رہا تھا؟ اگر میرے ساتھ رضیہ نام کی کوئی عورت تھی تو وہ اب کہاں ہے؟''

میرے دماغ پر دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ تیز سنسناہٹ کے بعد سر میں ایک بار پھر درد ہونے لگا اور میں سر جھٹک کر رہ گیا۔ میں جو کچھ بھی تھا مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میری یادداشت کھو چکی تھی.....!!

میرے دماغ میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ سر کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ اور پھر سسکیوں کی آواز سُن کر میں اپنا سر درد بھول گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ آواز اُس سکرین کے دوسری طرف سے اُبھر رہی تھی جو میرے اور ساتھ والے بیڈ کے درمیان ایستادہ تھی۔ میں اُس بیڈ سے اُٹھ کر سکرین کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ بستر پر بیٹھی ہوئی ایک جوان عورت گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی۔

''کیا ہوا..... تمہیں کوئی تکلیف ہے کیا؟'' میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ اُس عورت نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ سیتا تھی جو چند لمحے حسرت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بیڈ سے اُٹھ کر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

''یہ کیا ہو گیا شمروز..... یہ سب کیا ہے؟ تمہاری یادداشت کیوں کھو گئی..... تمہیں کچھ یاد

کیوں نہیں آتا؟ مجھے بڑا خوف لگ رہا ہے۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ ہم کون ہیں تو یہ لوگ ہمیں فوراً پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اور جانتے ہو پھر کیا ہوگا؟''

''تم کون ہو.....؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں..... میں سیتا ہوں..... مجھے پہچانو شمروز!'' اُس نے جواب دیا۔ ''اب بھی وقت ہے..... اپنے ذہن پر زور دو اور یاد کرنے کی کوشش کرو! میں نے ریگستان کے سفر کے بارے میں انہیں ایک فرضی کہانی سنائی تھی۔ اُنہوں نے تمہارے شریر کے زخم دیکھنے کے لئے تمہارے کپڑے اُتار دیئے تھے اور سمجھ گئے تھے کہ تم مسلمان ہو۔ میں نے اُنہیں تمہارا اور اپنا وہی نام بتا دیا جو بابوراؤ نے ہمیں بتائے تھے۔ یعنی تم وحید الدین ہو اور میں تمہاری دوست رضیہ۔ میں اُن لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو بہت سادہ لوح، بیوقوف اور ڈرپوک ظاہر کر رہی ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہماری اصلیت زیادہ عرصے تک چھپی نہیں رہ سکے گی اور.....''

ڈاکٹر رادھا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اے مسٹر وحید! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ڈاکٹر رادھا قریب آ کر بولی۔

''اس عورت کے رونے کی آواز سن کر میں یہاں آ گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''پہچانو اسے..... یہ رضیہ ہے۔ تمہاری دوست۔'' ڈاکٹر رادھا بولی۔

''نہیں..... میں اسے نہیں جانتا۔'' میں نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے..... اب تم اپنے بیڈ پر جاؤ! میں صبح بشیر سے بات کروں گی۔ شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔''

''بشیر کون؟''

''اسی قصبے کا رہنے والا ہے۔ مسلمان ہے..... اُس سے مل کر تمہیں یقیناً بہت خوشی ہوگی۔'' ڈاکٹر رادھا نے کہا۔

اسی وقت درمیانے قد کا ایک آدمی کھانے کی ٹرے اُٹھائے میرے بیڈ کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے تنگ سی پتلون اور ڈھیلی سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر دھاری دار کپڑے کی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ اُس نے ٹرے میرے بیڈ پر رکھ دی جس کے ایک پیالے میں گدلا سا شوربا اور تام چینی کی پلیٹ میں دو چپاتیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''یہ میرا اسسٹنٹ جگت سنگھ ہے۔ میری عدم موجودگی میں ہسپتال کی تمام ذمہ داریاں یہی پورا کرتا ہے۔'' ڈاکٹر رادھا نے کہا اور وارڈ کے آخری بیڈ کی طرف دیکھنے لگی جہاں ایک مریضہ کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر رادھا تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اُس کی طرف چلی گئی۔

میں نے بستر پر رکھی ہوئی ٹرے اُٹھا کر سٹول پر رکھ دی اور سامنے دیوار پر نظریں جماتے ہوئے سوچنے لگا کہ میں کون ہوں..... کیا ہوں؟ رضیہ نامی اس عورت کے ساتھ سفر کیوں کر رہا تھا؟ اگر رضیہ میری دوست ہے تو میرے بارے میں سب کچھ بتا کیوں نہیں دیتی؟ لیکن میرے

ذہن میں کوئی بات نہیں آ سکی۔ دماغ کی نسوں میں تناؤ سا پیدا ہونے لگا..... تاریکی کی چادر آنکھوں کے سامنے پھیلنے لگی۔ میں نے سوچنا چھوڑ دیا۔ ٹرے اُٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی اور شوربے میں روٹی بھگو کر کھانے لگا۔

ماحول میں ایک عجیب سی پراسراریت تھی۔ میں اجنبی لوگوں میں گھرا ہوا اپنے آپ سے بھی اجنبی تھا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ ذہن میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ اچانک دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا جیسے کچھ یاد آ رہا ہو..... لیکن پھر ایک دم تاریکی چھا گئی..... کوئی بات ذہن کے تاریک گوشے سے اُبھر کر سامنے آنا چاہتی تھی لیکن ہر مرتبہ دماغ میں سوئیوں کی چبھن سی ہونے لگتی۔ میں نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ میں کبھی بجلی کے کوندے سے لپکنے لگتے اور کبھی تاریکی چھا جاتی۔ پھر نجانے کب میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا.....!!

○

صبح میں بستر پر اپنے اِردگرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ رضیہ ناشتے کی ٹرے لے کر پہنچ گئی۔ اُس کے چہرے پر غم اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اُس نے ٹرے سٹول پر رکھ دی اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''مجھے اس حادثے میں بہت معمولی چوٹیں آئی تھیں..... اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور اگرچہ ہسپتال میں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے مگر ڈاکٹر رادھا نے محض تمہاری وجہ سے مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے اور میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ مریضوں کی دیکھ بھال اور دوسرے کاموں میں اُس کی مدد کرتی رہوں گی۔''

''چلو اچھا ہے..... تمہارا دل لگا رہے گا۔'' میں نے جواب دیا۔ میں جب بھی رضیہ کو دیکھتا میرے دماغ کو جھٹکا سا لگتا لیکن پھر تاریکی چھا جاتی.....

''میں مریضوں کو ناشتہ وغیرہ دے دُوں..... پھر تمہارے پاس آ کر بیٹھوں گی۔'' وہ کہتے ہوئے دوسری طرف چلی گئی۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے ٹرے اپنے سامنے رکھی اور ناشتہ کرنے لگا۔ اسی دوران رضیہ واپس آ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دراز قامت آدمی وارڈ میں داخل ہوا۔ وہ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر پنجے تلے قدم اُٹھاتا ہوا بیڈ کے قریب آ گیا۔ اُس کا جسم صحت مند اور آنکھوں میں تجسس کی چمک تھی۔ بڑی بڑی مونچھیں اُس کی شخصیت کو بڑا پروقار بنا رہی تھیں۔ وہ چند لمحے پُرتجسس نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم وحید الدین ہو؟''

''ہاں..... اور تم؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میرا نام بشیر ہے۔'' اُس شخص نے اپنا تعارف کرایا۔ ''ڈاکٹر رادھا نے بتایا تھا کہ تمہاری

یادداشت کھو چکی ہے۔''

''ہاں..... کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... '' اُس نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی حادثے کے باعث یادداشت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسا وقتی طور پر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی اور معمولی حادثے سے تمہاری یادداشت لوٹ آئے۔''

بشیر کچھ دیر میرے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ رضیہ بھی اس دوران کہیں جا چکی تھی۔ میں بستر پر لیٹا سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ میں اپنے خیالات سے چونکا تو اُس وقت جب ایک اور آدمی میرے بیڈ کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ چھوٹے قد کا گول مٹول سا آدمی تھا جس نے سفید دھوتی اور کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ ہندو تھا۔ مٹکے کی طرح پھولا ہوا پیٹ عجیب سا تاثر پیش کر رہا تھا۔

''میرا نام رائے ہے۔'' اُس نے رُومال سے پیشانی اور گردن پر بہنے والا پسینہ پونچھتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں ڈیزرٹ آفیسر ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو۔ اس ریگستان میں سفر کرنے والوں کی دیکھ بھال کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں..... بتاؤ! اب تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے یا نہیں؟''

میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ ویسے یہ شخص مجھے ذرا بھی پسند نہیں آیا تھا اور میری خواہش تھی کہ اُوٹ پٹانگ سوالات سے میرا دماغ خراب کرنے کی بجائے جلد سے جلد چلا جائے۔ چند رسمی باتوں کے بعد اُس نے بتایا کہ وہاں سے چند میل دُور سڑک کے کنارے ایک خالی سوٹ کیس کی شناخت کرانا چاہتا تھا کہ وہ میرا ہے یا نہیں؟ یہ جاننے کے بعد کہ میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں اُس کا یہ سوال بڑا ہی احمقانہ تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ ڈاکٹر نے مجھے آرام کا مشورہ دیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے..... میں ڈاکٹر سے مشورہ کر لیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دے گی۔'' رائے کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ گیا اور میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اطلاع دی کہ ڈاکٹر رادھا نے اُسے کل مجھے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی ہے۔

''مجھے افسوس ہے..... میں کل بھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔ تم اگر کوئی سوٹ کیس شناخت کرانا چاہتے ہو تو اُسے یہاں کیوں نہیں لے آتے؟'' میں نے جواب دیا۔ نجانے کیا بات تھی کہ اُس اجنبی کی نظریں مجھے اپنے جسم پر سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''سوٹ کیس یہاں لانا درست نہیں ہوگا۔ میں پرسوں آؤں گا یا پھر اُس سے اگلے دن میں تمہارے صحت یاب ہونے کا انتظار کر سکتا ہوں..... میں پھر آؤں گا۔'' وہ شخص کہتا ہوا

دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ رائے چلا گیا لیکن میرے لئے کچھ اور اُلجھنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ میں اُس کی موجودگی میں عجیب سی بے چینی محسوس کرتا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وارڈ سے نکل کر ہسپتال کے صحن میں آ گیا۔ سورج اگرچہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا مگر اُس کی حدت برقرار تھی۔ ہسپتال کی شکستہ باؤنڈری وال کے دوسری طرف ایک جوہڑ نظر آ رہا تھا جس کے گندے پانی میں مویشی اور ننگ دھڑنگ بچے نہا رہے تھے۔ کنارے پر ایک طرف چند ہندو عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں اور اُن کے قریب ہی تین چار خارش زدہ کتے پانی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

مجھے وہاں کھڑے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر رادھا کا اسسٹنٹ جگت سنگھ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا وہاں پہنچ گیا..... اُس کے ہاتھ خون آلود دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔

''ارے کیا ہوا..... تمہارے ہاتھ سے خون کیوں بہہ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا..... یہ میرا خون نہیں ہے۔'' جگت سنگھ کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

اُسی وقت چار آدمی ایک چارپائی کندھوں پر اُٹھائے ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ چارپائی پر ایک موٹے آدمی کی لاش تھی۔ لاش پر کئی گہرے زخم نظر آ رہے تھے۔ اُسے بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔ وہ لوگ لاش کو کہیں دُور سے اُٹھا کر لائے تھے۔ سانس لینے کے لئے اُنہوں نے چارپائی برآمدے میں رکھ دی۔

میں بھی قریب آ گیا اور لاش کا چہرہ دیکھتے ہی بری طرح بدحواس ہو گیا۔ وہ مسٹر رائے کی لاش تھی جو ڈیزرٹ آفیسر کی حیثیت سے مجھ سے ملا تھا..... ابھی میں لاش کو اچھی طرح دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ ڈاکٹر رادھا بھی وہاں پہنچ گئی۔

''تم اپنے بیڈ پر جاؤ مسٹر وحید! میں کچھ دیر بعد تم سے ملاقات کروں گی۔'' ڈاکٹر رادھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور آدمیوں کو لاش اُٹھانے کا اشارہ کیا۔ میں اپنے بیڈ پر آ گیا اور کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ ہسپتال کے برآمدے میں اب قصبے کے بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ رضیہ بھی تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ وہ بھی بدحواس اور کسی قدر خوفزدہ سی نظر آ رہی تھی۔

''تمہارے لئے ایک بری خبر ہے.....'' اُس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''ڈاکٹر رادھا کہہ رہی ہے کہ اب تمہیں ہسپتال سے چھٹی دے دی جائے گی۔''

''کیوں..... اُس نے اچانک یہ فیصلہ کر لیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ یہ خیال ہی وحشت انگیز تھا کہ مجھے ہسپتال سے چھٹی دی جانے والی ہے۔ نئی جگہ..... اجنبی لوگ... اپنے آپ سے اجنبی..... میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

''رائے مر چکا ہے..... اور لوگوں کا خیال ہے کہ مرنے سے پہلے وہ جس آخری انسان سے ملا وہ تم ہو۔'' رضیہ نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

''میری ملاقات کا اُس کی موت سے کیا تعلق؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔ بس وہ لوگ کہتے ہیں کہ تم آخری شخص ہو جس سے رائے ملا تھا..... میں جا رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد آؤں گی۔'' وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا..... یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ مجھ سے ملاقات کے بعد رائے اگر مر گیا تھا یا کسی نے اُسے قتل کر دیا تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟ میں اپنی اس اُلجھن پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ڈاکٹر رادھا کا انتظار کرنے لگا اور ڈاکٹر رادھا تقریباً آدھے گھنٹے بعد آئی تھی۔

''کیا یہ درست ہے کہ مجھے یہاں سے ڈسچارج کیا جا رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں مسٹر وحید..... ہمیں دوسرے مریض کے لئے بیڈ کی ضرورت ہے اور تمہیں اب کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہے صرف یادداشت کھوئی ہے اور اس کے علاج کے لئے ضروری نہیں کہ ہسپتال میں رہا جائے۔ تمہیں ہسپتال چھوڑنے پر مجبور کرتے ہوئے مجھے افسوس ہو رہا ہے لیکن میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ اگر تم چاہو تو قصبے کے گیسٹ ہاؤس میں تمہارا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ بشیر بھی وہیں رہتا ہے۔''

''گیسٹ ہاؤس میں.....؟'' میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''میرے خیال میں مجھے ہسپتال سے نکالنے کی وجہ وہ نہیں جو تم نے بتائی ہے۔ رضیہ سے معلوم ہوا ہے کہ قصبے کے لوگ مجھ پر کسی قسم کا شبہ کر رہے ہیں۔ ڈیزرٹ آفیسر رائے اپنی موت سے کچھ دیر پہلے مجھ سے مل کر گیا تھا اور اُس کی موت کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جا رہا ہے..... گویا میں کسی شیطانی قوت کے زیر اثر ہوں۔''

''نہیں..... یہ بات نہیں مسٹر وحید۔ ہمیں واقعی دوسرے مریض کے لئے بیڈ کی ضرورت ہے۔ رضیہ بھی اب تمہارے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں رہے گی۔'' ڈاکٹر رادھا نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''رائے کی موت کیسے واقع ہوئی تھی..... اُسے قتل کیا گیا تھا یا کوئی حادثہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اُس کی موت کی وجہ کوئی نہیں جانتا۔ اُس کی لاش بستی سے تقریباً ایک میل دُور ریگستان میں اُس کی جیپ کے قریب پڑی پائی گئی تھی جس پر زخموں کے لاتعداد نشان تھے اور زبان بھی کٹی ہوئی تھی۔ آس پاس اُس کی جیپ کے پہیوں کے علاوہ اور کسی قسم کے نشان نہیں ملے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہو کہ اُسے کسی نے قتل کیا ہوگا۔ اس وجہ سے اُس کی موت کو پُراسرار قرار دیا جا رہا ہے اور.....''

''اور اس کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جا رہا ہے۔ کیونکہ آخری مرتبہ وہ مجھ سے مل کر گیا تھا۔'' میں نے اُس کا جملہ مکمل کر دیا۔

ڈاکٹر رادھا نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ چند لمحوں بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں کچھ دیر بعد کسی کو تمہارے پاس بھیج دُوں گی جو تمہیں گیسٹ ہاؤس پہنچا دے گا۔'' یہ کہنے کے ساتھ ہی ڈاکٹر رادھا وہاں سے چلی گئی۔

ڈاکٹر رادھا کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر اُلجھن میں مبتلا ہو گیا۔ بشیر مجھے ہندوؤں کی توہم پرستی کے بارے میں تھوڑا بہت بتا چکا تھا اور میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ قصبے کے لوگ مجھے کسی پراسرار شیطانی قوت کے زیر اثر سمجھ رہے تھے اور ظاہر ہے وہ یہاں میری موجودگی کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن میں یہ قصبہ اُس وقت تک نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک میری یادداشت نہ لوٹ آئے۔ اس کے لئے یادداشت کا بحال ہونا بہت ضروری تھا۔ آخر میں کون ہوں..... کہاں سے آیا ہوں اور یہاں کس طرح پہنچا؟ رضیہ سے میرا کیا تعلق ہے؟ اُس نے مجھے ایک عجیب کہانی سنائی تھی۔ مجھے شمروز کے نام سے مخاطب کیا تھا اور اپنا نام بھی سیتا بتایا تھا اور اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ اگر قصبے کے لوگوں پر ہماری اصلیت کھل گئی تو وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ ہماری اصلیت کیا ہے؟ کیا ہم کوئی سنگین جرم کر کے بھاگے ہوئے ہیں؟ سیتا..... اچھا نام تھا..... سیتا..... دماغ پر زور ڈالنے سے میرا سر دُکھنے لگا اور میں کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

یہ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک لمبی سڑک اور اُسے کراس کرتی ہوئی چند گلیاں جن میں جا بجا کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔ قصبے کے عین وسط میں ایک مندر، اُس سے متصل پرائمری سکول اور چند دُکانیں تھیں۔ یہاں ان دیہاتیوں کی ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ بیشتر مکان کچے تھے البتہ چند پیلی اینٹوں کے کچھ پختہ مکان بھی نظر آ رہے تھے۔ قصبے کے آخری سرے پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ کمپیری کی بنا پر مسجد کی حالت خاصی ابتر تھی۔ مینار ٹوٹ چکے تھے۔ پیلی اینٹوں کی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ صحن میں خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ چار دیواری کی اینٹیں لوگ اپنے گھروں کی تعمیر میں استعمال کر چکے تھے۔ اینٹوں کی بجائے اب وہاں بانس کے پودوں کی چار دیواری تھی۔ مسجد کے محرابی دروازے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ برآمدے پر کھپریل کی چھت تھی۔ مسجد سے ملحق وہ چھوٹی سی عمارت تھی جسے گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ دونوں عمارتوں کا برآمدہ ایک ہی تھا۔ بعض اوقات مسجد کو بھی مہمان خانے کے طور پر استعمال کر لیا جاتا تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مسجد ہی دراصل قصبے کا گیسٹ ہاؤس تھی۔ وہ حصہ جو بشیر کے استعمال میں تھا کسی زمانے میں مسجد کے پیش امام کا حجرہ رہا ہوگا۔ یہ حصہ صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔

میں جب سیتا کے ساتھ وہاں پہنچا تو بشیر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا۔ کمرے میں پرانے طرز کی ایک مسہری بچھی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔ اندرونی حصہ میں اس سے ملحق ایک اور چھوٹا سا کمرہ تھا جسے بیک وقت

کچن اور غسل خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ چھوٹا کمرہ بھی اتنا کشادہ تھا کہ بوقت ضرورت اُس میں ایک چارپائی بھی بچھائی جاسکتی تھی۔ بڑے کمرے کی ایک کھڑکی سے دُھوپ کی کرنیں کمرے کے وسط میں پہنچ رہی تھیں۔ رائٹنگ ٹیبل پر ایک پرانے سے ٹائپ رائیٹر کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

''تم لوگوں کے یہاں آنے سے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ رہائش کے لئے تم لوگ یہ کمرہ استعمال کر سکتے ہو۔ میں مسجد میں سو جایا کروں گا۔ تم لوگ آرام کرو! میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔'' بشیر نے خاموش ہو کر کچھ دیر سیتا کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔

میں عجیب سی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ بشیر کے جاتے ہی سیتا تو کمرے کی چیزوں کا معائنہ کرنے لگی اور میں بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ میں اس وقت عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اس چھوٹے سے قصبے کی تمام آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ بشیر واحد مسلمان تھا۔ وہ تقریباً پینتیس سال کی عمر کا ایک وجیہہ اور خوبرو آدمی تھا۔ مسلمان ہونے کے ناطے اگرچہ ہمیں اُس سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن رضیہ (سیتا) کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں اُبھرنے والی چمک نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

دفعتہً میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا..... ذہن پر گہری تاریکی کی بجائے دُھندسی محسوس ہو رہی تھی۔ اس دُھند میں کچھ ہیولے سے اُبھر رہے تھے۔ اور پھر اپنے بازو پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے میں اُچھل پڑا..... وہ سیتا تھی۔

''اوہ..... کیا بات ہے؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''باہر ایک آدمی تم سے ملنا چاہتا ہے۔ اُس کا تعلق پولیس سے ہے۔'' سیتا نے کہا۔ اُس کے لہجے میں ہلکے سے خوف کی جھلک تھی۔

''پولیس.....؟'' میں چونک گیا۔ پھر اُٹھ کر باہر آ گیا۔ سیتا بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ لیکن دروازے سے نکلتے ہی وہ دوسری طرف مُڑ گئی۔ مسجد کے سامنے ایک جیپ کھڑی تھی۔ ایک دراز قامت آدمی جیپ سے ٹیک لگائے کھڑا اس طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے جسم پر آدھے آستین کی سرمئی رنگ کی شرٹ اور خاکی نیکر تھی۔ سر پر انڈین پولیس کے بیج والی ٹوپی تھی۔

''میرا نام گوپال سنگھ ہے اور میں پولیس کیپٹن ہوں۔'' اُس شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہارے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن چند ضروری باتیں پوچھنا تھیں جس کے لئے تمہیں زحمت دے رہا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ ہم کمرے میں بیٹھ کر بات کریں۔'' اُس نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور میرے ساتھ چل پڑا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کچھ بتا سکوں گا۔ تم بھی جانتے ہو کہ ایک حادثے کے بعد میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں اس حادثے کے بارے میں نہیں، رائے نامی اُس شخص کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں جو آج صبح تم سے ملا تھا۔ اور تم سے ملاقات کے تھوڑی ہی دیر بعد اُسے ریگستان میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔'' گوپال سنگھ نے کہا۔

''لل..... لیکن میں اُسے بالکل نہیں جانتا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے ہسپتال آیا تھا اور کسی سوٹ کیس کی شناخت کے سلسلے میں مجھے ڈیزرٹ آفس لے جانا چاہتا تھا۔'' میں نے رُک رُک کر جواب دیا۔ کسی انجانے خوف کی لہر میرے پورے جسم میں سرائیت کر گئی تھی۔

''تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہاں ڈیزرٹ نام کا کوئی محکمہ نہیں ہے..... اس لئے کسی ڈیزرٹ آفس یا ڈیزرٹ آفیسر کا بھی کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔'' کیپٹن گوپال سنگھ نے کہا۔ ''میں نے تمہاری دوست رضیہ سے بھی کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے یا تمہارے بارے میں اُس وقت تک کچھ بتانے کو تیار نہیں جب تک تمہاری یادداشت لوٹ نہیں آتی۔ میں اسے زبان کھولنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ رائے سے تمہاری کیا بات چیت ہوئی تھی؟''

میں میز کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں چند لمحے اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اُسے بتانے لگا کہ رائے نامی اُس شخص سے میری کیا گفتگو ہوئی تھی؟ میں نے یہ بھی بتایا کہ رائے نے دوبارہ آنے کے لئے کہا تھا۔ کیپٹن گوپال میری بتائی ہوئی باتیں ڈائری پر نوٹ کرتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر اُس نے ڈائری جیب میں ڈال لی۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ضرور.....'' گوپال سنگھ مسکرا دیا۔ ''اُس کا اصل نام بہاری لال تھا۔ عام طور پر اُسے مسٹر رائے کہا جاتا تھا۔ اُس کا کسی محکمے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُس کی جیب کا رجسٹریشن نمبر بھی جعلی ہے۔ وہ دراصل منشیات کا اسمگلر تھا۔ اُس کی مجرمانہ سرگرمیاں خاصی وسیع تھیں۔ وہ قتل کے ایک کیس میں بھی بمبئی پولیس کو مطلوب تھا لیکن اچانک غائب ہو گیا۔ اُس کا بمبئی سے یہاں آنا اور تم سے ملنے کا مطلب ہے کہ تمہاری ہستی اُس کے لئے بہت اہم تھی۔ وہ اب مر چکا ہے اور تمہیں کچھ یاد نہیں۔ لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم اُس کے لئے اتنے اہم کیوں تھے؟''

''میں کچھ نہیں جانتا..... میں کیا بتا سکتا ہوں؟'' میرے لہجے میں بے بسی تھی۔

''پلیز..... کچھ یاد کرنے کی کوشش کرو! میں نہیں چاہتا کہ تمہاری لاش بھی مسٹر رائے کی طرح ریگستان میں پڑی ہوئی ملے۔'' کیپٹن گوپال سنگھ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں کانپ اُٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا بشیر کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے کیپٹن گوپال سنگھ سے جس طرح ہاتھ ملایا اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح

جانتے تھے۔

''ہیلو سنگھ..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' بشیر نے اُسے گھورا۔

''میں تمہارے اس مہمان سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بقول اس کے اسے کچھ یاد نہیں۔'' کیپٹن گوپال سنگھ نے جواب دیا۔

''یہ درست ہے..... اس کی یادداشت کھو چکی ہے۔'' بشیر نے کہا۔

''بہر حال..... میں پھر آؤں گا۔ اور مسٹر وحید! بہتر ہوگا کہ تم جلد سے جلد اپنی یادداشت واپس لانے کی کوشش کرو۔'' گوپال سنگھ نے کہتے ہوئے اس انداز سے میری طرف دیکھا جیسے اُسے شبہ ہو کہ میں یادداشت کھو جانے کا ڈھونگ رچا رہا ہوں۔

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سیتا کھانے کی ٹرے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ باتوں میں احساس ہی نہیں رہا تھا کہ شام ہو چکی ہے۔ کیپٹن گوپال عجیب سی نظروں سے سیتا کو دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ سیتا نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور ہم تینوں کھانا کھانے لگے۔

کھانے کے بعد بشیر ہمیں قصبے کی سیر کو لے جانا چاہتا تھا لیکن سیتا، ڈاکٹر رادھا کی مدد کا بہانہ کر کے ہسپتال چلی گئی۔ بشیر نے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا مجھے دے دیا اور خود باہر نکل گیا۔ ہم دونوں کا قد و قامت تقریباً ایک ہی تھا اس لئے بشیر کے کپڑے مجھے فٹ آ گئے۔ لباس بدلنے کے بعد میں بیڈ پر بیٹھ گیا اور کیپٹن گوپال سنگھ کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اُس نے بتایا تھا کہ رائے نباتات کا اسمگلر ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ نباتات کے ایک اسمگلر کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ را... میرے پاس کیوں آیا تھا؟ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں سر جھٹکتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ بشیر مسجد کے برآمدے میں میرا منتظر تھا۔ ہم دونوں جیسے ہی بانس کے پودوں کی باڑھ سے نکلے، باہر موجود ایک پولیس کانسٹیبل نے ہمیں روک لیا۔

''یہ آدمی باہر نہیں جا سکتا۔'' کانسٹیبل نے میری طرف اشارہ کیا۔

''کیوں.....؟'' بشیر کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ نکلی۔

''کیپٹن گوپال کا حکم ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے۔ میری ڈیوٹی اس لئے یہاں لگائی گئی ہے۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔

''اسے ذرا قصبے تک جانا ہے..... اگر چاہو تو تم بھی ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔'' بشیر نے کہا۔ کانسٹیبل چند لمحے سوچتا رہا، پھر ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور ہم سے دو قدم آگے چلنے لگا۔

ہماری واپسی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ کانسٹیبل تو باہر ہی رُک گیا اور بشیر مسجد والے کمرے میں چلا گیا جہاں اُس نے فرش پر ہی بستر لگا لیا تھا۔ میں تنگ سا برآمدہ طے کرتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ دروازہ کھولتے ہی مجھے عجیب سا احساس ہونے لگا۔ دل میں اضطراب اور بے چینی سی تھی۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا دروازے کے قریب کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ میں

نے دیوار ٹٹول کر سوئچ آن کر دیا۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا.....

کمرے میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ بشیر کا سوٹ کیس بستر پر کھلا پڑا تھا۔ کپڑے اور دوسری چیزیں بھی فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں چند لمحے متوحش نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر دروازے سے باہر آ کر بشیر کو پکارنے لگا۔

کمرے کی حالت دیکھ کر بشیر بھی چونک گیا..... صورتحال سمجھنے میں اُسے دیر نہیں لگی تھی۔ وہ اُلجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا، گویا اس کی وجہ جاننا چاہتا ہو۔ لیکن ظاہر ہے میں کیا بتا سکتا تھا؟ میں تو خود اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا جو اپنے آپ کو بھی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ چند لمحوں تک ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر بشیر آگے بڑھ کر چیزیں سمیٹنے لگا۔ باہر اگرچہ کانسٹیبل موجود تھا لیکن اُس سے کسی قسم کی مدد لینا بیکار تھا۔

بشیر دوبارہ مسجد والے کمرے میں جا چکا تھا۔ میں سیتا کا انتظار کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ شاید ہماری غیر موجودگی میں یہ تلاشی سیتا نے لی ہو۔ لیکن بہت دیر تک جب سیتا نہیں آئی تو میں یہ سوچتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا کہ سیتا ہسپتال میں سو گئی ہوگی۔

○

صبح ڈاکٹر رادھا نے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔ میں نے خمار آلود نگاہوں سے اطراف میں دیکھا۔ مشرقی کھڑکی سے اندر آنے والی دُھوپ کی کرنیں فرش پر مچل رہی تھیں۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر..... کیا بشیر نے تمہیں رات کے واقعہ کے بارے میں بتا دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں..... لیکن اس وقت میں رضیہ کے بارے میں پوچھنے آئی ہوں۔ تم نے اُسے کہیں دیکھا تو نہیں؟'' ڈاکٹر رادھا کے لہجے میں پریشانی نمایاں تھی۔

''گزشتہ رات اُس نے کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا تھا، پھر ہسپتال چلی گئی تھی اور واپس نہیں آئی تھی۔ شاید وارڈ کے کسی بیڈ پر سو رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''وہ رات کو کھانا لے کر یہاں آئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اُسے نہیں دیکھا..... وہ غائب ہے۔''

''غائب سے کیا مطلب.....؟'' میں بری طرح چونک گیا۔ ڈاکٹر رادھا کے لہجے نے مجھے اور سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گزشتہ روز کیپٹن گوپال سنگھ کی پوچھ گچھ سے وہ کہیں بھاگ گئی ہو... لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ اس ریگستان میں کہاں جا سکتی تھی؟

''پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ہندو سادھو نے گزشتہ رات اُسے کسی آدمی کے ساتھ کیکر کے درختوں کے جھنڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ لباس سے وہ آدمی کوئی ہندو ہی لگتا تھا تاریکی کے باعث سادھو اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ اس کے بعد سے رضیہ کو نہیں دیکھا گیا۔'' ڈاکٹر رادھا نے بتایا۔

''تم نے مجھے رات ہی کو کیوں نہیں بتایا تھا؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''رات کو تو میں اپنے کوارٹر میں تھی۔ یہ سب کچھ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی معلوم ہوا ہے۔'' ڈاکٹر رادھا نے کہا۔

رائے کی موت کا منظر میری نظروں میں گھوم گیا۔ کہیں رضیہ بھی..... نہیں نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ رضیہ کے بارے میں ایسا نہیں سوچا جا سکتا۔ وہ یہاں جرائم پیشہ افراد کی آلہ کار نہیں ہو سکتی تھی۔ اُسے یقیناً اُن لوگوں نے اغوا کیا ہوگا جو مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔ وہ رضیہ کے ذریعے دباؤ ڈال کر اپنا مقصد پورا کرنا چاہتے ہوں گے..... میں نے سر جھٹک دیا اور ڈاکٹر رادھا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا اُسے ریگستان کی طرف تلاش کیا گیا ہے؟ میرا مطلب ہے.....'' کسی انجانے خوف سے میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں۔'' ڈاکٹر رادھا نے جواب دیا۔ ''یہاں دو تین روز سے کچھ پراسرار واقعات رونما ہونے لگے ہیں۔''

''کیا میرا ان پراسرار واقعات سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''صورتحال خاصی پیچیدہ ہے۔'' بشیر کی آواز سن کر میں دروازے کی طرف گھوم گیا۔ وہ نجانے کب سے دروازے میں کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ ''یہاں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان پراسرار واقعات کے ذمہ دار تم ہو۔''

میں ایک بار پھر سوچ میں کھو گیا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے صرف دو دن ہوئے تھے اور اس عرصہ میں ایک آدمی پراسرار طریقے سے ہلاک ہو چکا تھا۔ اور میری اپنی دوست لاپتہ تھی۔ بدقسمتی سے وہ دونوں آخری مرتبہ مجھ سے ملے تھے۔ لوگوں کے خیال میں، میں کسی پراسرار شیطانی قوت کے زیر اثر تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ ان پراسرار واقعات کا مجھ سے کوئی تعلق ضرور ہے اور وہ مجھے قصوروار سمجھ رہے تھے۔

''ہسپتال میں ایک آدمی آیا ہے جو تم سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ اگرچہ ہندو ہے لیکن اُس کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ رام داس ملہوترہ کا شمار بمبئی کے امیر ترین آدمیوں میں ہوتا ہے۔ وہ ہسپتال کے سامنے والے میدان میں خیمہ زن ہے۔ اگر تم چاہو تو اُس سے مل سکتے ہو۔'' ڈاکٹر رادھا نے کہتے ہوئے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''اوہ..... اگر وہ میرے بارے میں جانتا ہے تو یقیناً میری مدد کر سکتا ہے۔ میں اُس سے ضرور ملوں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں کیپٹن گوپال سنگھ کی واپسی کا انتظار کر لینا چاہئے۔ وہ رضیہ کی تلاش میں ریگستان کی طرف گیا ہوا ہے۔'' بشیر نے کہا۔

''میں اُس کی موجودگی ضروری نہیں سمجھتا۔'' میں نے اُسے گھورا۔

''تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' بشیر نے کہا۔ اُس نے اپنے طور پر میری حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لی تھی اور مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ البتہ یہ اطمینان تو تھا کہ ان حالات میں میرا کوئی ہمدرد بھی موجود ہے۔

کچھ دیر بعد ہم گیسٹ ہاؤس سے نکل آئے اور بشیر کی جیپ میں سوار ہو کر اُس مقام کی طرف چل دیئے جہاں ڈاکٹر رادھا کے کہنے کے مطابق رام داس ملہوترہ خیمہ زن تھا۔

ہسپتال کے سامنے ایک وسیع میدان میں شاندار خیمے نصب تھے۔ اُن خیموں کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا جیسے کوئی مہاراجہ یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہو۔ تین چھوٹے خیمے تھے اور ایک بڑا جو باہر سے بہت خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ بڑے خیمے کے قریب ہی ایک شاندار شامیانہ لگا ہوا تھا جس کے نیچے تین چار ایزی چیئرز بچھی ہوئی تھیں۔ شامیانے کے بانس پر لگی ہوئی ایک چھوٹی چرخی سے کپڑے کا بنا ہوا ایک بہت بڑا پنکھا لگا ہوا تھا۔ چرخی میں سے گزرنے والی رسّی کا دوسرا سرا ایک آدمی کے ہاتھ میں تھا جسے وہ زور زور سے آگے پیچھے کھینچ رہا تھا اور اُس کے اس عمل سے پنکھا متحرک تھا اور ہوا لگ رہی تھی۔

شامیانے کے قریب ہی ایک ٹرک اور ایک شاندار لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ ٹرک میں ایک چھوٹا سا جنریٹر بھی نصب تھا جس سے ضرورت کے وقت بجلی پیدا کی جا سکتی تھی۔ لینڈ کروزر بھی ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ کرسیوں کے قریب ہی ایک میز تھی جس کے ساتھ ہی ایک آئس باکس بھی رکھا ہوا تھا جس میں کوکا کولا کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔

درمیانی کرسی پر ایک ادھیڑ عمر آدمی پُروقار انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں میں موٹا سا سگار دبا ہوا تھا۔ قیمتی لباس کے ساتھ ہی اُس کا بارُعب چہرہ اور آنکھوں کی چمک اُس کی شخصیت میں بڑا پراسرار تاثر پیدا کر رہی تھی۔ اُس کے قریب ہی دو آدمی مؤدبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ وہ دونوں بھی ہندو تھے۔

ہماری جیپ شامیانے سے چند گز کے فاصلے پر رُک گئی۔ میں، ڈاکٹر رادھا اور بشیر کے ساتھ جیپ سے اُتر آیا۔ ڈاکٹر رادھا نے اُس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتا دیا تھا کہ وہی رام داس ملہوترہ ہے جو مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ اُس شخص نے اگرچہ اپنے آپ کو میرا شناسا بتایا تھا لیکن وہ میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔

''مجھے افسوس ہے وحید! تم جن حالات سے دوچار ہو وہ میرے لئے بھی پریشانی کا باعث ہے۔ میں اُس وقت بمبئی میں تھا۔ تمہارے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر میں نے اخبار میں پڑھی تھی۔''

''یہ حالات میرے لئے خاصے پریشان کن ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ یہاں ڈاکٹر رادھا اور مسٹر بشیر کا مجھے بہت سہارا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا میں مسٹر وحید سے تنہائی میں بات کر سکتا ہوں؟'' ملہوترہ نے باری باری ڈاکٹر رادھا اور بشیر کی طرف دیکھا۔ اُن دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کندھے اُچکاتے ہوئے وہاں سے دُور ہٹ گئے۔ رام داس ملہوترہ ایک بار پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''اگر تمہاری یادداشت برقرار ہوتی تو تم مجھے فوراً پہچان لیتے۔ میں تھوڑے عرصہ بعد جیسلمیر جاتا رہتا ہوں۔ آخری مرتبہ چند روز پہلے ہم جیسلمیر میں ملے تھے۔ اس وقت تمہاری مدد کرنا میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ اور یہاں میری آمد کا مقصد بھی یہی ہے۔''

''جیسلمیر.....'' میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

''میرا خیال ہے اگر تم کوشش کرو تو تمہیں سب کچھ یاد آ سکتا ہے۔'' ملہوترہ کی نظروں میں عجیب سی چبھن تھی۔

''نہیں..... مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا..... میں اپنا ماضی بھول چکا ہوں۔'' میں نے بے بسی سے جواب دیا۔

''تو گویا تم مکمل طور پر اپنی یادداشت کھو چکے ہو؟'' ملہوترہ کی نظروں میں شبے کی جھلک تھی۔

رام داس ملہوترہ کے جارحانہ تیور دیکھ کر ڈاکٹر رادھا اور بشیر قریب آ گئے۔

''ڈاکٹر رادھا کا خیال ہے کہ مسٹر وحید کو آرام اور سکون کی ضرورت ہے..... دماغ پر غیر ضروری بوجھ ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔'' بشیر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''اس اطلاع کا شکریہ.....'' ملہوترہ نے بشیر کو گھورا۔

''تیز دُھوپ اسے نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔'' اس مرتبہ ڈاکٹر رادھا نے کہا۔

''میں آپ لوگوں کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا..... اگر آپ دونوں چاہیں تو واپس جا سکتے ہیں۔ وحید دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائے گا۔ میرا خیمہ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ اسے گرمی کا احساس تک نہیں ہوگا۔'' ملہوترہ نے کہا۔

''وحید میرے زیر علاج ہے..... میں اسے ایسا مشورہ نہیں دُوں گی۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ کیوں وحید؟'' ڈاکٹر رادھا نے میری طرف دیکھا۔

''ہاں چلو.....'' میں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ رام داس ملہوترہ اگرچہ اپنے آپ کو میرا شناسا بتا رہا تھا اور کسی ایسے شخص کی موجودگی میرے لئے اطمینان کا باعث ہو سکتی تھی۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ یہ شخص مجھے قطعی پسند نہیں آیا تھا اور یہاں کھڑے کھڑے میرا دل گھبرانے لگا تھا۔

''تو ٹھیک ہے..... میں شام کو گیسٹ ہاؤس آ جاؤں گا۔ مجھے کچھ ایسی باتیں معلوم ہیں جو تمہاری یادداشت لوٹانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔'' رام داس ملہوترہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور رخصت کرنے کے لئے جیپ تک ہمارے ساتھ آیا۔

ڈاکٹر رادھا کو ہسپتال کے سامنے اُتار کر ہم دونوں گیسٹ ہاؤس آ گئے۔ بشیر نے اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا اور میں بستر پر لیٹا موجودہ صورتحال کے بارے میں سوچتا رہا۔

بہاری لال رائے کے قتل اور پھر رضیہ کی گمشدگی نے فضا میں عجیب سی کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ رام داس ملہوترہ کی آمد نے مجھے ایک اور اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو میرا شناسا بتا رہا تھا۔ اور چند روز پہلے جیسلمیر میں مجھ سے ملاقات کا دعویدار بھی تھا۔ مجھے یہ سب کچھ یاد نہیں تھا لیکن ملہوترہ کا رہن سہن اور ٹھاٹھ بتا رہا تھا کہ اگر وہ کروڑ پتی نہیں تو لکھ پتی ضرور ہے۔ اُس کی شان و شوکت کسی مہاراجہ سے کم نہیں تھی۔ اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اُس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہوگی..... اور اُس کی آمدنی کا ذریعہ کیا تھا؟

شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ ملہوترہ کی لینڈ کروزر گیسٹ ہاؤس کے سامنے رُکی تو میں اُس وقت بشیر کے ساتھ کمپاؤنڈ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ملہوترہ کا ڈرائیور گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ دوسرے ملازم نے نیچے اُتر کر دروازہ کھولا اور ملہوترہ لینڈ کروزر سے اُتر کر پُر وقار انداز میں چلتا ہوا ہماری طرف آنے لگا۔ ہم دونوں نے اُٹھ کر اُس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے تیسری کرسی کی طرف اشارہ کیا جو باقی دونوں کرسیوں کی طرح خاصی شکستہ تھی۔

''مسٹر بشیر! اگر تم اجازت دو تو میں تنہائی میں وحید سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' ملہوترہ نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد بشیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بشیر نے میری طرف دیکھا اور میری رضامندی پا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد ملہوترہ کئی لمحوں تک گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا اور پھر قدرے آگے جھکتے ہوئے بولا۔

''اب تمہیں یاد آ جانا چاہئے کہ چند روز پہلے جیسلمیر میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔''

''مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔ ماضی کی کوئی بات میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہیں اتنا تو یاد ہوگا کہ انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ نے ریگستان میں سم کے مقام پر تم سے ملاقات کی تھی اور تم دونوں کے درمیان ایک نہایت اہم معاملہ طے ہوا تھا۔'' ملہوترہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا گویا اُسے شبہ تھا کہ میں یادداشت کھو جانے کا ڈھونگ رچا رہا ہوں۔

''انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ..... اہم معاملہ..... میں بالکل نہیں سمجھا۔'' مجھے اُس کی باتوں سے اُلجھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

''اب مجھے کھل کر بات کرنی پڑے گی۔'' ملہوترہ نے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ ''تم اگر وادی ہو کشمیری مجاہد..... جو اپنے دیش کی آزادی کی جنگ لڑ

رہے تھے۔تم نے کشمیر میں بھارتی سیناؤں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔تمہاری گرفتاری کے لئے انعامات مقرر کئے گئے لیکن تم بھارتی سیناؤں کے خلاف کامیابی سے کارروائیاں کرتے رہے اور بالآخر انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کی ایک خوبصورت ایجنٹ کو کشمیر بھیجا گیا تاکہ وہ تمہیں اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر تمہیں گرفتار کرنے میں مدد دے سکے۔وہ تم تک پہنچ تو گئی لیکن خود تمہارے پریم میں مبتلا ہوگئی۔سیتا اور تم نے دوسرے مجاہدین کے ساتھ مل کر جموں میں کئی اعلیٰ بھارتی فوجی افسروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔اور تم دونوں پنجاب سے ہوتے ہوئے جیسلمیر پہنچ گئے اور یہاں بھی تم دونوں نے تباہی پھیلانا شروع کر دی۔لودروا کیمپ کو تباہ کر کے تم لوگوں نے واقعی ایک اہم کارنامہ انجام دیا تھا۔تمام انٹیلی جنس ایجنسیاں اور پولیس تمہاری تلاش میں تھی۔لیکن انٹیلی جنس آفیسر بابوراؤ نے تمہیں کھوج نکالا۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''بابوراؤ اپنے دیش کا کھاتا ہے مگر غدار ہے۔اُس نے لودروا کیمپ کے بارے میں ایک مکمل فلم تیار کی تھی جس میں بھارت اسرائیل معاہدے کا عکس بھی شامل تھا۔وہ یہ مائیکرو فلم بمبئی میں کلیان رائے جی نامی ایک شخص کو پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ یہ کام خود نہیں کرنا چاہتا تھا۔اُسے اپنے کسی آدمی پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔ایسے کاموں میں بڑی رازداری برتی جاتی ہے۔تم لوگ اُس کی نظروں میں آ گئے۔بابوراؤ نے تم سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔اُس نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا کہ اگر تم پکڑے بھی گئے اور وہ مائیکرو فلم تم سے برآمد ہوگئی تو سارا الزام تم ہی لوگوں پر آئے گا۔مجھے تم لوگوں پر کبھی شبہ نہ ہوتا لیکن میرے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ بابو راؤ نے وحید الدین اور رضیہ کے نام سے کاغذات بنوا کر تم لوگوں کو جیسلمیر سے نکلنے کا موقع فراہم کیا ہے اور چیک پوسٹ پر تم لوگوں کی گاڑی بھی چیک نہیں ہونے دی۔یہ میرے آدمیوں کی حماقت تھی کہ بابوراؤ اُسی دوپہر اُن کے ہاتھوں مارا گیا اور تم لوگ بھی غائب ہوگئے۔اور پھر میں نے اخبار میں رضیہ اور وحید الدین نامی شخص کو ریگستان میں پیش آنے والے حادثے کی خبر پڑھی تو میں سمجھ گیا کہ حادثے کا شکار ہونے والے سیتا اور شمروز کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتے۔''

''میں نہیں سمجھا کہ تم کیا کہہ رہے ہو.....آج سے پہلے نہ میں نے تمہیں کبھی دیکھا اور نہ ہی مجھے کوئی ایسی بات یاد ہے۔'' میں نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔اور پھر دفعتہً میرے دماغ میں دھماکہ سا ہوا.....

''یاد کرنے کی کوشش کرو مسٹر شمروز!'' ملہوترہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''اُس مائیکرو فلم میں بھارت سرکار کے اہم ترین راز ہیں۔اگر وہ فلم پاکستان کے ہاتھ لگ گئی تو ہند سرکار کو پاکستان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔اور بین الاقوامی برادری میں سبکی الگ ہو گئی۔مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔میں ہند سرکار کو کسی دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی بجائے اپنے سامنے جھکانا چاہتا ہوں۔اُس فلم کی بدولت ہمیں ہند سرکار سے منہ مانگی رقم مل سکتی ہے۔اور

میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں بحفاظت سرحد کے پار پہنچا دیا جائے گا۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا.....میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے بے بسی سے سر جھٹک دیا۔

''ویسے تمہاری یہ ذہنی کیفیت کب تک درست ہو جائے گی؟'' ملہوترہ نے مشتبہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ڈاکٹر رادھا کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے دو چار روز میں میری یادداشت لوٹ آئے یا اس میں غیر معینہ عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ.....'' ملہوترہ نے کہا۔''بہرحال یہ باتیں کسی سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔میں پھر کسی وقت تم سے ملاقات کروں گا۔اپنے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کرو.....ہو سکتا ہے تمہیں کچھ یاد آ جائے۔'' ملہوترہ کہتے ہوئے اُٹھ گیا۔وہ جیسے ہی کمپاؤنڈ سے باہر نکلا بشیر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا۔مجھے یقین تھا کہ وہ کسی جگہ چھپ کر ہماری نگرانی کر رہا ہوگا۔

میں اس وقت شدید اُلجھن میں مبتلا تھا۔دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔بشیر شاید چہرے کے تاثرات سے میری کیفیت بھانپ گیا تھا۔وہ مجھے سہارا دے کر کمرے میں لے آیا۔وہ مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میری زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔بالآخر کئی منٹ کی خاموشی کے بعد میں نے اُسے رام داس ملہوترہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا جسے سن کر بشیر بری طرح چونک گیا۔

''دہشت گردی.....مائیکرو فلم.....'' بشیر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''صورتحال خاصی پیچیدہ ہوگئی ہے۔میرا خیال ہے ہمیں فوراً کیپٹن گوپال کو اطلاع دینی چاہئے۔لیکن نہیں.....اس طرح معاملہ کچھ اور بگڑ جائے گا۔''

بشیر تقریباً ایک گھنٹے تک میرے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر اُٹھ کر مسجد والے کمرے میں چلا گیا۔میں بستر پر لیٹ گیا.....میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔دفعتہً ایک اور خیال میرے ذہن میں اُبھرا۔صورتحال نہ صرف پیچیدہ بلکہ ہمارے لئے نہایت سنگین ہوگئی تھی۔اگر پولیس کو پتہ چل گیا کہ میں درحقیقت کون ہوں تو اذیت ناک موت سے مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا۔رضیہ نے بھی کہا تھا کہ اُس کا نام سیتا اور میں شمروز ہوں اور اب رام داس ملہوترہ بھی ایک ایسی کہانی سنا رہا تھا جو نہایت خوفناک تھی۔اگر ہم واقعی کچھ اور تھے تو انٹیلی جنس آفیسر بابوراؤ نے ہمارے لئے جن فرضی ناموں سے کاغذات بنوائے تھے وہ فرضی نام ہی ہمیں اب تک بچائے ہوئے تھے۔رام داس ملہوترہ سب کچھ جانتا تھا اور ہمارے فرضی ناموں سے بھی واقف تھا۔اسی لئے ہمارے بارے میں اخبار میں خبر پڑھ کر ہمیں تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا تھا۔بابوراؤ کو اُس کے آدمی اُسی روز موت کے گھاٹ اُتار چکے تھے جب ہم جیسلمیر سے نکلے تھے۔اگر وہ زندہ ہوتا تو ملہوترہ سے پہلے یہاں پہنچ چکا ہوتا۔صورتحال کی سنگینی کا اندازہ لگا کر میں کانپ اُٹھا۔سیتا بھی شاید صورتحال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے غائب ہوگئی تھی اور میرے لئے بھی بچاؤ کا

ایک ہی راستہ تھا۔ فرار.....!

میں وقت گزرنے کا انتظار کرتے ہوئے یہ سوچتا رہا کہ کیا میں واقعی دہشت گرد تھا؟ کیا میرا تعلق کشمیر سے ہے؟ لیکن کشمیر کہاں ہے؟ اور وہ انٹیلی جنس آفیسر بابوراؤ کون تھا؟ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کسی نے مجھے کوئی مائیکرو فلم دی تھی۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

نصف شب کے قریب جب مجھے یقین ہو گیا کہ بستی والے سو رہے ہوں گے تو میں آہستگی سے اُٹھ کر کھڑکی کے راستے کمرے سے باہر آ گیا۔ میں مسجد کے سامنے والے رُخ سے کمرے سے باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس طرح مجھے مسجد کے برآمدے سے گزرنا پڑتا اور اس طرح بشیر کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ مزید برآں گیسٹ ہاؤس کے گیٹ پر کیپٹن گوپال سنگھ کا کانسٹیبل بھی موجود تھا۔ بشیر اور کانسٹیبل اگرچہ سو رہے تھے لیکن قدموں کی آہٹ سے کسی کی آنکھ کھل سکتی تھی۔

گیسٹ ہاؤس کی پچھلی دیوار تقریباً آٹھ فٹ اُونچی تھی۔ دیوار کی اینٹیں ٹوٹی ہوئی ہونے کی وجہ سے اس پر چڑھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں دیوار کی ٹوٹی ہوئی جگہوں پر پیر پھنسا کر آہستہ آہستہ اُوپر چڑھنے لگا۔ اُوپر پہنچ کر میں نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ نیچے گرتے ہوئے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور میرے دائیں ٹخنے میں ہلکا سا جھٹکا لگا۔ درد کی شدت سے میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں چند لمحوں تک ٹخنہ سہلاتا رہا اور جب درد کسی حد تک کم ہوا تو لنگڑاتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا۔

گلی سے نکل کر قصبے کی مین روڈ پر پہنچتے ہی کتوں نے بھونک کر میرا استقبال کیا..... میں جلدی سے ایک اور گلی میں گھس گیا اور دوبارہ مین روڈ پر آنے کی بجائے گلیوں میں چلتا رہا۔

میرے سامنے کسی منزل کا نشان نہیں تھا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک گلی کے آخری موڑ پر پہنچا تو ہسپتال کی عمارت دیکھ کر ٹھٹھک گیا..... اس کے سامنے ہی رام داس ملہوترہ کا کیمپ تھا۔ میں کچھ دیر گلی کے موڑ پر کھڑا کیمپ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر واپس مُڑنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ہی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچ اُٹھیں..... سر پر لگنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا اور لہراتا ہوا نیچے گر گیا..... اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا.....!

○

جس جگہ میں ہوش میں آیا اُسے باقاعدہ کمرہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ تقریباً بارہ فٹ لمبا اور سات فٹ چوڑا پہاڑی غار تھا۔ غیر ہموار دیواریں اور جھکی ہوئی چھت میرے خیال کی تصدیق کر رہی تھیں۔ چھت اس قدر نیچی تھی کہ قدرے لمبے قد کے آدمی کا سر چھت کو چھو سکتا تھا۔ یہاں فرنیچر نام کی ایک پرانی سی کرسی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ لکڑی کی چند ٹوٹی ہوئی چیزیں بھی

بکھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے قریب پتھر کا ایک چبوترہ تھا جس پر ٹین کا بنا ہوا ایک دیا جل رہا تھا۔ دیئے میں کیراسین آئل کی بجائے شاید کسی قسم کی چربی استعمال کی جا رہی تھی۔ گاڑھے سیاہ دُھویں کے ساتھ غار میں ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میرے قریب ہی گدلے سے پانی کا ایک جگ رکھا ہوا تھا۔ میری ایک کلائی آہنی کڑے میں جکڑی ہوئی تھی جس سے منسلک زنجیر کا دوسرا سرا دیوار میں لگے ہوئے ایک ہُک میں پھنسا ہوا تھا.....

چند لمحوں تک تو میں کچھ نہ سمجھ سکا اور پھر رفتہ رفتہ صورتحال واضح ہوتی چلی گئی۔ رات کو ہسپتال کے قریب سر کی پشت پر ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کیا گیا تھا اور اب میں ایک قیدی تھا۔ لیکن میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ مجھے قید کرنے والا کون ہے؟

میں کچھ دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر اُس قید خانے کا جائزہ لینے لگا۔ میرے ہاتھ میں پڑی ہوئی زنجیر خاصی لمبی تھی۔ میں اس حد تک آگے بڑھتا رہا جس حد تک زنجیر اجازت دے رہی تھی۔ یہ غار شاید اس سے پہلے بھی قید خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ ایک طرف کپڑے کے چند چیتھڑے اور غلاظت کا ڈھیر نظر آ رہا تھا جس سے شدید تعفن اُٹھ رہا تھا۔ میں دوسری طرف گھومنا ہی چاہتا تھا کہ کونے میں کوئی چمکتی ہوئی چیز دیکھ کر رُک گیا۔ میں نے چبوترے پر رکھا ہوا چراغ اُٹھا لیا اور آگے بڑھنے لگا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... چراغ کی روشنی میں چمکنے والی وہ چیز دُھوپ کا وہ چشمہ تھا جو ڈاکٹر رادھا نے رضیہ یا سیتا کو دیا تھا۔ اُس کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور فریم درمیان سے مُڑا ہوا تھا۔ میرے لئے خوفزدہ ہونے کی بات یہ تھی کہ ٹوٹا ہوا وہ چشمہ ایک انسانی ہاتھ کی گرفت میں تھا جس کا باقی جسم دیوار کے پیچھے تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تو مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا..... وہ رضیہ..... سیتا تھی.....!

دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد جب آنکھیں کھولیں تو حقیقت جوں کی توں میرے سامنے موجود تھی۔ سیتا کا مُردہ جسم آڑی ترچھی حالت میں پڑا تھا..... اُس کا لباس تار تار اور جسم پر لاتعداد چھوٹے چھوٹے زخم آ رہے تھے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ مرنے سے پہلے اُس پر بے پناہ تشدد کیا گیا تھا..... میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ رضیہ یا سیتا کی موت کا ذمہ دار صرف اور صرف میں تھا.....

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور دماغ میں تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ سر پر جہاں ضرب لگائی گئی تھی وہاں درد کی شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر پر دھماکے ہو رہے ہوں۔ پھر اچانک ہی دماغ میں روشنی کا جھماکہ ہوا۔ بجلی کا ایک کوندا سا لپکا اور میں اپنے ماضی کی طرف لوٹنے لگا.....!

میری کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ رہی تھی۔ بیتے ہوئے واقعات تاریکی سے نکل کر سامنے آنے لگے۔ خیالات اور یادوں کے اس ہجوم میں میرا دماغ دُکھنے لگا۔ میں بار بار سر کو جھٹک رہا

تھا تا کہ ذہن کا بوجھ کسی حد تک کم ہو سکے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ماضی کی ایک ایک تصویر ذہن کے پردے پر واضح ہوتی چلی گئی.....!

میرا گاؤں سوپور کم از کم تین مرتبہ درندہ صفت بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا تھا۔ میں اُس وقت کم عمر تھا لیکن ان درندوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میں نے بھی رائفل اُٹھا لی اور مجاہدین کے ایک گروپ میں شامل ہو گیا۔ اور پھر میرا نام بھارتی فوجیوں کے لئے دہشت کی علامت بن گیا..... میں ایک معرکے میں زخمی ہو کر ڈوڈا کی طرف نکل آیا جہاں سیتا نے مجھے ایک غار میں پناہ دی اور چوری چھپے میرا علاج کرایا۔ سیتا ''را'' کی ایجنٹ تھی۔ نہایت خوبصورت، حسین۔ اُسے میری گرفت کے لئے کشمیر بھیجا گیا تھا لیکن وہ میرے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ سیتا ہندو تھی لیکن اپنے کزن کے ہاتھوں اپنی عزت لٹوا بیٹھی۔ اُسے اپنے دھرم ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔ کشمیر میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ اُسے ہندو فوجیوں سے نفرت اور کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی ہو گئی۔

میں اور سیتا مل کر تباہی پھیلاتے رہے۔ ہم نے ہندو فوج کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا۔ جیسلمیر کے قریب دہشت گردی کے ٹریننگ کیمپ کی تباہی ہمارا آخری کارنامہ تھا۔ ہم پکڑے جانے کے خوف سے چھپتے پھر رہے تھے کہ بابو راؤ نامی ایک انٹیلی جنس آفیسر کی نظروں میں آ گئے اور اُس نے ہمیں فرار ہو جانے میں تعاون کی پیشکش کی۔ وہ اپنی گاڑی ہمارے ذریعے پوکھران بھجوانا چاہتا تھا لیکن ہمیں ریگستان میں وہ حادثہ پیش آ گیا اور میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا۔ ہمیں شمروز اور سیتا کی حیثیت سے تو شناخت نہیں کیا گیا لیکن ہمارے لئے گئی اور اُلجھنیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اور پھر رام داس ملہوترہ آ گیا..... وہ مجھ سے کسی مائیکرو فلم کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور میں ایسی کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

اس دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ سیتا سہمی سہمی سی رہی تھی۔ اور پھر اُس نے مجھے بتایا بھی تھا کہ وہ میری اور اپنی اصلیت چھپانے کے لئے اپنے آپ کو سیدھی سادھی اور ڈرپوک سی لڑکی پوز کر رہی تھی۔ اور پھر یکایک وہ غائب ہو گئی..... اور اب اُس کی نچی ہوئی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ سیتا بڑی جگرے والی لڑکی تھی۔ اُس نے کٹھن اور سنگین ترین حالات کا مقابلہ کیا تھا اور اس میں کبھی لچک نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ اس طرح خاموشی سے مر جائے گی؟ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر اُن سیکرٹ ایجنٹوں کی زندگی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ان کی سرگرمیاں بڑی خوفناک ہوتی ہیں۔ چٹکی بجاتے میں حکومتوں کے تختے اُلٹ دیتے ہیں اور خود بالآخر گمنامی کی موت مر جاتے ہیں اور سیتا بھی گمنامی کی موت مر گئی تھی۔

مجھے یاد آ گیا کہ میں سیتا کے ساتھ بابو راؤ کی کار پر پوکھران جانے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ اور پھر صحرا میں بھٹکتے ہوئے اس پہاڑی پر پہنچ گئے جہاں سے گرنے کے بعد میری یادداشت گم ہو گئی تھی۔

ہسپتال میں پہلے بہاری لال رائے نے اپنے آپ کو ڈیزرٹ آفیسر ظاہر کر کے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ کسی سوٹ کیس کی شناخت کے بہانے مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد رائے کو پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا تھا۔ پھر رام داس ملہوترہ سامنے آیا وہ اپنے آپ کو میرا شناسا ظاہر کرتے ہوئے مجھ سے کسی مائیکرو فلم کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ اور اب سیتا کی مسخ شدہ لاش میرے سامنے تھی۔ ملہوترہ ہم دونوں کی اصلیت سے آگاہ تھا۔ سیتا کو دھوکے سے اغوا کر لیا گیا تھا اور وہ لوگ تشدد کر کے اُس سے غالباً اُس مائیکرو فلم کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے لیکن وہ تشدد کی تاب نہ لا سکی اور ختم ہو گئی۔ خود مجھے بھی قصبے سے اغوا کر کے اس غار میں قید کر دیا گیا تھا۔ لیکن میں اب تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ رائے کو کس نے قتل کیا تھا؟ سیتا کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتارنے والا کون تھا؟ رام داس ملہوترہ یا کوئی اور.....؟

بہاری لال رائے اور رام داس ملہوترہ کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اُن دونوں میں سے کسی کا بھی بابو راؤ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُنہیں کسی طرح علم ہو گیا تھا کہ بابو راؤ نے سرکاری رازوں پر مشتمل کوئی مائیکرو فلم بنائی ہے جسے وہ بمبئی کے کلیان جی نامی کسی شخص کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ لوگ وہ فلم ہتھیانا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر رادھا نے بتایا تھا کہ مجھے اور سیتا کو ایک شتر سوار بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال چھوڑ گیا تھا۔ وہ شتر سوار کون تھا اور ہماری کار کہاں تھی.....؟ ہسپتال میں قیام کے دوران کسی نے ایک مرتبہ بھی کار کا ذکر نہیں کیا تھا۔ سیتا نے اُن لوگوں کو بتایا تھا کہ اُن کی کار خراب ہو گئی تھی اور وہ لوگ اُس پہاڑی پر آ گئے تھے جہاں اُنہیں وہ حادثہ پیش آیا تھا۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ کار کہاں گئی؟ جو شخص اُنہیں زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال چھوڑ گیا تھا اُس نے چٹان کے دامن میں کار ضرور دیکھی ہو گی۔ لیکن اُس نے کسی سے کار کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا.....؟

بہت دیر تک سوچنے کے بعد میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تو میں نے سر جھٹک کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔ دیئے میں شاید تیل ختم ہو رہا تھا کیونکہ روشنی کم ہو گئی تھی۔ میری کلائی پر پڑی ہوئی ہتھکڑی خاصی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ میں اُس ہاتھ کو کم سے کم حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ تکلیف زیادہ نہ ہو۔

سیتا کی موت پر میرا دل دُکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں ایک ہمدرد ساتھی سے محروم ہو گیا تھا..... سناٹا میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کر رہا تھا۔ لیکن پھر دفعتہً باہر کسی جگہ دھمک سی سنائی دی۔ وہ بھاری قدموں کی آواز تھی جو لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ بالآخر دروازے کے سامنے پہنچ کر یہ آواز رُک گئی۔ اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی..... میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ میں نے جلدی سے رُخ پھیر لیا۔

''بہت بہادر بننے کی کوشش کر رہے تھے..... مسجد کے گیسٹ ہاؤس کو بھول جاؤ اور ذرا میرے گیسٹ ہاؤس میں بھی رہ کر دیکھ لو!''

غار کے دہانے کی طرف سے اُبھرنے والی یہ آواز رام داس ملہوترہ کی تھی۔ میں نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ دروازے میں تین آدمی کھڑے تھے۔ ایک ملہوترہ، دوسرا اُس کا دیو قامت ملازم جس نے تیسرے آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ دیو قامت ملازم نے اُس آدمی کو زوردار دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے وسط میں آ کر گرا۔

وہ بشیر تھا جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا..... بشیر کو اس حالت میں دیکھ کر میں لرز اُٹھا.....!

○○○

بشیر کی پیشانی سے بہتا ہوا خون اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اُس کے ساتھ مار پیٹ بھی کی گئی تھی۔ میں چند لمحے متوحش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا پھر رام داس ملہوترہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تو مجھے اغوا کرنے والے تم ہو..... لیکن بشیر کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

''یہ تمہارا سب سے بڑا ہمدرد ہے اور اسے یہاں لانا میرے لئے یوں بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے کہ قصبے میں اب تمہیں تلاش کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ ہندوؤں کو تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ غائب ہو جانے پر اُنہوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا۔'' ملہوترہ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن سیتا نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ اس معصوم کو اس بے رحمی سے کیوں ہلاک کیا گیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''وہ تمہاری ساتھی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ تمہارے راز سے واقف ہوگی۔ اور ہم وہی راز اُس سے اگلوانا چاہتے تھے۔ وہ ''را'' کی سابق ایجنٹ تھی۔ تمہارے ساتھ مل کر اس نے بڑی تباہی پھیلائی تھی۔ بھارتی حکمران تو اس کے نام سے بھی کانپنے لگے تھے۔ لیکن وہ تو بڑی ٹھس ثابت ہوئی۔ ٹنگو کے چند ہاتھ بھی برداشت نہ کر سکی۔'' ملہوترہ نے کہا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے لمبے تڑنگے آدمی کی طرف دیکھا جس نے بشیر کو دھکا دے کر گرایا تھا۔

''نہیں..... وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''گویا تم جانتے ہو۔'' ملہوترہ نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''مم..... میں کیسے جانتا ہوں..... مجھے کچھ یاد نہیں..... تم جانتے ہو میں اپنی یادداشت سے محروم ہو چکا ہوں۔'' میں نے چہرہ جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ میں اُس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ میری یادداشت لوٹ آئی ہے۔

''ہوں.....!'' ملہوترہ نے مجھے گھورا۔ ''میں تم سے علیحدگی میں بات کروں گا۔ کھانا تیار ہو چکا ہے اور تمہیں بھوک بھی لگ رہی ہوگی..... ہماری باقی گفتگو کھانے پر ہوگی۔''

ملہوترہ نے ٹنگو کو اشارہ کیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر بشیر کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا لیکن ہاتھ بندھے رہنے دیئے۔ پھر وہ میرے قریب آ گیا اور میری کلائی میں پڑا ہوا آہنی کڑا کھول دیا۔

''تمہیں یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی ملہوترہ.....'' بشیر نے اُسے دھمکی دی۔ ''کیپٹن گوپال کو وحید کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اس کی گمشدگی پر وہ خاموش نہیں رہے گا۔ تم کسی طرح بچ نہیں سکو گے۔''

''میرے بچنے اور نہ بچنے کا سوال تو اُس وقت پیدا ہوگا جب مجھ پر بات آئے گی۔ قصبے کے کسی آدمی کو یہ علم نہیں ہے کہ تم لوگوں کو اغوا کرنے والا کون ہے۔'' ملہوترہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب..... کیا تم ہمیں زندگی بھر کے لئے اپنا قیدی بنائے رکھنا چاہتے ہو؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''میں یہ روگ نہیں پالوں گا..... لیکن تم لوگوں کو اس طرح غائب کر دیا جائے گا کہ دنیا میں تمہارا نام تک نہیں رہے گا۔'' ملہوترہ نے کہا۔

''کیا تم ہمیں قتل کر دو گے؟'' میں نے اُسے گھورا۔

''ہاں..... اور تم لوگوں کی ہڈیاں بھی اس غار میں گل سڑ جائیں گی۔'' ملہوترہ نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

میں نے ایک نظر بدقسمت سیتا کی لاش اور زمین پر بندھے ہوئے بشیر کی طرف دیکھا اور غار کے دہانے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ملہوترہ آگے تھا۔ اُس کے پیچھے میں اور ٹنگو، جس نے میرے بازو پر گرفت جما رکھی تھی۔

مختلف سرنگوں میں چکراتے ہوئے ہم جیسے ہی غار سے باہر نکلے مارے حیرت کے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں..... جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ چاروں طرف چٹانوں میں گھرے ہوئے ایک چھوٹے سے میدان میں خیمے نصب تھے۔ دو مختلف جگہوں پر پیٹرومیکس جل رہے تھے۔ ایک طرف ملہوترہ کا باورچی کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا۔

ہم ایک میز کے قریب پہنچ گئے جس کے گرد کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہمارے بیٹھنے کے چند منٹ بعد ملازم نے میز پر کھانا چن دیا۔ ملہوترہ نے کھانے کی طرف اشارہ کیا لیکن میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''میرے ساتھ تعاون کر کے فائدے میں رہو گے۔'' ملہوترہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''بصورت دیگر تمہاری اور بشیر کی موت بڑی اذیت ناک ثابت ہوگی۔ میرا یہ ملازم ٹنگو تشدد اور اذیت کے بیسیوں طریقے جانتا ہے۔''

''کیا تم واقعی ہمیں قتل کر دو گے؟'' میں نے متوحش نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''اپنے آپ کو احمق ثابت کرنے کی کوشش مت کرو شمروز!'' ملہوترہ نے کہا۔ ''تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ مجھ سے تعاون کرو۔ اور یہ بات ذہن نشین کر لو کہ یہاں نہ تو کوئی تمہاری مدد کو آئے گا اور نہ ہی تم یہاں سے فرار ہو سکتے ہو۔ اور اگر تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو

میں سچ اُگلوانا بھی جانتا ہوں۔ مجھ سے تعاون کر کے فائدے میں رہو گے۔ تم وہ مائیکرو فلم میرے حوالے کر دو! اور میں تمہیں سرحد پار کرا دوں گا۔ تم پاکستان میں محفوظ رہو گے۔ یہاں کی انٹیلی جنس، آرمی یا پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔''

''لیکن..... مجھے کچھ یاد نہیں..... میں کچھ نہیں جانتا۔''

''تمہیں سب کچھ یاد آ جائے گا۔'' ملہوترہ نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ عین اُسی لمحہ خیمے کے دوسری طرف کوئی پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں نے چونک کر اُس طرف دیکھا۔ ملہوترہ کے چہرے پر ایک لمحہ کو اُلجھن کے تاثرات اُبھرے تھے۔ پھر یہ تاثرات بدل گئے۔ وہ ٹارچ اُٹھا کر اُس کی روشنی میں چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس وقت مجھے بھی پہلی مرتبہ اس جگہ کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ چٹانوں میں کسی مندر کے کھنڈرات تھے۔ کیمپ کے چاروں طرف اُونچی شکستہ دیواریں تھیں۔ کہیں کہیں کوئی ستون بھی نظر آ رہا تھا۔

''شاید کوئی جانور تھا۔'' ملہوترہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''میں تم سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک ٹھیک جواب دو گے۔''

''تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔ میں اب بھی اندھیرے میں اُس طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اور پھر ایک لمحے کے لئے میں نے دو چٹانوں کے درمیان ایک ہیولے کو معلق دیکھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ملہوترہ کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''تو پھر مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔'' ملہوترہ نے کہتے ہوئے جیب سے سٹین لیس سٹیل کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی جس میں ایک سرنج اور ایک چھوٹی سی شیشی میں کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔

''یہ ٹروتھ سیریم ہے..... اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ہر ایک کو سچ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے استعمال سے پہلے میں ویسے ہی تم سے سوالات کروں گا۔ اس کے بعد یہ انجکشن لگا کر وہی سوالات دُہرائے جائیں گے۔ اگر کسی بات میں تضاد پایا گیا تو پھر تمہیں ٹنگو کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور یہ جان لو کہ ٹنگو تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دے گا۔''

''تم سمجھتے کیوں نہیں.....'' میں تقریباً چیخ اُٹھا۔ ''جب میں کچھ جانتا ہی نہیں تو دواؤں کے استعمال اور تشدد کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' میں خاموش ہو کر ملہوترہ کے چہرے کو تکنے لگا جس پر درندگی اور بربریت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میری نظروں کے سامنے سیتا کی لاش گھوم گئی جو اس کی بربریت کا واضح ثبوت تھی۔ لیکن میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو زبان نہیں کھولوں گا۔ اور ویسے بھی اس مائیکرو فلم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا جس کے بارے میں وہ کہہ رہا تھا۔

''تمہیں شاید علم نہیں.....'' میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''بشیر

کیپٹن گوپال کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔ وہ مجھے تلاش کرتا ہوا اس طرف ضرور آئے گا۔''

''یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔'' ملہوترہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کیپٹن گوپال سنگھ کو اطلاع دینے کے بعد بشیر کی نیت بدل گئی ہو۔ ممکن ہے اسے بھی تمہاری اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہو اور وہ تمہیں لے کر فرار ہو گیا ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بشیر نے یہ پروگرام بڑی عجلت میں بنایا تھا۔ کیونکہ اُس کی جیپ میں پانی کی ایک بوتل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کسی خاطر خواہ انتظام کے بغیر ریگستان میں نکلنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ تم لوگ بھی ریگستان میں راستہ بھٹک گئے۔ جیپ کا پٹرول ختم ہو گیا تو تم لوگ تپتے ہوئے صحرا میں گرمی اور پیاس سے مر گئے۔ دونوں کی لاشیں جیپ میں ملیں گی۔ اور ہر کوئی لالچ اور ہوس کے اس انجام پر کانپ اُٹھے گا۔''

میں کانپ کر رہ گیا۔ ملہوترہ کے شیطانی ذہن نے بڑے بھیانک منصوبے تیار کر رکھے تھے۔

''اگر میں یہ کہوں کہ میں..... کچھ جانتا ہوں تو.....؟'' میں نے رُک رُک کر کہا۔

''تم مجھے ہر وہ بات بتاؤ گے جو میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اور میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ٹنگو کو بھی مایوس نہیں کرنا چاہتا۔'' اُس نے دیو قامت ٹنگو کو اشارہ کیا۔

میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر سی دوڑ گئی..... میں سمجھ گیا کہ ملہوترہ مجھے کسی حالت میں بھی نہیں بخشے گا۔ سب کچھ جان لینے کا اعتراف کر کے میں نے گویا اپنے مقدر پر خود ہی بدقسمتی کی مُہر لگا دی تھی۔ ملہوترہ سچ اُگلوانے کے لئے میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دے گا۔

دیو قامت ٹنگو نے چمڑے کے ایک فیتے سے میری دونوں کلائیاں اس قدر مضبوطی سے باندھ دیں کہ چمڑے کا فیتہ گوشت میں پیوست ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پھر ٹنگو نے میرا سر پکڑ کر گردن کو ایک طرف موڑا۔ میری گردن کی ہڈی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی..... ٹنگو نے ایک زوردار جھٹکا دے کر میری گردن چھوڑ دی۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ میں، جس کے نام ہی سے دنیا کانپتی تھی، اس قدر آسانی سے ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور خاموشی سے تشدد برداشت کر رہا تھا۔

''میں تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں.....'' ملہوترہ کی آواز سنائی دی۔ ''وہ مائیکرو فلم کہاں ہے؟''

''مجھے کچھ یاد نہیں..... میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

ملہوترہ نے ایک بار پھر ٹنگو کو اشارہ کیا۔ عین اُسی لمحے کسی طرف سے دھب کی آواز سنائی دی..... ملہوترہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور نکال لیا۔ اُس نے ٹارچ اُٹھا کر دوسرے ملازم ارجن کو اشارہ کیا اور وہ دونوں آواز کی سمت دوڑ پڑے۔

میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ آواز کیسی تھی۔ میں تو خوفزدہ سی نظروں سے ٹنگو کو دیکھ رہا تھا جو میرے اوپر جھک رہا تھا۔ اُس نے میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے زمین پر پڑا ہوا پلائر اُٹھا لیا..... میں دہشت سے کانپ اُٹھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ٹنگو پلائر سے میرے ناخن کھینچنا چاہتا ہے۔ لیکن اُسی وقت دھب کی ایک اور آواز سنائی دی..... اور اس کے ساتھ ہی کسی نے جلتا ہوا پیٹرومیکس اُٹھا کر خیمے کی طرف اُچھال دیا۔ ٹنگو میرا ہاتھ چھوڑ کر اُس طرف بھاگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اور پھر دفعتہً پشت کی طرف سے ایک سرگوشی سنائی دی۔

''شمروز..... کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟''

آواز بلاشبہ بشیر کی تھی..... میں کرسی سے اُٹھ کر آواز کی طرف دوڑا۔ اگرچہ خیمے کو آگ لگ چکی تھی لیکن اُس طرف تاریکی تھی۔ میں جیسے ہی ایک ٹوٹے ہوئے ستون کے قریب پہنچا کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کھینچتا ہوا پہاڑی کے ایک اور غار میں داخل ہو گیا۔

وہ بشیر تھا۔ ہم دونوں اندھوں کی طرح غار میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے بالآخر ایک کھلی جگہ پر نکل آئے۔ یہ بھی مندر کے کھنڈر کا ہی ایک حصہ تھا۔ ہمارے سامنے پتھروں کی کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی مدھم روشنی میں نیچے ایک جیپ کھڑی نظر آ رہی تھی۔ میرا سانس پھول رہا تھا..... میں اپنی کیفیت پر قابو پانے کے لئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

''ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں نکلے۔ نیچے میری جیپ کھڑی ہے۔ اگر ملہوترہ ہم سے پہلے جیپ تک پہنچ گیا تو ہمارے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں گی۔'' بشیر میرا بازو پکڑ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔

ایک جگہ ہم ایک دیوار کی آڑ میں رُک گئے۔ بشیر شیشے کے ایک ٹکڑے سے میری کلائیوں پر بندھا ہوا چمڑے کا فیتہ کاٹنے لگا۔ یہ سیتا کی ٹوٹی ہوئی عینک کا شیشہ تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ غار کے اندر بشیر نے اپنے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسّی کس طرح کاٹی ہو گی۔ اور شیشے کے ٹکڑے سے اب وہ میرے ہاتھوں پر بندھا ہوا چمڑے کا فیتہ کاٹ رہا تھا۔ سیتا مرنے کے بعد بھی میری مدد کو پہنچ گئی تھی۔

چند سیکنڈ بعد ہم دیوار کی آڑ سے نکل کر پھر نیچے اُترنے لگے۔ آخری سیڑھی سے زمین کا فاصلہ تقریباً آٹھ فٹ تھا اور وہاں سے پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر جیپ کھڑی تھی۔ بشیر سیڑھی سے نیچے کود گیا۔ میں چھلانگ لگانے کی بجائے سیڑھی کا کنارہ پکڑ کر لٹک گیا اور اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ چھوڑتا فضا دھماکے کی آواز سے لرز اُٹھی..... دائیں طرف بلندی سے آنے والی گولی میرے بالکل قریب پتھر پر لگی۔ پتھر کا ایک ٹکڑا اُڑ کر میری گردن پر لگا اور اُسی وقت میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ بشیر مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا دیوار کے ساتھ چپک گیا۔

دائیں طرف دیوار پر کھڑا رام داس ملہوترہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس کے ساتھی مختلف سمتوں

میں کھڑے فائرنگ کر رہے تھے۔

بشیر نے چند لمحے صورتحال کا جائزہ لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ میں اُس وقت اپنے آپ کو دنیا کا سب سے احمق انسان سمجھ رہا تھا۔ ملہوترہ اور اُس کے آدمی اب جیپ پر فائرنگ کر رہے تھے۔ گولی لگنے سے جیپ کی ونڈ شیلڈ میں ایک سوراخ ہو گیا تھا اور مکڑی کے جالے کی طرح شیشے میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔

ہم کچھ دیر دیوار کے ساتھ چپکے رہے پھر تیزی سے جیپ کی طرف دوڑے..... میں جیپ کے پچھلے حصے پر چڑھ گیا اور بشیر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن سٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو مرتبہ غرانے کے بعد تیسری مرتبہ انجن سٹارٹ ہو گیا اور اُسی لمحہ ایک گولی ہڈ کو چیرتی ہوئی میرے پیر کے قریب فرش پر لگی..... جیپ کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ پوری رفتار سے دوڑنے لگی۔

میرے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت جیپ کے فرش پر لیٹا رہا۔ فائرنگ کی آوازیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں اور جیپ تیز رفتاری سے ریگستان میں اُچھلتی ہوئی جا رہی تھی۔

''ہم کس طرف جا رہے ہیں؟'' میں نے جیپ کے فرش سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ پتہ نہیں.....'' بشیر نے جواب دیا۔ ''اس وقت تو میں ان لوگوں سے زیادہ سے زیادہ دُور نکل جانا چاہتا ہوں۔ رات کے وقت سمت کا تعین مشکل ہے۔ ویسے چندن یہاں سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم صبح ہونے پر ہی راستے کا تعین کر سکیں گے۔ اس وقت تک ہم کسی محفوظ مقام تک پہنچ جائیں گے۔''

''وہ پہاڑی کہاں پر ہے جہاں سے شتر سوار مجھے اور سیتا کو بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر لایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی راستے میں ہے..... چندن سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر۔ وہاں سے تقریباً پانچ میل شمال میں وہ سڑک ہے جو چندن اور پوکھران کی طرف جاتی ہے۔'' بشیر نے کہا۔

''کیا اس پہاڑی میں غار وغیرہ بھی ہوں گے؟''

''راجستھان کے صحراؤں میں نظر آنے والی ہر پہاڑی میں تمہیں خوفناک غار ملیں گے۔'' بشیر نے کہا۔ ''کسی زمانے میں اس علاقے میں کالی دیوی کے ماننے والوں کی اکثریت تھی۔ تباہی و بربادی کی اس دیوی کے پجاری اُسے خوش رکھنے کے لئے انسانی جانوں کی بھینٹ دیا کرتے تھے۔ شہر کے کسی مندر میں چونکہ وہ کسی انسان کو کالی کے چرنوں پر موت کے گھاٹ نہیں اُتار سکتے تھے اس لئے اُن لوگوں نے ریگستان میں ان پہاڑیوں کے غاروں میں کالی دیوی کی قربان گاہیں بنا رکھی تھیں۔ اس طرح وہ قانون کی گرفت سے بھی آزاد رہتے تھے۔ لیکن پھر قانون کی سختی سے یہ رجحان ختم ہوتا چلا گیا۔ جس غار سے ہم فرار ہوئے ہیں وہاں بھی کسی زمانے

میں کالی دیوی کا مندر تھا اور غار کا وہ حصہ قربان گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا جہاں ہمیں قید رکھا گیا تھا۔''

کالی دیوی اور انسانوں کی قربانی کے بارے میں، میں پہلے بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ میں مزید کچھ کہنے کی بجائے صحرا کی تاریکی میں گھورنے لگا۔

تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد جیپ کا انجن خرخرانے لگا..... اس کے ساتھ ہی رفتار کم ہوتی چلی گئی۔ بشیر گیئر بدل بدل کر انجن کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا اور بالآخر جیپ رُک گئی۔ بشیر انجن چیک کرنے کے لئے نیچے اُترا تو لڑکھڑا کر ریت پر گر گیا۔

میں جلدی سے نیچے کود گیا۔ بشیر کو اُٹھانے کے لئے جیسے ہی اُس کا ہاتھ پکڑا، میں بری طرح چونک گیا..... اُس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ میں نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھ چپ چپانے لگا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ جب بشیر کو غار میں لایا گیا تھا تو اُس کی پیشانی زخمی تھی اور غالباً اسی وجہ سے اُسے بخار ہو گیا تھا۔ اور بخار بھی اس قدر شدید تھا کہ اگر فوری طور پر کسی قسم کی طبی امداد نہ پہنچائی گئی تو اُس کی حالت بگڑنے کا اندیشہ تھا۔ مجھے تو حیرت تھی کہ وہ اب تک اپنے آپ پر قابو کیسے پائے ہوئے تھا؟

میں نے بڑی مشکل سے اُسے اُٹھا کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ جیپ میں پانی کی ایک بوتل مل گئی۔ میں نے اپنی قمیض کا دامن پھاڑا اور کپڑا بھگو بھگو کر اُس کی پیشانی پر رکھنے لگا۔ اس وقت اس کے علاوہ کچھ اور کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

رات بیتتی جا رہی تھی۔ بشیر پر غنودگی طاری تھی اور میں اس خیال سے سہما جا رہا تھا کہ اگر بشیر کو کچھ ہو گیا تو آبادی سے میلوں دُور ریگستان میں میری زندگی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر رام داس ملہوترہ اور اُس کے وحشی ساتھیوں کے ہاتھ آنے سے بچ بھی گیا تو دن میں انگاروں کی طرح تپتی ہوئی ریت مجھے موت کی نیند سلا دے گی۔

رات کے آخری پہر بشیر کو کچھ ہوش آیا لیکن وہ اپنی جگہ سے اُٹھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے اُسے لیٹے رہنے کا مشورہ دیا اور دھیان بٹانے کے لئے اُس سے باتیں کرنے لگا۔

''میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں وحید!'' بشیر نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ رام داس ملہوترہ تم سے کسی مائیکرو فلم کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے سیتا کی موت اور مجھ پر تشدد بھی تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے۔ آخر کیوں؟''

بشیر کی اس کیوں کے پیچھے بہت سے سوالات پوشیدہ تھے۔ میں فوری طور پر جواب دینے کی بجائے سوچنے لگا کہ میری وجہ سے یہاں دو قتل ہو چکے ہیں۔ بشیر بھی میری ہی وجہ سے مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اگر وہ مجھے لے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب نہ ہو پاتا تو یقیناً مجھے بھی قتل کر دیا جاتا۔ موجودہ حالات میں ہم دونوں کی زندگیوں کی اب بھی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اگر ملہوترہ ہمیں تلاش کرتا ہوا اس طرف آ نکلا تو ہم چوہوں کی طرح مارے جائیں گے۔ ملہوترہ

اور اُس کے ساتھی مسلح تھے جبکہ ہم دونوں نہتے تھے۔ اور ہماری طرف سے کسی قسم کا دفاع ممکن نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کے اس نازک موڑ پر بشیر کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔ بالآخر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں مدھم لہجے میں بشیر کو اس خونریزی کا پس منظر بتانے لگا۔

''وہ مائیکرو فلم کہاں ہے؟'' اُس نے میرے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''میں اُس فلم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔ اگر اعتماد نہ ہوتا تو اپنے بارے میں یہ سب کچھ بھی نہ بتاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انٹیلی جنس آفیسر بابو راؤ نے مجھے کوئی فلم نہیں دی تھی اور نہ ہی میں اس سلسلے میں کچھ جانتا ہوں۔ اُس نے ہمیں اپنی گاڑی پوکھران پہنچانے کے لئے کہا تھا۔ وہ فلم اگر اس گاڑی میں کہیں چھپائی گئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔''

''مجھے تم سے ہمدردی ہے شمروز.....'' بالآخر اُس نے کہا۔ ''اگر کسی ہندو کو تمہاری اصلیت کا پتہ چل گیا تو تم ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکو گے۔ اگر تم دوبارہ ملہوترہ کے ہاتھ لگ گئے تو وہ بھی تمہیں اس وقت تک زندہ رکھے گا جب تک تم سے اس مائیکرو فلم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر لیتا۔''

''اور میں مائیکرو فلم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''اور جب اُسے یقین ہو جائے گا کہ تم واقعی اُس فلم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو اس صورت میں بھی وہ تمہیں موت کے گھاٹ اُتارنے میں دیر نہیں لگائے گا۔'' بشیر نے کہا۔

کچھ دیر بعد موضوع بدل گیا اور ہم باتوں میں اس قدر مگن رہے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

دن کا ہلکا سا اُجالا پھیل رہا تھا۔ بشیر نے جیپ کا بونٹ اُٹھایا اور انجن چیک کرنے لگا۔ بیٹری کا تار لوز ہو گیا تھا۔ اُسے درست کرتے ہی انجن سٹارٹ ہو گیا۔ بشیر کی حالت اگرچہ زیادہ بہتر نہیں تھی لیکن اُس نے جیپ کو تیز رفتاری سے دوڑا دیا۔ بخار کے باعث اسٹیئرنگ پر اُس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

مشرقی اُفق پر سرخی پھیل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد سورج طلوع ہو گیا۔ سورج کا گولا منظر عام پر آتے ہی آسمان سے آگ برسنے لگی۔ ریت تپنے لگی..... رات کے وقت ہوا کے جو جھونکے خوشگوار محسوس ہو رہے تھے اب لو کے تھپیڑے بن کر جسم کو جھلسائے دے رہے تھے۔ ہم صحیح سمت میں جا رہے تھے۔ بشیر کے خیال میں چندن زیادہ سے زیادہ بیس میل دُور تھا۔ جیپ کی ٹینکی میں اتنا پٹرول موجود تھا کہ اگر راستہ بھٹکے بغیر چلتے رہے تو آسانی سے وہاں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن صحرا میں بھٹکنے کا خیال ہی رُوح فرسا تھا۔

گرمی کی شدت سے دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ بوتل

میں صرف چند گھونٹ پانی رہ گیا تھا اور ہم دونوں میں سے کوئی بھی اُسے استعمال نہیں کر رہا تھا۔ پانی کے یہ چند گھونٹ ہم نے کسی انتہائی نازک وقت کے لئے محفوظ کر رکھے تھے۔

بشیر کی حالت پھر بگڑنے لگی..... میں نے اُسے ایک گھونٹ پینے کا مشورہ دیا مگر اُس نے انکار کر دیا۔ اسٹیئرنگ اُس کے قابو میں نہیں تھا لیکن وہ اسٹیئرنگ سے ہٹنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ سامنے بہت دُور ایک پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ میرے خیال میں اُس کا فاصلہ تین چار میل سے کم نہیں تھا۔ جیپ کا رُخ اُسی پہاڑی کی طرف تھا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال اُبھرا کہ یہ وہی پہاڑی تو نہیں جہاں مجھے اور سیتا کو حادثہ پیش آیا تھا؟ ہم اب تک تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور بشیر کے کہنے کے مطابق وہ پہاڑی چندن سے آدھے راستے میں تھی۔ اس حساب سے یہ وہی پہاڑی ہونی چاہئے تھی۔

''کیا یہ وہی پہاڑی ہے جہاں ہمیں حادثہ پیش آیا تھا؟'' میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

''ہاں..... اور اس طرف تقریباً پانچ میل دُور پوکھران کی طرف جانے والی سڑک ہے۔'' بشیر نے ایک طرف اشارہ کیا۔ پھر چونکتے ہوئے بولا۔ ''اوہ..... وہ دیکھو! وہ کیا ہے؟''

میں نے بھی چونک کر اُس طرف دیکھا۔ وہ ایک سیاہ نقطہ تھا جو لمحہ بہ لمحہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کوئی جیپ تھی جو بڑی تیزی سے فاصلہ سمیٹ رہی تھی۔ اُس جیپ کو دیکھ کر میرا دل لرز اُٹھا..... مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رام داس ملہوترہ ہم سے پہلے یہاں پہنچ گیا تھا اور اب بڑی تیزی سے ہماری طرف آ رہا تھا..... ہم ایک بار پھر وہیں پہنچ گئے تھے جہاں سے چلے تھے۔ بشیر نے اُس جیپ کو اپنی طرف آتے دیکھنے کے باوجود اپنی جیپ کی رفتار کم نہیں کی تھی۔

''بشیر! اُدھر دیکھو..... بائیں طرف۔'' میں نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ اُس طرف سے بھی ایک جیپ تیز رفتاری سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ ''شاید وہ ہمیں دونوں طرف سے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ ملہوترہ کے ساتھی نہیں.....'' بشیر نے جواب دیا۔ ''پولیس جیپ ہے۔ جیپ پر پولیس کا لیگ بھی نظر آ رہا ہے۔ شاید کیپٹن گوپال سنگھ ہماری تلاش میں اس طرف آ نکلا ہے۔''

غور سے دیکھنے پر مجھے بھی دوسری جیپ پر ایک چھوٹا سا جھنڈا لہراتا ہوا نظر آ گیا..... اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ ہم ملہوترہ کے شکنجے میں آنے سے بچ جائیں گے۔

بشیر نے جیپ کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ ہماری جیپ دوسری دونوں جیپوں کے درمیانی رخ پر بڑھ رہی تھی۔ ان دونوں جیپوں کی رفتار میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ فاصلے لمحہ بہ لمحہ سمٹنے لگے.....

اب دونوں طرف کی جیپیں اتنا قریب آ چکی تھیں کہ ان میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ دائیں طرف سے آنے والی جیپ میں ملہوترہ اور اُس کے ساتھی تھے اور بائیں طرف سے آنے والی جیپ میں کیپٹن گوپال سنگھ اور تین کانسٹیبل نظر آ رہے تھے۔ بشیر شاید ان دونوں

جیپوں کے درمیان سے اپنی جیپ نکال لے جانا چاہتا تھا۔ اُس کی نظریں ملہوترہ والی جیپ پر تھیں۔ شاید وہ فاصلے کا تعین کر کے فائرنگ رینج سے دُور رہنا چاہتا تھا۔ میری نظریں اچانک ہی سامنے ایک گہرے کھڈ کی طرف اُٹھ گئیں۔ ہماری جیپ تیزی سے اُس کھڈ کی طرف بڑھ رہی تھی..... میں نے چیخ کر بشیر کو اُس طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی..... جیپ کے پہیوں نے زمین چھوڑ دی..... چند لمحے ہوا میں تیرتی رہی پھر قلا بازی کھاتی ہوئی ایک زوردار دھماکے سے کھڈ کی تہہ میں گر گئی.....

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے جیپ کے کھڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی جیپ سے چھلانگ لگا دی تھی۔ میں لڑھکتا ہوا ایک چھوٹے کھڈ میں گر گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ تاریکی میں ڈوبتے ذہن کے ساتھ فائرنگ کی آوازیں بھی میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے کان پھاڑ دینے والا ایک آخری زوردار دھماکہ سنا اور اس کے بعد کچھ معلوم نہیں ہو سکا..... میرا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب گیا تھا.....!

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا تھا۔ لیکن گرمی کی شدت سے دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عجیب سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا کھڈ سے باہر آ گیا۔ سامنے کا منظر دیکھتے ہی میں لرز اُٹھا.....

کیپٹن گوپال کی جیپ کے پرخچے اُڑ چکے تھے۔ اُس کے ٹائروں اور بعض حصوں سے اب بھی دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جیپ پر دستی بم یا ایسا ہی کوئی آتش گیر مادہ پھینکا گیا تھا۔ کیپٹن گوپال سنگھ اور اُس کے کانسٹیبلوں کی جھلسی ہوئی لاشیں جیپ کے قریب ہی بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے دوسری جیپ کی طرف دیکھا۔ ملہوترہ کے دونوں ساتھیوں ٹنگو اور ارجن کی لاشیں ریت پر پڑی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوئے تھے۔ لیکن ملہوترہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں آگے بڑھ کر جیپ کے دوسری طرف چلا گیا اور پھر دوسرے ہی لمحہ مجھے ٹھٹک جانا پڑا..... ملہوترہ جیپ کے دوسری طرف ریت پر پڑا ہوا تھا۔ اُس کے سینے میں گولیوں کے تین نشان تھے۔ خون سے اُس کا لباس تر ہو رہا تھا۔ ہاتھوں اور چہرے پر بھی خون کے دھبے نظر آ رہے تھے جس سے اُس کا چہرہ کچھ اور بھی بھیانک ہو گیا تھا۔ لیکن..... وہ ابھی زندہ تھا۔ آہٹ پا کر اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحے حقارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اُس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے ملہوترہ کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ لیا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر ملہوترہ کے ہاتھ پر ٹھوکر مار دی..... ریوالور اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گرا۔ میں نے جھپٹ کر ریوالور اُٹھا لیا اور اُس کا رُخ ملہوترہ کے سر کی طرف کر کے ٹرائیگر دبا دیا..... ایک دھماکہ ہوا اور گولی ملہوترہ کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ میں نے ریوالور اُس کی لاش کے قریب پھینک دیا۔ چند لمحے اُس کی

طرف دیکھتا رہا اور پھر پہاڑی کی طرف چلنے لگا۔

پہاڑی میں غار تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی۔ غار میں ایک خوفناک منظر میرا منتظر تھا..... میری کار تو موجود تھی لیکن اُس کے قریب ہی زمین پر ایک آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی جس کے جسم کی رنگت بالکل سیاہ تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی شخص تھا جس نے مجھے اور سیتا کو ہسپتال پہنچایا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم دونوں کو ہسپتال لے جانے سے پہلے اُس نے کار غار میں لا کر کھڑی کی ہو گی اور ہمیں ہسپتال پہنچانے کے بعد اُس کی نیت بدل گئی ہو گی۔ اُس نے کار میں رکھے ہوئے سوٹ کیس میں سونے کی مورتیاں اور زیورات دیکھ لئے ہوں گے اور یہ سب کچھ چرانے کی نیت سے آیا ہو گا لیکن کسی زہریلے سانپ نے اُسے ڈس لیا۔ اس علاقے میں ایسے زہریلے سانپوں کی کمی نہیں تھی جن کے کاٹنے سے فوراً ہی موت واقع ہو جاتی ہے اور جسم سیاہ پڑ جاتا ہے۔

میں لاش سے نظریں ہٹا کر کار کی طرف متوجہ ہو گیا جو ریت میں اٹی ہوئی تھی۔ میں کار کا دروازہ کھول کر کچھ دیر باہر کھڑا رہا، پھر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن سٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ کچھ ہی دیر میں انجن سٹارٹ ہو گیا۔ میں ریورس گیئر میں کار کو غار سے باہر نکال لایا اور بشیر کے بتائے ہوئے راستے کی طرف موڑ دیا۔

تقریباً پینتیس منٹ بعد میں سڑک پر پہنچ گیا..... یہ وہی سڑک تھی جہاں سے سیتا کے ساتھ میں نے کار چٹان کی طرف موڑی تھی۔ یہ سڑک ایک طرف چندن سے ہوتی ہوئی پوکھران کی طرف چلی گئی تھی اور دوسری طرف جیسلمیر کی طرف جہاں سے ہم آئے تھے۔ میں نے کار جیسلمیر کی طرف موڑ دی۔

سڑک پر چند میل کا فاصلہ طے کر کے میں نے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف دیکھا تو چونک سا گیا..... آئینے میں پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی سیتا کی ساڑھی کا عکس نظر آ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اُس روز جب پہاڑی کے قریب ہم کار سے اُترے تھے تو سیتا اسی کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور گرمی کی شدت سے گھبرا کر اُس نے ساڑھی اُتار کر اس سیٹ پر ڈال دی تھی۔ اور جب ہم چٹان سے گرے تھے تو سیتا کے جسم پر صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ تھا۔ ہسپتال میں ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹر رادھا نے اپنی ایک ساڑھی سیتا کو دے دی تھی جسے وہ آخری وقت تک پہنے رہی تھی۔ میرے خیال میں سیتا کی اُس ساڑھی کو پسنجر سیٹ پر ہونا چاہئے تھا لیکن وہ پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی تھی۔ ممکن ہے اُس شتر سوار نے کار کے سامان کی تلاشی لیتے ہوئے یہ ساڑھی اُٹھا کر پچھلی سیٹ پر پھینک دی ہو۔

سیتا مر چکی تھی۔ اُس کی کسی چیز کا کار میں موجود ہونا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کار کو سڑک سے بہت دُور ہٹا کر روک لیا اور پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ ساڑھی کے علاوہ سیتا کا ہینڈ بیگ بھی پچھلی سیٹ پر موجود تھا۔ سیتا کے دو تین اور کپڑے اور کچھ

دوسری چیزیں بھی سوٹ کیس میں موجود تھیں۔ میں نے تمام کپڑے، ہینڈ بیگ اور سیتا سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو سیتا کی ساڑھی میں لپیٹ کر ایک گٹھڑی سی بنائی اور کار سے اُتر آیا۔ کار سے چند گز دُور ریت میں گڑھا کھود کر گٹھڑی کو دفن کر دیا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا دوبارہ کار میں آ گیا۔

سوٹ کیس میں سونے کی مورتیاں اور زیورات جوں کے توں موجود تھے۔ میں نے اُن پر اپنے کپڑے ڈال دیئے اور سوٹ کیس بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ میرا رُخ اگرچہ جیسلمیر کی طرف تھا مگر میں جیسلمیر نہیں جانا چاہتا تھا۔ جیسلمیر سے چند میل پہلے ایک کچی سڑک دیوی کوٹ نامی قصبے کی طرف مُڑ گئی تھی۔ یہی سڑک آگے جا کر جیسلمیر سے باڑمیر کی طرف جانے والی پختہ سڑک سے مل جاتی تھی۔ میں نے کار دیوی کوٹ کی طرف جانے والی کچی سڑک پر موڑ دی۔

تین بجے کے لگ بھگ میں دیوی کوٹ پہنچ گیا۔ یہاں زیادہ دیر رُکنا مناسب نہیں تھا۔ چندن کے لوگوں کو صحرا میں پولیس اور رام داس ملہوترہ کے درمیان خونی تصادم کا پتہ چل گیا ہوگا اور کھڈ سے بشیر کی لاش بھی مل گئی ہوگی۔ اور عین ممکن ہے یہ خبر اب تک دیوی کوٹ جیسے چھوٹے قصبے میں بھی پہنچ گئی ہو اور پولیس کو کسی مشتبہ شخص کی تلاش ہو کیونکہ قصبے والوں کے خیال میں رضیہ اور وحید الدین کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ پولیس کو یقیناً اُن کی بھی تلاش ہوگی اس لئے زیادہ دیر یہاں رُکنا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا اور جب باہر نکلا تو ایک بھکاری لڑکا کار صاف کر رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ گاڑی کی صفائی کا خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا اور یہ مسئلہ اُس بھکاری لڑکے نے حل کر دیا تھا۔ میں ریسٹورنٹ کے دروازے میں کھڑا لڑکے کی طرف دیکھتا رہا۔ اور جب کار اچھی طرح صاف ہو گئی تو میں نے لڑکے کے قریب آ کر پانچ روپے کا ایک سکہ بھکاری لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا اور کار میں بیٹھ گیا۔ ایک پٹرول پمپ سے ٹینکی فل کرانے کے بعد میں باڑمیر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں سورج غروب ہونے کے بعد ہی باڑمیر پہنچا تھا۔ یہ اگرچہ بڑا قصبہ تھا مگر زمیندار ورجندر ناتھ کا مکان تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ راجندر ناتھ کی کھیتی باڑی بھی تھی اور بازار میں آڑھت کی دُکان بھی تھی جہاں عام طور پر اُس کے منشی وغیرہ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ مرچوں کا سیزن تھا۔ ان دنوں یہ کاروبار عروج پر تھا۔ ہندوستان بھر سے مرچوں کے بیوپاری اس سیزن میں باڑمیر اور ان قصبوں میں آیا کرتے تھے جو مرچوں کی پیداوار کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ مجھے بھی مرچوں کا بیوپاری ہی سمجھا گیا تھا۔ اتفاق سے میں نے جس شخص سے راجندر ناتھ کے بارے میں دریافت کیا تھا وہ بھی مرچوں کا آڑھتی تھا۔ اُس نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی کہ وہ مجھے راجندر ناتھ سے سستا اور بہترین مال دے سکتا ہے لیکن بالآخر اُس نے مجھے راجندر ناتھ کی دُکان کا پتہ بتا دیا۔

راجندر ناتھ تھوڑی دیر پہلے ہی دُکان سے گھر جا چکا تھا۔ میں نے منشی کو بتایا کہ میں راجندر ناتھ کا رشتے دار ہوں اور جودھ پور سے آیا ہوں تو اُس نے ایک ملازم کو میرے ساتھ کر دیا۔

ملازم میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور راستہ بتاتا رہا۔ بالآخر قصبے کے تقریباً آخر میں ایک حویلی نما مکان کے پھاٹک کے سامنے اُس نے گاڑی رُکوالی اور نیچے اُتر کر پھاٹک کے ذیلی دروازے میں داخل ہو گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ ایک آدمی کے ساتھ باہر آیا۔ وہ آدمی دراز قامت اور بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں نے اُس کے چہرے کا خاصا رعب بنا رکھا تھا۔ اُس نے دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا اور وہ واقعی زمیندار لگتا تھا۔

میں نے ہندوانہ انداز میں اُسے پرنام کیا اور اُسے ذرا الگ لے جا کر کہا۔ ''میں سیتا کا دوست مہابیر سنگھ ہوں۔ کچھ مہمان آپ کے پاس پہلے بھی آ چکے ہیں اور.....''

''سیتا کہاں ہے.....؟'' وہ میری بات کاٹ کر کار کی طرف دیکھنے لگا۔

''وہ جیسلمیر میں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''چند روز بعد آئے گی۔ ویسے وہ خیریت سے ہے اور.....''

''کار کو اندر لے چلو! آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔'' اُس نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی اور ملازم کو پھاٹک کھولنے کا اشارہ کیا۔

میں کار کو پھاٹک کے اندر لے آیا۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ بہت وسیع و عریض کمپاؤنڈ تھا۔ سامنے حویلی کی عمارت تھی۔ دائیں طرف درختوں کے نیچے ایک ٹریکٹر اور ایک کار کھڑی تھی۔ میں نے اپنی کار بھی ان کے پیچھے کھڑی کر دی۔

راجندر ناتھ مجھے حویلی کے ایک کمرے میں لے آیا اور سیتا کے بارے میں مختلف سوالات کرنے لگا۔ باتوں کے دوران ایک موقع پر اُس نے مجھے شمروز کے نام سے مخاطب کیا تو میں اُچھل پڑا.....

''میں سب کچھ جانتا ہوں.....'' اُس نے کہا۔ ''بھارت سرکار نے اگر ہمارے خاندان کے ساتھ زیادتیاں نہ کی ہوتیں تو ہمیں سیتا کی اس حرکت پر افسوس ہوتا۔ لیکن اپنے ساتھ سرکار کی زیادتیوں کو دیکھتے ہوئے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ سیتا نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک کیا، اور جو کچھ بھی کر رہی ہے ٹھیک کر رہی ہے۔ ہمیں کوئی افسوس نہیں۔''

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اُس کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

''سیتا کو تو تمہارے ساتھ آنا تھا..... وہ کیوں نہیں آئی؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''کسی وجہ سے اُسے جیسلمیر میں رُکنا پڑ گیا ہے۔ وہ تین چار روز مزید وہاں رہے گی۔ اس

کے بعد شاید وہ جے پور بھی جائے گی۔'' میں نے اُٹھ کر سوٹ کیس کھولا اور سونے کی دو مورتیاں نکال کر اُسے پیش کر دیں۔ ''یہ تحفے آپ کے لئے سیتا نے بھیجے ہیں۔''

''سونے کی ہیں.....؟'' وہ مورتیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی۔

''جی ہاں..... خالص سونے کی۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر اُن مورتیوں کی تعریفیں کرتا رہا پھر اُٹھ کر اندرونی دروازے میں غائب ہو گیا۔ اُس کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ راجیو، شوبھا اور کلپنا کے علاوہ راجندر ناتھ کی پتنی رجنی اور جوان بیٹی شانتی بھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر تو راجیو اور شوبھا کو بھی خوشی ہوئی تھی لیکن کلپنا کی خوشی قابل دید تھی۔

''سیتا دیوی کہاں ہے؟'' یہ سوال راجیو نے کیا تھا۔

''وہ چند روز بعد آئے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ لوگ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر ایک ملازمہ نے آ کر رجنی کے کان میں سرگوشی کی تو وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''بھوجن تیار ہے..... تم بھی منہ ہاتھ دھولو بیٹا! اور سب لوگ وہیں آ جاؤ۔''

اس کے تقریباً بیس منٹ بعد ہم سب کھانے کے کمرے میں جمع تھے۔ فرش پر پلاسٹک میٹ بچھا ہوا تھا جس پر دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا تھا۔ پیتل کی تھالیوں میں پیتل کی کٹوریاں تھیں جن میں مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے اُس وقت واقعی بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں بے تکلفی سے اُن لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔

○

میں نے راجیو کو سیتا کی المناک موت کے بارے میں بتا دیا لیکن کسی اور کو اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔

دو دن میں، میں نے راجندر ناتھ کے بارے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس علاقے کا ایک بڑا زمیندار تھا۔ پاکستان کی سرحد یہاں سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ وہ اسمگلر نہیں تھا لیکن اسمگلروں سے اُس کے تعلقات ضرور تھے۔ اور میں نے اُس کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ہمیں سرحد پار کروا سکتا ہے۔

اور پھر تیسرے روز میں نے راجندر ناتھ سے یہ بات کہہ دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سونے کی ایک اور مورتی اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔

''یہ تحفہ میری طرف سے۔''

راجندر ناتھ کی آنکھوں میں ایک بار پھر چمک اُبھر آئی لیکن مجھے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ مزید ایک دن گزارنے کے بعد راجیو شوبھا کو لے کر جودھ پور روانہ ہو گیا جہاں اُس کے

کچھ رشتہ دار قیام پذیر تھے۔ میں نے سونے کی دو مورتیاں اُسے بھی تھما دی تھیں کہ انہیں بیچ کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر لے۔ کلپنا میرے ساتھ جانے پر بضد تھی۔ اُس کے ماں باپ ختم ہو چکے تھے۔ بھارت میں اُس کا کوئی قریبی عزیز بھی موجود نہیں تھا۔ اُس نے اپنی قسمت کو میرے ساتھ ہی وابستہ کر لیا تھا۔

راجیو اور شوبھا کے جودھ پور جانے کے اگلے روز میں اور کلپنا راجندر ناتھ کے ساتھ اُس کی پرانی سی گاڑی میں گھورا، شیتل ورنا اور سانچور سے ہوتے ہوئے سوئی گام پہنچ گئے۔ بابو راؤ والی گاڑی میں نے راجندر ناتھ کی حویلی میں ہی چھوڑ دی تھی اور میں نے اُسے گاڑی کے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ بعد میں کسی وقت اُس کے لئے مصیبت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

''اس کی تم چنتا ہی مت کرو.....'' راجندر ناتھ نے کہا۔ ''چار دن بعد مالک بھی دیکھے گا تو اپنی کار کو پہچان نہیں سکے گا۔''

سوئی گام میں ہم نے رام نواس نامی ایک پنڈت کے گھر میں قیام کیا۔ ایک دن ہمیں وہاں بھی رہنا پڑا۔ یہاں بھی سونے کے چند زیور اور سونے کی ایک مورتی پنڈت کی نذر کرنی پڑی تھی۔ اگلے روز دوپہر کے بعد ہمیں کہہ دیا گیا کہ ہم تیار رہیں۔ رات کو کسی بھی وقت ہماری روانگی ہو سکتی ہے۔

سرحد سوئی گام سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ سرحد سے دوسری طرف رن کچھ کا علاقہ تھا۔ اس پورے خطے میں کہیں دلدلیں تھیں، کہیں پہاڑیاں اور کہیں ببول اور کیکر کے چھدرے جنگل پھیلے ہوئے تھے..... نگر پارکر نام کا قصبہ بھی سرحد کے دوسری طرف چند میل سے زیادہ نہیں تھا۔

کلپنا ایک عجیب سی سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو میرے ساتھ جوڑ لیا تھا۔ اپنوں کو چھوڑ کر اُس نے مجھے اپنا مان لیا تھا اور اب اپنا دیس بھی چھوڑ رہی تھی۔

سورج ڈھلنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم ایک کھٹارہ سی جیپ پر سوئی گام سے روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ راجندر ناتھ کے علاوہ صرف ایک آدمی تھا جو ڈرائیو کر رہا تھا۔

سوئی گام سے سرحد کے دوسری طرف نگر پارکر تک ایک نیم پختہ سڑک چلی گئی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک اُس سڑک پر سفر کرنے کے بعد جیپ ریگستان کی طرف مُڑ گئی اور مزید ڈیڑھ گھنٹوں بعد ٹیلوں کے قریب رُک گئی۔ وہاں ٹیلوں کی آڑ میں پانچ اُونٹ تھے۔ ہر اُونٹ کے ساتھ دو آدمی تھے اور وہ سب کے سب مسلح تھے۔

رات دو بجے کے قریب ایک اور شتر سوار وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ آتے ہی سندھی زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا۔

''چلو جلدی کرو..... اُونٹوں پر بیٹھو!'' شتر بانوں میں سے ایک نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔

تمام اُونٹوں پر اگرچہ سامان لدا ہوا تھا لیکن ایک اُونٹ پر مجھے اور دوسرے پر کلپنا کو بٹھا دیا گیا۔ اور پھر اُونٹ جس طرح کھڑے ہوئے تھے میں بمشکل اپنے آپ کو سنبھال سکا تھا۔ دوسرے اُونٹ پر بیٹھی ہوئی کلپنا کے منہ سے تو ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

راجندر ناتھ اور جیپ کا ڈرائیور وہیں رہ گئے تھے۔ شتر بان اُونٹوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ یہ اُونٹ کی سواری کا میرا پہلا تجربہ تھا۔ یہ بے کل جانور جس طرح جھٹکے دے رہا تھا اس سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل کر رہ گیا۔ کلپنا بھی خوف سے چیخ رہی تھی اور میں چیخ چیخ کر اُسے بتا رہا تھا کہ وہ کجاوے کو مضبوطی سے پکڑے رکھے۔ مجھے ان شتر بانوں پر حیرت ہو رہی تھی جو اُونٹوں کی رسیاں پکڑے اُن سے بھی آگے دوڑ رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد اُن کی رفتار کم ہوگئی۔ اب اُونٹ معمول کی چال چل رہے تھے لیکن ہمیں جھٹکے بدستور لگ رہے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ مزید سفر کرنے کے بعد ایک بستی کے آثار دکھائی دینے لگے۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ بستی سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُونٹ بستی میں داخل ہو کر ایک حویلی کے پھاٹک میں داخل ہوگئے۔ احاطے میں اُونٹوں کو جس طرح بٹھایا گیا تھا، میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا تھا۔

مجھے اور کلپنا کو عمارت کے اُوپر والے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں صرف ایک جھلنگا سی کھاٹ بچھی ہوئی تھی۔

''اب تم لوگ ادھر آرام کرو سائیں! صبح وڈیرہ تم سے بات کرے گا۔'' ہمارے ساتھ آنے والے شخص نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں اس چارپائی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس چارپائی پر بھی صرف ایک رلّی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے باڑمیر سے روانہ ہونے سے پہلے یہ عقلمندی کی تھی کہ سوٹ کیس کا سامان ایک تھیلے میں ڈال لیا تھا۔ اُس میں زیور بھی تھے اور کپڑے بھی۔ اور وہ تھیلا میں نے گلے میں لٹکا رکھا تھا۔

میں نے دروازے کو اندر سے کنڈا لگا دیا اور رلّی اُٹھا کر فرش پر بچھا دی۔

''تم چارپائی پر لیٹ جاؤ! میں یہاں لیٹ جاتا ہوں۔'' میں نے کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور تھیلا کندھے سے اُتار کر تکیے کی طرح رکھ لیا۔ کمرے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا جسے بجھانا میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

رات بھر جاگنے اور اس سفر نے بری طرح تھکا دیا تھا۔ کلپنا چارپائی پر لیٹ گئی اور میں نے بھی رلّی پر دراز ہوتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دیر سویا ہوں گا اور پھر دروازے پر دستک کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی..... آنکھ کھلتے ہی میں اس لئے بھی چونک گیا کہ کلپنا میرے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کا

ایک ہاتھ میرے سینے پر تھا۔

دستک کی آواز دوبارہ اُبھری۔ میں نے کلپنا کا ہاتھ آہستگی سے اپنے اُوپر سے ہٹایا اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر وہی آدمی کھڑا تھا جو ہمیں اس کمرے میں چھوڑ کر گیا تھا۔

''سائیں! تم لوگ ناشتہ کر لو..... پھر وڈیرہ تم سے بات کرے گا۔'' اُس نے کہا۔

''منہ ہاتھ دھونے کی جگہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اُدھر غسل خانہ ہے.....'' اُس نے باہر ایک طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے..... ہم تھوڑی دیر میں تیار ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور کلپنا کو جگا دیا۔

ایک گھنٹے بعد ہم اُس شخص کے سامنے موجود تھے جسے وڈیرہ کہا گیا تھا۔ وہ لمبے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ ٹوتھ برش ٹائپ کی بھاری مونچھیں، سفید اُجلے کپڑے، کندھے پر پھیلی ہوئی اجرک اور پیروں میں تلے کے کھسے۔ اُس نے سرسری انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر کلپنا پر نظریں جما دیں۔ میں نے کھانس کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو سائیں؟'' اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کراچی۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''اگر تم لوگ بس پر سفر کرو گے تو پولیس جگہ جگہ تنگ کرے گی۔ اور پھر تمہارے ساتھ یہ چھوکری بھی تو ہے نا۔'' اُس نے کہتے ہوئے کلپنا کی طرف دیکھا۔ ''میں ایک گھنٹے بعد کراچی جا رہا ہوں..... تم لوگ چاہو تو میرے ساتھ چلے چلو۔''

''بہتر ہے جی۔ لیکن.....'' میں کہتے کہتے رُک گیا۔

''لیکن کیا.....؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ہمارے پاس روکڑا نہیں ہے جی..... اگر آپ یہ بکوا دیں تو ہمارے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔'' میں نے جیب سے سونے کی ایک چین نکال کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

وہ چند لمحے چین کو دیکھتا رہا۔ اُسے انگوٹھے کے ناخن پر رگڑا۔

''خالص سونے کی ہے جی..... اس میں ذرا بھی کھوٹ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے دیکھ لیا ہے..... کیا لو گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''جو مناسب ہو.....'' میں نے جواب دیا۔

اُس نے ایک بار پھر چین کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، پھر جیب سے تین ہزار روپے نکال کر میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے خاموشی سے وہ رقم لے لی۔ مجھے پاکستانی کرنسی کی ضرورت تھی اس لئے میں نے کوئی بھاؤ تاؤ نہیں کیا۔ حالانکہ میرے حساب سے وہ چین آٹھ ہزار سے کم نہیں تھی۔

''تم لوگ ناشتہ وغیرہ کر لو..... ہم ایک گھنٹے بعد یہاں سے چلیں گے۔'' وڈیرے نے کہا اور اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا۔ وہ ملازم ہمیں ایک اور کمرے میں لے آیا۔ یہاں فرش پر قالین

بچھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں بٹھا کر باہر چلا گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد میں اور کلپنا ناشتہ کر رہے تھے۔

اُس وقت صبح کے آٹھ بجنے والے تھے۔ نو بجے کے قریب ہم کراچی کے لئے روانہ ہو گئے۔ پجیرو بڑی شاندار اور ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک گن مین بیٹھا ہوا تھا۔ اُس سے پچھلی سیٹ پر وڈیرہ اور آخری سیٹ پر ہمیں بٹھا دیا گیا۔ آخر میں سامان رکھنے کی جگہ پر ایک واٹر کولر بھی رکھ لیا گیا تھا۔

یہ علاقہ بھی ریگستانی تھا۔ کہیں کہیں سبزہ تھا۔ تھوڑی بہت کھیتی باڑی تھی اور چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ میں راجستھان میں ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ ریگستان میں رہنے والوں کی زندگی کتنی کٹھن ہوتی ہے۔

ہم رحیم بازار، بدین، گڑھی، جیٹی، سجاول اور ٹھٹھہ سے ہوتے ہوئے شام کے قریب کراچی پہنچ گئے۔

''تم لوگوں کو کہاں جانا ہے؟'' وڈیرے نے پیچھے مُڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جہاں کہو اُتار دیں گے۔''

''کسی ہوٹل کے سامنے اُتار دیں جناب!'' میں نے جواب دیا۔

''ہوٹل میں ٹھہرو گے اس چھوکری کے ساتھ؟'' اُس نے مجھے گھورا۔ ''کوئی رشتہ دار، کوئی جاننے والا نہیں ہے یہاں؟''

''نہیں جناب..... ہم پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں۔ یہاں ہم کسی کو نہیں جانتے نہ کوئی ہمیں جانتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کراچی بڑا ظالم شہر ہے.....'' وڈیرے نے کہا۔ ''تم اکیلے ہوتے تو مجھے پرواہ نہ ہوتی۔ لیکن اس چھوکری کے ساتھ میں تمہیں کسی ہوٹل میں نہیں رہنے دُوں گا۔''

''تو پھر..... ہم کیا کریں؟'' میں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا لگتی ہے تمہاری؟'' اُس نے پوچھا۔

''میری پتنی ہے جی۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تو پھر ایسا ہے کہ.....'' اُس نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''کراچی میں میرا بنگلہ ہے گلشن اقبال میں..... کئی کمرے ہیں۔ میں ایک کمرہ تم لوگوں کو دے دُوں گا۔ جب تک چاہو وہاں رہ لینا میرے مہمان بن کر۔ اور یہ بھی رکھ لو اپنے پاس..... کسی اور وقت کام آ جائے گی۔'' اُس نے جیب سے چین نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

''نہیں جناب..... یہ میں آپ کے ہاتھ بیچ چکا ہوں۔ اگر آپ اسے واپس کریں گے تو آپ کو اپنے پیسے بھی واپس لینے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا، اچھا بھئی.....'' وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ چین اُس نے دوبارہ جیب میں رکھ لی تھی۔ ''تم تو ناراض ہونے لگے۔ ہمارا مہمان بننا بھی منظور ہے یا نہیں؟''

''جب تک کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا آپ کی مہمان نوازی اور مہربانیوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

گزشتہ رات سے اب تک وڈیرے نے ہمارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اور اب وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔ اور میں نے بلا تکلف اُسے سب کچھ بتا دیا۔ اب میں پاکستان میں تھا اور میرے دل میں کوئی خوف نہیں رہا تھا۔

''اوہ.....'' میری داستان سن کر وہ اُچھل پڑا۔ ''تم تو ہیرو ہو ہیرو..... بات یہ ہے سائیں کہ ہندوستانی اسمگلروں سے میرے تعلقات ضرور ہے۔ وہ ہمارا کاروبار ہے لیکن اپنے وطن سے محبت ہمارا ایمان ہے۔ ہم نے جیسلمیر والے کیمپ کی تباہی کے بارے میں سنا تھا اور ہم خوش ہوئے تھے۔ اب تم امن کی سرزمین پر آ گئے ہو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ تم سے ملاقات کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ اب تم اور کہیں نہیں جاؤ گے۔ میرا گھر تمہارے لئے حاضر ہے شمروز سائیں! پاکستان کے لوگ بھی کشمیریوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کراچی والوں کو جب پتہ چلے گا کہ تم کون ہو تو وہ تمہارے جلوس نکال دیں گے۔ تمہیں کندھوں پر اُٹھا لیں گے۔ ایک دو روز آرام کر لو سائیں! پھر دیکھنا میں تمہارے کتنے جلوس نکلواتا ہوں۔''

وڈیرہ نوازش علی اس طرح خوش ہو رہا تھا جیسے اُسے بہت بڑی دولت مل گئی ہو۔ اس کے بعد تو وہ میرے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اور پھر اُس نے وہ سوال بھی کر ڈالا جس کے بارے میں، میں بہت دیر سے سوچ رہا تھا۔

''شمروز سائیں! اس چھوکری سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' اُس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ یہ تمہاری پتنی ہے۔ لیکن اب یہ بات صاف ہو گئی کہ نہ تم ہندو ہو اور نہ ہی یہ تمہاری پتنی ہو سکتی ہے۔ اگر میری اُلجھن دُور کر دو تو.....''

''نوازش علی صاحب!'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہندوؤں میں سیتا جیسی لڑکی بھی تھی جس نے میری خاطر اپنی جان دے دی اور یہ کلپنا بھی ہے جو میری خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ آئی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''اوہ.....'' وڈیرہ نوازش علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''تو پھر یوں کہو نا کہ یہ لڑکی ہماری بیٹی ہوئی۔ اور اس کا نام کلپنا نہیں زلیخا ہے۔'' اُس نے پیچھے جھک کر کلپنا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر وہی چین جیب سے نکال کر کلپنا کے ہاتھ میں دے دی۔ ''زلیخا بیٹی! اس وقت تو میری طرف سے یہ سلامی سمجھ کر قبول کر لو! باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔''

کلپنا نے میری طرف دیکھا، اُس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔

''لے لو بھئی.....!'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''انہیں یہ زنجیر واپس کرنا تھی سو کر دی۔'' وڈیرہ نوازش علی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پجیرو مختلف سڑکوں پر ہوتی ہوئی گلشن اقبال کے بلاک سکس میں داخل ہو کر ایک بنگلے کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر رُک گئی۔ ہارن بجانے پر ایک

ادھیڑ عمر آدمی نے گیٹ کھول دیا اور پجیرو اندر داخل ہو کر برآمدے کے سامنے رُک گئی۔ یہ خاصا بڑا بنگلہ تھا۔ وسیع اور بہت خوبصورت لان تھا۔ کوٹھی دو منزلہ تھی۔ اُوپر جانے کے لئے اندر ہی سے زینہ تھا۔ اُس بوڑھے ملازم کا نام آچر تھا۔ یہاں اس کے ساتھ اُس کی بیوی حضوری بھی تھی۔ آچر کو معلوم تھا کہ وڈیرہ نوازش علی آج آنے والا ہے۔ اُس نے کھانا تیار کر رکھا تھا۔

بنگلے میں فرنیچر بھی بہت شاندار تھا۔ وڈیرہ نوازش علی کلپنا کا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں لے گیا۔ میں بھی اُن کے ساتھ ہی تھا۔ کمرے میں لمبے چوڑے وارڈ روب اور دوسری چیزوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ کسی خاتون کا کمرہ تھا۔ وارڈ روب میں ہینگروں پر بڑے شاندار زنانہ ملبوسات ٹنگے ہوئے تھے۔

''بیٹی زلیخا! یہ کمرہ اور اس کی ہر چیز آج سے تمہاری ہے۔ یہ وارڈ روب ہے اور وہ باتھ رُوم کا دروازہ..... جو لباس تمہیں پسند ہو نہا کر پہن لو۔ ہم ایک گھنٹے بعد کھانے کی میز پر تمہارا انتظار کریں گے۔'' وڈیرہ نوازش علی نے کہا اور مجھے دوسرے کمرے میں لے آیا۔ ''یہ فی الحال تمہارا کمرہ ہے..... تم بھی نہا کر تیار ہو جاؤ!'' وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گیا۔ میں چند لمحے کھڑا حیرت سے اُس کے بارے میں سوچتا رہا پھر دروازہ بند کر لیا۔ تھیلا کندھے سے اُتار کر بیڈ پر رکھا اور اپنے کپڑے نکالنے لگا۔

ایک گھنٹے بعد ہم تینوں کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کلپنا نے نیوی بلیو رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس رنگ کا دوپٹہ بھی گلے کی زینت بنا ہوا تھا۔ اس لباس میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

کھانے کے دوران زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ تاہم وڈیرہ نوازش علی بار بار کلپنا کی طرف دیکھ رہا تھا اور ہر بار کوئی نہ کوئی ڈش اُٹھا کر اُس کے سامنے رکھ دیتا اور بڑے اصرار سے اُسے ہر ڈش میں سے کچھ نہ کچھ لینے پر مجبور کرتا رہا۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں بیٹھ کر چائے کے دوران باتیں کرنے لگے۔ وڈیرہ کلپنا کو زلیخا کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا۔ اور بالآخر جب میں نے اس نام کے حوالے سے ایک سوال کیا تو وہ گویا پھٹ پڑا۔

یہ انکشاف میرے لئے بڑا دلچسپ ہوا کہ زلیخا اُس کی بیٹی کا نام تھا جو کراچی کے ایک کالج میں زیرِ تعلیم تھی اور ایک سال پہلے اس شہر میں کار کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئی تھی۔ اب بات میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ کلپنا کو بار بار اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا۔ اُسے کلپنا میں اپنی زلیخا کی جھلک نظر آئی تھی اور وہ کمرہ بھی زلیخا کا تھا جس کی ہر چیز اُس نے کلپنا کے حوالے کر دی تھی۔

''میں نے اپنی حویلی میں کلپنا کو دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ تم لوگوں کو اپنی گاڑی پر کراچی لے کر جاؤں گا اور تمہارا گھر دیکھ لوں گا اور بعد میں کسی نہ کسی بہانے تم لوگوں سے رابطہ رکھوں گا۔'' وڈیرہ نوازش علی کہہ رہا تھا۔ ''لیکن راستے میں تم نے جو انکشافات کئے اس سے مجھے اپنے

دل کی بات کہنے کا موقع مل گیا۔ آج میں بہت خوش ہوں..... مجھے میری بیٹی بھی مل گئی ہے اور ایک ایسا شخص بھی جس کی دوستی پر میں فخر کر سکتا ہوں۔''

''ہم اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہمیں آپ جیسا مربی مل گیا۔'' میں نے کہا۔

ہم رات کے تقریباً دو بجے تک باتیں کرتے رہے اور پھر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ بستر پر لیٹتے ہی میں سو گیا اور صبح دس بجے سے پہلے میری آنکھ نہیں کھل سکی تھی۔ کلپنا بھی اپنے کمرے میں سو رہی تھی اور وڈیرہ نوازش علی کہیں جا چکا تھا۔

ہم نے ناشتہ کیا اور وڈیرہ بارہ بجے کے قریب واپس آ گیا۔ اور پھر اُس کا زیادہ وقت مختلف لوگوں سے ٹیلی فون پر باتیں کرتے گزرا۔

چار بجے کے قریب کچھ لوگ آ گئے جنہوں نے کچھ ایسی تیاریاں شروع کر دیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا جیسے کوئی دعوت ہونے والی ہو۔ لان کے آدھے حصے میں ایک طرف مختصر سا سٹیج بنا دیا گیا تھا جس کے سامنے کئی کرسیاں قطار در قطار رکھ دی گئی تھیں جبکہ لان کے باقی حصے میں میزیں لگا کر اُن پر کراکری سجائی جا رہی تھی۔ روشنی کا بھی معقول انتظام کیا جا رہا تھا۔

ساڑھے چھ بجے مہمان آنا شروع ہو گئے..... وڈیرہ نوازش علی نے مجھے اور کلپنا کو ایک کمرے تک محدود کر دیا اور خود باہر جا کر مہمانوں کا استقبال کرنے لگا۔ اور پھر جب سات بجے کے قریب وہ ہم دونوں کو باہر لے کر آیا تو میری آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی.....

لان میں درجنوں پریس رپورٹرز موجود تھے..... کئی فوٹو گرافرز تھے اور نصف درجن سے زیادہ ٹی وی کیمرے مختلف جگہوں پر لگے ہوئے تھے..... رپورٹروں اور فوٹو گرافرز میں مقامی بھی تھے اور غیر ملکی بھی۔ ہم جیسے ہی برآمدے میں نکلے کیمروں کی فلیش لائٹس چمکنے لگیں اور ٹی وی کیمروں کے رُخ ہماری طرف ہو گئے.....

میں اور کلپنا بری طرح بدحواس ہو گئے۔ وڈیرہ نوازش علی ہمیں سٹیج پر لے آیا جہاں تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو کرسیوں پر ہم بیٹھ گئے اور تیسری کرسی پر وڈیرہ براجمان ہو گیا۔ کافی دیر تک کیمروں کی فلیش لائٹس بجلی کے کوندوں کی طرح چمکتی رہیں اور پھر وڈیرہ نوازش علی اُن سب لوگوں سے میرا تعارف کرانے لگا۔ میں نے اُسے جو کچھ اپنے بارے میں بتایا تھا وہ اُس نے رپورٹروں کو بتا دیا..... اور پھر رپورٹرز مجھ سے سوالات کرنے لگے۔ بعض غیر ملکی رپورٹرز مجھ سے تاریخوں کے حوالے دے کر کشمیر کے اُن واقعات کے بارے میں پوچھتے رہے جو میرے نام سے منسوب تھے۔ میں اُنہیں تفصیل سے سب کچھ بتاتا رہا۔ سیتا کے بارے میں بھی کئی سوالات کئے گئے۔ میں نے اُن سوالوں کے جواب بھی بڑے اطمینان بخش طریقے سے دیئے۔ جیسلمیر کیمپ کی تباہی کے بارے میں بہت سے سوالات کئے گئے اور میں ان کے بھی جواب دیتا رہا۔

ایک گھنٹے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا..... ٹی وی چینلز کے نمائندے تو فوراً ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اخبارات کے رپورٹرز میزوں کے گرد کھڑے ناؤ نوشی کے دوران بھی مجھ سے اور کلپنا سے مختلف سوالات کرتے رہے۔

نو بجے ہم لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے اور پھر خبرنامے میں ٹی وی اسکرین پر اپنے آپ کو دیکھ کر میں اُچھل پڑا..... کشمیر کے حوالے سے وزیراعظم کے ایک بیان کے بعد ہماری اس پریس کانفرنس کی کارروائی نشر کی جا رہی تھی۔

وڈیرہ نوازش علی چینلز تبدیل کرتا رہا۔ ہر چینل کے نیوز بلیٹن میں میری اس پریس کانفرنس کو سب سے زیادہ اہمیت دی جا رہی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری شخصیت اس قدر اہم ہو گی۔ لیکن وہ حقیقت میرے سامنے تھی جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا.....!

○

وڈیرہ نوازش علی اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا۔ کلپنا صوفے پر میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے آپ کو ٹی وی پر دیکھ کر اُس کے چہرے پر بھی سنسنی کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ انٹرویو کے دوران بعض رپورٹروں نے اُس سے چند سوالات پوچھے تھے لیکن وہ زیادہ تر خاموش ہی رہی تھی۔ کشمیر کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ البتہ خود اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا یا جیسلمیر میں اُس نے ''را'' کے ظلم و ستم کے جو مظاہرے دیکھے تھے اُن کے بارے میں اُس نے بہت کچھ بتایا تھا۔ کلپنا نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ زندگی میں کبھی اس طرح اُس کی پذیرائی ہو گی یا اس طرح وہ ٹی وی پر آئے گی۔ اور اب وہ اپنے آپ کو ٹی وی کی سکرین پر دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔

لیکن..... میں اس صورتحال سے مطمئن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ پاکستان میں بھی بھارتی انٹیلی جنس کے ایجنٹ موجود تھے جو مختلف شہروں میں بم دھماکوں اور تخریب کاری کی دیگر وارداتوں کے ذریعے پاکستان میں انتشار پھیلا رہے تھے۔ ان بھارتی ایجنٹوں کا زیادہ زور کراچی میں تھا جہاں آئے دن دہشت گردی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ بعض ایجنٹ پکڑے جاتے تھے اور بعض انسانوں کے اس جنگل میں غائب ہو جاتے تھے۔

میں ٹی وی پر آ گیا تھا..... اور مجھے تشویش یہ تھی کہ بھارتی ایجنٹوں کو بھی ظاہر ہے پتہ چل گیا ہو گا اور یقیناً وہ خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ میں نے کلپنا کے سامنے اپنے ان خدشات کا اظہار نہیں کیا لیکن گیارہ بجے کے قریب وڈیرہ نوازش علی واپس آیا تو میں نے اُسے اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔

''میں جانتا ہوں سائیں.....'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے ایک غلطی تو ہو گئی لیکن میں نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔''

''وہ کیا.....؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''ابھی بتاؤں گا..... تھوڑی دیر میں پتہ چل جائے گا۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور پھر مجھے پتہ چل گیا کہ اُس نے کیا بندوبست کیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک گاڑی کوٹھی کے سامنے آ کر رُکی۔ وڈیرہ نوازش علی اُٹھ کر گیٹ سے باہر چلا گیا اور میں بھی برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ سکیورٹی گارڈز کی وردی میں ملبوس چار لمبے تڑنگے آدمی تھے۔ وہ کسی سکیورٹی ایجنسی سے آئے تھے۔ چاروں کے ہولسٹرز میں پستول نظر آ رہے تھے۔ اُن کے ساتھ پانچواں آدمی سادہ لباس میں تھا۔ وہ شاید اس سکیورٹی ایجنسی کا کوئی آفیسر تھا۔ اُس نے گھوم پھر کر کوٹھی کا جائزہ لیا اور اُن چاروں گارڈز کو اس طرح متعین کر دیا کہ اُن کی نظروں میں آئے بغیر کوئی غیر متعلق شخص کوٹھی کے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا۔ اُن میں سے دو کی ڈیوٹی تو کوٹھی کے مرکزی گیٹ پر لگا دی گئی تھی۔ ایک کو اُوپر کی منزل پر سامنے کے رُخ پر تعینات کیا گیا تھا اور ایک کی ڈیوٹی کوٹھی کے پچھلے حصے پر لگا دی گئی تھی تاکہ پچھلی گلی پر بھی نگاہ رکھی جا سکے۔

یہ کوٹھی کی حفاظت کا بہترین انتظام تھا۔ کوئی غیر متعلق شخص کوٹھی میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے وڈیرہ نوازش علی اس انتظام سے مطمئن ہو لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ یہ سکیورٹی گارڈز اگرچہ ریٹائرڈ فوجی تھے اور بڑے چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف بھارتی انٹیلی جنس کے ایجنٹ تھے جنہیں اس قسم کی صورتحال سے نمٹنے کی خصوصی تربیت دی گئی تھی اور مجھے ان کا اچھا خاصا تجربہ بھی تھا۔ نجانے کیا بات تھی کہ ان انتظامات کے باوجود میری تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ اگلے روز صبح سویرے ہی وڈیرہ نوازش علی نے اپنے نوکر آچر کو بھیج کر کئی اخبارات منگوا لئے۔ ٹی وی کی طرح اخبارات نے بھی ہمارے بارے میں خبروں کو سب سے زیادہ اہمیت دی تھی۔ ہر اخبار کی ہیڈ لائن یہی تھی۔ ہر اخبار کے صفحہ اوّل پر میری اور کلپنا کی تصویریں بھی تھیں۔ بعض اخبارات نے وڈیرہ نوازش علی کی تصویریں بھی شائع کی تھیں۔ کلپنا اپنی تصویریں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔

گزشتہ رات ٹی وی پر خبر نشر ہونے کے بعد کئی لوگوں کے ٹیلی فون آئے تھے۔ اور اب بھی آٹھ بجے کے بعد ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھ گیا..... حالانکہ صرف ایک اخبار نے وڈیرہ نوازش علی کا فون نمبر شائع کیا تھا اور عوام کو اطلاع دی تھی کہ کشمیر کے اس مجاہد اعظم سے اس نمبر پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کشمیر میں میری کارروائیوں پر مجھے مبارکباد دینا چاہتے تھے۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ میرے ساتھ آنے والی لڑکی کلپنا نہیں سیتا ہے جو کشمیر اور ہندوستان میں میرے ساتھ سرگرم رہی تھی۔ اور شاید بعض وجوہات کی بناء پر اس کا اصل نام نہیں چھاپا گیا تھا۔ بہت سے لوگ تو صرف کلپنا ہی سے بات کرنے کے

خواہش مند تھے۔

اُس روز کئی کشمیری رہنماؤں کے بھی فون آئے تھے جو کراچی میں اپنی تحریک کے سلسلے میں سرگرم تھے۔ یہ سب لوگ مجھ سے ملنا چاہتے تھے لیکن میں مصروفیت کا بہانہ بنا کر اُنہیں فی الحال ٹالتا رہا۔ میں کوئی لائحہ عمل طے کئے بغیر کسی سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ میں کسی ایسے کشمیری رہنما سے ضرور ملنا چاہتا تھا جس کا تعلق کشمیر میں بھارتی فوجیوں کے خلاف برسر پیکار اُس پارٹی سے ہو جس سے میں بھی وابستہ رہ چکا تھا۔

تین چار روز گزر گئے۔ میں اخبارات کے ذریعے صورتحال کا جائزہ لیتا رہا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ بھی کوٹھی سے باہر نہیں نکلا تھا البتہ وڈیرہ نوازش علی ایک مرتبہ کلپنا کو ساتھ لے گیا تھا۔ اور تقریباً تین گھنٹوں بعد وہ واپس آئے تو کلپنا تحائف سے لدی پھندی تھی۔ وارڈ روب میں اگرچہ وڈیرے کی بیٹی زلیخا کے ملبوسات بھرے ہوئے تھے لیکن اُس نے کلپنا کو اور بھی کئی جوڑے خرید کر دیئے تھے۔

وڈیرہ نوازش علی کے اور بھی کچھ رشتے دار کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ وہ لوگ اکثر ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ اُن کی خواتین تو بس کلپنا کو گھیرے رہتی تھیں۔ وہ سب لوگ اُسے زلیخا ہی کے نام سے پکارتے تھے۔

کئی روز گھر میں بند رہنے کے بعد بالآخر میں نے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا..... میں نے ان کشمیری رہنماؤں کی ایک فہرست بھی تیار کر رکھی تھی جن سے میں ملنا چاہتا تھا۔

کراچی میں لاتعداد کشمیری آباد تھے۔ یہاں مختلف پارٹیوں کے دفتر بھی تھے لیکن مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ یہ لوگ صرف بیانات کی حد تک محدود تھے۔ یہاں میری بعض ایسے خود ساختہ کشمیری لیڈروں سے بھی ملاقات ہوئی جو کشمیر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ کشمیر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے اُن کے اپنے کوئی ذرائع نہیں تھے۔ اُن کا انحصار اخبارات پر ہی تھا۔ تاہم پاکستان کی ایک دینی جماعت جہاد کشمیر کے حوالے سے بہت زیادہ سرگرم تھی۔ اُس جماعت کے رہنما جلسوں میں اپنے پُرجوش خطابات سے لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑتے رہتے تھے۔ یہاں سے مجاہدین کو بھی کشمیر کے محاذ پر جہاد کے لئے بھیجتے رہتے تھے۔ اور مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ محاذ پر جانے والے یہ مجاہدین کشمیری نہیں تھے۔ وہ پاکستانی نوجوان تھے جو ہندوؤں سے برسر پیکار کشمیری مجاہدین کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے گھربار اور آرام و آسائش چھوڑ کر جہاد کے لئے جاتے تھے۔ پاکستان کی یہی دینی جماعت کشمیری مجاہدین اور مقبوضہ کشمیر سے لٹ پٹ کر آنے والے مہاجرین کے لئے ضرورت کا سامان جمع کر کے بھی بھیجتی رہتی تھی۔ جبکہ اصل کشمیری باشندوں کو ایسے کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو چندے جمع کر کے اور بیانات کے ذریعے اپنی لیڈری چلا رہے تھے۔

آٹھ دس دنوں کے دوران کسی ایسے کشمیری سے میری ملاقات نہیں ہو سکی جو واقعی کسی کشمیری

تنظیم سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ چند روز بڑے سکون سے گزر گئے تھے۔ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں بڑی حد تک بیزار ہو چکا تھا اور کشمیر کی طرف جانا چاہتا تھا تاکہ اپنی سرزمین پر پہنچ کر اپنی سرزمین کی آزادی کے لئے ایک بار پھر سرگرم عمل ہو سکوں..... لیکن وڈیرہ نوازش علی نے مجھے روک رکھا تھا کہ میں چند روز اور آرام کر لوں۔

اُس رات دو مہمان آئے تھے۔ وہ دونوں کشمیری نہیں تھے لیکن کشمیریوں کے ہمدرد ضرور تھے۔ اُنہوں نے رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھایا تھا۔ کھانے کے بعد کلپنا تو اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور ہم لوگ دیر تک لاؤنج میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

اُن میں رئیس غوث بخش نام کا ایک شخص وڈیرہ نوازش علی کا دُور کا رشتہ دار بھی ہوتا تھا اور دوسرا مقبول احمد اُس کا دوست تھا۔ رات دو بجے کے قریب جب وہ لوگ جانے لگے تو وڈیرہ نوازش علی نے اُنہیں روک لیا۔ آچر نے فوراً ہی اُوپر والے ایک کمرے میں اُن کے لئے بستر درست کر دیئے تھے۔ وہ دونوں ڈھائی بجے کے قریب اُوپر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وڈیرہ نوازش علی بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔

یہاں آنے کے بعد کلپنا اور میں الگ الگ کمروں میں سوتے تھے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں نے کلپنا کے کمرے میں جھانکا۔ نیلی مدھم روشنی والا نائٹ بلب جل رہا تھا اور کلپنا کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کا چہرہ میری طرف تھا اور وہ جاگ رہی تھی۔ مجھے دروازے میں دیکھ کر وہ اُٹھ گئی۔ میں بھی آگے بڑھ آیا۔

''کیا بات ہے..... تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''نیند نہیں آ رہی.....'' کلپنا نے جواب دیا۔ ''پتہ نہیں کیا بات ہے..... عجیب سی وحشت طاری ہو رہی ہے۔''

''اپنا گھر یاد آ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا گھر تو وہی ہے جہاں تم ہو گے.....'' کلپنا بولی۔ ''لیکن آج تو بڑی وحشت سی ہو رہی ہے۔''

''تین بجنے والے ہیں۔ لیٹ کر آنکھیں بند کر لو! نیند آ جائے گی۔'' میں کہتے ہوئے کمرے سے باہر آ گیا۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں بھی اپنے بستر پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ میں دراصل اس صورتحال سے پریشان تھا جس کا مشاہدہ میں کئی روز سے کر رہا تھا۔ کراچی میں لاکھوں کشمیری آباد تھے۔ اُن میں دولت مند بھی تھے، غریب بھی اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے بھی۔ پوش علاقوں میں اُن کے قالینوں اور کاروں کے شوروم بھی تھے اور یہ ٹھیلوں پر سبزیاں بھی بیچتے تھے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ یہ لوگ مطمئن اور پُرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُنہیں کشمیر میں ہونے والی جنگ سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میں یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی آہٹ محسوس کر کے چونک گیا۔ گردن گھما کر اُس

طرف دیکھا تو کلپنا دروازے میں کھڑی تھی۔ مجھے حرکت کرتے دیکھ کر وہ آگے آ گئی۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی..... اکیلے میں ڈر لگ رہا ہے۔'' کلپنا کے لہجے میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ میں بھی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''یہاں لیٹ جاؤ.....'' میں کنارے کی طرف سرک گیا۔ ''تمہیں کس بات کی وحشت ہو رہی ہے..... اور یہاں ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''پتہ نہیں.....'' وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ ''دو تین دن سے دل میں ہول سے اُٹھ رہے ہیں۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔''

''کچھ نہیں ہونے والا..... آنکھیں بند کر لو اور اطمینان سے سو جاؤ!'' میں نے کہا اور اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا۔

کلپنا دھیمے لہجے میں باتیں کرتی رہی اور پھر وہ سو گئی۔ میں نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا اور پلنگ کے کنارے پر کروٹ پھیر کر لیٹ گیا۔ میں کافی دیر تک کلپنا کے بارے میں سوچتا رہا جو اپنا سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ یہاں اگرچہ اُسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اُسے وڈیرہ نوازش علی کے خاندان کی خواتین اور دوسرے لوگوں سے بہت پیار ملا تھا۔ وڈیرہ نوازش علی سے باپ جیسی شفقت ملی تھی۔ لیکن اُسے اپنا دیش اور اُس دیش کے لوگ تو یاد آتے ہوں گے۔ اور میں جانتا تھا کہ ایسی یادیں ہی بعض اوقات انسان کے لئے سوہانِ رُوح بن جاتی ہیں۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں.....

میں پتہ نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ ایک زوردار دھماکہ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی..... دھماکہ ایسا تھا جیسے سر پر بم پھٹا ہو۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا اور دوسرے ہی لمحہ کلپنا بھی چیختی ہوئی اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی..... اُسی لمحہ ایک اور زوردار دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ بھی بم کی طرح زوردار تھا۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو..... میں پلنگ کے بالکل کنارے پر تھا۔ کلپنا مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اُچھلی تو میں اُس کے دھکے سے پلنگ کے نیچے گر گیا۔ کلپنا بھی میرے اُوپر ہی گری تھی۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔

پے در پے دھماکے ہو رہے تھے..... اس کے ساتھ ہی انسانی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں..... پھر پستول یا ریوالور سے فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔

جب میں کشمیر میں تھا تو کسی چھاپہ مار کارروائی کے دوران ایسے زوردار دھماکوں، چیخوں اور فائرنگ کی آوازیں سنائی دیا کرتی تھیں۔ ایک لمحہ کو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ لیکن یہ کوئی خواب نہیں حقیقت تھی.....!

اسی لمحہ وڈیرہ نوازش علی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''شمروز..... زلیخا! کہاں ہو تم لوگ.....؟''

''ہم یہاں ہے بابا! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا۔

ٹھیک اُسی وقت ایک اور زوردار دھماکہ ہوا..... اور پھر یوں لگا جیسے عمارت کا کوئی حصہ گرا ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی وڈیرہ نوازش علی کی چیخ سنائی دی۔ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ راہداری میں پہنچتے ہی میں رُک گیا۔ شدید سردی اور سنسنی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی چلی گئی.....

کوٹھی کا لاؤنج والا حصہ گر چکا تھا..... ایک اور زوردار دھماکہ ہوا اور عمارت کا ایک اور حصہ بیٹھتا ہوا نظر آیا۔ کمرے میں کلپنا کی چیخوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا کمرے میں پہنچ گیا اور کلپنا کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے کے پچھلے دروازے کی طرف دوڑا۔ یہ دروازہ عقبی صحن میں کھلتا تھا۔ اس طرف بھی بہت وسیع و عریض لان تھا۔ میں کلپنا کو کھینچتا ہوا لان کے آخری سرے پر دیوار کے قریب بیٹھ گیا۔

''تم یہاں بیٹھو..... میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے کلپنا کو دیوار کے قریب بٹھا دیا۔

''مجھے چھوڑ کر مت جاؤ..... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' کلپنا چیخی۔

وڈیرہ ملبے کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اُس کی زندگی خطرے میں ہے۔'' میں نے بھی چیخ کر کہا۔

''تم یہاں بیٹھی رہو! یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' میں دوڑتا ہوا عمارت میں گھس گیا۔ دھماکوں کی آوازیں اب سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ کوٹھی پر حملہ کیا گیا تھا اور یہ حملہ سامنے کے رُخ پر سڑک کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس حملے میں راکٹ برسائے گئے تھے۔ اگر بم پھینکے گئے ہوتے تو عمارت مکمل طور پر ملبے کا ڈھیر بن چکی ہوتی۔

عمارت کے کچھ حصے گرے تھے۔ وڈیرہ ہال کے دوسری طرف والی راہداری کے ایک کمرے میں تھا۔ وہ دھماکوں کی آواز سن کر ہماری خیریت دریافت کرنے کے لئے اس طرف دوڑا تھا لیکن ایک گرتی ہوئی دیوار کے نیچے دب گیا تھا۔ وڈیرے کی دونوں ٹانگیں ملبے کے نیچے دبی ہوئی تھیں اور وہ مدد کے لئے چیخ رہا تھا۔ میں جھک کر اُس پر سے ملبہ ہٹانے لگا۔ اسی دوران ایک گارڈ بھی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ہم دونوں نے مل کر وڈیرے کو ملبے سے نکالا۔ اُس کی ایک ٹانگ بری طرح کچلی گئی تھی۔ جبکہ دوسری ٹانگ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ ہم دونوں نے اُسے لان میں دُور لے جا کر گھاس پر لٹا دیا اور دوبارہ عمارت کی طرف دوڑے۔

اُس عمارت پر سڑک کی طرف کسی گاڑی سے پانچ راکٹ برسائے گئے تھے..... تین راکٹ عمارت کے اُوپر والے حصے پر لگے تھے اور دو نچلے حصے میں۔ اُوپر جانے والی سیڑھیاں سلامت تھیں۔ میں اور گارڈ دوڑتے ہوئے اُوپر پہنچ گئے۔ اُوپر زیادہ تباہی پھیلی تھی۔ اُوپر کی منزل پر سامنے کے رُخ پر جو گارڈ ڈیوٹی دے رہا تھا وہ ختم ہو چکا تھا..... وہ کمرہ بھی ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا جس میں رئیس غوث بخش اور مقبول احمد سوئے ہوئے تھے۔ مقبول احمد ملبے کے نیچے دب کر ختم ہو چکا تھا جبکہ رئیس غوث بخش شدید زخمی ہو گیا تھا۔ ہم کسی نہ کسی طرح اُسے نیچے لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک گارڈ بھی شدید زخمی ہوا تھا۔ جبکہ چوتھا گارڈ معمولی زخمی تھا اور

وڈیرے کے ملازم آچر کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ شاید وہ ملبے کے نیچے دب کر ختم ہو چکا تھا یا بے ہوش تھا۔ پکارنے کے باوجود کسی طرف سے اُس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

مجھے حیرت تھی کہ یہاں اتنی شدید راکٹ بازی ہوئی تھی۔ آس پاس کی کوٹھیاں اگرچہ محفوظ رہی تھیں لیکن کوئی پڑوسی صورتحال معلوم کرنے کے لئے باہر نہیں نکلا تھا۔ اپنی جان تو سب کو عزیز ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں باہر نکلنے کی حماقت کون کر سکتا ہے؟

مجھے ایک اور بات پر بھی حیرت تھی۔ کوٹھی کے اُوپر والا حصہ تقریباً پوری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ چند دیواریں کھڑی تھیں۔ نیچے کے حصے میں بھی تباہی پھیلی تھی لیکن بجلی ابھی تک برقرار تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُوپر والی ایک دیوار دھڑام سے گری اور اس کے ساتھ ہی تاریکی چھا گئی..... گلی کے کھمبے سے بجلی کی لائن اسی دیوار پر لگے ہوئے ایک بریکٹ سے منسلک تھی۔ وہ دیوار گری تو برقی رو بھی منقطع ہو گئی۔ اور یہ بھی مقام شکر تھا کہ راکٹ بازی یا بجلی کی تاریں ٹوٹنے سے آگ نہیں لگی تھی۔

اندھیرا ہوتے ہی کوٹھی کے پچھلی طرف سے کلپنا کی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں بد حواس ہو کر اُس طرف دوڑا۔ اندھیرے میں ٹھوکریں لگنے سے میں دو تین مرتبہ گرتے گرتے بچا تھا۔

''کلپنا..... کہاں ہو تم؟'' میں کوٹھی کے عقبی لان میں پہنچ کر چیخا۔

''مم..... میں..... میں یہاں ہوں۔'' اندھیرے میں ایک طرف سے کلپنا کی ڈری ڈری چیخ سنائی دی۔

میں دوڑتا ہوا اُس طرف پہنچ گیا۔ عقبی کوٹھی سے بہت مدھم سی روشنی اس طرف پہنچ رہی تھی لیکن واضح طور پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کلپنا نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں کلپنا کو لے کر کوٹھی کے سامنے والے لان میں آ گیا..... ایک گن مین گیٹ کھول کر باہر جا چکا تھا۔ وہ سامنے والی کوٹھی کا گیٹ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ میں نے کلپنا کو وڈیرہ نوازش علی کے پاس گھاس پر بٹھا دیا اور خود بھی باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

سامنے کی کوٹھی کے لوگ ہماری آوازیں سن کر اطمینان کر لینے کے بعد ہی باہر نکلے تھے۔ وہ لوگ بھی ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک آدمی نے بتایا کہ اُس نے فون کر دیا ہے۔ پولیس آنے ہی والی ہو گی۔

کچھ اور کوٹھیوں کے لوگ بھی باہر آ گئے۔ شروع میں جب ہم یہاں آئے تھے تو ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے ہمیں بڑی شہرت ملی تھی۔ اس گلی کے رہنے والے تو ہمارے بارے میں اچھی طرح جان چکے تھے۔ اور اب وہ لوگ بھی سمجھ گئے تھے کہ حملہ ہم پر ہوا تھا۔

پولیس آدھے گھنٹے بعد پہنچی تھی اور اس کے مزید آدھے گھنٹے بعد دو ایمبولینس گاڑیاں بھی پہنچ گئیں۔ زخمیوں اور لاشوں کو ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ پہلے پولیس کی صرف ایک موبائل آئی تھی۔

اُس پولیس پارٹی کے انچارج نے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے کر مزید پولیس منگوالی تھی۔

کلپنا کو سامنے کی کوٹھی میں رہنے والی عورتیں اپنے ساتھ لے گئیں اور میں پولیس کے ساتھ ٹارچوں کی روشنی میں وڈیرے کے ملازم آچر اور چوتھے گن مین کو تلاش کرنے لگا۔ رات کی تاریکی رخصت ہو رہی تھی اور دن کا اُجالا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ دن کے اجالے میں تلاش کا کام آسان ہو گیا۔ دونوں کی لاشیں ملبے کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ اُنہیں بھی ایک ایمبولینس کے ذریعے بھیج دیا گیا۔

ملگجا اُجالا اب دن کی تیز روشنی میں بدل رہا تھا۔ گلی میں بیسیوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ پولیس والوں کو جب یہ پتہ چلا کہ یہ حملہ ایک معروف کشمیری مجاہد اور اُس کی ساتھی کو ہلاک کرنے کے لئے کیا گیا تھا تو اُنہوں نے فوراً ہی اپنے افسرانِ اعلیٰ کو اطلاع دے دی اور دن کی روشنی پھیلنے تک پولیس کے بعض اعلیٰ افسران بھی پہنچ گئے اور اخبارات کے فوٹو گرافروں اور رپورٹروں نے بھی وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

پولیس کے ایک ذمہ دار آفیسر نے فوراً ہی پریس کو یہ بیان دے دیا کہ یہ بھارتی انٹیلی جنس ''را'' کے ایجنٹوں کی کارروائی ہے جنہوں نے ایک کشمیری مجاہد کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کشمیری مجاہد کے بارے میں ٹی وی پر بھی بہت کچھ آ چکا ہے اور اخبارات میں بھی بہت کچھ چھپ چکا ہے۔

ایک اخباری رپورٹر نے پولیس آفیسر کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پولیس کو معلوم تھا کہ وہ مجاہد کشمیر میں اور پھر راجستھان میں پاکستان کے خلاف بھارتی انٹیلی جنس کے نیٹ ورک کو بھاری نقصان پہنچا کر یہاں آیا تھا۔ یہ بھارتی انٹیلی جنس کے لئے موسٹ وانٹڈ آدمی ہے۔ یہاں بھی ''را'' کے تربیت یافتہ ایجنٹ موجود ہیں۔ اسے یہاں بھی خطرہ تھا اور پولیس بھی اس خطرے سے آگاہ تھی اس کے باوجود سرکاری طور پر اس مجاہد کی حفاظت کے لئے کوئی انتظامات کیوں نہیں کئے گئے؟''

''ہم سے اس کے لئے کوئی درخواست نہیں کی گئی تھی۔'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ ''لیکن میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ حملہ آوروں کو بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔''

میں خاموش کھڑا پولیس اور پریس رپورٹروں کی بحث سنتا رہا۔ فوٹو گرافروں نے میری تصویریں بھی کھینچی تھیں۔ پولیس نے تباہ شدہ کوٹھی کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ نصف درجن کانسٹیبل اس کوٹھی پر بھی تعینات کر دیئے گئے جہاں کلپنا موجود تھی۔ اور پھر میں ایک پولیس پارٹی کے ساتھ ہسپتال روانہ ہو گیا۔

ہسپتال میں عجیب سماں تھا..... افراتفری مچی ہوئی تھی۔ وڈیرہ نوازش علی کا دوست مقبول محمد اور دو گن مین ہلاک ہو چکے تھے۔ دوسرا گن مین معمولی زخمی ہوا تھا جسے مرہم پٹی کے بعد فارغ کر دیا گیا تھا۔ رئیس غوث بخش کا ایک بازو اور کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وڈیرہ نوازش کی

بھی ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ وہ دونوں آپریشن تھیٹر میں تھے۔

مجھے آپریشن تھیٹر میں نہیں جانے دیا گیا۔ وڈیرہ نوازش علی کی گلی میں رہنے والے چند لوگ بھی اپنی گاڑیوں پر ہسپتال پہنچ چکے تھے۔ وڈیرے کے اُن سے اچھے تعلقات تھے اور وہ لوگ اُس کی ہمدردی اور محبت میں چلے گئے تھے۔

پولیس کی بھاری نفری بھی ہسپتال میں موجود تھی۔ چند مسلح پولیس والوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ پہلے میں بینچ پر بیٹھا رہا پھر مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ میں وہ پورا دن ہسپتال میں ہی رہا۔ اس دوران دو تین مرتبہ وڈیرہ نوازش علی کے پڑوسی کو فون کر کے کلپنا کے بارے میں بھی دریافت کر لیا تھا۔ اگرچہ اُس کی حفاظت کے لئے نصف درجن پولیس والے اُس کوٹھی پر تعینات تھے۔ اُن کے علاوہ بھی پولیس کی بھاری نفری نے وڈیرے کی تباہ شدہ کوٹھی کو گھیرے میں لے رکھا تھا لیکن کلپنا خوفزدہ تھی۔

دوپہر کے گیارہ بجے کے قریب بعض ایوننگ پیپرز مارکیٹ میں آ گئے تھے۔ ہر اخبار کی ہیڈ لائن ایک ہی تھی۔

''کشمیری مجاہد کی کوٹھی پر حملہ..... چار افراد ہلاک۔''

تفصیلات تو وہی تھیں جو آپ جان چکے ہیں۔ لیکن اخبارات نے خوفناک حد تک سنسنی پھیلانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

وڈیرہ نوازش علی اور رئیس غوث بخش کو پرائیویٹ رومز میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ اُن دونوں کے جسم پلاسٹر اور پٹیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ مجھے تھوڑی ہی دیر اُن کے پاس رہنے دیا گیا۔ وڈیرے کے کئی رشتے دار بھی ہسپتال میں موجود تھے۔ مجھے ہسپتال سے جانے کے لئے کہا گیا تو وڈیرے کا ایک قریبی عزیز رئیس سلطان بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ اکثر کوٹھی پر آتا رہا تھا اور مجھ سے خاصا بے تکلف بھی تھا۔ ہم کار پر ہسپتال سے روانہ ہوئے تو میری حفاظت کے لئے پولیس کی ایک موبائل بھی ہمارے ساتھ تھی۔

کوٹھی کا بالائی حصہ اگرچہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا لیکن گراؤنڈ فلور کے کچھ حصے رہائش کے قابل تھے۔ لیکن وہاں نہ تو بجلی تھی اور نہ ہی گیس۔ حفاظتی نکتہ نظر کے تحت مین لائن سے ان کے کنکشن کاٹ دیئے گئے تھے۔

میرے لئے واقعی پریشانی کی بات تھی کہ کہاں جاؤں..... کلپنا بھی خاصی پریشان تھی۔ ایسے موقع پر رئیس سلطان ہی ہماری مدد کو آگے آیا تھا۔ اُس نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی تو میں انکار نہیں کر سکا تھا۔ رئیس سلطان کا بنگلہ گلشن اقبال کے بلاک نمبر دو میں تھا۔ دو سو چالیس گز کا یہ بنگلہ بھی دو منزلہ تھا۔ نچلی منزل کا ایک کمرہ ہمارے لئے خالی کر دیا گیا۔ نصف درجن پولیس والے بھی ہماری حفاظت کے لئے بنگلے پر تعینات ہو چکے تھے۔

اُس رات میں اور کلپنا دیر تک جاگتے رہے اور اس صورتحال پر غور کرتے رہے۔ اس میں

شبہ نہیں تھا کہ کوٹھی پر راکٹوں سے حملہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی ''را'' کے ایجنٹوں ہی نے کیا تھا۔ پچھلے چند روز سکون سے گزرے تھے تو میں ''را'' کو بھول گیا تھا۔ لیکن ''را'' والے مجھے نہیں بھولے تھے۔ پاکستان میں بھی اُن کا مضبوط نیٹ ورک قائم تھا اور کراچی میں تو وہ بہت عرصہ سے بڑے منظم طریقے سے اپنی مذموم سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ وہ لوگ میرے خلاف کارروائی کے لئے موقع کی تلاش میں تھے۔ اور بالآخر انہیں موقع مل گیا تھا۔

کوٹھی کے گیٹ پر تعینات گن مین کے کہنے کے مطابق صبح چار بجے کے قریب کوٹھی سے تقریباً پچاس گز دُور سڑک پر ایک کار آ کر رُکی تھی۔ کوٹھی پر اُسی کار سے راکٹ برسائے گئے تھے۔ گن مین نے گیٹ پر موجود اپنے دوسرے ساتھی کے ہمراہ پوزیشن سنبھال کر اُس کار پر فائرنگ بھی کی تھی لیکن وہ کار پستولوں کی رینج سے دُور تھی۔ اور وہ دہشت گرد کوٹھی پر یکے بعد دیگرے پانچ راکٹ برسانے کے بعد کار میں فرار ہو گئے تھے۔ اس خوفناک حملے میں، میں تو بچ گیا تھا لیکن چار بے گناہ مارے گئے تھے اور ہمیں پناہ دینے والا وڈیرہ نوازش علی شدید زخمی ہوا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ شاید وہ اب کبھی بھی اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔

یہ جو کچھ بھی ہوا تھا بہت افسوس ناک تھا۔ اور مجھے اس پر بہت دُکھ تھا کہ میری وجہ سے چار بے گناہ انسان اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور وڈیرہ نوازش علی جیسا مخلص اور انسان دوست شخص نہ صرف زندگی بھر کے لئے مفلوج ہو گیا تھا بلکہ اُس کی کوٹھی بھی تباہ ہو گئی تھی۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ افسوس اور دُکھ اس بات کا تھا کہ کراچی میں کشمیریوں کی کئی تنظیمیں تھیں۔ ہر تحریک جہاد کی دعویدار تھی لیکن کسی کشمیری لیڈر نے اس خوفناک واقعہ کے بعد مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

کراچی میں ان تنظیموں کے بارے میں شروع میں میرا جو تجزیہ تھا وہ درست ثابت ہوا تھا۔ ان تنظیموں کے لیڈروں میں آپس میں ہی اتنے شدید اختلافات تھے کہ وہ کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکتے تھے۔ کبھی ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ ان میں کبھی اتفاق رائے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ کشمیر میں جہاد کے حوالے سے چندے جمع کرنے کے معاملے میں تو یہ لوگ بڑے فعال تھے لیکن عملی طور پر یہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں کشمیری عوام اور کشمیری مجاہدین کی ہمدردی میں جو کچھ بھی کیا جا رہا تھا وہ مقامی باشندوں کی طرف سے ہو رہا تھا۔ اسی حوالے سے میں یہ بات کہنے میں حق بجانب تھا کہ کشمیر کی آزادی کی جنگ کشمیری نہیں پاکستانی لڑ رہے تھے۔

میں ایک بار پھر محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ مقامی انتظامیہ کی طرف سے میری سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ تاہم میری حفاظت کے لئے نصف درجن مسلح پولیس والے چوبیس گھنٹے بنگلے کے سامنے موجود رہتے تھے۔ کلپنا بھی میرے ساتھ قید ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر کی خواتین نے کئی مرتبہ برقعہ پہنا کر اُسے اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہا تھا لیکن اُس نے ہر مرتبہ انکار کر دیا۔

اُن دہشت گردوں کا ابھی تک سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا جنہوں نے وڈیرہ نوازش علی کی

کوٹھی پر راکٹ برسائے تھے۔ بعض مشتبہ لوگ حراست میں لئے گئے تھے لیکن پولیس ان سے کچھ معلوم نہیں کر سکی تھی۔

وڈیرہ کی کوٹھی پر حملہ کرنے والے ''را'' کے ایجنٹ تربیت یافتہ تھے۔ مجھ سے زیادہ اُنہیں کون جانتا تھا؟ یہ حملہ بڑی پلاننگ سے کیا گیا تھا۔ یقیناً تمام انتظامات پہلے ہی مکمل کر لئے گئے ہوں گے۔ حملے کے بعد وہ لوگ اپنے کسی نہ کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے اور ان کا سراغ لگانا اب آسان نہیں تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا..... میں وڈیرہ نوازش علی کو دیکھنے کے لئے ہسپتال بھی نہیں جا سکا تھا۔ میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

اُس رات دس بجے کے قریب ایک گاڑی کوٹھی کے سامنے آ کر رُکی۔ اس کے چند منٹ بعد رئیس سلطان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور کلپنا بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُسے دو دن سے ہلکا سا بخار ہو رہا تھا۔

''دو آدمی تم سے ملنے کے لئے آئے ہیں سائیں شمروز!'' رئیس سلطان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کے ساتھ ایک پولیس آفیسر بھی ہے۔''

''کون ہیں وہ لوگ؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''تم ڈرائنگ رُوم میں آ جاؤ! وہ لوگ وہاں بیٹھے ہیں۔'' سلطان کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

میں کچھ دیر اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ پھر کمرے سے نکل کر ڈرائنگ رُوم میں آ گیا۔ وہاں صوفوں پر رئیس سلطان کے علاوہ تین آدمی اور تھے۔ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر تھا، دوسرا درمیانے قد کا آدمی جس کے چہرے پر چھوٹی نوکدار داڑھی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اور تیسرے آدمی کی صورت دیکھ کر میں اُچھل پڑا.....!!

○○○

وہ غازی عبدالحق تھا..... کئی مرتبہ کشمیر کے مختلف علاقوں میں بھارتی فوجیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں میں ہمارے ساتھ حصہ لے چکا تھا۔ ہم کئی محاذوں پر شانہ بشانہ لڑے تھے۔ عبدالحق کئی مرتبہ زخمی ہوا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے اکیلے ہی بھارتی فوجیوں کی ایک چوکی تباہ کر دی تھی۔ اس کارروائی میں وہ خود بھی شدید زخمی ہوا تھا اور کم از کم تین مہینے سرینگر سے تیس میل دُور ایک پہاڑی غار میں زیر علاج رہا تھا۔ اُس کی اس کارروائی پر ہی اُسے غازی کا خطاب دیا گیا تھا۔

غازی عبدالحق مجھے دیکھ کر صوفے سے اُٹھ گیا۔ ہم نے بڑے پُر جوش انداز میں ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔ پولیس آفیسر نے بھی مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ برکت اللہ نام کے دوسرے آدمی نے بھی مجھ سے معانقہ کیا تھا۔

اس ملاقات کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم رئیس سلطان کے بنگلے سے رخصت ہو رہے تھے۔ بنگلے کے سامنے نیلے رنگ کی پجیرو کھڑی تھی جس کے شیشے سیاہ رنگ کے تھے۔ قریب ہی ڈرائیور کے ساتھ سادہ لباس میں ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا جس نے آٹو میٹک رائفل اُٹھا رکھی تھی۔ وہ بڑا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے پجیرو کا دروازہ کھول دیا۔ پجیرو کی سیٹ پر ہم اس طرح بیٹھے کہ میں اور کلپنا درمیان کی سیٹ پر تھے، غازی عبدالحق اور اُس کا ساتھی برکت اللہ پچھلی سیٹ پر۔ گن مین ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈیوٹی پر متعین پولیس والے بھی اپنی موبائل میں بیٹھ گئے۔ پیچھے کچھ دُور ایک جیپ کھڑی تھی۔ پولیس آفیسر ہم سے ہاتھ ملانے کے بعد جیپ کی طرف چلا گیا تھا۔

پجیرو حرکت میں آ گئی..... گلی کے موڑ پر ایک پک اپ بھی کھڑی تھی جس کے پچھلے حصے پر فرش پر چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن چاروں کے پاس آٹو میٹک رائفلیں تھیں۔ ہماری پجیرو گلی سے نکلی تو وہ پک اپ بھی ہمارے پیچھے لگ گئی۔

آگے ہماری گاڑی تھی، اُس کے پیچھے پولیس کی موبائل اور آخر میں وہ پک اپ۔ مین روڈ پر آ کر گلشن چورنگی سے پولیس موبائل بائیں طرف مُڑ گئی اور پک اپ ہمارے پیچھے لگی رہی۔ نیپا چورنگی سے پجیرو یونیورسٹی روڈ پر بائیں طرف مُڑ گئی۔ وہ پک اپ بھی ہمارے پیچھے ہی تھی۔ میں نے دو تین مرتبہ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو غازی عبدالحق نے بتایا کہ اس پک اپ میں اپنے ہی آدمی ہیں۔

ہماری گاڑی یونیورسٹی سے بہت آگے نکل کر دائیں طرف ایک سڑک پر مُڑ گئی۔ اس علاقے میں ابھی ڈویلپمنٹ کا کام ہو رہا تھا۔ کئی رہائشی پراجیکٹ زیرِ تعمیر تھے۔ اُس سڑک پر نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پجیرو بائیں طرف ایک اور سڑک پر مُڑ گئی۔ اس مرتبہ فاصلہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ پجیرو ایک بہت بڑے آہنی پھاٹک کے سامنے رُک گئی۔

پھاٹک کھلا اور پجیرو کے پیچھے وہ پک اپ بھی اندر آ گئی۔ یہ بہت وسیع و عریض احاطہ تھا۔ کئی ایکڑ رقبہ اُونچی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا۔ اندر کی طرف چار دیواری کے ساتھ ساتھ ناریل کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ احاطے کے اندر بھی جگہ جگہ ناریل کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ بہت بڑے حصے میں سرسبز اور دبیز گھاس لگی ہوئی تھی۔ احاطے کے ایک طرف حجرہ نما کئی کمرے تھے جبکہ دوسری طرف ایک بنگلہ نما خوبصورت عمارت تھی۔

پجیرو اُس بنگلے کے سامنے رُک گئی جبکہ پک اپ دوسری طرف کمروں کے سامنے ایک جگہ رُکی تھی۔ ہم پجیرو سے نیچے اُترے تو تین آدمی برآمدے میں نمودار ہوئے اور اُنہوں نے آگے بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔

یہ انکشاف میرے لئے خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ یہ دینی مدرسہ تھا۔ یہاں دینی تعلیم کے ساتھ جہاد کی تبلیغ بھی ہوتی تھی۔ یہاں تقریباً پچاس طالب علم ان حجروں میں اقامت پذیر تھے جبکہ دن کے وقت شہر کے مختلف علاقوں سے بڑی تعداد میں طلباء یہاں آتے تھے۔ مولوی برکت اللہ اس مدرسے کا مہتمم تھا۔ وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ اسی احاطے میں رہائش پذیر تھا۔ اُس کی رہائش گاہ اسی بنگلہ نما عمارت کے پچھلی طرف ایک احاطے کی عقبی چار دیواری کے قریب ایک کشادہ مکان میں تھی۔ پانچ چھ فٹ اُونچی ایک دیوار اُٹھا کر اُس کا صحن بالکل الگ کر دیا گیا تھا۔ کلپنا کو فوراً ہی اُس مکان میں خواتین کے پاس بھیج دیا گیا اور ہم بنگلے کے ایک وسیع کمرے میں آ گئے جہاں فرش پر سینتھیٹک قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیے بھی رکھے ہوئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے سامنے چائے کی پیالیاں رکھ دی گئیں اور گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ غازی عبدالحق کے کہنے کے مطابق انہیں کراچی میری آمد کا اُسی روز پتہ چل گیا تھا جب میں ہندوستان کی سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہوا تھا اور اُس سے اگلے روز وڈیرہ نوازش علی کے ساتھ کراچی پہنچا تھا۔ مولوی برکت علی نے اُسی رات کشمیر میں میرے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ وہ مجھ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن ہماری پارٹی کی ہائی کمان نے اُسے روک دیا تھا اور مجھ سے دُور رہنے کی ہدایت کی تھی۔ اس کے دو دن بعد ٹی وی پر میرا انٹرویو نشر ہوا تھا۔

غازی عبدالحق کے کہنے کے مطابق ہماری پارٹی کی کمان اس وقت کمانڈر لگریز کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اگرچہ بہت جوشیلا نوجوان تھا لیکن بڑی سمجھداری سے کام لے رہا تھا۔ اُس نے بھارتی فوج کو کشمیر میں کئی محاذوں پر لوہے کے چنے چبوا دیئے تھے۔ وہ چھلاوے کے نام سے مشہور ہو

گیا تھا۔ ایک رات سرینگر میں کوئی چھاپہ مار کارروائی کرتا تو صبح باندی پورہ میں اُس کی موجودگی کی اطلاع ملتی۔

میری عدم موجودگی میں کشمیر میں آزادی کی تحریک میں بڑے نشیب و فراز آئے تھے۔ ہمارے کئی پرانے مجاہدین اپنی سرزمین کی حرمت پر قربان ہو چکے تھے۔ لاتعداد نئے پُرجوش اور ولولہ انگیز نوجوان تحریک میں شامل ہو کر بھارتی فوجیوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے ہوئے تھے۔

غازی عبدالحق کے کہنے کے مطابق کشمیر میں مجاہدین کی تین چار تنظیمیں مل کر ایک بڑی کارروائی کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ اور اس کے لئے اُنہیں چند ایسے نوجوانوں کی ضرورت تھی جو وادی سے باہر رہ کر اس منصوبے پر کام کر سکیں۔ اس سلسلے میں میرا نام بھی اُن کے سامنے تھا۔ لیکن وہ لوگ ابھی اس منصوبے کو حتمی نہیں دے پائے تھے کہ اُنہیں وڈیرہ نوازش علی کی کوٹھی پر راکٹوں سے حملے کی اطلاع ملی۔ میں اس حملے میں بچ گیا تھا اور پولیس کی ایک پارٹی میری حفاظت پر معمور کر دی گئی تھی۔ لیکن مولوی برکت اللہ نے بھی اپنے آدمیوں کے ذریعے خفیہ طور پر میری نگرانی شروع کرا دی تھی۔

ادھر سرینگر میں ہماری ہائی کمان نے بھی اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسلحہ اور گولہ بارود کی ضرورت تھی۔ روس کے شکنجے سے آزاد ہونے والی وسطی ایشیائی اسلامی ریاستوں میں اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ان ریاستوں کو اپنی اقتصادی اور مالی حالت کو سہارا دینے کے لئے سرمائے کی ضرورت تھی اور بعض ریاستیں یہ اسلحہ فروخت کر کے مختلف ممالک سے سرمایہ اور ضرورت کی چیزیں حاصل کر رہی تھیں۔

ہماری ہائی کمان نے بھی ایسی ہی ایک وسط ایشیائی ریاست سے اسلحہ اور گولہ بارود کا بندوبست کر لیا تھا اور اس گولہ بارود کو کشمیر تک پہنچانے کے لئے کم از کم دو ایسے آدمیوں کی ضرورت تھی جو وادی کے چپے چپے سے واقف ہوں اور ہوائی جہاز میں اس علاقے کی نشاندہی کر سکیں جہاں اسلحہ گرایا جانا تھا۔ اس مقصد کے لئے میرا اور ترمیز نامی ایک نوجوان کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ترمیز ان دنوں بارہ مولا میں تھا۔ اُسے اطلاع بھجوا دی گئی تھی کہ وہ آزاد کشمیر کی طرف سے ہوتا ہوا کراچی پہنچ جائے۔

غازی عبدالحق مجھ سے رابطے کے لئے خود کراچی آ گیا تھا اور اُس نے مجھ سے رابطہ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اور اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا اس منصوبے کی تفصیلات بیان کر رہا تھا۔ منصوبہ بڑا خوفناک تھا۔ غازی عبدالحق کی اطلاع کے مطابق بھارت کارگل کی طرف سے پاکستانی علاقے میں واقع چند ایسی پہاڑی چوٹیوں پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا جو دفاعی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ ان چوٹیوں پر قبضہ کر کے پاکستان کو اس طرف سے مفلوج

کیا جا سکتا تھا۔ پاکستان بھی بھارت کے اس منصوبے سے بے خبر نہیں تھا اُس نے بھی کارگل کے دوسری طرف اپنے علاقے میں دفاعی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

سرینگر سے کارگل پہنچنے کا واحد راستہ وہ ہائی وے تھا جو درّہ زوجی لا، دراس اور لداخ سے ہوتا ہوا کارگل تک پہنچتا تھا۔ ہمارے مجاہدین کا منصوبہ یہ تھا کہ بھارت جیسے ہی کارگل کی طرف اپنی کارروائی شروع کرے اُس ہائی وے کو بلاک کر کے اُس کی سپلائی لائن کاٹ دی جائے اور اس سے پہلے مجاہدین کی ایک بڑی تعداد لداخ سے آگے پہنچا دی جائے تا کہ بھارتی فوج کے لئے زیادہ سے زیادہ مشکلات پیدا کی جا سکیں۔

ہائی کمان نے منصوبے کی منظوری دے دی تھی۔ اسلحہ لانے کے لئے ایک چھوٹے طیارے کا بھی بندوبست ہو چکا تھا جس کا پائلٹ ایک اطالوی تھا۔ اُس کا تعلق اٹلی کے ایک ایسے گروہ سے تھا جو دنیا بھر کے چھوٹے ممالک کو اُن کی ضرورت کے مطابق اسلحہ اور گولہ بارود سپلائی کرتا تھا۔ ہماری تنظیم کے لئے بھی اسلحہ کا بندوبست اُسی گروہ نے کیا تھا۔

منصوبہ اگرچہ بڑا خوفناک تھا۔ اُس کی کامیابی سے بھارت کی کمر ٹوٹ سکتی تھی۔ اُس کے فوجی بڑی تعداد میں مجاہدین کے گھیرے میں آ جاتے تو مجاہدین بھارتی حکمرانوں سے اپنی بات منوا سکتے تھے اور بھارت کو یقیناً اُن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے۔

ہم رات کو دیر تک بیٹھے اس منصوبے کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ مجھے کلپنا کی بھی پریشانی تھی۔ میں نے جب غازی عبدالحق سے اس کا ذکر کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اس کی تمہیں فکر نہیں کرنی چاہئے..... وہ یہیں رہے گی مولوی برکت اللہ کی فیملی کے ساتھ۔'' وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''سونا مارگ کے قریب مقررہ مقام پر اسلحہ گرانے کے بعد تمہارا جہاز واپس چلا جائے گا اور اس کے بعد تم کراچی واپس آ جاؤ گے۔ اس کے بعد صورتحال بڑی حد تک تبدیل ہو چکی ہوگی۔ تم اگر چاہو تو یہاں رہ کر بھی تحریک کے لئے خدمات انجام دے سکو گے۔''

اگلے روز میں نے کلپنا سے اس منصوبے کا ذکر کیا تو وہ پریشان ہو گئی۔

''کیا تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟'' اُس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''مجبوری ہے.....'' میں نے کہا۔ ''تم جانتی ہو میں نے اپنی زندگی اپنے وطن کی آزادی کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ میں کشمیر سے باہر بھی رہا تو اپنے کاز کے لئے کام کرتا رہا۔ اور اب مجھے ایک اور موقع مل رہا ہے۔ مجھے اپنے مشن کی کامیابی کے لئے تمہاری دُعاؤں کی ضرورت ہے۔ میں واپس آؤں گا۔ اور پھر ہم دونوں.....''

''کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی؟'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔

''نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر کوئی زمینی مشن ہوتا تو میں تمہیں کبھی بھی یہاں نہ چھوڑتا۔ لیکن مجبوری ہے۔''

اُس روز شام سے ذرا پہلے ایک فوٹو گرافر میری تصویریں کھینچ کر لے گیا۔ اس کے اگلے روز ترمیز بھی کراچی پہنچ گیا۔ وہ بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ملا۔ ہم کشمیر میں کئی معرکوں میں اکٹھے رہ چکے تھے۔

ایک ہفتے میں ہمارے پاسپورٹ تیار ہو گئے اور ویزے بھی لگ گئے۔ ہماری تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ہمیں ہر طرح کی بریفنگ دی جا چکی تھی۔ اور جب میں کلپنا سے مل کر رخصت ہونے لگا تو وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے میری آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں..... میرے دل میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ میرے اس مشن کا انجام نجانے کیا ہو..... میں زندہ واپس آتا بھی ہوں یا نہیں۔ میرے بعد کلپنا کا کیا ہوگا؟

میں یہ سب کچھ سوچتا ہوا کلپنا سے رخصت ہو گیا.....

جہاز نے ٹیک آف کیا تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں زندگی میں پہلی مرتبہ ہوائی جہاز میں بیٹھا تھا۔ میں دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا اور اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پرواز ہموار ہوئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

ہماری منزل الماتا تھی۔ ایئر پورٹ پر دو آدمی ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ ہم رات نو بجے کے قریب الماتا پہنچے تھے۔ وہ دونوں ہمیں شہر کے نواح میں واقع ایک مکان میں لے گئے۔ پہلے کھانا اور پھر اس کے بعد سبز قہوے سے ہماری تواضع کی گئی۔

''اب تم لوگ آرام کرو! ہم صبح چھ بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' اُن دونوں میں سے ایک نے کہا اور وہ ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

اس مکان میں صرف ایک بوڑھا رہ گیا تھا۔ اُس کی عمر ستر سے کچھ اُوپر ہی رہی ہوگی۔ چہرے پر جھریوں نے مکڑی کا جالا سا تان رکھا تھا۔ بوڑھے نے ہمیں صبح پانچ بجے جگا دیا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو اطراف کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ مکان ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تھا۔ چاروں طرف اُونچے درخت اور سبزہ تھا۔ دُور پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں تھیں۔ مجھے کشمیر کی وادی یاد آ گئی..... ایسے حسین مناظر وہیں دیکھے جا سکتے تھے۔

ہم ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر تیار ہو گئے۔ ہمارے دونوں میزبان ٹھیک چھ بجے پہنچ گئے اور ہم بوڑھے سے رخصت ہو کر اُن کے ساتھ کھلی چھت والی جیپ پر سوار ہو گئے۔ پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک اگرچہ پختہ تھی لیکن بعض مقامات پر نہایت خطرناک موڑ اور گھاٹیاں تھیں۔ اس لئے جیپ کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ ہمارا سفر تقریباً دن بھر جاری رہا۔ ہم فردنزے، اندژان اور قوقند سے ہوتے ہوئے بالآخر شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد مرغاب پہنچ گئے۔

مرغاب کو شہر نہیں ایک بڑا قصبہ کہا جا سکتا تھا۔ اُس کی آبادی سرسبز پہاڑیوں پر اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھی۔ ہماری جیپ شہر کے مرکزی بازار سے ہوتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی اور

بالآخر ایک بہت بڑی حویلی میں داخل ہو کر رُک گئی۔ اُس حویلی کی دیواریں کسی قلعے کی فصیل کی طرح بہت مضبوط اور اُونچی تھیں۔ چاروں کونوں پر واچ ٹاورز کی طرح برج بنے ہوئے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہاں کسی زمانے میں قبیلے کے سردار کی رہائش ہوا کرتی تھی۔ جب کمیونزم کا تسلط ہوا تو اس حویلی پر حکومت نے قبضہ کر لیا اور سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد یہ ریاست آزاد ہوئی تو یہ حویلی اس علاقے کے ایک بااثر آدمی کے قبضے میں آ گئی۔

حویلی کی عمارت بہت شاندار تھی۔ اُس میں کئی کمرے تھے۔ یہاں تین آدمی پہلے سے موجود تھے۔ ہم دن بھر کے سفر سے بری طرح تھک گئے تھے۔ گرم گرم قہوے سے ہماری تواضع کی گئی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم جلد ہی سو گئے۔

صبح سات بجے میں بیدار ہو گیا۔ ترمیز ابھی تک سو رہا تھا۔ میں حویلی کی عمارت سے نکل کر لان میں آ گیا۔ بڑی دبیز اور ملائم گھاس تھی۔ کئی اقسام کے پھولوں کے پودے تھے۔ ایک طرف گلاب کے پھولوں کا تختہ تھا۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ گلاب کے اتنے حسین پھول میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ یہ حویلی بھی کسی قدر بلندی پر تھی۔ اطراف میں دُور دُور تک بلند پہاڑوں کی چوٹیاں تھیں۔ بعض چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور صبح کی نرم دُھوپ میں برف اس طرح چمک رہی تھی کہ ان پر نگاہ ٹکانا مشکل ہو رہا تھا۔

ہمارے دونوں میزبان بھی رات اُسی حویلی میں رہے تھے۔ نو بجے کے قریب ہم سب نے ناشتہ کیا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دو اور آدمی وہاں پہنچ گئے۔ اُن میں ایک بہت ہی بارُعب شخصیت کا مالک تھا وہ ناصر تھا۔

ہمیں ایک بہت بڑے کمرے میں لے جایا گیا اور اُس کمرے کو دیکھ کر میری آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں..... یہاں ہر قسم کے اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ناصر ہی وہ شخص تھا جس نے یہاں ہمارے لئے اسلحہ کا بندوبست کیا تھا۔ اُس نے ہمیں اسلحہ کی دو پیٹیاں بھی دکھائیں جو ہمیں لے جانی تھیں۔ اُن میں آٹو میٹک رائفلیں، مارٹر گنیں، لائٹ مشین گنیں، اینٹی ایئر کرافٹ گنیں، راکٹ لانچر، لاتعداد راکٹ، مارٹر گنوں کے گولے اور بڑی مقدار میں ایمونیشن شامل تھا۔

حویلی کے دوسرے کمروں میں بھی اسلحہ اور گولہ بارود کے انبار لگے ہوئے تھے۔ شام سے ذرا پہلے اسلحہ کی کچھ پیٹیاں ایک ٹرک پر لاد کر کسی طرف روانہ کر دی گئیں اور اس کے ایک گھنٹے بعد ہم بھی جیپ پر روانہ ہو گئے۔ آڑھے ترچھے بل کھاتے ہوئے پہاڑی راستوں پر ایک گھنٹے کا یہ سفر خاصا دُشوار ثابت ہوا تھا۔

ہماری منزل پہاڑیوں میں گھرا ہوا وہ چھوٹا سا میدان تھا جہاں ڈکوٹا قسم کا ایک طیارہ بھی کھڑا تھا۔ دراز قامت ناصر اور ایک اور آدمی پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے۔ اسلحہ کی پیٹیاں جہاز پر لادی جا چکی تھیں۔ جہاز کا پائلٹ ایک نوجوان اطالوی تھی۔ سلوانو اس قسم کے کئی خطرناک

مشن انجام دے چکا تھا۔ اُسے ایسے کاموں کا خاصا تجربہ تھا۔

میدان میں دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی عمارت بھی تھی اور ناصر اُس عمارت کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے پرانی سی میز پر ایک طاقتور ٹرانسمیٹر رکھا ہوا تھا۔ دس بجے کے قریب اُس ٹرانسمیٹر پر سگنل موصول ہوا۔ ناصر نے کال ریسیو کی، چند منٹ تک بات کرتا رہا پھر ٹرانسمیٹر بند کر کے اُٹھ گیا۔

''کلیرنس سگنل مل گیا ہے.....اب تم لوگ روانہ ہو جاؤ!'' وہ ہمیں اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

ہم عمارت کے سامنے کھڑے ہوئے جہاز کے قریب آ گئے۔ جہاز میں پائلٹ کی سیٹ کے پیچھے صرف دو سیٹیں تھیں۔ باقی حصے میں اسلحہ اور گولہ بارود کی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے بیٹھتے ہی پائلٹ سلوانو نے بھی اپنی سیٹ سنبھال لی۔

''اُوپر ریک پر پیراشوٹ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ باندھ لو!'' اُس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم نے پیراشوٹ اُتار لئے۔ سلوانو کو اپنی سیٹ سے اُٹھنا پڑا۔ پیراشوٹ باندھ کر اُس نے ہمیں سمجھا دیا کہ ضرورت پڑنے پر انہیں کس طرح کھولا جا سکتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

وہ میدان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چاروں طرف پہاڑیاں تھیں۔ اور مجھے حیرت تھی کہ یہ طیارہ یہاں کس طرح اُترا ہو گا۔

انجن سٹارٹ ہوا اور طیارہ میدان میں دوڑنے لگا..... اُس کی رفتار بڑھتی گئی اور پھر وہ مینڈک کی طرح پھدک کر فضا میں بلند ہو گیا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا..... میرا خیال تھا کہ طیارہ کسی بھی وقت کسی پہاڑی سے ٹکرا جائے گا۔ لیکن سلوانو ماہر پائلٹ تھا وہ بڑی ہوشیاری سے طیارے کو اُوپر اُٹھاتے ہوئے پہاڑیوں کے اس حصار سے نکالتا ہوا لے گیا۔ فضا میں ایک دو چکر لگانے کے ساتھ طیارہ بدستور بلندی اختیار کرتا رہا اور بالآخر اُس کا رُخ پامیر کے بلند سلسلہ کوہ کی طرف مُڑ گیا۔

ہم پامیر کی پچیس ہزار فٹ بلند چوٹی پار کر کے پاکستان کی فضائی پٹی سے ہوتے ہوئے کشمیر کی فضا میں آ گئے تھے۔ ہمیں زمین پر اُس جگہ کی تلاش تھی جہاں ہمیں اسلحہ کی پیٹیاں گرانی تھیں۔ پیٹیوں کے ساتھ پیراشوٹ لگے ہوئے تھے اس لئے پیٹیوں کے زمین پر گر کر ٹوٹنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ہمیں زمین سے روشنی کے مخصوص سگنلز کی تلاش تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اپنی منزل کا سراغ لگاتے ہمارا طیارہ ایئر پاکٹ میں پھنس گیا..... ہوا کے قیامت خیز جھونکے طیارے کو اُس کے راستے سے ہٹا کر کسی اور طرف لے گئے۔ نوجوان پائلٹ سلوانو طیارے کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن جہاز اُس کے قابو میں نہیں رہا تھا۔ ہمارے دونوں طرف چٹانیں تھیں اور خطرہ تھا کہ جہاز کسی بھی وقت کسی چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا..... جہاز تیزی سے ایک طرف جھک رہا تھا۔ کڑک کی ایک خوفناک آواز کے ساتھ جہاز کا دروازہ ٹوٹ گیا اور اسلحے کی بھاری پیٹیاں اِدھر اُدھر لڑھکنے لگیں..... اور پھر وہ پیٹیاں ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر گرنے لگیں۔ جہاز کا توازن بگڑ چکا تھا اور وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر غوطے کھا رہا تھا.....

''اب جہاز کو بچانا ممکن نہیں۔'' سلوانو نے چیخ کر کہا۔ ''چھلانگ لگا دو..... ہری اپ! ورنہ جہاز کے ساتھ ہم سب کے بھی ٹکڑے ہو جائیں گے۔''

میں نے ترمیز کی طرف دیکھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ہم دونوں تیزی سے جہاز کے پچھلے حصے کی طرف لپکے۔ اُسی وقت کڑکڑاہٹ کی ایک اور زوردار آواز سنائی دی..... دروازے کے قریب جہاز کا فرش اس طرح ٹوٹ رہا تھا جیسے زلزلے سے زمین پھٹ رہی ہو۔

اسلحے کی ساری پیٹیاں غائب ہو چکی تھیں۔ صرف دو پیٹیاں ایسی تھیں جو دروازے کے بالکل قریب پڑی تھیں۔ جہاز کو ایک جھٹکا لگا اور وہ دونوں پیٹیاں بھی دروازے سے نکل کر تاریک خلا میں غائب ہو گئیں..... میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مجھے چھلانگ لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے جیسے ہی راڈ کو چھوڑا خود بخود پھسلتا ہوا دروازے سے باہر گرا اور ہوا میں قلابازیاں کھانے لگا.....

جہاز سے گرنے کے بعد میں زمین تک کس طرح پہنچا تھا اس کی تفصیل آپ میری اس کہانی کے شروع میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں میں انہیں دُہرانا ضروری نہیں سمجھتا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اسلحہ کی پیٹیاں کس جگہ گری تھیں؟ ترمیز کہاں تھا اور میں کہاں ہوں؟ لیکن سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ ہمارا مشن ناکام ہو گیا تھا اور کروڑوں ڈالر مالیت کا وہ اسلحہ اور گولہ بارود بھارتی درندہ صفت فوجیوں سے برسرِ پیکار مجاہدین تک پہنچنے کی بجائے ضائع ہو گیا تھا۔

اس مشن کی ناکامی سے جہاں ایک طرف بھاری مالی نقصان ہوا تھا وہاں مجاہدین کی سرگرمیاں بھی متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ یہاں سے بچ کر کسی محفوظ جگہ تک پہنچ سکتا ہوں یا ان پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا؟

پیراشوٹ سے اُترتے ہوئے میں نے دُور کسی بستی کی روشنیاں دیکھی تھیں۔ اس بستی والوں نے جہاز کی آواز سنی ہو گی اور جہاز کو گر کر تباہ ہوتے بھی دیکھا ہو گا۔ اگر وہ کوئی عام بستی تھی تو ممکن ہے کسی نے توجہ نہ دی ہو لیکن اگر وہ کوئی فوجی کیمپ تھا تو اُنہیں ضرور تشویش ہوئی ہو گی۔ رات کے وقت وادیٔ کشمیر کے کسی بھی حصے میں کسی ہوائی جہاز کے آنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ دہلی پٹھان کوٹ سے سرینگر کے لئے انڈین ایئر لائن کی پرواز دن کے وقت آتی تھی اور یہی پرواز کارگل اور لیہہ کا چکر بھی لگاتی تھی۔ لیکن رات کے وقت تو کسی پرواز کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ روشنیاں کسی فوجی کیمپ کی تھیں تو ممکن ہے کوئی پارٹی تباہ ہونے والے جہاز کی تلاش میں روانہ ہو چکی ہو یا روانہ ہونے والی ہو.....

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا۔ ایک جگہ رُک کر نشیب میں دیکھنے لگا۔ لیکن ظاہر ہے تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ترمیز کا نام لے کر پکارنے لگا۔ میری آواز پہاڑوں میں بازگشت پیدا کرتی رہی لیکن جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ ترمیز شاید مجھ سے بہت دُور نکل گیا تھا۔ میں دوسری طرف نشیب میں اُترنے لگا۔

دو گھنٹوں تک چلتے رہنے کے بعد میں رُک گیا۔ اس طرح تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا اس لئے میں نے دن کی روشنی پھیلنے کا انتظار کرنا مناسب سمجھا اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میرے چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس سناٹے میں جھینگروں اور دیگر حشرات الارض کی آوازیں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں۔ میں پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا صورتحال پر غور کرتا رہا۔ اسلحہ اور گولہ بارود کے اس نقصان سے اس علاقے میں مجاہدین کی سرگرمیاں متاثر ہو سکتی تھیں اور عین ممکن ہے ہماری ہائی کمان کا وہ منصوبہ بھی ناکام ہو جائے جس کے لئے اتنی محنت کی گئی تھی۔ کراچی میں غازی عبدالحق نے بتایا تھا کہ محبِ وطن کشمیریوں کی اوورسیز انجمن نے یورپ میں آباد کشمیریوں سے چند جمع کر کے کروڑوں ڈالر مالیت کا یہ اسلحہ خریدا تھا جو اس طرح ضائع ہو گیا تھا۔

میں پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا یہی کچھ سوچتا رہا اور پھر میری آنکھ لگ گئی.....!

تیز روشنی سے میری آنکھ کھل گئی..... سورج طلوع ہو چکا تھا اور چمکتی ہوئی تیز دُھوپ براہِ راست میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ میں کچھ دیر اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔

پہاڑیاں زیادہ تر بنجر اور ویران تھیں۔ چھوٹی جھاڑیاں تو بکثرت تھیں لیکن بڑے پودے اور درخت کہیں کہیں نظر آ رہے تھے۔ نشیب میں ایک چشمے کے کنارے میں رُک گیا۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر چند گھونٹ پانی پیا اور ایک بار پھر کسی بستی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

ہر طرف بنجر ویرانہ تھا۔ میں دوپہر تک پہاڑیوں پر گھومتا رہا لیکن نہ تو کوئی بستی دکھائی دی نہ ہی ترمیز ملا اور نہ ہی کسی جگہ تباہ شدہ جہاز کا ملبہ دکھائی دیا۔ پائلٹ سلوانو کے بارے میں میرا خیال تھا کہ اُس نے بھی جہاز سے چھلانگ لگا دی تھی لیکن وہ بھی کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

اس بنجر اور ویران پہاڑی علاقے کو دیکھ کر میرا اندازہ تھا کہ میں درّہ زوجی لا سے آگے لداخ کی طرف کسی جگہ نکل آیا ہوں اور اسلحہ کی پیٹیاں پتہ نہیں کس علاقے میں گری تھیں۔

ایک تنگ سی پہاڑی میں ایک چٹان نما پتھر کے دوسری طرف آتے ہی میں ٹھٹھک کر رُک گیا۔ وہ منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... پیراشوٹ اُونچی جگہ پر جھاڑیوں میں

پھنسا ہوا تھا اور قریب ہی پائلٹ سلوانو پتھروں پر اوندھا پڑا ہوا تھا..... میں دوڑ کر سلوانو کے قریب پہنچ گیا اور اُس پر جھکتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں تھا..... اُس کا سر پھٹا ہوا تھا اور خون بہہ کر جم چکا تھا۔ پیراشوٹ کی ڈوریاں اُس کے پیروں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نیچے آتے ہوئے پیراشوٹ کی ڈوری اُس کے پیروں سے لپٹ گئی تھی اور وہ سر کے بل پتھروں پر گرا تھا اور اُس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی تھی.....

میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پھر آگے چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ تباہ شدہ جہاز کا ملبہ بھی آس پاس ہی کہیں ہو گا لیکن دُور دُور تک کسی ایسی چیز کا سراغ نہیں ملا۔ بھوک اور پیاس سے میری بری حالت ہو رہی تھی۔ تھکن سے نڈھال ہو کر میں ایک جگہ پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور فوراً ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں.....!

پتہ نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور دوسرے ہی لمحہ میں اُچھل پڑا..... تین رائفلیں میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں..... اور میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا تھا۔

تیز دُھوپ کی چمک سے میری آنکھوں میں چکا چوندی ہو رہی تھی۔ میرے سامنے تین آدمی تھے جو میری طرف رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ دُھوپ کی چمک کی وجہ سے اُن کے چہرے تو صاف نظر نہیں آ رہے تھے البتہ اُن کے جسموں پر فوجی وردیاں نہیں تھیں اور یہی بات میرے لئے اطمینان کا باعث بنی تھی۔

میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ میں اس وقت پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز پڑا ہوا تھا۔ سیدھا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی تو ایک خوفناک غراہٹ میری سماعت سے ٹکرائی۔

''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا..... ورنہ گولی مار دُوں گا۔''

میں پھر بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ چند سیکنڈ گزر گئے۔ اور پھر اُس آدمی نے مجھے اُٹھنے کا حکم دیا لیکن ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دے دی کہ اگر میں نے کوئی غلط حرکت کی تو نتیجہ میرے حق میں نہیں نکلے گا۔

میں محتاط انداز میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ لوگ میرے وطن کے مجاہدین ہی تھے..... لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی اُبھرا تھا۔ پہاڑوں میں مجاہدین کے خفیہ ٹھکانوں کا سراغ لگانے کے لئے بھارتی فوج کے انٹیلی جنس والے بھی مجاہدین کے بھیس میں پہاڑوں میں گھومتے رہتے تھے اور اگر یہ واقعی مجاہدین تھے تو میرے بارے میں اُن کے ذہن میں بھی شاید ایسا ہی کوئی خیال ہو گا۔

''عباسی..... تلاشی لو اس کی۔'' اس شخص نے اپنے کسی ساتھی کو حکم دیا۔

میں اُس وقت چٹان کی طرف رُخ کئے ہاتھ سر سے اُوپر اُٹھائے کھڑا تھا۔ ایک آدمی آگے بڑھ کر میرے لباس کو تھپتھپانے لگا۔ اور پھر اُس نے میری جیب سے پستول نکال لیا۔ اُس وقت

کہیں دُور سے ایک آواز سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا عباسی کا نام لے کر پکار رہا تھا۔

''ہم یہاں ہیں..... ادھر آ جاؤ مہر ولی!'' اُس شخص نے چیخ کر جواب دیا جس نے میری تلاشی لی تھی۔

دو تین منٹ گزر گئے۔ پھر پتھروں پر چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کم از کم دو آدمی تھے۔ وہ ہمارے قریب آ کر رُک گئے۔ اور پھر ایک آواز سن کر میں اُچھل پڑا.....

''یہ کون ہے؟''..... یہ آواز شناخت کرنے میں مجھے کوئی دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔

''یہاں سو رہا تھا..... میرا خیال ہے انٹیلی جنس کا کوئی آدمی ہے۔'' یہ اُس شخص کی آواز تھی جس نے مجھے شروع میں وارننگ دی تھی۔ پھر اُس نے مجھے اپنی طرف مُڑنے کا حکم دیا۔

میں بڑے اطمینان سے پیچھے گھوم گیا۔ اُس نئی آواز کے بارے میں میرے ذہن میں جو خیال اُبھرا تھا وہ درست نکلا۔ وہ کمانڈر عثمان تھا..... ہم طویل عرصے تک ساتھ رہے تھے۔ انت ناگ کے قریب ہم دونوں نے مشترکہ کارروائی کر کے ایک بہت بڑا فوجی کیمپ بھی تباہ کیا تھا۔

کمانڈر عثمان چند لمحے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر چیختا ہوا والہانہ انداز میں دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا.....

''شمروز..... میرے دوست..... تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ کیا یہ واقعی تم ہو؟''

''تمہیں اپنی آنکھوں پر یقین کر لینا چاہئے۔'' میں نے جواب دیا۔ صورتحال بدل گئی تھی۔ میری طرف تنی ہوئی رائفلیں ہٹ گئی تھیں۔ وہ سب باری باری مجھ سے گلے مل رہے تھے۔

''آؤ..... ادھر سائے میں بیٹھتے ہیں۔'' کمانڈر عثمان نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں مجھے تقریباً سو گز کے فاصلے پر چند درخت نظر آ رہے تھے۔

ہم درختوں کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ کمانڈر عثمان کے ایک ساتھی نے کندھے پر لٹکی ہوئی چھاگل اُتار کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے پانی کے دو تین گھونٹ پیئے اور چھاگل دوسرے کی طرف بڑھا دی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ اور جب اُنہیں یہ پتہ چلا کہ میں بھوکا ہوں تو ایک مجاہد نے اپنے لباس کے اندر سے ایک تھیلی نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ اُس میں کوئی پاؤ بھر بھنے ہوئے چنے ہوں گے جن میں گڑ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ملے ہوئے تھے۔ کشمیر کی آزادی کے لئے لڑنے والے حریت پسندوں کی یہی خوراک تھی۔ اور کبھی تو کئی کئی روز فاقوں میں گزارنے پڑتے تھے۔ ہماری زندگی آبادیوں سے دُور جنگلوں اور پہاڑوں میں گزر رہی تھی۔ کبھی کسی آبادی میں جانے کا اتفاق ہوتا تو کوئی اچھی چیز کھانے کو مل جاتی تھی۔

میں نے ایک مٹھی چنے کھائے اور ایک دو گھونٹ پانی پی کر رب کا شکر ادا کیا۔

کمانڈر عثمان کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ ان لوگوں کو اسلحہ لے کر آنے والے ایک جہاز کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ مجاہدین کی کئی پارٹیاں سونا مارگ کے آس پاس کی پہاڑیوں پر پھیلا دی گئی تھیں تا کہ اگر غلطی سے جہاز سے اسلحہ کی پیٹیاں کسی اور جگہ گرا دی جائیں تو اُنہیں تلاش کر کے قبضے میں لیا جا سکے۔ اُنہوں نے جہاز کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجاہدین کی دو تین پارٹیاں اُس طرف روانہ ہو گئی تھیں۔ وہ لوگ پوری رات اور پھر پورا دن پہاڑوں میں سفر کرتے رہے۔ اُنہیں اسلحہ کی چند پیٹیاں مل گئی تھیں جنہیں محفوظ مقام پر پہنچا دیا گیا تھا اور اب وہ لوگ پہاڑوں میں مزید پیٹیاں تلاش کر رہے تھے کہ میں نظر آ گیا۔

اُنہیں سلوانو کی لاش بھی مل گئی تھی اور ایک جگہ جہاز کا ملبہ بھی مل گیا تھا لیکن اسلحہ کی مزید پیٹیاں نہیں ملی تھیں۔ اور پھر باتوں میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ ہم اس وقت درّہ زوجی لا کے آس پاس موجود ہیں اور ہائی وے ہم سے چند میل سے زیادہ دُور نہیں جو دراس، لیہہ اور لداخ سے ہوتی ہوئی کارگل کی طرف جاتی ہے۔

کمانڈر عثمان کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ہائی کمان سے اُن کا ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم ہے۔ ہائی کمان کو اسلحہ کی پیٹیوں کی بازیابی کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ بیشتر گولا بارود ضائع ہو جانے کے باوجود ہائی کمان کے منصوبے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور مجاہدین کی مختلف پارٹیوں کو دو دن کے اندر اندر دراس کے قرب و جوار میں جمع ہونے کا حکم دے دیا گیا تھا۔

رات ہم نے اُنہی پہاڑوں پر گزاری اور صبح ہوتے ہی روانہ ہو گئے۔ ہماری منزل وہاں سے میلوں دُور وہ غار تھا جہاں کمانڈر عثمان کی پارٹی نے اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ اسلحہ کی دستیاب ہونے والی پیٹیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ وہ چھ پیٹیاں تھیں۔ کچھ مجاہدین اس طرف بھی آس پاس کے پہاڑوں میں گھومتے رہے لیکن مزید اسلحہ نہیں ملا اور نہ ہی ترمیز کا کوئی سراغ ملا۔ میرا خیال تھا کہ یا تو وہ کسی اور طرف نکل گیا تھا یا وہ بھی جہاز کے پائلٹ سوانو کی طرح.....

کمانڈر عثمان کے ساتھ بائیس آدمی تھے۔ ہم لوگ اگلے روز صبح سویرے ہی دراس کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسلحہ کی پیٹیاں اگرچہ خاصی وزنی تھیں لیکن مجاہدین نے اُنہیں پھولوں کے ٹوکروں کی طرح اُٹھا رکھا تھا۔ اسلحہ اور گولہ بارود ہمارے لئے خوراک سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اس لئے اس کے وزن کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

ہم لوگ ہائی وے سے دُور رہ کر سفر کر رہے تھے۔ ہائی وے کے آس پاس رہنے سے کسی جگہ بھارتی فوجیوں سے بھی تصادم کا اندیشہ تھا۔

پورا دن اور اس کے بعد نصف رات تک سفر کرنے کے بعد ہم نے ایک غار میں پڑاؤ ڈال دیا۔ وہاں چند مجاہدین پہلے سے موجود تھے جن سے پتہ چلا کہ مجاہدین کی دوسری پارٹیاں بھی قرب و جوار میں پہنچنا شروع ہو گئی ہیں۔ پہاڑوں میں پورا دن اور آدھی رات تک کا سفر اگرچہ تھکا دینے والا تھا لیکن مجاہدین ان مشکلوں اور تکلیفوں کے عادی ہو چکے تھے۔

اس کیمپ میں پہلے سے موجود مجاہدین کے پاس کھانے پینے کا سامان بھی موجود تھا۔ اُنہوں نے قہوے سے ہماری تواضع کی۔ کچھ مجاہدین تو قہوہ پینے کے تھوڑی ہی دیر بعد سو گئے۔ میں، کمانڈر عثمان اور چند مجاہد ایک طرف بیٹھے صورتحال پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

صبح سویرے دو اور مجاہدین وہاں پہنچ گئے۔ اُنہوں نے بتایا کہ بھارتی فوج کے ٹرکوں کے قافلے دراس کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں اور کمانڈر عثمان غار سے نکل کر اُن مجاہدین کے ساتھ پہاڑی کے اُوپر پہنچ گئے۔ وہاں سے تقریباً ڈیڑھ میل دُور نشیب میں ہائی وے نظر آ رہی تھی۔ کمانڈر عثمان دُوربین آنکھوں سے لگائے کچھ دیر اُس طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے دُوربین میری طرف بڑھا دی۔ میں دُوربین آنکھوں سے لگا کر ہائی وے کی طرف دیکھنے لگا۔ اطلاع دینے والے مجاہدین کے مطابق بیس ٹرکوں پر مشتمل ایک قافلہ گزر چکا تھا۔ یہ دوسرا قافلہ تھا جس میں چوبیس ٹرک شامل تھے۔ میں کافی دیر تک اُس قافلے کو دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لیتے ہوئے دُوربین کمانڈر عثمان کی طرف بڑھا دی۔

فوجی قافلہ پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ہم پہاڑی سے اُتر کر غار میں آ گئے۔ کمانڈر عثمان نے فوراً ہی ٹرانسمیٹر پر ہائی کمان سے رابطہ کیا اور اُن فوجی قافلوں کے بارے میں اطلاع دی۔

''ہمیں اطلاع مل چکی ہے۔'' دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ ''ان قافلوں کو گزر جانے دیا جائے اور اُس وقت تک کوئی کارروائی نہ کی جائے جب تک ہائی کمان سے حکم نہ دیا جائے۔''

کمانڈر عثمان دیر تک باتیں کرتا رہا، پھر میری بات بھی کرائی گئی۔ اس وقت مجاہدین کی کئی تنظیموں نے ایک مشترکہ محاذ قائم کر رکھا تھا جس کا سپریم کمانڈر نورغنی تھا۔ اور اس وقت وہ خود ٹرانسمیٹر پر موجود تھا اور مجھے پہلی بار اُس سے براہِ راست بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُس نے میرے کام کی تعریف کی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اسلحہ کی کچھ اور پیٹیاں بھی مل چکی ہیں، اور پھر یہ افسوس ناک اطلاع بھی دی کہ ترمیز بھی پہاڑوں میں زخمی حالت میں پڑا ہوا مل گیا تھا جسے محفوظ جگہ پر پہنچا دیا گیا ہے۔

سپریم کمانڈر نورغنی سے اس محاذ کے بارے میں تفصیل سے بات ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ کارگل کے محاذ پر بھارتی اور پاکستانی فوج میں گھمسان کی جنگ جاری ہے۔ بھارتی فوج پاکستانی علاقے میں گھس گئی تھی جہاں سے اُسے بھگا دیا گیا اور اب پاکستانی فوج بھارتی علاقے میں پیش قدمی کر رہی ہے۔ ٹائیگر ہل نامی پہاڑی چوٹی پر قبضے کے لئے دونوں فوجوں میں زبردست لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ پہاڑی چوٹی دفاعی اعتبار سے دونوں کے لئے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

اور پھر شام کو ہمیں ہائی کمان کی طرف سے اطلاع ملی کہ پاکستانی فوج نے ٹائیگر ہل پر قبضہ کر لیا ہے۔ بھارتی فوج پسپائی اختیار کر کے ٹائیگر ہل سے بہت دُور واپس آ چکی ہے۔ لیکن وہ

اس پہاڑی پر قبضہ کرنے کے لئے نئی حکمت عملی تیار کر رہے ہیں اور اس کے لئے سرینگر سے مزید کمک طلب کر لی گئی ہے۔

ہائی کمان کی طرف سے ہمیں حکم دیا گیا کہ اب ہم کسی فوجی قافلے کو دراس سے آگے نہ آنے دیں۔ اگر ہم اس ہائی وے پر بھارتی فوج کی سپلائی لائن کاٹنے میں کامیاب ہو گئے تو کارگل کے محاذ پر بھارتی فوج کے قدم مکمل طور پر اُکھڑ جائیں گے اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں شکست سے نہیں بچا سکے گی۔ اور یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ کارگل کے محاذ پر شکست کھانے کے بعد کشمیر کے دوسرے محاذوں پر بھی بھارتی فوج کے قدم اُکھڑنا شروع ہو جائیں گے۔

ہم درّہ زوجی لا اور اُس کے درمیانی علاقے میں تھے۔ یہ پورا علاقہ دونوں طرف سے مجاہدین کے گھیرے میں تھا۔ یہ وہ شہ رگ تھی جسے اگر کاٹ دیا جائے تو کارگل کی طرف موجود بھارتی فوجی اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ درّہ زوجی لا اور اُس کے آس پاس موجود تمام مجاہدین کو ہائی کمان کی طرف سے فوجی قافلوں کے خلاف کارروائی کے احکامات مل چکے تھے۔ مجاہدین کی تعداد اگرچہ کم تھی لیکن اُن کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔

ہم رات ہی کو غار سے نکل کر ہائی وے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ اور گولہ بارود موجود تھا کہ ہم کئی روز تک بھارتی فوج کے قافلوں کو آگے جانے سے روک سکتے تھے۔ کمانڈر عثمان نے بارہ مجاہدین پر مشتمل ایک پارٹی کی کمان مجھے سونپ دی تھی۔ اس طرح تمام مجاہدین کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔

ہائی وے سے تقریباً سو گز دُور ہم نے پہاڑیوں میں پوزیشن سنبھال لی اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ کمانڈر عثمان نے ٹرانسمیٹر پر دوسرے کمانڈروں سے بھی رابطہ رکھا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا اور ہم صبح ہونے کا انتظار کرتے رہے..... رات کی تاریکی دم توڑنے لگی اور دن کا اُجالا پھیلنے لگا۔ سورج طلوع ہو گیا اور دُھوپ پھیلنے لگی۔ آٹھ بجے کے قریب ٹرانسمیٹر پر سگنل موصول ہوا۔ کمانڈر عثمان نے فوراً ہی کال ریسیو کی۔ مجاہدین کی ایک پارٹی سے اطلاع ملی کہ تقریباً چالیس ٹرکوں پر مشتمل ایک فوجی قافلہ درّہ زوجی لا میں داخل ہو رہا ہے۔ مجاہدین کی یہ پارٹی زوجی لا درّے کے دوسری طرف تھی اور فوجی قافلے کو اُس طرف سے گزر کر ہماری طرف آنا تھا۔ ہم سے آگے دراس کی طرف مجاہدین کی دوسری پارٹیاں بھی مورچے لگائے بیٹھی تھیں۔ ہمارے حملے کے بعد فوجی ٹرک اگر واپس جانے کی کوشش کرتے تو درّہ زوجی لا کے دوسری طرف موجود مجاہدین کی پارٹی اُن کا راستہ روک لیتی۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک گھنٹے بعد ایک جیپ نظر آئی جس پر آگے لائٹ مشین گن نصب تھی۔ اُس کے پیچھے ٹرکوں کی طویل قطار تھی۔ بعض ٹرکوں پر ترپال پڑے ہوئے تھے اور بعض میں فوجی بھرے ہوئے تھے۔ ایسے ٹرکوں پر سامنے اور دائیں بائیں لائٹ مشین گنیں بھی نصب تھیں..... ٹرک ہمارے سامنے سے گزرتے رہے اور پھر اچانک ہی فضا میں اللہ اکبر

کی فضا گونج اُٹھی.....

یہ حملہ کرنے کا سگنل تھا۔ پہاڑوں میں اس آواز کی بازگشت ختم ہونے سے پہلے ہی فضا تڑتڑاہٹ کی آوازوں سے گونج اُٹھی۔ قافلے پر یہ حملہ اگرچہ اچانک ہی ہوا تھا مگر قافلے والے غالباً اس قسم کی صورتحال کے لئے تیار تھے۔ اُدھر سے بھی جوابی کارروائی شروع ہو گئی۔ لیکن بھارتی فوجیوں کے مقابلے میں ہم بہتر پوزیشن میں تھے۔

بھارتی قافلہ شاہراہ پر تھا جس کے دونوں طرف کھلی جگہ تھی۔ جبکہ ہم بڑے بڑے پتھروں اور چٹانوں کے پیچھے پوزیشن لئے ہوئے تھے۔ ہماری کارروائی زیادہ مؤثر ثابت ہو رہی تھی۔ جلد ہی فضا دھماکوں سے گونجنے لگی..... ٹرکوں میں بھرا ہوا گولہ بارود خوفناک دھماکوں سے پھٹنے لگا..... ٹرکوں کے ٹکڑے اور انسانی جسموں کے چیتھڑے فضا میں اُڑ اُڑ کر چاروں طرف پھیلنے لگے..... پیچھے کے چند ٹرک مُڑ کر پیچھے کی طرف دوڑنے لگے۔ ہم نے اُنہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ درّہ زوجی لا کے دوسری طرف مجاہدین کی پارٹی موجود تھی اور ہمیں توقع تھی کہ وہ ان ٹرکوں میں سے کسی کو بھی بچ کر جانے نہیں دیں گے۔

ہمارا یہ معرکہ تین گھنٹوں تک جاری رہا۔ ہم نے بھارتی ٹرکوں کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ ہمارے دو ساتھی شہید ہوئے تھے۔ سگنل ملتے ہی ہمارے مجاہدین آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ دو گھنٹوں میں ہم وہاں سے بہت دُور نکل آئے۔ لیکن پہاڑوں میں دھماکوں کی آوازیں اب بھی گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔

ہم غار میں پہنچ چکے تھے۔ ہم اپنے صرف ایک شہید ساتھی کی لاش اپنے ساتھ لا سکے تھے۔ دوسرے کو ایک راکٹ لگا تھا اور اُس کا جسم ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تھا۔ اُسے سمیٹنا ممکن نہیں تھا۔

ہم اپنے شہید ساتھی کی تجہیز و تکفین کی تیاری کر رہے تھے کہ فضا میں پھڑپھڑاہٹ کی آوازیں سنائی دینے لگیں..... اُسی وقت ہمارے دو ساتھی دوڑتے ہوئے غار میں داخل ہوئے۔

''گن شپ ہیلی کاپٹر آ رہے ہیں.....'' ایک نے چیخ کر بتایا۔

تمام مجاہدین کو خبردار کر دیا گیا کہ کوئی بھی غار سے باہر نہ نکلے۔ یہ غار بہت بڑا تھا اور اندر بہت دُور تک چلا گیا تھا۔ سب کو پیچھے بھیج دیا گیا۔

میں کمانڈر عثمان کے ساتھ غار کے دہانے کے قریب پتھروں اور جھاڑیوں میں چھپ کر صورتحال کا جائزہ لینے لگا۔ وہ چار گن شپ ہیلی کاپٹر تھے جو بہت بلندی پر فضا میں مردار خور گدھوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ وہ چاروں طرف گردش کرتے ہوئے غالباً مجاہدین کو تلاش کر رہے تھے جو قافلے کو تباہ کر کے پہاڑوں میں غائب ہو گئے تھے۔

ایک ہیلی کاپٹر دیر تک ہمارے سروں پر منڈلاتا رہا، پھر وہ ہائی وے کے ساتھ ساتھ درّہ زوجی لا کی طرف جانے لگا۔ وہ ہیلی کاپٹر ہم سے اتنا دُور جا چکا تھا کہ ایک چھوٹا سا نکتہ بن کر رہ گیا تھا اور دفعتہً وہ نکتہ شعلہ بن کر فضا میں بکھر گیا.....

''گڈ.....!'' کمانڈر عثمان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ زوجی لا درّے کی طرف وہ گن شپ ہیلی کاپٹر مجاہدین کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد اُس نواح میں باقی تین ہیلی کاپٹر بھی دکھائی دیئے لیکن وہ بہت بلندی پر تھے۔ فضاؤں میں دھماکوں کی ہلکی ہلکی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً وہ تینوں ہیلی کاپٹر اُن پہاڑوں پر بمباری کر رہے تھے۔

ہم شام تک اس قسم کے مناظر دیکھتے رہے۔ سہ پہر کے قریب تو ہائی وے کے آس پاس کئی ہیلی کاپٹر پرواز کرتے ہوئے دکھائی دیئے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر شاہراہ پر کسی جگہ اُتر گئے تھے۔ لیکن آدھے گھنٹے بعد وہ دوبارہ فضا میں بلند ہو گئے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی فضا میں گن شپ ہیلی کاپٹروں کی پروازیں شروع ہو گئیں۔ یہ ہیلی کاپٹر تعداد میں ایک درجن سے بھی زیادہ تھے۔ اُنہیں مجاہدین کی تلاش تھی۔ کہیں کہیں یہ ہیلی کاپٹر راکٹ اور گولے بھی برسا دیتے لیکن اُن کا یہ گولہ بارود ضائع ہی جا رہا تھا۔ مجاہدین اتنے لاپرواہ نہیں تھے کہ اُن کی نظروں میں آ جاتے۔ یہ سلسلہ شام تک جاری رہا۔ ہم غار کے دہانے کے قریب دبکے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔

اس سے اگلے روز صبح چار بجے کے قریب ٹرانسمیٹر پر ہائی کمان کی طرف سے اطلاع ملی کہ ایک اور فوجی قافلہ سرینگر سے روانہ ہونے والا ہے جو نو بجے کے قریب ہمارے ٹھکانے کے قریب سے گزرے گا۔ اس قافلے کو فضائی تحفظ فراہم کرنے کے لئے چار گن شپ ہیلی کاپٹر بھی فضا میں پرواز کرتے رہیں گے۔

ہائی کمان سے یہ اطلاع ملتے ہی ہم غار سے نکل کر شاہراہ کے قریب اپنے مورچوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ ہم نے جگہ بدل لی تھی اور دراس کی طرف کچھ آگے نکل گئے تھے۔ ہیلی کاپٹروں کی موجودگی میں قافلے پر حملہ کرنا اگرچہ انتہائی خطرناک تھا لیکن خطرے کی پرواہ کسے تھی؟ ہم تو جان ہتھیلی پر لئے پھر رہے تھے۔ ہم اپنے وطن کی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔ ہمارے سامنے ایک ہی مقصد تھا، غاصبوں سے وطن کی آزادی.....

صبح ہونے سے پہلے پہلے ہم نے ایسی جگہوں پر مورچے بنا لئے کہ فوری طور پر ہیلی کاپٹروں کی نظروں میں بھی نہ آ سکیں۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب دو ہیلی کاپٹر شاہراہ کے اُوپر بہت بلندی پر پرواز کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ مجاہدین کو حکم دے دیا گیا تھا کہ جب تک پارٹی کے کمانڈر کی طرف سے حکم نہ ملے گولی نہ چلائی جائے۔

بہت آگے جانے کے بعد وہ دونوں ہیلی کاپٹر واپس پلٹ آئے۔ اس مرتبہ ایک ہیلی کاپٹر سڑک کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف تھا۔ تاکہ وہ سڑک کے دونوں طرف آس پاس کی پہاڑیوں کو بھی چیک کر سکیں۔

سوا نو بجے کے قریب قافلے کا پہلا ٹرک نظر آ گیا..... دو ہیلی کاپٹر آگے اور دو ہیلی کاپٹر قافلے کے پیچھے پرواز کر رہے تھے۔ انتہائی خطرناک صورتحال تھی۔ غلط حکمت عملی ہم سب کو موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ فضا میں پرواز کرتے ہوئے گن شپ ہیلی کاپٹرز پر نہ صرف ہیوی مشین گنیں نصب تھیں بلکہ راکٹ اور گولے بھی برسائے جا سکتے تھے۔ لیکن ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے۔

اُس وقت میں کمانڈر عثمان کے ساتھ ہی تھا۔ اُس نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے جو مشورہ دیا قریب بیٹھے ہوئے ایک اور مجاہد نے بھی اس کی تائید کر دی۔ اور پھر ٹرکوں کا وہ قافلہ جیسے ہی ہمارے سامنے پہنچا کمانڈر عثمان نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور حملہ شروع ہو گیا.....

آگے والے دونوں ہیلی کاپٹر کافی آگے نکل چکے تھے۔ دھماکوں کی آواز سنتے ہی وہ چکر کاٹتے ہوئے پلٹے اور ہم پر مشین گنوں کی بارش ہونے لگی..... لیکن ہم لوگوں نے اپنے مورچے نہیں چھوڑے۔ قافلے کی طرف سے بھی ہم پر ہیوی مشین گنوں سے زبردست فائرنگ کی جا رہی تھی۔ گولیاں ہمارے آس پاس پتھروں اور چٹانوں میں لگ رہی تھیں۔

میری پوری زندگی بھارتی بھیڑیوں کے خلاف ایسے ہی معرکوں میں گزری تھی۔ لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ایسا زبردست معرکہ اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ ہمارے سامنے سے بھی گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور اُوپر سے بھی شعلے برسائے جا رہے تھے۔ لیکن ہمارا کوئی بھی ساتھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا تھا۔

ہیلی کاپٹر سے مارا جانے والا ایک راکٹ ہمارے پیچھے چٹان پر لگا۔ کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا..... اُس ہیلی کاپٹر سے ہیوی مشین گن سے گولیاں بھی برسائی جا رہی تھیں۔ ایک گولی مجھ سے کچھ دُور میرے ایک ساتھی کے بازو پر لگی۔ وہ چیخ کر پہلے پیچھے گرا پھر سنبھل کر اُس نے اپنی لائٹ مشین گن اُٹھالی اور فائرنگ کرتا ہوا کھلی جگہ پر نکل گیا..... اُس کی گن کا رُخ ہیلی کاپٹر کی طرف تھا اور ہیلی کاپٹر بھی اُس وقت ذرا نیچے تھا۔ مجاہد نے ہیلی کاپٹر کو تو نشانہ بنا لیا لیکن ہیلی کاپٹر سے چلائے جانے والے ایک راکٹ نے اُس کے بھی پرخچے اُڑا دیئے..... ہیلی کاپٹر فضا میں لڑکھڑاتا ہوا قافلے کے ایک ٹرک کے اُوپر گرا اور خوفناک دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

ڈھائی گھنٹوں کے اس معرکے میں ہماری پارٹی کے تین مجاہد شہید اور چھ زخمی ہوئے تھے۔ یقیناً مجاہدین کی دوسری پارٹیوں میں بھی اسی طرح کے جانی نقصان ہوئے ہوں گے۔

قافلہ تباہ ہو چکا تھا۔ مجاہدین کو واپسی کا حکم دے دیا گیا۔ قافلے کے علاوہ ہم نے دو ہیلی کاپٹر بھی تباہ کئے تھے۔ باقی دو ہیلی کاپٹر فضا میں گردش کرتے ہوئے پہاڑوں میں بکھرے ہوئے مجاہدین پر گولیاں اور راکٹ برساتے رہے۔

ہم اپنے زخمی مجاہدین کو لے کر وہاں سے میلوں دُور اپنے ایک اور ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ کچھ اور ہیلی کاپٹر بھی فضا میں نمودار ہوئے تھے جو شام کا اندھیرا پھیلنے تک پہاڑوں پر پرواز کرتے

رہے۔ وقفے وقفے سے دھماکوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں۔

میں غار کے اندر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میرے آس پاس بیٹھے ہوئے ساتھی آج کی صورتحال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی کے پاس ریڈیو ٹرانسسٹر بھی تھا اُس نے خبریں سننے کے لئے ریڈیو آن کر دیا۔

خبروں میں اپنا نام سن کر میں اُچھل پڑا..... دوسرے ساتھی بھی قریب آ گئے۔ وہ خبر زیادہ تفصیلی نہیں تھی لیکن اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے اور پورے بدن میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا آزاد کشمیر ریڈیو پر نشر ہونے والی وہ خبر سنتا رہا.....!

نیوز کاسٹر کا ایک ایک لفظ میرے دل و دماغ پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہا تھا..... اس خبر کے مطابق بعض نامعلوم دہشت گردوں نے ایک دینی مدرسے پر حملہ کر کے آٹھ افراد کو ہلاک کر دیا تھا جن میں مدرسے کے مہتمم کے گھر کی دو خواتین کے علاوہ کلپنا نام کی وہ ہندو لڑکی بھی شامل تھی جو کچھ عرصہ پہلے کشمیر کے نامور مجاہد شمروز کے ساتھ ہندوستان سے آئی تھی۔ کراچی پولیس کے مطابق مدرسے پر یہ حملہ ''را'' کے ایجنٹوں نے کیا تھا۔ کیونکہ اُنہیں یہاں شمروز کی موجودگی کا شبہ تھا۔ لیکن شمروز چند روز پہلے یہاں سے جا چکا تھا تاہم اُس کی راجستھان سے آنے والی ہندو دوست یہاں موجود تھی جو دہشت گردوں کے اس حملے میں جاں بحق ہو گئی۔

ریڈیو بند کر دیا گیا۔ غار میں موجود تمام مجاہدین میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ سے اظہار ہمدردی کرنے لگے۔

اُس رات میں ایک لمحے کو بھی نہیں سو سکا تھا۔ کلپنا کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔ کتنی معصوم تھی وہ..... وہ میرے ساتھ زندگی بتانا چاہتی تھی اور میری خاطر اپنی زندگی ہار گئی.....!

وقت گزرتا رہا..... میرے دل پر کئی زخم تھے جن میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

بھارتی فوجیوں کے خلاف ہماری کارروائیاں جاری رہیں۔ پندرہ دنوں تک ہم نے درّہ زوجی لا اور دراس کے درمیان کارگل کی طرف جانے والی شاہراہ کو ناکہ بندی جاری رکھی۔ ہمارے کئی ساتھی شہید اور زخمی ہو چکے تھے لیکن ہم نے بھارتی فوج کی ایک گاڑی کو بھی آگے نہیں جانے دیا۔ ہم نے اُس شاہراہ کو بھارتی فوجی قافلوں کا قبرستان بنا دیا تھا۔

کارگل کے محاذ پر بھی گھمسان کی جنگ جاری تھی۔ ٹائیگر ہل پر پاکستانی فوج کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ بھارتی فوج زبردست ہزیمت اُٹھا رہی تھی۔ اور پھر اچانک ہی وہ خبریں آنے لگیں جنہوں نے مجھے ہی نہیں تمام مجاہدین کو بھی دہلا کر رکھ دیا.....

اب تک کی اطلاعات کے مطابق کارگل کے محاذ پر ہمارے مجاہدین اور پاکستانی فوج کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ بھارتی فوج پر دونوں طرف سے دباؤ تھا۔ وہ چکی کے دو پاٹوں کے بیچ

میں پس رہے تھے۔ اپنے مورچے چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے۔ اُنہیں کسی کمک اور رسد کی توقع نہیں تھی۔ یہاں سے ہم نے اُن کی سپلائی لائن مکمل طور پر کاٹ دی تھی۔ لیکن پھر اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستانی فوج ٹائیگر ہل سے واپس جا رہی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر بھارت کی بکھری ہوئی فوج نے متحد ہو کر ٹائیگر ہل پر بھرپور حملہ کر دیا۔ پسپا ہوتی ہوئی پاکستانی فوج کو زبردست نقصان اُٹھانا پڑا.....

صورتحال بدل گئی تھی۔ کارگل کے محاذ پر مجاہدین کو بھی زبردست نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ وہ بھی مورچے چھوڑ کر منتشر ہو رہے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا تھا..... شاندار فتح شکست میں کیسے بدل گئی تھی؟ ہم نے زوجی لا اور دراس کے مقامات پر شاہراہ کی ناکہ بندی کر کے بھارتی فوج کی سپلائی لائن کو مکمل طور پر کاٹ دیا تھا۔ یہ صورتحال ایسی تھی کہ اگلے چند روز میں بھارت کو پورے کشمیر میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن..... یہاں وہ کچھ ہو گیا تھا جو میری تو کیا کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کارگل میں ہمارے مجاہدین کو بھی زبردست جانی نقصان اُٹھانا پڑا اور یہاں بھی مجاہدین بھی شدید بد دِلی پھیل گئی تھی۔

اُس روز دراز کے قریب شاہراہ پر ایک اور فوجی قافلے پر حملہ کرتے ہوئے مجاہدین میں وہ جوش و خروش نہیں تھا۔ قافلے کے فوجیوں نے بھی زبردست جوابی کارروائی کی اور تقریباً ایک درجن گن شپ ہیلی کاپٹر بھی ہم پر آگ برساتے رہے۔

یہ محاذ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ ہمارے کئی مجاہدین شہید ہو چکے تھے اور کئی زخمی ہوئے تھے۔ کمانڈر عثمان نے پسپائی کا حکم دے دیا..... میں نے بھی اپنا مورچہ چھوڑ دیا۔ ہمارے سروں پر پرواز کرتا ہوا ہیلی کاپٹر ہیوی مشین گن سے ہم پر گولیوں کی بارش کر رہا تھا۔ میرا ایک ساتھی چھلنی ہو کر گرا۔ میں نے چھلانگ لگا کر ایک بڑے پتھر کے پیچھے پناہ لے لی۔ ہیلی کاپٹر کچھ آگے نکل گیا تھا۔

میں نے اپنے شہید ساتھی کی طرف دیکھا، اُس کے پاس لائٹ مشین گن تھی جو اُس کے قریب ہی پڑی تھی۔ گن میں بیلٹ بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے دوڑ کر لائٹ مشین گن اُٹھا لی اور پتھر کے پیچھے دبک گیا۔

ہیلی کاپٹر واپس آ رہا تھا..... اس وقت وہ بہت نیچے تھا۔ شاید پائلٹ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو گیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہم نے مورچے چھوڑ دیئے ہیں تو ہمارے حوصلے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ہوں گے۔

ہیلی کاپٹر بہت نیچے آ گیا..... اُس کا پائلٹ اب مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں لگی ہوئی گن مسلسل گولیاں برسا رہی تھی۔ میں اچانک ہی لائٹ مشین گن سنبھالے پتھر کی آڑ سے

نکلا اور ڈرائیگر دبا دیا.....

میری یہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ کم از کم دو گولیاں کاک پٹ کا شیشہ توڑتی ہوئی پائلٹ کو لگیں۔ ایک پہلو میں اور دوسری گردن پر..... پائلٹ اپنی سیٹ پر اوندھا ہو گیا اور ہیلی کاپٹر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح فضا میں لہرانے لگا..... اور ٹھیک اُسی لمحے ہیلی کاپٹر کی مشین گن کا رُخ میری طرف ہو گیا.....

مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کے مختلف حصوں میں انگارے بھر گئے ہوں..... میں چیخ کر لہراتا ہوا گرا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک اور زوردار دھماکے کی آواز سنی۔

میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی..... اور پھر میں نے ایک آدمی کو اپنے اُوپر جھکتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ کمانڈر عثمان تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا.....!!

○

اس واقعے کو چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ اور شاید وہ میری زندگی کا آخری معرکہ تھا.....

میں آزاد کشمیر کے ایک ہسپتال میں مفلوج پڑا ہوں..... مجھے نہیں معلوم کہ میرے مجاہد ساتھی مجھے یہاں تک کس طرح لائے تھے؟ لیکن اُنہوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ اپنی زندگیاں، خطرے میں ڈال کر میری زندگی بچانے کے لئے مجھے یہاں تک لے آئے۔ میری زندگی تو بچ گئی لیکن میں اس قابل نہیں رہا کہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکوں..... میری دائیں ٹانگ اور بایاں بازو کندھے کے قریب سے کاٹ دیا گیا ہے..... میرے دائیں ہاتھ پر بھی گولی لگی تھی لیکن وہ زخم اتنا خطرناک نہیں تھا کہ وہ ہاتھ بھی کاٹنا پڑتا۔ میرا یہ ہاتھ بھی خاصا کمزور ہو گیا ہے اس میں اتنی سکت نہیں کہ رائفل اُٹھا سکوں۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ اب بھی پُرعزم ہوں اور اُس وقت کا انتظار کر رہا ہوں کہ رائفل اُٹھا کر دشمن کے سینے چھلنی کر سکوں۔

میں آزاد کشمیر کے اس شہر یا ہسپتال کا نام نہیں بتاؤں گا جہاں میں زیر علاج ہوں۔ میرے صرف چند ہی مجاہد دوست جانتے ہیں کہ میں کہاں ہوں۔ وہ لوگ وقتاً فوقتاً میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ اُن کی باتوں سے مجھے بڑا حوصلہ ملتا ہے۔

کمانڈر عثمان ہی کے کہنے پر میں نے اپنی یہ سرگزشت لکھنی شروع کی تھی جو کسی نہ کسی رسالے یا اخبار کے توسط سے آپ تک پہنچے گی۔ اس خودنوشت کا اہم مقصد عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرنا بھی ہے۔ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن اس خودنوشت کے اختتام پر میں بڑی طاقتوں سے یہ سوال ضرور کروں گا کہ کیا اپنا حق مانگنے والی قومیں اسی طرح ظلم و بربریت کا شکار ہوتی رہیں گی؟ کیا کشمیر، بوسنیا اور چیچنیا کے مظلوم عوام اسی طرح استحصال کی چکی میں پستے رہیں گے.....؟

آخر میں اپنے پڑھنے والوں سے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں ہاتھ